جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

PDFBOOKSFREE.PK

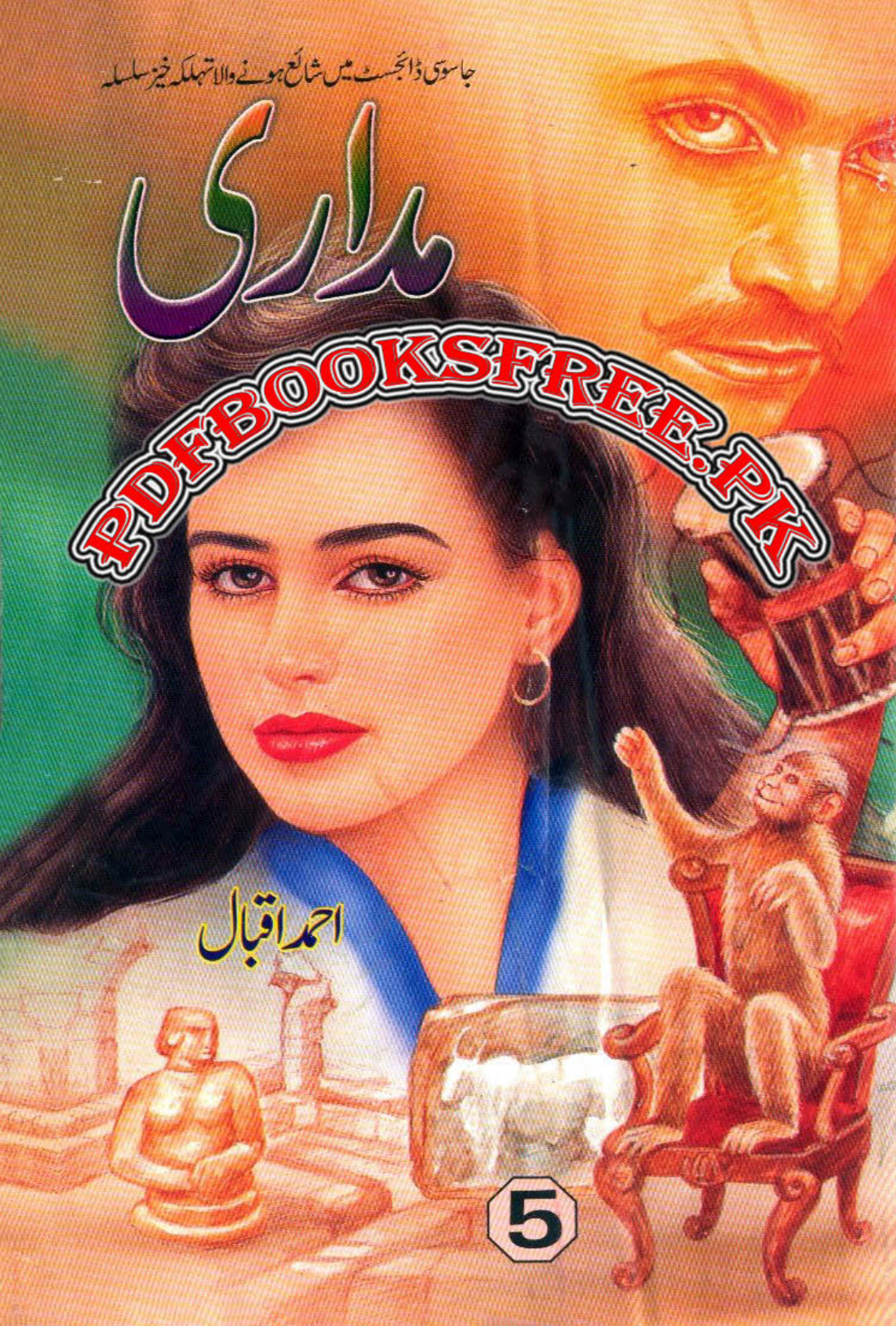

احمد اقبال

5

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے پرآشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

پانچواں حصہ

احمد اقبال

ناشر

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔عزیز مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۱

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

ر اوّل ——— ۲۰۰۳ء
طبع ——— یو اینڈ می پرنٹرز، لاہور
پوزنگ ——— صوبا کمپوزنگ سنٹر، لاہور

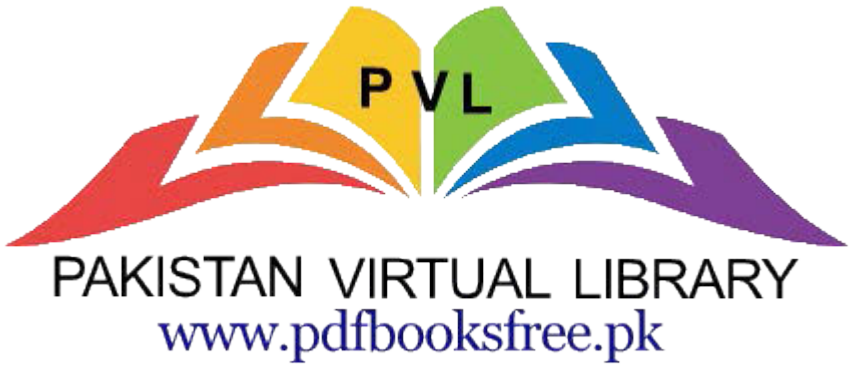

ان میں سے ایک نے ریوالور کو ایسے لہرایا جیسے سلطان راہی گنڈاسا لہراتا ہے اور اعلان کرتا ہے۔ اوئے میں ٹوٹے کردیاں گا۔ وہ خود سیاہ رو پستہ قد اور بھاری بدن تھا مگر اس کی آواز مضحکہ خیز حد تک نسوانی تھی۔

"اوئے خبردار۔۔۔ خبردار۔۔۔ میں گولی ماردوں گا' ٹھاہ کرکے۔"

دوسرا دبلا دراز قد اور خاموش طبع لگتا تھا۔ اس نے مصطفیٰ قریشی کی آنکھوں سے ہم تینوں کی صورت کا جائزہ لیا۔ وسیم کی حالت تو پہلے ہی ابتر ہو رہی تھی۔ رئیس بھی گھبرا گیا تھا اور بے وقوفوں کی طرح منہ کھولے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک ریوالور رئیس کے پاس بھی ہے اور موقع ملے تو وہ اسے استعمال بھی کر سکتا ہے۔ ہم اتنے مجبور' کمزور اور لاچار نہیں تھے جتنا خود کو پنجابی فلموں کے ولن سے بڑا بدمعاش سمجھنے والوں نے فرض کرلیا تھا۔

وہ ایسا فرض کرنے میں کسی حد تک حق بجانب تھے کیونکہ ہم تینوں میں سے صرف وسیم ان کے برابر عمر رسیدہ تھا۔ رئیس اور میں تو ابھی لونڈے تھے۔ اپنی دانست میں انہوں نے اچانک ہمیں آلیا تھا اور کسی جوابی کارروائی کے قابل ہی نہیں چھوڑا تھا۔ ان دونوں نے اپنے اپنے ریوالور کا رخ وسیم کی طرف کر رکھا تھا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر انہیں کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا تو وسیم کی طرف سے کہ وہ مسلح ہوگا۔ ہم جیسے ناتجربہ کار اور نوعمر لڑکے ان کے نزدیک درخور اعتنا نہیں تھے۔

موقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے میں نے ان کی خوش فہمی کو درست ثابت کرنے کا فیصلہ کیا اور کانپتی آواز میں کہا "کک۔۔۔ گولی ماردو گے۔۔۔ کس کو؟"

سلطان راہی نے بلی کی طرح دہاڑ کے کہا "جس نے بھی چالاک بننے کی کوشش کی' ہم بڑے حرامی ہیں۔"

میں نے سچ کو تسلیم کرنے کے انداز میں سر ہلایا "اچھا جی!"

رئیس میری اداکاری کو سمجھ گیا۔ اس کو زیادہ اداکاری نہیں کرنی پڑی کیونکہ وہ سچ مچ سخت دہشت زدہ ہو گیا تھا "آپ۔۔۔ کیا چاہتے ہو جی؟"

خود کو مصطفیٰ قریشی سمجھنے والے نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا "تم میں سے گلزار احمد کون ہے۔ تم۔ تم ہو گلزار احمد۔"

اس نے وسیم کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وسیم کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اور اس نے سر ہلا کے اعترافِ جرم کیا۔

"پھر یہ دونوں کون ہیں؟ تیرے بارے وے پتہ؟" سلطان راہی بولا اور اپنے مذاق پر خود ہی ہنس پڑا "ایہہ تے بالکل ہی۔۔۔ لگدے نے۔"

میں نے دل ہی دل میں اسے وہی کہا جو اس نے مجھے سمجھا تھا۔ امید ہے آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

داکاری سے پیدا ہونے والا تاثر تھا جس نے مجھے زیادہ پُرامید کردیا "ہم۔۔۔ ہم تو پہلوان جی۔۔۔ ادھر رہتے ہیں۔"

"ساتھ والے گھر میں" رئیس نے باقاعدہ لرزتے ہوئے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا "گلزار یہی ہے۔"

مصطفیٰ قریشی نے اپنے ساتھی کو گھورا "دانت مت نکال۔ اس کی تلاشی لے، گلزار کی۔"

میں نے ہکلا کے کہا "چو۔۔۔ چو۔۔۔ چوہدری صاحب۔۔۔ ہم۔۔۔ جائیں۔"

"تم یہاں کیا کر رہے تھے؟" مصطفیٰ قریشی نے کہا۔

میں نے کہا "اوجی۔۔۔ یہ آج ہی آیا ہے۔۔۔ بے بے نے کہا سی۔۔۔ جا کے روٹی کو پوچھ لو۔"

یہ محلے کی روایات کے مطابق ایک منطقی بات تھی۔ سب تک محلے میں نیا آنے والا اپنا سامان سیٹ نہ کرے اور گھر والی چولہا نہ جلائے، پڑوسی ایک دو وقت کا کھانا بھیجنا اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھتے ہیں۔

رئیس تو یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ خوف سے بے ہوش ہو کے گر جائے گا۔ میرا خیال تھا کہ یہ اوور ایکٹنگ ہے مگر اچانک اس نے ایک ایسی حرکت کی جس نے اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھر دیا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں رئیس کو اداکاری کے ایسے مظاہرے پر سال رواں کا سب سے بڑا ایوارڈ ضرور دیتا۔ اس وقت حالات کی سنگینی کے باعث میں نے اپنی ہنسی کو ضبط کرلیا اور ہونٹوں تک آجانے والی مسکراہٹ کو بڑی مشکل سے چھپالیا۔

"سر۔۔۔ جی۔۔۔ پہلوان جی۔۔۔" رئیس نے باقاعدہ تھر تھر کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑے "ہم۔۔۔ ہم۔۔۔ ہم جائیں۔"

اور اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کی پتلون کے پائنچوں اور جوتوں کو بھگونے والا پانی فرش پر بہنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ پانی نہیں تھا۔ بزدلی کے اعلیٰ ترین مظاہرے کا ثبوت تھا جو رئیس نے جانتے بوجھتے فراہم کیا تھا۔

دونوں ولن ٹائپ حضرات نے بھی فرش پر بہتے پانی کو پہلے حیرانی سے دیکھا۔ کسی نوجوان کا اس حد تک ڈرپوک ہونا ان کی نظر میں ایک شرمناک بات تھی اور اپنے آپ کو مصطفیٰ قریشی سمجھنے والے کی نظر میں رئیس کے لیے افسوس، کراہت، حقارت اور نفرت آمیز ناپسندیدگی کے جذبات بہت یاں ہوگئے تھے۔ لاشعوری طور پر انہوں نے خود کو کتنا بہادر اور جرأت مند محسوس کیا ہوگا جو موت کے کھلونے ہاتھ میں لیے زندگی سے کھیلتے پھرتے تھے۔

سلطان راہی کو بہت ہنسی آئی۔ "ٹھیک آگیا سالا میں۔۔۔ اے نے تے موتر چھڑیا۔۔۔"

اس کے ساتھی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا "چلو اوئے تم دونوں۔ ادھر کھڑے ہو جاؤ دیوار کے ساتھ اور خبردار جو آواز نکالی۔"

"میں گولی مار دیاں گا۔ ٹھاہ کر کے۔۔۔" سلطان راہی نے دوسری بار ریوالور لہرا کے اعلان کیا۔

میں نے روہانی آواز میں کہا "ہم۔۔۔ کسی کو۔۔۔ کسی کو نہیں بتائیں گے چو۔۔۔ چوہدری صاحب۔ ہمیں جانے دو۔"

"چلے جانا۔۔۔ مگر ابھی نہیں۔۔۔ جب ہم چلے جائیں تو جانا" مصطفیٰ قریشی نے کچھ تسلی دینے کے انداز میں کہا "اور کاکا جی۔ کسی سے بات کی ہماری بارے میں تو ہم پہنچ جائیں گے تمہارے گھر۔ ساتھ والا گھر ہے نا تمہارا۔ ہم بڑے حرامی ہیں۔"

"ہاں جی۔۔۔" میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔

اب مجھے یقین تھا کہ خود کو بار بار حرامی کہنے والے اتنے بڑے بدمعاش نہیں تھے جتنے بڑے احمق ثابت ہو چکے تھے۔ صورتِ حال پوری طرح ہمارے حق میں تھی۔ انہوں نے ہمیں تلاشی سے مستثنیٰ قرار دے کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی مگر اس میں کافی دخل ہماری کوششوں کا بھی تھا۔ ہم نے عملاً خود کو وہی ثابت کردیا تھا جو سلطان راہی نے کہا تھا۔ اس کامیابی کا اصل سہرا میں نے رئیس کے سر باندھا جس نے بڑی بہادری سے اپنی پتلون خود گیلی کر کے گویا اپنی بزدلی کی سند فراہم کردی تھی۔

دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کے میں نے رئیس کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے بڑی بدمعاشی سے آنکھ ماری۔ ستائش کے جذبات اس نے میری آنکھوں میں دیکھ لیے ہوں گے۔ اب وہ میرے اشارے کا منتظر تھا۔

دونوں ولن اب وسیم کی طرف متوجہ تھے "ہاں بھئی گلزار۔ اب ہم سے بات کر۔"

وسیم نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری "کون ہو تم لوگ۔ آخر؟"

مصطفیٰ قریشی نے اس کے گال پر چانٹا مارا۔ اس سے تالی بجنے جیسی آواز پیدا ہوئی "مال کدھر ہے ہمارا پتر!"

میں نے پیچھے سے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ حوصلہ رکھے۔ اس وقت ان دونوں میں سے کسی کی توجہ میری یا رئیس کی طرف نہیں تھی لیکن سلطان راہی کا رخ میری طرف تھا اور ہم میں سے کوئی ذرا بھی حرکت کرتا تو وہ اپنی زنانہ آواز میں چلانے لگتا "اوئے میں گولی مار دیاں گا۔ ٹھاہ کر کے۔"

وسیم نے کہا "کمال کرتے ہو تم بھی۔ کون سا مال۔"

حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ اس نے وسیم کے پیٹ پر لات ماری "وہی جو تمہیں ائرپورٹ پر دیا گیا تھا۔"

وسیم پیچھے گرا اور درد سے دہرا ہو گیا "مجھے۔۔۔ تم نے کچھ نہیں دیا تھا۔"

"ہاں مگر وہ ہمارے بندے تھے۔"

وسیم نے کہا "انہوں نے مجھے پھنسا دیا۔ سوٹ کیس بدل دیا میرا۔ مجھے بتائے بغیر۔"

"ایسے کام بتا کے نہیں کیے جاتے۔"

"اور میں پھنس جاتا پھر؟" وسیم نے فریاد کی۔

"پھر کیا۔۔۔ ہم چھڑا لیتے ہیں اپنا مال۔۔۔ اور مال کے ساتھ بندہ۔ تھوڑا خرچہ زیادہ کرنا پڑتا ہے۔" وہ بولا "کہاں ہے وہ سوٹ کیس پتر؟"

"او میرے باپ، جن کا مال تھا وہ لے گئے۔ اب دوبارہ تمہیں کہاں سے دوں مال" وسیم نے کہا "سوٹ کیس تو وہ لے گیا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "کون لے گیا ہے سوٹ کیس؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میرے پاس ایک سبزی والا آیا تھا اپنی ریڑھی لے کر۔ اس نے کہا کہ وہ سوٹ کیس دے دو۔ اس نے پہلے مجھے پوچھا تھا کہ گلفام کون ہے؟"

مصطفیٰ قریشی نے پھر لات گھمائی مگر وسیم اس بار غلط مار کے بچ گیا۔

میں نے اس موقع پر مداخلت کی "یہ ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک کہتا ہے جی!"

اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا "کیا ٹھیک کہتا ہے؟"

میں نے کہا "ایک بندہ آیا تھا۔ ایک جیسے دو سوٹ کیس تھے۔ ان میں سے ایک لے گیا۔ اس نے پوچھا تھا کہ گلفام کون ہے تم میں سے۔"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے" رئیس نے گواہی دی "ہم دو منٹ پہلے آئے تھے۔"

مصطفیٰ قریشی نے اس صورتِ حال پر غور کیا "وہ محلے میں آتا ہے سبزی کی ریڑھی لے کر؟"

"مجھے۔۔۔ نہیں معلوم" وسیم نے کہا "میں تو ابھی آیا ہوں یہاں۔"

"پھر تو نے ایسے ہی دے دیا اسے ہمارا مال" مصطفیٰ قریشی نے وسیم کو گردن سے پکڑ کے اٹھالیا۔

"او۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔" وسیم نے اس کے بڑے ہاتھوں کی گرفت سے نکلنے کی پوری کوشش کی مگر ناکام رہا۔

میں نے محسوس کیا کہ دخل اندازی سے کھیل کا پانسا پلٹ دینے کے لیے اس سے بہتر موقع شاید نہ آئے۔ سلطان راہی بڑی دلچسپی سے گلزار کی بے بسی کا تماشا کر رہا تھا اور اس کے لبوں پر عجیب سی پُرلطف مسکراہٹ تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کے سامنے سانپ اور نیولے کی لڑائی ہو رہی ہے جس میں نیولے نے سانپ کی گردن پکڑی ہے اور سانپ کرب سے بل کھا رہا ہے۔

میں نے رئیس کو سرکی خفیف سی جنبش سے اشارہ کیا اور بہت آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے گیا۔ رئیس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے اپنے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ بہت آہستہ سے میں نے رئیس کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا "ون۔۔۔ ٹو۔۔۔ تھری۔"

تھری پر ہم نے ریوالور نکال کے جست لگائی اور ایک سیکنڈ میں ریوالور کی نال ان کی کمر سے لگا دی۔ سیفٹی کیچ میں نے بعد میں ہٹایا۔

ایک لمحے کے لیے وہ دونوں مفلوج ہو گئے۔ "ہلنا مت۔ بالکل۔" میں نے مصطفیٰ قریشی کو حکم دیا "ورنہ گولی تمہارے ریڑھ کی ہڈی میں گھس جائے گی۔"

رئیس نے سلطان راہی کا سارا ایکشن ایسے ختم کر دیا تھا جیسے فلم کے آخری سین میں ہوتا ہے۔ رئیس ہیرو بن گیا تھا۔ "نیچے ڈال دے اپنا پستول۔ ورنہ جہاں ایک سوراخ تیرا پیارے، اس سے اوپر دوسرا کردوں گا۔"

سلطان راہی نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ شاید اسے ایک ڈراؤنا خواب لگ رہا ہوگا کہ جس شخص کی ہمت اور شجاعت کے بارے میں اس نے ناقابلِ اشاعت رائے ظاہر کی تھی، وہ اس کے برعکس ثابت ہو رہا تھا۔ گیدڑ کی کھال نیچے سے آدم خور شیر نکل آیا تھا۔ اب اس کی آب پاشی کی باری تھی۔

میں نے سلطان راہی کی فرمانبرداری کو سراہا "ویری گڈ۔ اب تم بھی اپنی توپ ہمارے حوالے کردو پتر ورنہ میں گولی مار دیاں گا۔"

"ٹھاہ کر کے۔" رئیس نے کہا "ہم بھی بڑے حرامی ہیں۔"

وسیم ابھی تک اپنا گلا سلا رہا تھا "یا میرے مولا۔ کس مصیبت میں پڑ گیا میں۔ یک نہ شد دو شد۔ ایک مال لے گیا، دوسرا جان لینے آگیا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "گلزار صاحب۔ غلط فہمی ہو جاتی ہے بندے کو بھی۔ حرکتوں سے نہ سہی ناک کان سے تو بندے کے پہچان لگتے ہیں یہ بھی۔ ہم سمجھا دیں گے انہیں۔"

مصطفیٰ قریشی نے بالآخر سانس لی "کچھ سمجھاؤ گے تو سمجھ میں آئے گا۔"

رئیس نے کہا "ایک بات تو سمجھ میں آ گئی ہو گی تجربے سے کہ وہ محاورہ آج بھی غلط نہیں ہے۔ مونا دیکھ کے لڑنے آتے ماڑا دیکھ کے ڈر جائے نا۔"

میں نے کہا "پھر اگلی بات؟"

رئیس نے سر کھجایا "چل یار، یہ سیدھی کر کے سمجھ لیں گے۔"

میں نے کہا "تو ان کے ریوالور خالی کر دے۔"

"پہلے کس پر" رئیس نے پیچھے گرا ہوا ریوالور اٹھا کے سلطان راہی کا نشانہ لیا تو اس کے دانت بجنے لگے۔ شاید کچھ دیر بعد اس کی پتلون بھی گیلی ہو جاتی۔

خالی ریوالور کی گولیاں اپنی جیب میں ڈال کے ہم نے ایک پُرامن کانفرنس کا ماحول پیدا کیا تاکہ فریقین ایک دوسرے کا مؤقف سن کے غلط فہمیوں کا ازالہ کر سکیں۔

وسیم نے ایک آتش فشاں جذباتی احتجاج کیا "اوئے تم نے تو مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا اور میرا جھٹکا بھی کر دیتے کبھی۔ ٹھیک ہے میں نے بڑے غلط کام کیے ہیں زندگی میں۔"

"اور کرتا رہوں گا" رئیس نے اضافہ کیا۔

"لیکن یہ کام میں نہیں کرتا۔ مجھے کیا پتا وہ کون حرامی تھے جنہوں نے میرا سوٹ کیس بدلا تھا۔ نہ انہوں نے شکل دکھائی نہ کچھ بتایا۔ اندر جو پیغام تھا اس میں بھی کچھ نہیں تھا کہ سوٹ کیس لینے کون آئے گا۔ نام کیا ہو گا اس کا اور شکل کیسی ہو گی۔ حلیہ بھی درج ہوتا تمہارا تو میں انتظار کرتا۔ جس نے آ کے کہا کہ مال دے دو، میں نے دے دیا۔ میں نے تو کسی اور کو کچھ بتایا نہیں تھا۔ ظاہر ہے کوئی بھی آتا تو میں یہی سمجھتا کہ وہ اصل آدمی ہے اور کسی کو کیا معلوم کہ یہاں میرے گھر میں کسی کا مال پڑا ہے۔ خود تمہارے کسی بندے نے منہ سے بات نکالی ہو اور بات پہنچ گئی ہو تمہارے کسی کاروباری دشمن تک تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔"

"یہ ناممکن ہے" مصطفیٰ قریشی نے بہت سوچ سمجھ کے کہا۔

"کیا ناممکن ہے؟" سلطان راہی نے پوچھا۔

"کسی اور کو بات معلوم نہیں ہو سکتی" اس نے کہا۔

وسیم نے اپنی گردن کو دائیں بائیں حرکت دی "کیا پتا ایئرپورٹ پر کسی نے تمہیں سوٹ کیس بدلتے دیکھ لیا ہو۔"

"جو بندہ ریڑھی لے کر آیا تھا، اس کا حلیہ کیسا تھا؟"

میں نے کہا "سبزی فروش جیسا۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جو مال لے گیا، وہ کوئی اور تھا۔ اسے ہم نے نہیں دیکھا۔ اس ریڑھی والے نے بتایا کہ وہ گلی کے آخر میں سڑک پر ٹیکسی میں بیٹھا ہے۔ اس نے سبزی فروش کو دیکھا جو خالی ریڑھی لے کر جا رہا تھا۔"

"اپنے گھر" رئیس نے کہا "ساری سبزی بیچنے کے بعد۔"

میں نے کہا "ہمیں کیا معلوم مگر اس بندے نے خالی ریڑھی دیکھی تو اسے سو روپے دے کر یہاں بھیج دیا۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" مصطفیٰ قریشی شک میں پڑ گیا۔

"ہم نے معلوم کیا۔ بزور بازو" رئیس نے بازو موڑ کے اپنے مسل دکھائے "ہم بھی کم حرامی نہیں ہیں پتر۔"

وہ مسکرانے لگا "ریڑھی والے کو شک نہیں ہوا؟"

"ہوا تھا۔ ٹیکسی والے نے اسے ایک جھوٹ بول کے مطمئن کر دیا تھا۔ غریب آدمی تھا۔ سو روپے کے لالچ میں انکار نہیں کر سکا۔"

"تم نے اس کا پیچھا نہیں کیا؟"

"ہم اس کا پیچھا کیوں کرتے آخر؟" میں نے کہا۔

سلطان راہی بولا "ٹیکسی والے کی شکل دیکھ لیتے۔"

"اس سے کیا ہوتا۔ اچھی صورت ہوتی تو میں نے کون سا نکاح پڑھوانا تھا اس کے ساتھ۔" وسیم نے بہت مدلل جواب دیا۔

"اچھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے ہی بندے ہوں" مصطفیٰ قریشی نے ہمارے مؤقف کو عبوری طور پر تسلیم کر لیا "لیکن کوئی اور بات ہوئی تو ہم پھر آئیں گے۔"

میں نے کہا "یہیں آنا۔ ساتھ والے گھر میں ہماری کوئی بے بے نہیں رہتی اور بتا کے آنا تاکہ ہم آج سے اچھی خاطر تواضع کا انتظام رکھیں۔"

مصطفیٰ قریشی نے جاتے جاتے رک کے پوچھا "ویسے تم لوگ کیا کرتے ہو، ابھی اتنی عمر نہیں ہے تمہاری۔ کس کے ساتھ ہو؟"

رئیس نے کہا "اس کا نام سنو گے تو تمہارے جسم کا ایک حصہ دھماکے سے پھٹ جائے گا اس لیے الٹے پاؤں لوٹ جاؤ۔ پیچھے مڑ کے مت دیکھنا۔"

"تم سے پھر ملاقات ضرور ہو گی پُتر" مصطفیٰ قریشی نے باہر کے دروازے سے نکل کے کہا۔

میں نے خالی ریوالور ان کی طرف پھینکے جو سیمنٹ کے فرش پر تیز آواز کے ساتھ گرے اور پھسلتے ہوئے دروازے تک گئے "یہ لے جاؤ۔ اگلی بار آؤ گے تو ضرورت پڑے گی۔"

سلطان راہی نے جھک کے ریوالور اٹھائے اور دوڑ کے باہر نکل گیا۔ باہر نکل کے اس نے رئیس کو پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا "اب بہادر بن رہا ہے۔ سب کے سامنے موتر کر دیا۔ دفع منہ۔"

رئیس اس کی طرف دوڑا مگر وہ بھاگ کے اپنے استاد کے ساتھ ہو گیا جو ناک کی سیدھ میں جا رہا تھا۔ ہم انہیں گلی کے آخری موڑ تک دیکھتے رہے مگر انہوں نے ایک بار بھی مڑ کے نہیں دیکھا۔ شاید سڑک پر کہیں کوئی گاڑی ضرور ہو گی جس میں کوئی ڈرائیور ان کی واپسی کی راہ دیکھ رہا ہو گا۔ یہ تو مشکل تھا کہ وہ مال اٹھانے پیدل آئے ہوں۔

کچھ دیر بعد وسیم نے گہری سانس لے کر کہا "شکر ہے دفع ہوئے۔"

رئیس نے کہا "تو شرط لگا لے مجھ سے۔ وہ پھر آئیں گے۔ تجھے ٹھاہ کرنے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ معاملہ کچھ گڑبڑ ہو گیا ہے۔"

وسیم کا چہرہ لٹک گیا "مگر میری کوئی غلطی نہیں اس میں۔"

رئیس نے کہا "غلطی تیرے باپ سے ہوئی تھی بیٹا۔ اس نے خواہ مخواہ تجھے پیدا کیا۔ کوئی لوتھڑا ہوتی تو سالی کسی کے کام آتی۔"

میں نے کہا "دیکھو مسٹر گلزار۔ آج تمہیں بچا لیا تقدیر نے۔ تمہاری تقدیر نے نہیں، اس عورت کی تقدیر نے جو تمہاری بیوی کہلاتی ہے۔ اب فیصلہ کر لو فوراً کہ چوراہے پر تم کو کدھر جانا ہے۔"

وسیم نے کہا "میں گھر جاؤں گا، اپنے گھر۔"

"بس تو دیر مت کرو۔ ابھی چلو" میں نے کہا۔

اس نے ڈھیر کی صورت میں بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا "ابھی۔۔۔ لیکن یہ سامان کیسے جائے گا اس وقت؟"

میں نے کہا "پاگل آدمی۔ تھوڑی سی سلت مل گئی ہے تو جان کی فکر کر۔ سامان قبر میں ساتھ نہیں جائے گا۔ کوئی بھروسا نہیں ان کا۔ وہ باہر جا کے کہیں سے فون کریں اور انہیں پتا چل جائے کہ تم نے ان کا مال کسی اور کو دے دیا ہے۔ غلطی تمہاری تھی یا نہیں۔ وہ گولی ضرور مار جائیں گے تمہیں۔"

وسیم گھبرا گیا "پھر کیا کروں۔ سامان سب چھوڑ دوں ایسے ہی؟"

"ایسا کون سا قیمتی سامان ہے۔ پرانے برتن، پرانا فرنیچر، پرانے کپڑے۔ یہ جان سے زیادہ پیارے ہیں؟"

"اچھا۔۔۔ میں ضروری چیزیں اٹھا لوں۔"

"ضروری نہیں۔ وہ چیزیں اٹھا لو جن سے تمہاری شناخت ہونے کا ڈر ہو۔ وہ تمہارا سراغ ڈھونڈھ نکالیں گے۔"

رئیس نے کہا "اور پھر گولی ماردیں، ٹھاہ کر کے۔"

افراتفری میں وسیم نے ایک سوٹ کیس خالی کیا اور پھر بھرا۔ دس منٹ بعد رئیس ایک ٹیکسی پکڑ لایا اور وسیم نے گھر کو تالا لگا لیا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ سوٹ کیس کے ساتھ خود بھی ڈکی میں گھسنا چاہتا تھا مگر میں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اس سے ٹیکسی والے کو خواہ مخواہ شک ہو جاتا۔

رئیس نے اپنا اطمینان پہلے ہی تیار کر لیا تھا کہ گلی کے

انوار علیگی کے قلم سے ایک دہشت ناک ناول
قیمت 250
محصول ڈاک 30
ہزار داستان
کمزور دل حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں
ایک انوکھا اور مسحور کن داستان جو پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لے گی۔
سانپوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی کی دلچسپ داستان حیرت۔
سانپوں کا شہر اور دنیا کا ایک آدم زاد کی پراسرار حکومت۔
کمرہ پندرہ سال اس کے لئے خوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔
سپید بابا کا غلام ایک بار وقت سیاہ سانپ قاضی نے دنیا کا قسم توڑ دیا۔
سپید بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔
علی بکسٹال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خر میں سڑک پر خطرے کے آثار نظر نہیں آئے۔ سلطان
ی اور مصطفیٰ قریشی کہیں روپوش کھڑے ہوں تو اور بات
ہے۔ کسی غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے میں نے
ر رئیس نے ریوالور بالکل ریڈی رکھے اور بہت دیر تک
پیچھے آنے والی ہر گاڑی کو شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔
وسیم کی حالت اس لڑکے جیسی ہو رہی تھی جو شوقین
اجی کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ کے ہیرو بننے فلمی
یا میں خوار ہونے کے لیے گھر سے بھاگ گیا ہو اور والدین
سے پھر پکڑ لائے ہوں۔ جب خوف کے اثرات کم ہوتے
گے تو اس پر ندامت کا احساس غالب آنے لگا۔ یہ ایک فطری
ت تھی۔ اسے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ وہ کس منہ سے
ی بچوں کا سامنا کرے گا۔
راستے میں ایک جگہ رئیس ٹیکسی سے اتر گیا۔
یار اب ہم کیا کریں گے تیرے ساتھ جا کے۔ اس سین میں
نا کوئی رول نہیں جس میں بچھڑتے ہوئے عاشق ماشوک
کتے ہیں۔"
میں نے کہا "عاشق معشوق نہیں' میاں بیوی۔"
رئیس ہنسنے لگا "ہاں یار۔ وہ عشق محبت کا ڈراما تو شادی
ے پہلے چلتا ہے۔ شادی کے سین پر تو فلم ہی ختم ہو جاتی
ہے۔ لکھا ہوا آ جاتا ہے' دی اینڈ۔"
میں نے کہا "تو کہاں جائے گا اس وقت۔ میرے ساتھ
ل۔ آدھے گھنٹے میں ملزم کو تھانے دار کے حوالے کر کے
تے ہیں۔"
"اب نہیں۔ اپن اس چیز سے پرہیز ہی کریں تو اچھا ہے
ے تھانے دار کہتے ہیں۔"
میں نے کہا "کیوں' ڈرنے کی کیا بات ہے۔ تو شریفانہ
ندگی گزار رہا ہے۔"
"شریفانہ۔۔۔؟" رئیس ہنسا۔ ابے بس یہ کافی ہے کہ
ندگی گزر رہی ہے اور باہر گزر رہی ہے۔ چوہا اور بلی ایک گھر
یں ساتھ رہیں تو اچھا ہے' ایک دوسرے کے سامنے نہ
میں۔"
"اچھا تو گھر جا کے انتظار کر میرا۔ ڈاکٹر رانجھا بھی آ گئے
وں گے۔ ان کو تسلی دے ورنہ وہ پریشان بیٹھے ہوں گے۔"
انسپکٹر بشیر تھانے کا راؤنڈ لگانے کے لیے نکلنے ہی والا
تھا۔ مجھے وسیم کے ساتھ دیکھ کے وہ حیران رہ گیا حالانکہ
تھانے دار قسم کے لوگ نہ حیران ہوتا جانتے ہیں اور نہ
پریشان ہوتا۔ قانون پر ہر قسم کے مجرموں سے نمٹتے ہوئے اور
تفتیش کرتے کرتے ان کے چہرے ربڑ جیسی کی ایسی نقاب
دار تہ چڑھ جاتی ہے جس کے نیچے سارے نرم رو جذبات گم
ہو جاتے ہیں۔
خود میں نے انسپکٹر بشیر کو گھر سے باہر ویسا ہی دیکھا تھا
جیسا کہ عام طور پر تھانے دار کو سمجھا جاتا ہے۔ ظالم اور
سفاک۔ اپنے اختیارات کی جا۔۔۔ دپامال کرنے والا شرفا
قانون کی گرفت سے ڈ۔۔۔ ر مجرموں کو ڈھیل دے کر
علاقے پر راج۔۔۔ ور اپنی راجدھانی یعنی تھانے میں
پیٹھ کے رعایا سے طاقت کا خراج وصول کرنے والا۔
لیکن ایک تھانے دار کی نجی زندگی میں جھانک کر دیکھنے
والا کوئی نہیں ہوتا۔ خود میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ گھر
میں وہ ایک عام زندگی کے مسائل سے گھرا ہوا آدمی ہے
بیوی سے محبت کرنے والا اور ڈرنے والا شوہر ہے۔ بچوں
سے پیار کرتا ہے۔ اس بہن کے لیے پریشان رہتا ہے جس
بسا بسایا گھر اجڑ گیا تھا اور اس کے مستقبل کے لیے فکرمند
ہے۔
اس نے پہلے وسیم کو بڑی محبت سے گلے لگایا "بھائی جی
آپ آ گئے۔ مجھے پتا تھا آپ آؤ گے۔"
وسیم کا حفت سے برا حال تھا "یار۔۔۔ مجھے معاف کرو۔
میں بہک گیا تھا۔"
بشیر ہنسا "او کوئی بات نہیں بھائی جی۔ انسان ہی بہکتا
ہے نا' شیطان جو ہے بہکانے والا۔ معافی کس بات کی۔ آؤ
اندر آؤ۔ چلو بھائی جی' اپنا ہی گھر ہے' آپ کا گھر ہے۔"
میں نے کہا "سر جی' ہم بھی چلیں اپنے گھر۔"
وہ چونک کے پلٹا "او یار' معاف کرنا۔ اصل شکریہ تو
مجھے تمہارا ادا کرنا چاہیے۔ تم نے کمال کر دیا یار۔"
میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ ہوتا سب خدا کے حکم
سے ہے۔ بندہ سارا کریڈٹ لے کر اسے اپنی کامیابی سمجھتا
ہے۔"
"او یار۔ بڑی بڑی باتیں مت کر۔ کام ضرور بڑا کیا ہے
تو نے مگر اتنا بڑا بھی نہیں ہو گیا ہے تو کہ ہمیں وعظ کرنے
لگے۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مجھے اپنے
ساتھ لے گیا۔
میں نے کہا "ہم کیا وعظ کریں گے کسی کو جی۔ اللہ نے
ہمیں توفیق دی کہ ہم نے ایک وعدہ کیا تھا آپ سے' وہ پورا
کر دیا۔"
بشیر چوہدری نے سر ہلایا "یہ کام تم نے کیا کیسے یار؟"
میں نے کہا "یہ بڑی لمبی کہانی ہے اور اب آپ سن کے
کیا کریں گے۔ بندہ سوچتا کچھ ہے' ہوتا کچھ اور ہے۔"

ڈرائنگ روم میں وسیم اکیلا صوفے پر بیٹھا دیوار کو گھور
رہا تھا۔ شاید اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ بے
خوفی سے اور اعتماد کے ساتھ سیدھا اندر جا کے بیوی سے کہتا
کہ لو بھئی' ہم واپس آ گئے ہیں خیر سے۔ ہماری نظر اتارو۔
صدقے واری جاؤ ہم پر یا جوتے مارو ہمارے سر پر۔ جیسی
تمہاری خوشی۔"
بشیر چوہدری نے کہا "لو بھائی جی۔ آپ ادھر کیوں بیٹھے
ہو۔ بھول جاؤ سب پہلے کی باتیں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ انت بھلا
سو بھلا۔"
"ALL IS WELL THAT ENDS WELL"
میں نے کہا۔
"بشیر۔ مجھے شرم آتی ہے۔"
"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" بشیر نے خوش ہو کے کہا
"اور تم کہتے کہ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تو ہم تمہارا کیا
بگاڑ لیتے۔ اچھا میں جا کے پہلے خود اسے بتا دوں۔ بڑا بھائی
ہوں نا۔ ڈانٹ کے سمجھا بھی سکتا ہوں کہ اپنے آپ پر اور
اپنی زبان پر قابو رکھے۔ اچانک تمہیں سامنے دیکھ کے اسے
شاک لگے گا۔ اندر سے تو خوش ہو گی مگر کچھ پتا نہیں ان
عورتوں کا۔ کھوپڑی الٹی ہوتی ہے نا اس کی زبان بھی الٹی چلتی
ہے۔"
وہ اندر گیا تو میں نے کہا "وسیم۔ اپنے معاملات کے تم
ذمہ دار ہو۔ کیا اچھا ہے اور کیا برا' یہ میں کیا سمجھاؤں
تمہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ قدرت بڑے سے بڑے آدمی کو بھی
نیکی اور شرافت کے راستے پر چلنے کا ایک موقع ضرور فراہم
کرتی ہے۔ انسانوں کی عدالت میں ایسا نہیں ہوتا کہ کسی مجرم
کو اصلاح کے لیے پہلے جرم پر سزا دیے بغیر چھوڑ دیا جائے۔"
"شاید تم ٹھیک کہتے ہو" وہ بولا۔
میں نے کہا "اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید آج تم کال کوٹھری
میں بیٹھے اپنی سزائے موت پر عمل درآمد کی تاریخ کا انتظار
کر رہے ہوتے۔ میں نے تو قسم کھائی تھی کہ تم کو تختۂ دار تک
پہنچا کے دم لوں گا۔ میں خود قتل کر دوں گا لیکن قدرت بڑی
رحمدل اور انصاف کرنے والی ہے۔ اس کے سامنے میری
کیسے چل سکتی تھی۔ خدا کو منظور نہیں تھا کہ تمہاری وہ بیوی
جس نے دکھ سکھ میں ہی نہیں' تمہارے جرائم میں بھی تمہارا
ساتھ دیا' بیوہ کہلائے۔ شوہر کی محبت میں اندھی ہو جانے والی
عورت نیکی' بدی' گناہ و ثواب سب بھول جاتی ہے۔"
اس نے اقرار میں سر ہلایا "اسے میں نے مجبور کر دیا تھا
ورنہ وہ ایسی عورت نہیں ہے۔"
"بس اسی لیے جو میں نے سوچا تھا اور چاہا تھا' اس کا
الٹ ہو گیا۔ تم نے ایک گناہ یا جرم کیا تھا۔ خدا نے مجھے زیادہ
سنگین جرم سے بچا لیا۔ اگر تمہارے بچے میرے ہاتھوں یتیم
ہو جاتے تو زیادہ برا ہوتا۔ دستِ قدرت نے کیسے مجھے مجبور
کر دیا کہ میں ہی تمہیں زندہ سلامت واپس لاؤں اور تمہارا
گھر اجاڑنے کے بجائے اپنی کوشش سے پھر آباد کروں۔"
"تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"
"بھول جاؤ گے تو مجھے کیا فرق پڑے گا۔ شاید قدرت
تمہیں دوسرا موقع نہیں دے گی" میں نے کہا "اور ابھی تم
جذباتی ہو رہے ہو۔ بعد میں تم گالیاں دو گے مجھے کہ میرے
اٹھائیس ہزار ڈالر لے گیا چھین کے۔"
"نہیں نہیں۔" وہ بولا "اٹھائیس ہزار ڈالر کیا ہوتے
ہیں۔ تم نے میری زندگی بچائی۔ مجھے میرا گھر واپس دے دیا۔
بیوی بچے ملوا دیے۔"
میں نے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ یہ اچھا نہیں لگتا کہ
اپنی بیوی سے تمہاری ملاقات کے سین میں مسٹر خواہ مخواہ
بھی نظر آئیں۔"
اس نے مجھے روکنے کی واجبی سی کوشش کی "بشیر سے
بھی نہیں ملو گے؟"
میں نے کہا "بس ہو گئی ملاقات۔ اب تم اسے سب
بتا دینا۔ بالکل سچ سچ۔ ایک لفظ بھی مت چھپانا۔ اس کے بعد
جیسا وہ کہے کرنا۔ وہ سب سنبھال لے گا اور ہاں' دو چار دن
بعد یا جب حالات سازگار ہوں' میرے پاس آ جانا۔ میں مکان
کو قانونی طور پر دوبارہ تمہارے نام کرانے کی کاغذی
کارروائی مکمل کروں گا۔ مکان کل تمہیں خالی ملے گا۔ چابی
کل بھی لے سکتے ہو تم مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال تمہارا
یہیں رہنا بہتر ہے۔ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے۔"
میں باہر نکلا لیکن فرار ہونے سے پہلے ہی پکڑا گیا۔
بشیر چوہدری نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے مجھے دیکھ لیا
"اوئے تم بھاگ کے کدھر جا رہے ہو؟ مجھے بڑا ضروری
تھانے پہنچنا ہے۔ ایک بندہ گزر گیا ہے۔"
میں نے کہا "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اعترافِ جرم
کر لیا تھا اس نے خودکشی سے پہلے یا نہیں؟"
وہ ہنسنے لگا "ٹھیک ہے بھئی۔ ادھر تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو
لیکن تھانے کے ایک کانسٹیبل کی گولی چلنے سے ایک حوالدار
مر گیا ہے۔ ابھی تو یہی بتایا ہے کہ سپاہی سے گولی اتفاقیہ چل
گئی۔ مگر کیا پتا اصل بات کا۔۔۔ تم کھانا کھا کے جانا۔"
میں نے کہا "بڑی مہربانی آپ کی مگر میرے گھر والے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پریشان ہوں گے۔"

وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا "تمہارے گھر والے؟"

"ہاں جی میرے گھر والے" میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔"

وہ ہنس پڑا "یہ کیا کریکٹر ہیں یار۔ انکل سرگم اور ماسی میسنے کی طرح۔"

"بس جی۔ دل جدھر مل جائے وہی اپنا گھر ورنہ ماں باپ کے گھر سے کیا شریف زادیاں اپنے آشنا کے ساتھ فرار نہیں ہوتیں۔ بیٹے نہیں جاتے گھر چھوڑ کے۔ ان کو خدا نے اولاد سے محرومی کا دکھ دیا تو تھوڑا ساتھ دینے کے لیے مجھے بھیج دیا۔ وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا۔ "تو بڑی عجیب چیز ہے یار اور تیرا دل۔"

"وہ تو پاگل ہے" میں نے کہا۔

"نہیں یار۔ سونے کا دل ہے تیرا۔ خالص سونا ہے۔ جو صرف محبت کر سکتا ہے۔ نفرت اور عداوت جانتا ہی نہیں" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اگر یہ میرے بس کی بات ہوتی تو میں اپنا دل تیرے دل سے بدل لیتا۔ ہر قیمت پر۔ چل بیٹھ گاڑی میں میرے ساتھ۔ میں تجھے گھر چھوڑ دوں گا۔"

میں اس کی شاہانہ اور بالکل نئی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ گیا۔

"آپ کی مہربانی ہے کہ میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہو۔ نئی گاڑی لی ہے آپ نے؟"

اس نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کے دائیں جانب موڑ لی "ہاں یار لیکن اب کسی چیز سے دل کو وہ خوشی نہیں ملتی جو سچی ہو اور خالص ہو۔ خریدی ہوئی خوشی میں کوئی مزہ نہیں رہا۔ اب دیکھ تو نے جب یتیم خانے سے نکل کے اپنی زندگی شروع کی۔ تو کیسی خوشی ہوئی تھی تجھے؟"

میں نے کہا "میں بتا نہیں سکتا۔ میرا مطلب ہے الفاظ میں۔"

"ہاں اور جب تو نے ایک فقیر کی بیٹی کے عشق میں خود فقیری اختیار کی تھی۔ تو کیسی خوشی ملی تھی تجھے؟"

میرے دل میں ایک آتشیں تیر اتر گیا۔ تم نے سنا شادو؟

ہم تو کہتے ہی نہیں کچھ مگر اے جانِ جہاں
لوگ کہتے ہیں کہ تو نے ہمیں برباد کیا

اور آج جب لوگ یہ کہتے ہیں کہ بتاؤ کون شادو آباد ہے اور کون خانماں برباد۔ ہے کوئی جواب اس سوال کا کہ ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا پایا ہے۔

بشیر کی نظر سامنے تھی اور وہ میری صورت کے تغیرات سے بے خبر بول رہا تھا "اور یہ دوسری قسم کی انمول خوشی بھی تیرے نصیب میں تھی۔ تو نے پھر ایک گھر بسا دیا۔ کون سی نیکی کی تھی تیرے ساتھ وسیم نے یا میں نے؟ تیرے دل میں نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسے کیسے بجھا دیا تو نے یار!"

"وقت بڑا مداری ہے تھانے دار صاحب۔ آدمی کو بندر کی طرح نچاتا ہے۔ الٹی قلابازی کھانے پہ مجبور کر دیتا ہے۔"

"اور یہ جو اپنا بیٹا سمجھنے لگے ہیں تجھے، کیا نام بتایا تھا ان کا؟"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔"

"ان کی مایوسی کو خوشی میں بدل دیا تو نے۔ مایوس تو ہوں گے کہ عمر گزر گئی اور اولاد کی نعمت سے محروم رکھا خدا نے۔ جوان بیٹا پا کے کتنے خوش ہوں گے وہ۔ تو خوش نصیب ہے یار۔ تقدیر موقع دیتی ہے تجھے۔ خوشی بانٹنے والا دکھی کیسے رہ سکتا ہے۔ تو ثواب کما رہا ہے۔ دعائیں سمیٹ رہا ہے۔ ہماری طرح گالیاں نہیں کھا رہا ہے اور بددعائیں نہیں لے رہا ہے۔ لکھ لے تو میری بات۔ یہی دعائیں مجھے بہت اوپر لے جائیں گی ایک دن۔ ہم کیا وہ سب بھی سیلیوٹ کریں گے تجھے جن کے ہم کتے ہیں۔"

اچانک میں نے محسوس کیا کہ انسپکٹر بشیر چوہدری جذباتی ہو رہا ہے اور اس کا یہ ڈیپریشن بے سبب نہیں۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لکنت تھی اور تھوڑا سا بوجھل پن تھا جو اسے نہ جاننے والا نوٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پی رکھی تھی۔ شاید وہ اس کا عادی تھا۔ ہر رات تھوڑی بہت پیتا تھا مگر آج اچانک اسے اپنے شغل سے کشی کو چھوڑ کے نکلنا پڑا۔ اس کے حواس اور اعصاب مکمل کنٹرول میں تھے۔ صرف اس کا ذہن نشے کے احساس سے ملنے والی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا اور اس کی زبان سے سچ اگلوا رہا تھا۔ وہ سچ جو پورے ہوش میں مصلحت اور دنیاداری کے خوف سے باہر نہیں آتا تھا۔

میں نے محتاط لہجے میں کہا "چوہدری صاحب۔ آپ ٹھیک تو ہیں؟"

وہ ہنسا "صاف پوچھتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کیا آپ نشے میں ہیں۔"

میں نے کہا "ایسی حالت میں گاڑی نہیں چلانی چاہیے آپ کو؟"

"کیوں؟ ایکسی ڈنٹ ہو جائے گا؟" وہ بولا "پھر کیا ہو گا؟ گاڑی برباد ہو جائے گی، ہو جانے دے۔ اس سے اچھی لے لوں گا میں اور خود مر گیا تو بھی تجھے کیا۔ یہ زندگی میری ہے یا

تیرے باپ کی دی ہوئی" اس نے ایک قہقہہ مارا "مگر تجھے کیا پتا اپنے باپ کا۔ تو پھر بھی مرنے سے ڈرتا ہے۔"

میرے حلق کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔ "زندگی خدا کی دی ہوئی نعمت ہے میرے لیے۔ میرے باپ کا ایک دن ضرور پتا چل جائے گا مجھے مگر تھانے دار صاحب، کیا آپ کو معلوم ہے یہ بات؟"

"ہاں۔۔۔ معلوم ہے مجھے۔ میری ماں نے کبھی نہیں بتایا تو کیا ہوا۔ دنیا والوں نے بتا دیا تھا۔۔۔ مجھے کیونکہ ساری دنیا جانتی تھی۔ وہ تو کا پتا نہیں جانتا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے جس کا نام میرے شناختی کارڈ پر اور کاغذات میں ہر جگہ درج ہے۔ وہ کوئی چوہدری یا ملک وغیرہ نہیں تھا۔ وہ تو بس نورو تھا۔ نورا، اور وہ جو میرا باپ تھا۔ وہ چوہدری رمضان تھا، بہت بڑا زمیندار۔ نورا اسی کا ایک معمولی مزارع تھا اسی لیے میں بشیر چوہدری بن گیا۔ کیوں نہ بنوں، میرے خون کا نمونہ لے کر جس کا دل چاہے ٹیسٹ کرا لے۔ یہ کسی کمین کا نہیں، چوہدری رمضان کا خاندانی خون نہ ہو تو۔۔۔ تو میں حرامی۔"

میں پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ شاید چلتے وقت اس نے کچھ اور چڑھا لی تھی یا وہ فعل ہو چکا تھا کہ تھانے سے بلاوا آ گیا۔ اس کا اثر اب ہو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں زیادہ لکنت آ گئی تھی اور صرف زبان ہی نہیں، اس کے ہاتھ بھی بہک رہے تھے۔ نظریں بھی بہک رہی تھیں، خیالات بھی بہک رہے تھے۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ گاڑی مجھے چلانے دیں۔ چلیں میں آپ کو تھانے پہنچا دوں۔"

"چپ کر کے بیٹھ" اس نے گرج کے کہا "تو چلا سکتا ہے یہ گاڑی؟ اتنی اوقات ہے تیری؟ اور یہ ہے آٹومیٹک گاڑی۔ کیا سمجھا، یہ میری مرضی سے بھی نہیں چلتی۔ ایک کچے تھانے دار کی نہیں مانتی، تو نے سائیکل بھی چلائی ہے کبھی۔"

میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس حالت میں تھانے دار کا خیر و عافیت کے ساتھ تھانے پہنچنا ایک معجزہ ہو گا۔ بعد میں کیا ہوتا ہے اس سے مجھے کیا۔ ابھی تو مجھے اپنا بھی خیریت کے ساتھ صحیح سالم گاڑی سے اترنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ میں زبردستی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ میں تھا اور سڑک خالی نہیں تھی کہ میں رسک لے سکتا۔

بالآخر گاڑی نہر کے پل پر سے گزری اور میں نے چلا کے کہا "چوہدری صاحب۔ پل کے بعد الٹے ہاتھ۔"

"ہاں ہاں۔ معلوم ہے مجھے" وہ جھوم کے بولا۔

اس نے پاور اسٹیئرنگ کو گھمایا اور اچانک اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ میری طرف جھکا اور اس کے ساتھ ہی اسٹیئرنگ کچھ اور گھوم گیا۔ گاڑی نے بڑی تیزی سے موڑ کاٹا پھر مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے چوہدری کو دور دھکیل کر اسٹیئرنگ کو سیدھے ہاتھ کی طرف گھمایا۔ گاڑی لہرا کے سیدھی ہوئی پھر اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا، گاڑی نے واپس ٹرن لیا اور نہر کی سڑک سے نیچے اتر گئی۔

میرا ہاتھ پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھ چکا تھا۔ گاڑی کے پانی میں گرنے کے ساتھ ہی ہینڈل کھینچ چکا تھا۔ پانی ایک دھماکے سے ہونے والے طوفانی ریلے کی طرح اندر آیا مگر اس وقت میں گیٹ کود کھلیل کر باہر گر گیا تھا۔ پانی کے دباؤ نے دروازے کو دوبارہ بند کر دیا اور میں نے گاڑی کو بہاؤ کے ساتھ آگے بڑھتا اور نیچے بیٹھتا محسوس کیا۔

میرے کانوں نے بشیر کی آواز بھی سنی۔ اس کا نشہ تو پانی کا تھپیڑا منہ پر پڑتے ہی ہرن ہو گیا تھا۔ اب وہ میرا نام لے کر چلا رہا تھا۔ میں نے حواس پر قابو پایا اور تیر کے دوسری طرف پہنچا۔ گدلے پانی کی نہر میں عام طور پر پانی کی گہرائی چھ سات فٹ ہی رہتی تھی مگر آج نہر کناروں تک بہہ رہی تھی۔

اگر بہت زیادہ رات نہ ہوتی تو یہاں نہر کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے درختوں کے نیچے اور سبزے کے فرش پر کچھ لوگ ضرور نظر آتے۔ ان میں زیادہ تر نوجوان اور بچے ہوتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں جھاڑیوں کی اوٹ میں کوئی خاندان بھی نظر آ جاتا تھا۔ کبھی ان جھاڑیوں میں جگنو بھی جھلملاتے تھے اور نہر کے پیچھے دھرمپورے کی (جو اب مصطفیٰ آباد ہو گیا تھا) پرانی آبادی کے لوگوں کے لیے یہ بڑی پُرلطف تفریح گاہ تھی۔

اس وقت نہر کے محکمے کا دفتر بھی ویران پڑا تھا اور اس کے سامنے سے گزرنے والی ٹریفک بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ گاڑی کے پانی میں گرنے سے جو آواز پیدا ہوئی تھی، اسے سڑک پر سے گزرنے والی ٹریفک کے شور میں کسی نے بھی نہیں سنا تھا۔

میں نے بڑی مشکل سے دروازے کو کھینچ کے کھولا اور بشیر چوہدری کو باہر نکال کے ایک بازو پر سنبھال لیا۔ میں نے اسے آواز دے کر ہوش میں لانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پہلے کون سا پوری طرح ہوش میں تھا۔ پانی کے ریلے نے اس کو بالکل ہی بے گانہ ہوش کر دیا تھا۔ منہ اور ناک کے راستے پانی اس کے پیٹ میں بھی گیا ہو گا اور شاید وہ تیرنا بھی نہیں جانتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسے چند فٹ دور کنارے تک کھینچ کر لانے میں میرے چند منٹ ہی لگے ہوں گے مگر مجھ پر خوف اور گھبراہٹ سوار تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں شل ہو رہے تھے۔ اس کے باوجود مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں نے اپنی حالت کی پروا نہ کرتے ہوئے بشیر چوہدری کی جان بچالی۔

میں نے اسے کنارے پر ڈالا اور الٹا لٹا کے اس کی کمر پر چڑھ گیا۔ بشیر چوہدری نے منہ سے پانی اگلا اور کراہا۔ یہ بڑی حوصلہ افزا علامت تھی۔ اسی وقت نہر کے مچھلے کا چوکیدار نمودار ہوا پھر شکستہ دیوار کی طرف سے ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ میں نے چلا کے کہا "اوئے ادھر آؤ۔ گاڑی پانی میں گر گئی ہے۔"

وہ چند منٹ کا وقفہ تھا جب میں اکیلا تھا۔ میری آواز کے ساتھ ہی جیسے ہر طرف سے مددگار نمودار ہو گئے۔ مچھلے انہار کا چوکیدار سب سے پہلے فون کرنے دوڑا "میں ٹیلی فون کرتا ہوں' ابھی ایمبولینس آجائے گی۔"

ایک نوجوان نے بشیر چوہدری کا معائنہ کرنے کے بعد کہا "خیر ہے۔ خیر ہے' بندہ بچ جائے گا۔"

تیسرا شخص ایک پہلوان ٹائپ عمر رسیدہ آدمی تھا جس کی دھوتی کے اوپر توند ہی توند تھی۔ "اوئے ڈیا ڈاکٹرا۔ دوڑ کے جا۔ سڑک سے کوئی گڈی پھڑ کے لا۔ ایمبولینس آتے آتے بڑی دیر ہو جائے گی۔"

نوجوان ایک دم اٹھ کے ریس میں حصہ لینے والوں کی طرح سڑک کی جانب بھاگا۔ اس کی تیز رفتاری نے مجھے حیران کر دیا۔ میں پیٹ اور سینے کو آہستہ آہستہ دبا دبا کے اندر کا سارا پانی باہر نکالنے کی کوشش میں لگا رہا۔ پھیپھڑوں میں پانی بھر جانے سے اس کی سانس رک سکتی تھی۔

بشیر چوہدری بری طرح کھانسا اور اس کے منہ سے جھاگ جیسا پانی نکلا۔ اس کے حلق میں اب بھی خرخراہٹ جاری تھی۔ عظیم الشان توند والے کے ایک ہاتھ میں گدھے کی جسامت والے بکرے کی رسی تھی جسے وہ دوسرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی خشک گھاس زبردستی کھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دو منٹ میں محکمۂ انہار کا چوکیدار پھر نمودار ہوا۔ "فون آ ک ہے" اس نے مایوسی سے کہا۔

"چل رہن دے" پہلوان نے طنز سے کہا "ایسا ہی ہوتا ہے سرکاری ٹیلی فونوں کا معاملہ۔ تالا توڑ نہیں سکتا تھا تو۔"

"تالے سے پہلے ٹیلی فون ٹوٹ جاتا" چوکیدار نے ناراضی سے کہا۔

"او آ گئی ہے گڈی!" پہلوان نے بڑی مسرت سے اعلان کیا۔

میں نے کہا "پہلوان جی۔ ایک مہربانی کرو۔ پیچھے میرا گھر ہے۔ وہاں بتانا ہے کہ میں اسپتال گیا ہوں۔ تھانے دار بشیر چوہدری صاحب کے ساتھ۔"

سڑک کی طرف دوڑ لگانے والا نوجوان پانچ منٹ میں کسی گاڑی والے کو روک کر ادھر لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ گاڑی والا نیک دل اور ہمدرد آدمی نہ ہوتا تو بہانہ کر کے نکل جاتا۔ اس نے نوجوان کی مدد کی اور انہوں نے بشیر چوہدری کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

میں نے پہلوان کو پتا سمجھاتے کہا "میرے گھر والے پریشان نہ ہوں۔ انہیں بتا دینا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ اور گاڑی کا خیال رکھنا۔"

"گاڑی تو کیچڑ میں دھنس گئی ہے۔ کرین سے ہی نکلے گی صبح" چوکیدار نے کہا۔ گاڑی لانے والا نوجوان آگے بیٹھ گیا۔ میں نے پیچھے بیٹھ کے بشیر چوہدری کا سر اوپر رکھا۔ اس کی بے ہوشی' حلق اور سینے سے نکلنے والی خرخر کی آوازوں سے مجھ پر دہشت اور گھبراہٹ سوار تھی۔ کہیں وہ راستے میں ہی نہ مر جائے۔ ایک تھانے دار کی حادثاتی موت بڑا سنگین معاملہ بن جائے گی اور میں تفتیش کے چکر میں پھنس جاؤں گا۔ اس کی نبض میرے ہاتھ پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس سے اچھا تھا میں پیدل آجاتا۔ تانگے میں بیٹھ جاتا۔ ٹیکسی کر لیتا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تھانے دار صاحب بوتل چڑھا کے نکلے ہیں۔ وہ تھانے جاتے ہوئے گھس جاتا کسی ٹرک یا بس میں۔ گاڑی ٹکراتا کسی دیوار سے یا بجلی کے کھمبے سے۔ خواہ مخواہ کا عذاب میرے جان پر تو نہ آتا۔ اس کی بیوی تو مجھے کوسے گی کہ منحوس۔ نڑ کے منحوس شوہر کو پکڑ لایا اور میرے شوہر کو غرق کر دیا۔ تیرا غرق ہو۔ صدمے سے اور غصے سے پاگل ہو جانے والی عورت کے پاس جو تھوڑی بہت عقل ہوتی ہے وہ بھی ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ اس کی زبان کو پھر کون روک سکتا ہے۔

"کون سے اسپتال جانا ہے؟" گاڑی والے نے کہا۔

میں نے چونک کے کہا "جو بھی قریب ہو۔"

"یہ سرکاری اسپتال کا کیس ہے۔ پرائیویٹ اسپتال والے کہاں دیکھیں گے" گاڑی والے نے کہا۔

میں نے کہا "ان کا تو باپ بھی دیکھے گا۔ یہ وردی میں نہیں مگر ہے پکا تھانے دار۔ ایس ایچ او۔ انسپکٹر بشیر چوہدری۔ بعد میں وہ جہاں چاہے بھیج دیں۔ پہلے جان بچ جائے۔"

میرا اندازہ درست تھا۔ ایک پرائیویٹ اسپتال میں جہاں چوبیس گھنٹے ایمرجنسی کا بورڈ لگا ہوا تھا پہلے مجھے انکار کیا

گیا پھر میں نے بتایا کہ میں کیس لے کر آیا ہوں تو قانونی پوزیشن کا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا۔ بشیر چوہدری کو فوراً اسٹریچر پر ڈال کے اندر پہنچا دیا گیا۔

میں خود سر تا پیر بھیگے ہوئے کپڑوں میں تھا اور کیچڑ والا پانی میرے بالوں میں بھر گیا تھا۔ میرے جوتوں میں اور جیبوں میں بھر گیا تھا۔ اس سے گاڑی والے کی سیٹوں پر چڑھے ہوئے سفید کور بالکل خراب ہو گئے تھے مگر اس نے پروا نہیں کی تھی اور گاڑی کو خوب دوڑا کے چند منٹ میں ہمیں اسپتال پہنچا دیا تھا تاہم وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ اپنا انسانی اخلاقی فرض ادا کرنے کے بعد بھی ٹھہرتا اور قانونی چکروں میں پڑ کے اپنی زندگی خراب کرتا۔ جیسے ہی اسپتال کا عملہ بشیر چوہدری کو اسٹریچر پر ڈال کے لے گیا' گاڑی والا اور اسے بلا کر لانے والا نوجوان اتفاقِ رائے سے ایک ساتھ فرار ہو گئے۔ پانچ منٹ بعد میں نے دیکھا تو وہاں میں اکیلا تھا۔

میں نے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا استعمال کرتے ہوئے پہلے انکوائری سے ایک تھانے کا نمبر لیا۔ وہاں موجود ڈیوٹی افسر سے پوچھا کہ بشیر چوہدری صاحب کس تھانے کے ایس ایچ او ہیں۔ اس تھانے سے مجھے بشیر چوہدری کے گھر کا نمبر ملا اور میں نے وسیم کو اس حادثے کے بارے میں بتایا۔

"کسی اور کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرا خیال ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ بس تم آجاؤ تاکہ میں باؤس" میں نے کہا "میری حالت بھی بہت زیادہ اچھی نہیں ہے۔"

ٹیلی فون رکھنے کے بعد میں نے ناگواری سے ناک بھوں چڑھانے والی نرس پر چڑھائی کر دی "ایسی شکلیں کیوں بنا رہی ہو۔" اس نے کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکا کے اور آگے جھک کر کہا۔

"تین کالیں کی ہیں تم نے؟" اس نے بیزاری سے کہا۔

میں نے ہاتھ مار کے فون نیچے گرا دیا "اور میں نے اسپتال کا فرش گندہ کر دیا ہے۔ بدبو آرہی ہے تمہیں میرے جسم سے۔ کیا تمہیں یہ نظر نہیں آتا کہ مجھے بھی توجہ اور کبھی امداد کی ضرورت ہے؟ کیا صرف ایک تھانے دار کی جان بچائی جاسکتی ہے ایمرجنسی میں۔ جو تھانے دار نہ ہو وہ بخار یا نمونے میں مبتلا ہو کے مرتا ہے تو مر جائے" میں نے دہاڑ کے کہا۔

"مجھ پر مت چلاؤ۔ یہ پرائیویٹ اسپتال ہے۔ خیراتی اسپتال نہیں ہے" اس نے برہمی سے کہا۔

"کیا میں نے کہا ہے تم سے کہ میرا علاج فی سبیل اللہ کرو" میں نے چیخ کے کہا "کتنا پیسہ چاہیے تمہیں؟"

وہ ڈر کے پیچھے ہو گئی "ہنگامہ مت کرو اسپتال میں ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔ پولیس کو بلا لوگی تم؟ پولیس کے ساتھ ہی آیا ہوں میں۔ وہ ایک تھانے دار ہے اور میں اس کا سالا ہوں۔"

وہ گھبرا کے بھاگی "میں۔۔۔ ڈاکٹر کو بلاتی ہوں۔"

ڈاکٹر ایک ہی تھا اور وہ نرسوں کو ہدایات دے کر فارغ ہو چکا تھا۔ بشیر چوہدری کو صاف ستھرا کر کے اور کپڑے بدل کے پرائیویٹ وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر کو نرس کے ساتھ آتے دیکھا۔

"انسپکٹر بشیر بالکل ٹھیک ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔" ڈاکٹر نے مسکرانے کی کوشش کی "صبح تک وہ پوری طرح ہوش میں آجائیں گے۔"

میں نے جیب میں سے بھیگے ہوئے ڈالر نکالے "یہ ستائیس ہزار ڈالر ہیں۔ گن لو اور اپنے پاس رکھ لو۔ بشیر چوہدری کا بہنوئی بھی آرہا ہے پھر بھی تم کو کتنی رقم کی ضرورت ہے۔۔۔" اپنی بات پوری ہونے سے پہلے میں وہیں گر کے بے ہوش ہو گیا۔ میری ٹانگیں بہت دیر سے کانپ رہی تھیں۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسپتال کے صاف ستھرے کپڑوں میں ایک بستر پر کمبل اوڑھے لیٹا ہوا تھا۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا تو چھ بج کے دس منٹ ہوئے تھے۔ میں نے سرہانے کی طرف لٹکنے والی بیل کا پش بٹن دبا دیا۔ چند منٹ میں ایک نرس نمودار ہو گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ صبح ہونے والی ہے۔ میں صرف چار پانچ گھنٹے بعد ہی ہوش میں آگیا تھا مگر میرا جسم درد کر رہا تھا اور بخار سے گرم بھی تھا۔ یہ جسم کا ایک فطری ردِ عمل تھا۔ ذہنی طور پر میں پوری طرح مستعد تھا۔ میں نے معلوم کیا تو نرس نے بتایا کہ بشیر چوہدری کے گھر سے کوئی آچکا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ آنے والا وسیم کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

چند منٹ کے بعد وسیم میرے کمرے میں پہنچ گیا۔ "کیا حال ہے یار۔ میں دو دفعہ پہلے دیکھ گیا تھا۔"

میں نے کہا "میں ٹھیک ہوں۔ چوہدری صاحب!"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ نیند میں ہیں ابھی۔ تم نے کمال کر دیا یار۔ ان کی جان بچائی مگر یہ سب ہوا کیسے؟" وسیم میرے پاس بیٹھ گیا۔

"بشیر چوہدری نشے میں تھا۔ گھر سے پتا نہیں کتنی پی کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چلا تھا کہ راستے میں ہی آؤٹ ہو گیا" میں نے کہا "میری کوئی نیکی اس کے کام آگئی ورنہ اس کے اعمال کی بات ہوتی تو میں بے گناہ مارا جاتا اس کے ساتھ۔"

وسیم نے مجھے تسلی دی "چلو اللہ نے سب خیر کی۔"

میں نے کہا "اب تم جاؤ میرے گھر۔ وہاں رئیس بھی ہو گا۔ اطلاع تو کر دی تھی میں نے انہیں مگر انہیں یہی بتایا تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ انہیں اسپتال کا بھی علم نہیں۔ رات بھر جاگ کے انتظار کیا ہو گا انہوں نے میرا۔ کہیں وہ اسپتالوں کی خاک چھانتے نہ نکل کھڑے ہوں۔"

اس نے میرے ہاتھ پر تھپکی دی "میں ابھی بلاتا ہوں۔ اسی گلی میں میرا ایک جاننے والا رہتا ہے۔ ویسے تو سب ہی جانتے ہیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں پیغام مل جائے گا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ شاید وہ آدھے گھنٹے کی نیند بھی نہیں تھی مگر اتنی سی دیر میں میری آنکھوں نے ایک خواب آرزو دیکھ لیا۔ وہ ایک بے سود خواب تھا۔ میرے ذہنی خلفشار اور لاشعور میں دبے ہوئے جذبوں کی عکاسی کرنے والا۔ میں نے اپنی لاش کو دیکھا جو سفید چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی پر فرش پر سیدھی رکھی ہوئی تھی۔ شاید چادر ہٹا کے میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور انکار کر رہی تھی "یہ ناصر نہیں ہے۔ یہ میرا ناصر نہیں ہے" اور ماسی ہیرا سے ایک کاغذ کا پرزہ دکھا کے کوس رہی تھی اور رو رہی تھی۔ حرام زادی 'کمینی' مرگیا وہ تیرے لیے۔ یہ دیکھ اس نے کیا لکھا ہے کنجری۔ میرا سوہنا پتر کھا گئی چڑیل۔ تیرا گھنسہ روے۔ مرجانیے" اور ڈاکٹر رانجھا اپنے آنسو قمیص کے دامن سے پونچھتے ہوئے فرما رہے ہیں۔ "بڑی بیگم صاحبہ بنی ہوئی ہے تو دیی فقیر زادی۔ نہیں مانتی تو مت مان لیکن اس کی قاتل تو ہے۔ دفع ہو یہاں سے۔"

کسی نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ایک ساتھ مجھے تین متفکر چہرے نظر آئے۔ یہ ڈاکٹر رانجھا' ماسی ہیرا اور رئیس کے چہرے تھے۔

"ہائے میں صدقے۔ کیا ہوا ہے تجھے۔" ماسی ہیرا نے مجھے اپنے ساتھ لپٹا کے رونا شروع کیا "کیا کرتا پھرتا ہے باہر۔"

میں نے خود کو سنبھالا اور ماسی ہیرا سے چھڑایا "ارے ماسی۔ تمہارے سامنے ہوں میں۔ کیا ہوا ہے مجھے؟ کچھ بھی تو نہیں۔"

"جھوٹ مت بول مجھ سے۔ بخار میں بدن جل رہا ہے اور شکل دیکھ اپنی۔ مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ کیا ہوا۔ کتنی چوٹوں کے نشان ہیں۔ سچ بتا کسی سے مار پیٹ ہوئی تھی۔ کس نے کیا ہے یہ حال تیرا۔ میں خون پی جاؤں گی ان کا۔"

میں نے مسکرا کے کہا "بلڈ پریشر اور بڑھ جائے گا' خون پینے سے۔ پہلے ہی اتنا خون بھرا ہوا ہے جسم میں کہ پھٹنے والی ہو" میں نے کہا۔

ڈاکٹر رانجھا نے سر سے ٹوپی اتار کے تبسم فرمایا "عزیزم پھر تو ضرور بتا دو اس کا نام اس ڈریکولا کو۔ آج تک تو صرف میرا خون جگر پیا ہے اس نے۔"

ماسی ہیرا نے آنسو صاف کیے اور بڑے دکھ سے رانجھے کو دیکھا "شرم نہیں آتی تجھے رانجھے۔ مخول کرتا ہے یہاں بھی میرے ساتھ۔ ذرا حالت دیکھ ناصر کی۔"

"وہ تو خیر دیکھ ہی رہا ہوں چشم خود لیکن مذاق کوئی نہیں کیا میں نے تیرے ساتھ۔"

"تا پھر کیا بولا تھا تو نے میرے کو۔ کوکا کولا جیسا نام تھا۔ ڈراکولا۔ کیا میں ڈراکولا ہوں۔ خون سے بھری ہوئی بوتل ہوں؟ تیرا خون پیا ہے میں نے؟ تیرا تو خون سفید ہو گیا ہے۔ دودھ کی طرح نکلے گا۔ جیسے آک کے پودے کا زہریلا دودھ ہوتا ہے۔" ماسی کی زبان چل پڑے تو پھر رانجھے کو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی تھی اور وہ بغلیں جھانکتا نظر آتا تھا۔

میں نے کہا "ماسی میرا آخری وقت ہے اور تم لڑنے میں مصروف ہو۔"

اس نے ایک سیٹی جیسی چیخ ماری پھر میرے ایک دو ہتڑ رسید کیے "تا مراد۔ مت نکال منہ سے ایسی منحوس بات۔ مریں تیرے دشمن۔"

رانجھے نے پھر بگاڑا "صاف نام کیوں نہیں لیتی میرا مگر میں نہیں ایسے مرنے والا۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے مار کے مرے گا تو۔ سیکڑوں ہزاروں بندے مارے ہیں اپنی ڈاکٹری سے۔ کسی دن آجائے گی میری باری بھی مگر مجھے بھی قسم ہے زہر پی لوں گی' تیری دوائی پی کے نہیں مروں گی۔"

رئیس بھی ہنسنے لگا "اسپتال آکے بیمار آدمی کو مار رہی ہو ماسی۔"

میں نے کراہنا شروع کیا "ہائے ظالم ماسی۔ جتنی ہڈیاں بچی تھیں' وہ سب تم نے توڑ دیں۔ مارتی ہو مجھے اور کہتی ہو مریں دشمن۔"

"تا پھر کیوں کرتا ہے ایسی دل جلانے والی باتیں۔ سچ بتا مجھے یہ اسی کا چکر تو نہیں ہے۔ اس نے کیا ہے تیرا یہ حال تو سوں رب دی۔ میں اس غمساں کھانی کو چھوڑوں گی نہیں۔

نوٹے کر کے نا۔ چیلوں کو کھلا دوں گی بوٹی بوٹی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کس کی بات کر رہی ہو تم ماسی۔"

"پنچھی طرح جانتا ہے تو۔ میں اس مرن جوگی شادو کی بات کر رہی ہوں۔ یہ رئیس حرامی جھوٹ بول کے مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتا۔ جھوٹ بھی ایسا کہ کہی کی سمجھ میں نہ آئے۔ گاڑی نہر میں گر گئی۔ پتا نہیں کون سی فلم دیکھ کے آیا تھا جس کی کہانی سنا رہا تھا۔ تھانے دار ساتھ تھا۔ نشے میں تھا۔"

میں نے کہا "رئیس نے ٹھیک بتایا تھا ماسی!"

"تا یہ کون شرابی کبابی تھانے دار تھا تیرے ساتھ اور گاڑی سڑک پر سے نہر میں کیسے چلی گئی۔ تو بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے۔" ماسی ہیرا نے سچائی پر اعتبار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ "یہ نشان صاف چوٹوں کے ہیں۔ ہائے' کیسی بے دردی سے پٹوایا ہے۔ دیکھ رانجھے' بڑا ڈاکٹر بنا پھرتا ہے تو۔ یہ نیل کیسا ہے آنکھوں کے پاس اور گال پر یہ خراش دیکھ۔"

"دیکھ رہا ہوں میں نیک بخت۔"

"اچھی طرح دیکھ۔ پورا پوسٹ مارٹم کر کے بتا۔ کس چیز کی چوٹ ہے پھر میں نے خود جا کے اسے نہ کوٹا تو میرا بھی نام ہیر نہیں۔ قیمہ کر دوں گی اس کا۔ کوفتے بنا دوں گی۔"

ماسی کے جوشیلے ماتا بھرے ایکشن اور پوسٹ مارٹم کے مطالبے نے سب کو بے اختیار ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ آدھا کام دوا نے کیا تھا تو باقی آدھا کام اس پیار اور محبت کی سادگی نے دور کر دیا۔ ہم سب کو اور سب کے ساتھ مجھے ہنستا دیکھ کے ماسی بھی مسکرانے لگی۔ بالآخر اسے یقین آگیا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

ابھی سب ہنس ہی رہے تھے کہ دروازے پر آہستہ سے ناک کر کے بشیر چوہدری اندر آگیا۔ اس نے بھی اسپتال کے کپڑے پہن رکھے تھے اور بظاہر اس کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ بستر سے بھی اٹھ سکتا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر جگہ جگہ زخموں کے نشان تھے جن کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے ضرور منع کیا ہو گا مگر وہ بھی تھانے دار تھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ مجھے دیکھنے چلا آیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا "ناصر' کیا حال ہے تیرا یار' ٹھیک ہے نا۔"

میں نے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں چوہدری صاحب۔ مگر آپ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کیوں آئے ہیں یہاں؟"

اندر آنے والے ایک ڈاکٹر اور ایک بدحواس نرس نے میری بات سن لی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا "پلیز چوہدری صاحب۔ میں نے منع کیا تھا آپ کو۔"

بشیر چوہدری مجھ پر جھک گیا "یار بشیر پر احسان کر دیا تو نے۔ میں نے تو تجھے بھی اپنے ساتھ مروانے میں کسر نہیں چھوڑی تھی۔ تو نے پھر بھی بچا لیا مجھے۔ شاباش ہے تجھے جوان۔ بڑا ہمت والا ہے تو۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ آپ ان کو لے جائیں۔ یہ فضول باتیں کرنے آگئے ہیں یہاں۔"

اس نے میری بات سنی ان سنی کر دی۔ "ہیرو۔ یہ تیرے گھر والے ہیں۔ وہی۔ ہیر رانجھا۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔ اور ماسی! یہ ہیں اپنے بشیر چوہدری صاحب۔ پکے تھانے دار ہیں۔ تین پھول والے' اب بے شک ان سے پوچھ لو کیا ہوا تھا۔ کوئی فلمی کہانی نہیں سنائی تھی رئیس نے۔"

"بڑا جیالا پتر ہے تمہارا۔ تھانے دار سے بھی زیادہ زور آور ہے۔ میں تو ڈوب جاتا گاڑی کے ساتھ۔ پتا نہیں یہ یہاں تک کیسے لے کر آیا۔"

ماسی کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ ڈاکٹر رانجھا کی آنکھوں میں ایک پُرفخر مسکراہٹ آگئی۔ ایک پکا تھانے دار ان کے بیٹے کو جیالا' ہمت والا اور ہیرو کہہ رہا تھا۔ اس کا احسان مند تھا۔

ڈاکٹر نے پھر واویلا مچایا "چوہدری صاحب۔ چلیں اپنے کمرے میں۔ یہ بڑی غلط بات ہے۔ آپ مجھے زبردستی پر مجبور کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں۔ لے جاؤ انہیں پکڑ کے۔ انجکشن لگا کے ایسے لٹا دو کہ یہ سوتے رہیں دو چار دن۔"

پھر وسیم نمودار ہو گیا "اوجی' آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ادھر آپ کے کمرے میں بیٹھے ہیں سارے۔ روپیٹ رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ڈھونڈھ کے لاتا ہوں۔ مجھے پتا تھا آپ یہاں ملیں گے۔"

بشیر چوہدری مسکرانے لگا "اور باقی سب کا کیا خیال تھا کہ میں مردہ خانے میں ملوں گا۔"

"ہائے جی رب نہ کرے۔" ماسی ہیرا نے عادت کے مطابق سینے پر ہاتھ رکھا "بڑی قیمتی جان ہے آپ کی۔ میرے پتر نے جان بچائی ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "اوئے پاگلا۔ کیوں کفر کا کلمہ زبان سے نکالتی ہے۔ بچانے اور مارنے والی رب کی ذات ہے۔ توبہ کر توبہ۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "رانجھا ٹھیک کہہ رہا ہے ماسی!"

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہے۔ خدا ابھی تو کسی کو وسیلہ بناتا ہے۔ ادھر نہر میں ڈوبنے لگا تھا تھانے دار تو کیا فرشتے آئے تھے اسے نکالنے۔ نکال کے تو ناصر ہی لایا نا۔ میرا پتر۔"

بشیر چوہدری نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور پھر ماسی کو دیکھ کے مسکرانے لگا "تمہارا پتر بڑے نصیبوں والا ہے مگر اس سے زیادہ خوش قسمت تم ہو کہ تمہیں ایسا سونے کے دل والا بیٹا ملا۔"

ماسی ہیر فرطِ جذبات سے رونے کے قریب ہو گئی "اس کے دل کا مت پوچھو تھانے دار جی۔ سونے سے بھی بڑھ کر ہے۔ ہیرا ہے ہیرا۔"

میں نے مذاق کیا "وہ تو بڑا سخت ہوتا ہے۔ پتھر ہوتا ہے ماسی۔"

اب ڈاکٹر اور وسیم نے بشیر چوہدری کو دونوں بازو تھام کے اپنی طرف کھینچا۔ بشیر چوہدری نے مزاحمت نہیں کی "اوئے بدمعاشی مت کرو یار۔ میں چلتا ہوں' پھر آؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد ماسی نے میری اور بلائیں لیں اور جھولی پھیلا کے کھڑی ہو گئی "میرے مولا۔ میرے ناصر کو بھلا چنگا کر دے۔ ریشم کی چادر لے کر جاؤں گی داتا صاحبؒ کے پاس۔ ایک دیگ پلاؤ کی ایک زردے کی چڑھاؤں گی۔"

"او بھئی نذر نیاز جتنا جی چاہے کر مگر اپنا ناصر بالکل بھلا چنگا ہے۔ معمولی بخار ہے۔ گھر چل کے میں دوائی کی ایک خوراک دوں گا تو گھوڑے کی طرح دوڑنے لگے گا" ڈاکٹر رانجھا نے فرمایا۔

"تو دے گا دوا؟" ماسی نے کمر پر ہاتھ رکھ کے اسے چیلنج کیا "کپڑے دھونے والا ڈنڈا مار کے سر پھاڑ دوں گی تیرا۔ خود کھا اپنی دوائی اور گھوڑے کی طرح دوڑیا گھوتے کی طرح۔"

"او پاگل کی بچی۔ یہ ولایتی دوائیں بڑی سخت اور ظالم ہوتی ہیں۔ جیسے ولایت کے حاکم لوگ ہوتے تھے۔ ہم دیسی مزاج کے لوگوں کو نہ ولایتی گولی راس آتی ہے نہ ولایتی زن۔ میں نے جو گولی ایجاد کی ہے۔"

"رانجھے' رانجھے۔ باز آجا ورنہ کسی دن گولی نہیں گولا ماردوں گی میں تجھے۔ بھنگیوں کی توپ میں ڈال کے چلا دوں گی۔" ہیر نے کہا۔

رئیس ابھی تک خاموش تھا اور میرے پیروں کی طرف ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ میں نے اسے اشارے سے پاس بلا کے کہا "رات کو میں نے ساری رقم اس نرس کو دے دی تھی۔ سارے نوٹ گیلے تھے۔"

"اسے کیوں دے دی تھی؟" رئیس نے مجھے آنکھ ماری "اتنی اچھی لگی کہ سب وار دیا اس پر تو نے۔"

میں نے کہا "یار میں نے سوچا کہ بے ہوش ہو گیا تو کوئی یہاں پاکٹ مار دے گا۔ میں بعد میں کیسے ثابت کرتا کہ میری جیب میں ستائیس ہزار ڈالر تھے۔ میری شکل سے اور حلیے سے تو ایسا لگتا تھا کہ میری جیب میں دس روپے بھی نہیں ہوں گے۔ اسپتال والوں کا خیال تھا کہ میں تھانے دار کو لانے والا کوئی راہ گیر ہوں یا ٹیکسی ڈرائیور۔ کوئی مجھے اٹینڈ ہی نہیں کر رہا تھا۔"

"ابے ایسا ہی ہوتا ہے ان پرائیویٹ اسپتالوں میں اور یہ تو بہت مہنگا اسپتال ہے۔ تیرے میرے جیسوں کو یہاں کون پوچھتا ہے۔ تو یہاں کیسے آگیا آخر؟"

میں نے کہا "خدا کا ایک نیک بندہ اپنی گاڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ تو ایسا کر۔ جا کے پوچھ وہ رات والی نرس سارے پیسے کس کے حوالے کر کے گئی ہے۔ ان کا حساب پوچھ کے ادائیگی کر کے چلتے ہیں گھر۔"

رئیس گیا اور تھوڑی دیر میں لوٹ آیا۔ اس نے نوٹ میرے تکیے کے نیچے رکھ دیے "رقم تو ساری دے دی انہوں نے پوری ہے۔ لیکن جانے کی اجازت کے لیے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سے پوچھو' اس نے صاف انکار کر دیا کہ پہلے بشیر چوہدری صاحب سے بات کرو۔"

رئیس نے تائید میں سر ہلایا "قسم اللہ کی۔ یہ سالے تو قسائی ہیں۔ کھال کھینچتے ہیں آدمی کی۔ پتا ہے کتنا کرایہ ہے اس کمرے کا؟ ایک ہزار روپے روز کا۔"

"ہائے میں مرگئی۔" ماسی ہیر نے سینے پر ہاتھ رکھا "روز کے ایک ہزار؟ تو نے ٹھیک سنا رئیس۔ مہینے کے ہوں گے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے اسے افسوس ناک نظروں سے دیکھا "کیسی کم عقل عورت ہے۔ کیا ولایتی ہوٹلوں جیسا ٹھنڈا ٹھار کمرا ہے۔ اے سی والا۔ نیچے قالین بچھا ہوا ہے۔ صوفہ لگا ہے' ہزار تو کچھ بھی نہیں۔"

"تیرے لیے کچھ نہیں لیٹ جا یہاں۔ ہمارے پاس حرام کے پیسے نہیں ہیں۔" ہیر نے فیصلہ کر دیا "کہہ دے اس ڈاکٹر سے رئیس کہ ہم جا رہے ہیں۔ جس کی ہمت ہو روک کر دکھائے۔"

ظاہر ہے کہ جو ہیر چاہتی تھی' وہ ناممکن تھا۔ ایک حکم بشیر چوہدری کا تھا اور دوسرا بڑے ڈاکٹر کا کہ مکمل بحالیِ صحت تک مجھے اسپتال سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ بل میں خود بھی ادا کر سکتا تھا مگر بعد میں بشیر چوہدری نے یہ ہدایات بھی جاری

کر دیں کہ سارے اخراجات وہ ادا کرے گا۔

میں نے سمجھا بجھا کے ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کو رخصت کیا۔ اوقاتِ ملاقات کے علاوہ مریضوں کے ساتھ پرائیویٹ روم میں صرف ایک شخص رہ سکتا تھا اور ماسی ہیر کا خیال تھا کہ میرا خیال وہی رکھ سکتی ہے۔ میں نے رئیس کو ساتھ رکھنا بہتر سمجھا اور ماسی کو اس دلیل سے قائل کیا کہ مردانہ وارڈ میں کسی عورت کو اور زنانہ وارڈ میں مردوں کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں۔ حفاظت کے خیال سے میں نے سارے ڈالر بھی اس کو دے دیے۔ ان کے جانے کے بعد رئیس نے مجھ سے وہ داستانِ شجاعت میری زبانی سنی جو اسے وسیم سنا چکا تھا۔

"بشیر چوہدری تو اب مرید ہو گیا' تیرا پیارے۔ ایک گھنٹے میں ایک احسان پر دو احسان کر دیے تو نے۔ اس کی بہن کا اور بھتیجی خصم اسے واپس لا دیا اور پھر اسے غرق ہونے سے بچا لیا۔"

"یار رئیس۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے وسیم کو بلیک میل کیا تھا۔ ہم اس کو سزا دینے گئے تھے کہ اسے اپنا مکان دگنی قیمت میں بیچ کے کچھ فائدہ اٹھالیں۔ آگے قدرت نے ایسے اسباب پیدا کر دیے کہ اپنی برائی ہی اپنے حق میں نیکی بن گئی۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ بشیر چوہدری کے ساتھ میں بھی مارا جاتا۔ کسی حادثے کا شکار ہو کے یا ڈوب کے۔"

"اپن تو شروع سے مانتے ہیں کہ تو قسمت کا دھنی ہے۔" اس نے گھڑی دیکھی "یار' اپنا تو بھوک سے دم نکل جائے گا۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

میں نے کہا "ابھی کون سی دوپہر ہو گئی ہے۔ جا دیکھ کہیں سے ناشتے کا انتظام ہو جائے تو۔"

رئیس کے اٹھنے سے پہلے وسیم کے ساتھ ایک عورت اندر آگئی۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس وقت جب وہ ناصر کی لاش پر جھوٹے بین کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس وقت بالکل بدلے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ میرے دل میں اس کے اور وسیم کے لیے نفرت کے انتقامی جذبات کتنے شدید تھے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اپنے ہم نام اور دوست ناصر عظیم کی لاش کو ان دونوں کے خون سے غسل دیتا مگر اس وقت وہ پرانی باتیں بھول کر مجھ سے ہمدردی کرنے اور میرا شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔

ایک بار پھر مجھے اس سے سخت نفرت محسوس ہوئی۔ اس کی ساری باتیں جھوٹ ہوں گی شکر گزاری بھی جھوٹ ہو گی۔ ہمدردی کے الفاظ جھوٹے ہوں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کے آنسو جھوٹ تھے جو وہ اپنے بھتیجے کی زخموں سے چور لہو آلودہ لاش پر بہا رہی تھی۔ وہ حادثے میں نہیں مرا تھا۔ وسیم نے اسے خود حادثے کا نشانہ بنا کے قتل کیا تھا۔ وسیم کی بیوی کے گلے میں سونے کا نیکلس کانوں کے بندے اور ہاتھوں کی چوڑیاں دیکھ کے مجھے یوں لگا جیسے وہ زیور بھی ناصر کی ماں کا ہو گا۔ وسیم کی بیوہ بھابی کا جس کے شوہر کو پھانسی ہو گئی تھی۔ اس کے حسن و شباب پر وسیم کی بھوکے گدھ جیسی نظریں نہ جانے کب سے تھیں۔ بھائی کے پھانسی چڑھتے ہی اس نے اپنے دانت تیز کیے اور دوسری شادی کے لیے اس پر ڈورے ڈالنے میں ناکام رہا تو اسے ایک پردہ فروش کے حوالے کر دیا پھر اسے قتل کر دیا اور اس کے گھر میں گاڑ دیا۔

وسیم کی بیوی نے بڑی ملامت سے کہا "تم ناصر عظیم ہو۔"

ذرا سی دیر کے لیے انتقام کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی تھی۔ میں نے کہا "ہاں' میں بھی ناصر عظیم ہوں' دوسرا ناصر عظیم۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "میں..... میں تو شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔"

"نہیں چاہیے مجھے یہ جھوٹا شکریہ۔ لالچی' مکار عورت!" میں نے غصے سے پھنکار کے کہا "خون کے داغ ہیں تیرے ہاتھوں پر' چہرے پر۔"

وسیم گھبرا گیا "چلو یار۔ ہمیں معاف کرو اب۔"

"میں معاف کروں؟ میں کون ہوتا ہوں کسی قاتل کو معاف کرنے والا۔ معافی مانگو خدا سے" میں اٹھ بیٹھا "اس دنیا میں تم اس لیے سزا سے بچ گئے کہ یہاں کے عدالتی نظام کی گرفت میں نہیں آئے اور میں مجبور تھا۔ میں اپنی زندگی کو تمہیں سزا دلوانے کے مقصد پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری کوشش ضائع جاتی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نے تمہیں ناصر کا خون معاف کر دیا اور اس کی ماں کے قتل کے الزام سے بری کر دیا۔ میں نے فیصلہ چھوڑ دیا ہے داور محشر کی آخری عدالت پر۔ جاؤ' پہلے جاؤ۔ میں پھر تمہاری صورت کبھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

رئیس نے بیچ میں آنے کی کوشش کی "یار چھوڑ۔ اپنا خیال کر۔ تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

وسیم کی بیوی کی آنکھوں میں مجھے ایک لمحے کے لیے خون آشامی کی چمک نظر آئی تھی۔ اس نے مجبوری میں یہ ذلت برداشت کی تھی۔ وہ میرے احسان سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ یہ اسپتال تھا۔ اس کا گھر ہوتا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاید وہ ایسی قوت برداشت نہ دکھاتی۔ اسے یہ بھی خیال تھا کہ وسیم اس کی حمایت میں ایک لفظ نہیں بولے گا اور بشیر چوہدری تو شاید میرے سامنے اس کے جھانپڑ رسید کر کے کہے گا کہ پھر معافی مانگو ناصر سے۔ جو وہ کہے' سنو۔ وہ جوتے مارے تب بھی مت بولو۔ اس کے احسان کا قرض تم کیسے اتارو گی۔ اس نے تمہارا سہاگ لوٹا دیا۔ تمہارا گھر تمہیں دے دیا۔ تمہاری زندگی واپس کر دی۔"

وہ خون کے گھونٹ پی کر اور وسیم کو اپنے ساتھ کھینچ کر پرے سے لے گئی۔ رئیس نے کہا "ابے کیوں' اپنا خون جلاتا ہے۔ اب کب تک جلاتا رہے گا۔ بس بھول جا اس بات کو پیارے۔"

میں نے کہا "کیسے بھول جاؤں یار رئیس اور کوئی اپنے دامن پر اس کے خون کے داغ لے کر میرے سامنے آئے اور پاک دامنی کی سند بھی مجھ سے مانگے تو میں کیسے برداشت کروں؟"

"وسیم کے سامنے تو اتنا مشتعل کبھی نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ شاید اس لیے کہ اتنے عرصے بعد میں نے پہلی بار اس عورت کو دیکھا۔ وسیم تو خیر ہے لالچی کتا۔ بھوکا بھیڑیا مگر یہ عورت۔۔۔"

رئیس نے کہا "دیکھو یار۔ بیوی ہونے کے ناتے بھی وہ مجبور تھی اور اس نے ایک سوکن کو راستے سے ہٹایا۔ تو یہ بھی اس کی جذباتی مجبوری بن گئی جس سے وسیم نے فائدہ اٹھایا۔"

میں لیٹ کر چھت کو دیکھتا رہا "پتا نہیں کیوں یار' مجھے اب ایسا لگتا ہے جیسے میں نے بڑی ذلالت کا ثبوت دیا۔ میں نے ناصر کے خون کی قیمت وصول کر لی۔ اٹھائیس ہزار ڈالر۔ انتقام کی خواہش سے دستبرداری قبول کر لی میں نے۔ کیوں کیا میں نے ایسا یار! میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟"

رئیس نے بے وقوفوں کی طرح مجھے دیکھا "ابے کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا "جو میں نہیں چاہتا۔۔۔ وہ ہو جاتا ہے۔۔۔ اور جو میں چاہتا ہوں وہ نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر مشہود کے گھر میں کیا ہوا۔ وہی جو میں نہیں چاہتا تھا اور شادو کے معاملے میں دیکھ لے۔ وہ نہیں ہوا جو میں چاہتا تھا اور اب وسیم کے ساتھ پھر وہ ہوا جو میں نہیں چاہتا تھا۔"

"سالے بند کر اپنی یہ بک بک۔ ایسا کس کے ساتھ ہوتا ہے دنیا میں کہ جو چاہے وہی ہو جائے؟" رئیس نے جھنجھلا کے کہا "آدمی خدا نہ ہو جائے اگر وہ اپنی مرضی اور ارادے سے کچھ بھی کرے۔ تو ہی کہتا تھا مجھ سے کہ سب تقدیر کا کھیل ہے اور تقدیر سے بڑا مداری کوئی نہیں۔۔۔ میں آتا ہوں ناشتا لے کر۔"

میں خاموش ہو گیا۔ وہ وقتی جذبات کا تند ریلا تھا جس میں بہہ کر میں یہ بات بھول گیا تھا جو ازلی و ابدی حقیقت ہے۔ حضرت علیؓ کا قول کہ میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کی شکست سے پہچانا۔

اس دن بہت لوگ مجھے بھی دیکھنے آئے۔ بشیر چوہدری کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی خبر پھیلی تو اس کے ماتحت اور افسران سب ہی اسپتال پہنچے اور بشیر چوہدری نے اپنی شراب پی کے گاڑی چلانے کی کوتاہی پر بڑی خوب صورتی سے پردہ ڈالا۔ اس نے ایک کہانی گھڑلی جس میں تھوڑی بہت نیک نامی اس کے حصے میں بھی آئی۔ اس نے کہا کہ ایک بڑھیا نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئی اور سڑک پار کرنے لگی۔ اسے بچانے کی اور کوئی صورت ہی نہ تھی۔ بڑھیا کو شاید ابھی تک پتا نہیں ہوگا کہ اس کو خراش تک نہیں آئی مگر ہم پہنچ گئے یہاں۔ وہ بھی اس نوجوان ناصر عظیم کی وجہ سے ورنہ شاید اب تک عالمِ ارواح میں بھی کئی گھنٹے

میری جانبازی اور حاضر دماغی کے قصے کو بھی اس نے بڑھا چڑھا کے بیان کیا۔ نتیجہ یہ کہ دوپہر کے بعد ایک ایس پی نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا اور شام کو ڈی آئی جی صاحب خود تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک اخباری نمائندہ بھی پہنچ گیا۔ اس نے نہر سے گاڑی کے نکالے جانے کی تصاویر بھی کھینچی تھیں اور وہ میرے انٹرویو سے اپنی اسٹوری مکمل کرنا چاہتا تھا۔

ایک حادثے نے مجھے ہیرو بنا دیا تھا۔ اب میرا انکار بھی انکسار سمجھا جا رہا تھا۔ جب ڈی آئی جی صاحب کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا تو رئیس نے کہا "ابے یار' یہ کیا مصیبت ہے۔ کوئی نکالا میرا انٹرویو لینے پر نہ تل جائے اور تصویریں چھاپ دے۔"

میں نے کہا "ڈرنے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"تیرے لیے نہ سہی' اپنے لیے ہے پیارے۔ دیکھ ماسی ہیر بھی آنے والی ہوگی ملاقات کا ٹائم ہو گیا ہے۔ اپن ذرا ایک راؤنڈ لگا کے آتے ہیں۔"

"کہاں جا رہا ہے راؤنڈ لگانے؟"

"دیکھ یار۔ مجھے بھی ان اسپتال والوں نے بلاوجہ روک رکھا ہے۔ تیرے ساتھ میں بھی بند ہوں صبح سے" رئیس بولا

"دل گھبرا رہا ہے ذرا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کس کے لیے گھبرا رہا ہے تیرا دل؟ سچ بات کیوں نہیں بتاتا۔"

اس نے خفت آمیز ہنسی کے ساتھ بتایا۔ "یار آج فائٹ ہوگی اپن تھوڑی سی دل پشاوری کرتے ہیں۔ خون میں گرمی آجاتی ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ فائٹ سے اس کی مراد عمران خان اور گواسکر کا مقابلہ ہے۔ مرغوں کی لڑائی پر شرط لگانے کا شوق بہت پرانا تھا اور اس۔۔۔ فائٹ کے دوران میں وہی حالت ہو جاتی تھی جو کرکٹ کے دیوانوں کی ون ڈے کرکٹ کے فائنل میں ہوتی ہے جب پاکستان کے مقابلے پر بھارت ہو۔

اس کے جاتے ہی ماسی ہیر آگئی۔ وہ اپنے ساتھ بہت کچھ لے کر آئی تھی اور اس کی یہ خواہش تھی کہ میں وہ سب ایک ساتھ اپنے پیٹ میں اتار لوں۔ جوس اور سوپ۔ چکن بریانی' قورمہ اور کھیر۔ پھل اور دودھ۔ یہ سب کچھ ایک لنچ باکس' اور ایک فٹن کیریئر باکس کے علاوہ دو شاپنگ بیگز میں بھرا ہوا تھا۔ اسے میں اکیلا کھاتا تو ایک ہفتے چل جاتا۔ میں نے سب سائیڈ ٹیبل کپ بورڈ کے اندر رکھوا دیا۔

"یہ کون آرہا ہے یہاں۔ باہر ہی روک رہا تھا مجھے ایک ہٹا کٹا مرد پولیس والا۔ کہنے لگا کہ تلاشی ہوگی۔ میں نے کہا کہ کیوں؟ کھانا لائی ہوں اپنے پتر کا۔ بھارت سے اسلحہ لے کر نہیں آئی ہوں۔ ماں ہوں ناصر کی پھر کہنے لگا کہ اچھا جلدی سے دے کر آجاؤ۔ اس وقت اندر کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ پتا نہیں کون آرہے ہیں۔ جی آئی جی' میں نے کہا آئی جی گئی جی کا نہیں پتا مجھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "ڈی آئی جی۔ بہت بڑے پولیس کے افسر کو کہتے ہیں۔ ان کے ساتھ اخبار والا بھی آرہا ہے۔"

"وہ جو ہماری گلی میں صبح صبح سائیکل پر آتا ہے؟ بڈھا بابا' بڑا نیک دل بندہ ہے۔ مجھے پوچھنے آرہا ہوگا۔"

میری وضاحت سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور باہر متعین ایک سب انسپکٹر نے گھبراہٹ میں کہا "چل مائی۔ نکل باہر۔۔۔ صاحب آگیا۔"

میں نے اسے ڈانٹ لگائی "تمیز سے بات کرو' یہ ماں ہے میری' یہ باہر نہیں جائے گی۔ تمہارے ڈی آئی جی صاحب کو نہیں آنا تو نہ آئیں۔"

اس کی شکل اتر گئی۔ ڈی آئی جی اس وقت بشیر چوہدری کے کمرے میں تھا۔ دس منٹ بعد وہ میرے پاس آگیا۔ کسی اخبار کا ایک رپورٹر اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے حادثے کی اور گاڑی کے نہر سے نکالے جانے کی رپورٹ بھی بنائی تھی اور اب اس میں میرا انٹرویو شامل کر کے اپنی اسٹوری کو مکمل کرنے کے چکر میں تھا۔ یہ کوئی خاص واقعہ نہیں تھا مگر وہ ڈی آئی جی صاحب کا کوئی چہیتا تھا یا اسے کسی بچے نے بطور خاص بلوایا تھا کہ بڑے صاحب کے اسپتال جا کر عیادت کرنے کی خبر اور تصویر کہیں تو شائع ہو۔

ڈی آئی جی کو سارے واقعے کی رپورٹ پہلے ہی مل چکی تھی۔ وہ سیدھا میری طرف آیا "تو تم ہو ناصر۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اس کے ساتھ آنے والے ایک ماتحت نے فوراً پھولوں کا گلدستہ مجھے پیش کیا۔ فوٹو گرافر نے فوراً تصویر بنالی۔

"میرا بہادر پتر ہے جی آئی جی صاحب!" ماسی فوراً درمیان میں حائل ہو گئی "میری تصویر بھی اتارو اخبار کے لیے۔ ہاں' میرا نام ہے ہیر۔"

ڈی آئی جی مسکرایا "تمہارے بیٹے نے جان کی بازی لگا کے ایک پولیس افسر کی جان بچائی۔ ہاں بھئی' ان کی تصویر ضرور آنی چاہیے۔"

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت

دو جلدوں میں مکمل

باقیہ

طاہر جاوید مغل

قیمت فی جلد 250 روپے

بہترین کمپوزنگ، خوبصورت جلد اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فوٹو گرافر نے تعمیل کی "بالکل آئے گی سر!"

ماسی نے گلدستہ پکڑلیا اور بڑے فخر سے ڈی آئی جی کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ اس طرح کہ ایک طرف میں تھا' درمیان میں وہ خود اور اس کے دائیں ہاتھ پر ڈی آئی جی صاحب۔ اب ماسی کی زبان نے اپنے پتر کو فرشتہ اور نارزن ثابت کرنے کے لیے فصاحت وبلاغت کا دریا بہانا شروع کیا تو اس پر بند باندھنا مشکل ہوگیا "ہائے میں مرگئی" اس نے فلیش چمکتے ہی سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

تصویر کھینچنے والا پریشان ہوگیا۔ ڈی آئی جی نے کہا "کیا ہوا؟"

"رانجھا تو ہے نہیں تصویر میں۔ اس نے تو چھوڑنا نہیں زندہ مجھے کہ ہیر' اپنی اکیلے تصویر چھپوالی" ماسی ہیر نے کہا "جی آئی جی صاحب۔ میرا گھر والا ہے رانجھا۔ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔ بڑی شفا ہے اس کے ہاتھ میں۔"

اس کی بات پر ڈی آئی جی سمیت سب لوگ ہنسنے لگے۔ ان میں ڈاکٹر بھی تھا جو اسپتال کا مالک تھا اور ایک ڈی ایس پی بھی۔ میں حیران تھا کہ گھر میں رانجھے کو ڈاکٹر سے زیادہ فرشتہ اجل کا ایجنٹ قرار دینے والی ماسی ہیر یہاں کتنے فخر سے کہہ رہی تھی کہ وہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے۔

"تم ہیر ہو اور وہ رانجھا!" ڈی آئی جی نے دلچسپی سے کہا اور اخبار والے کی طرف دیکھا کہ وہ بھی یہ نقطہ نوٹ کرلے۔

"ہاں جی۔ آپ ایسا کرو' ادھر بیٹھو کرسی پر اور اخبار والے کاکا' تو بھی ٹھہر۔ رانجھے کے بغیر تو تصویر ادھوری ہے" ماسی نے کرسی آگے بڑھادی۔

ڈی آئی جی خوش مزاج آدمی تھا "ہیر۔ تمہارا رانجھا دس بجے آتا ہے نا۔ ابھی تو بڑی دیر ہے۔ میں پھر آجاؤں گا کھانے کے بعد۔ ابھی میں ٹائم پر گھر نہ پہنچا تو بیوی سخت اور ظالم ہے میری۔ بہت مارے گی مجھے۔"

"ہائے میرا مرگئی۔" ہیر نے پھر سینے پر ہاتھ رکھا "تمہیں مارتی ہے؟ اپنے مزاجی خدا کو؟ توبہ توبہ۔۔۔۔ اور تم اتنے بڑے پولیس افسر۔ مار کھاتے ہو ایک عورت سے۔۔۔۔ یہ اخبار والا سب سن رہا ہے۔ کتنی بے عزتی ہوگی تمہاری اگر اس نے یہ بھی لکھ دیا۔"

میں نے ہیر کا ہاتھ دبایا "بس کرو۔ بولے ہی چلی جارہی ہو۔ کسی اور کو بھی بولنے دو۔"

ڈی آئی جی نے خاموشی کے ایک لمحے کا فائدہ اٹھایا "اچھا بھئی۔ آئی وش یو ہیلتھ۔ تمہیں پولیس کی طرف سے تعریفی سند دی جائے گی۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

ماسی نے چلا کے کہا "دس بجے روٹی کھا کے آجانا ضرور۔"

رات تک ہیر رانجھا کا نام اسپتال کے عملے سے پولیس کے بہت سے افسروں کی زبان پر آگیا تھا اور سب اس نئے دور کے ہیر رانجھے کی جوڑی کا ہنس ہنس کر ذکر کررہے تھے۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب رات دس بجے اخبار کا رپورٹر اور فوٹو گرافر دوبارہ نمودار ہوا "ہیر جی۔ کدھر ہے آپ کا رانجھا۔"

"ہائے ہائے۔ آجائے گا۔ بندہ ہے کوئی ٹائم سے چلنے والی گاڑی تو نہیں ہے اور گاڑی کون سی ٹائم پر چلتی ہے۔ سب لیٹ آتی ہیں۔ بیٹھ دو منٹ آرام سے ادھر۔ بھوک لگی ہے تو بتا۔ کھانا بہت ہے سب کے لیے۔ جوس تو میں دوں گی نہیں۔ میرے پتر نا صر کے لیے ہے۔"

رپورٹر نے کرسی پر بیٹھ کے ہاتھ جوڑے "کچھ نہیں کھانا مجھے میری ماں۔ چائے مل جائے گی تو پی لوں گا۔"

میں نے کہا "تم پھر کیوں آگئے۔"

"آنا کیسے نہ" وہ مجبور شکل بنا کے بولا "ڈی آئی جی صاحب کا حکم تھا کہ رانجھے کی تصویر بھی لگنی چاہیے ہیر کے ساتھ۔ اب الگ سے بناؤں گا اور پھر کاٹ کے ساتھ لگاؤں گا۔ ان کو ناراض نہیں کرسکتا۔ چھوٹے بھائی کی درخواست دی ہے نوکری کے لیے۔ تم کیا کرتے ہو؟"

اس کا سوال اتنا غیر متوقع تھا کہ میں چونک پڑا۔

"میں۔۔۔۔ پڑھتا ہوں ابھی۔"

اچانک رپورٹر نے چٹکی بجائی "یاد آگیا۔ جب سے تمہیں دیکھا تھا دماغ اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ تم سے پہلے بھی ملاقات ہوئی ہے۔ تم وہی ہو نا جس نے مشہور فلمی ہیروئن نیلم کی گاڑی کے سامنے آکے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "کون الو کا پٹھا ایسا کہتا ہے۔"

اس نے محتاط ہوکے کہا "میں نے دیکھا تھا تمہیں وہاں بھی۔ جب نیلم آئی تھی تمہیں دیکھنے کے لیے۔۔۔۔ رائٹ۔۔۔۔ تم وہی ہو۔"

میں نے کہا "وہ تو ٹھیک ہے لیکن خودکشی والی بات غلط ہے۔"

"واہ یار۔ تم تو پبلسٹی کے بندے ہو۔ اب دیکھنا کیا دھانسو اسٹوری بنے گی۔ ایسا اسکوپ۔ SCOOP بھی ایسا EXCLUSIVE۔ صبح نیلم دیکھے گی تو دوڑی آئے گی۔ میں

رات کو ہی اسے فون پر بتادوں گا کہ بس مجھے وقت بتادے۔ میرے سوا کسی کو تصویر نہ ملے۔"

میں نے کہا "کیا سب اخبار والے ایسے ہی پاگل ہوتے ہیں۔ وہ بہت پرانی بات ہے۔ نیلم بھول چکی۔ اس کے بعد نہ وہ ملی کبھی اور نہ میں نے کوشش کی۔ وہ بہت بڑی اور معروف آرٹسٹ ہے۔"

"آرٹسٹ؟ ہیر اسٹار ہے ہیر اسٹار۔"

اب ماسی ہیر کے لیے بولنا ضروری ہوگیا۔ "ہائے' بڑی اچھی کڑی ہے۔ بڑی سوہنی اور اتنی مسکین۔ تو جانتا ہے وہ کہاں رہتی ہے؟"

رپورٹر ہنسنے لگا "سارا زمانہ جانتا ہے۔"

"گولی مار سارے زمانے کو۔ تو صبح لے چل مجھے اس کے گھر۔ میں اس کے ماں باپ سے بات کرتی ہوں۔"

میں نے اپنا سر پکڑلیا "اف ماسی۔۔۔۔ کیا بات کروگی تم اس سے۔"

"ہائے بات کروں گی تیری اور کیا۔۔۔۔ کیوں تجھے اچھی نہیں لگتی؟ سال دو سال بڑی ہو تجھ سے تو کوئی بات نہیں۔ رانجھا بھی تو تجھ سے چھوٹا ہے عمر میں پر خاوند تو خاوند ہی ہوتا ہے۔ مزاجی خدا' اسے کہاں ملے گا میرے سوہنے ناصر پتر جیسا۔۔۔۔ چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔"

چائے پیتے ہوئے اخباری نمائندے کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ میں نے انگریزی میں کہا "اپنی اسٹوری میں یہ سب نہ شامل کرے جو ایک ماں کے جذبات ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں یار" اس نے کہا۔

ماسی ہیر خفا ہونے لگی "کیا بک رہے ہو انگریزی میں۔ مجھے بھی بتاؤ۔"

میں نے کہا "کچھ نہیں ماسی۔ یہ بتا رہا ہے کہ اس کی تو شادی ہوچکی ہے دو بچے ہیں۔"

ماسی ہیر نے جوتی اٹھالی "جھوٹ مت بول۔ دو بچے کدھر سے ہوگئے۔ جب گھر آئی تھی تو میں نے خود پوچھا تھا اس سے اور اس نے بتایا تھا مجھے کہ ابھی کیس بات پکی نہیں ہوئی۔"

"تم نے پوچھا تھا؟" میں نے ہنس کے کہا "بڑی چیز ہو تم بھی ماسی پھر اس مرتبہ کرلینا بات پکی بلکہ صبح تک تو میں بھی اس قابل ہوجاؤں گا کہ دوڑ کے قاضی کو پکڑلاؤں۔ دیر کیسی نیک کام میں۔ رحمتی اسپتال سے ہوسکتی ہے۔ سارے ڈاکٹر نرسیں باراتی بن جائیں گے۔ ان میں چھوارے بانٹ دیں گے۔"

اخباری نمائندے نے بے چینی سے گھڑی دیکھی اور چائے کا خالی کپ رکھ دیا "بھئی کیا ہوگیا؟ آج تو رانجھا ایکسپریس بہت لیٹ ہوگئی۔"

"کوجی نام لیا کسی نے ہمارا اور ہم حاضر۔" رانجھے نے کمرے میں قدم رنجہ فرما کے کہا "شیطان کو کس نے یاد کیا؟"

اخباری نمائندے کے لیے ہیر سے زیادہ رانجھے کی دید ایک عبرتناک واقعہ ثابت ہوئی۔ خصوصاً اس وقت جب رانجھے نے اپنی ٹوپی اتار کے سر کا چمکتا ہوا گلوب برآمد کیا۔ تیل سے پالش کی ہوئی سطح سے روشنی پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ ہیر وارث شاہ کی داستان کے سارے رومانی تصورات اصلی زندگی کے ہیر رانجھا کو دیکھ کر سخت مجروح ہوتے تھے۔

"اتنی دیر سے کیوں آیا ہے رانجھے!" ماسی ہیر نے وقت پر دفتر پہنچ جانے والے افسر کی طرح مسٹر رانجھا ڈی آئی جی سے سخت لہجے میں سوال کیا۔

"اب جھوٹ بولوں یا سچ!" رانجھا پاؤں لٹکا کے بیڈ پر بیٹھ گیا "سچ یہ ہے نیک بخت کہ ایک مریض کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اسی میں دیر ہوئی۔ ایک تو وہ آئی اس وقت جب میں اٹھ رہا تھا۔"

"آئی۔۔۔۔" ہیر نے ہائے کے انداز میں کہا۔

"ہاں۔۔۔۔ مریض تو کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ یا ہوسکتی ہے۔۔۔۔ اس کے ساتھ بھی کوئی نہیں تھا اور کلینک میں بھی اکیلا ہی تھا میں۔۔۔۔ اوپر سے لائٹ چلی گئی تھی۔۔۔۔ بس چاند کی روشنی آرہی تھی اندر۔۔۔۔ اب جو میں نبض دیکھنے لگا تو ٹائم کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔۔۔۔ بالکل جمیل جیسی گہری۔"

ہیر نے جل بھن کے کہا "شرم کر۔ کچھ حیا کر رانجھے۔۔۔۔ اس عمر میں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہے پتر یہ جاہل عورت۔ عمر کا بیماری سے کیا تعلق" رانجھا بولا "وہ کیا فرمایا ہے شاعر مشرق اپنے علامہ اقبال صاحب نے۔ دیکھا اس بیمارِ دل نے آخر کام تمام کیا۔"

میں نے کہا "ہر شعر علامہ اقبال کا نہیں ہوتا۔"

"ہر اچھا شعر ہوتا ہے" رانجھے نے اصرار کیا "تو بس۔ اتنی سی بات ہے یار۔ نبض اتنی دیر دیکھی مگر بیماری کا پتا نہیں چلا تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھنا پڑا۔ اس سے بھی معلوم نہیں ہوا پھر بیڈ پر لٹا کے تفصیلی معائنہ کرنا بھی ضروری ہوگیا۔"

"ہائے میں مرگئی" ہیر نے سینے پر دو ہتڑ مارا "اندر لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا تو اسے؟ اندھیرے میں۔ بیڈ پر لٹا کے دیکھا؟ کیا جوان اور خوب صورت بھی تھی وہ؟"

رانجھے نے جانتے بوجھتے مجرمانہ چپ بتایا "ہاں۔ یہی مجبوری تھی۔"

"میں سب سمجھتی ہوں" ماسی رونے کے قریب ہو گئی "تو خود بھی لیٹ گیا ہو گا۔"

رانجھے نے سر جھکا کے اقرار کیا "ہاں' مجبوری تھی۔"

"بیڑا غرق ہو تیری مجبوری کا۔ چلا جاتا پھر اس کے ساتھ۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔" ہیر نے سچ مچ رونا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ یار' بڑے افسوس کی بات ہے۔ کیوں تنگ کرتے ہو ماسی ہیر کو۔"

رانجھا ہنسنے لگا "ہے کہ نہیں پاگل؟ او بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

ہیر نے خفت سے اسے دیکھا "مگ۔۔۔ تو نے تو کہا تھا کہ سچ بول رہا ہے۔"

"جھلی ہے۔ عمر ساری گزر گئی تیرے ساتھ۔ اعتبار نہیں سیکھا تو نے رانجھے پر۔ جوانی میں بھی کوئی مس یونیورس اپنا ہاتھ پکڑ کے کہتی ناکہ چل میرے ساتھ۔ تو ہم نے کہہ دینا تھا کہ درفٹے منہ۔ ہیر کی جوتی زیادہ خوب صورت ہے تجھ سے۔"

اخباری نمائندہ منہ کھولے دم بخود بیٹھا تھا۔ ابھی تک رانجھے نے اسے دیکھا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ دروازے کے پیچھے تھا۔

میں نے کہا "کیا خیال ہے پھر؟ ہیر رانجھے کی اس لو اسٹوری کے بارے میں؟ میں تو روز دیکھتا ہوں ایسے سین۔"

وہ کیمرا سنبھال کے کھڑا ہو گیا "اگر میں شاعر ہوتا۔۔۔ تو ایک اور قصہ ہیر رانجھا لکھتا۔"

رانجھے نے اسے چونک کے دیکھا اور پھر بڑے اہتمام سے تصویر بنوائی۔ مختصراً اسے فوٹو گرافر نے بتایا تھا کہ وی آئی پی صاحب آئے تھے اور تصویر انہی کے حکم سے اتاری جا رہی ہے۔ رانجھے کا چہرہ بھی خوشی سے سرخی کی طرح چمکنے لگا تھا۔

جب اخباری نمائندہ جلدی میں ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا تو رانجھے نے پاؤں سمیٹ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا "ویسے تو بھوک مرگی ہے میری یہ بات سن کے مگر نکال جو بھی ہے۔ میں ذرا تفصیل سے ساری اسٹوری سن لوں اپنے پتر ناصر سے۔۔۔ مگر پہلے ایک بات میں بتا دوں۔"

میں نے کہا "وہ بات جو ادھوری رہ گئی تھی' مجبوری والی۔"

وہ ہنسنے لگا "او نہیں یار۔ ابھی نیچے پتا ہے کیا ہوا۔ مجھے روک لیا دروازے پر گارڈ نے۔ کہنے لگا ملاقات کا ٹائم نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر رانجھا ہوں میں۔ وہ کہنے لگا کہ میں نے کبھی اسپتال میں نہیں دیکھا تمہیں۔ اس نے ایک نرس کو بلا لیا کہ کیا یہ نئے ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ اب اس نے جواب میں کیا کہا۔ یہ بات سنانے والی نہیں ہے۔"

ہیر نے کھانا لگانے سے پہلے بستر پر اخبار بچھایا "پتا ہے مجھے اس نے کیا کہا ہو گا۔ یہی کہ شکل سے ڈاکٹر لگتا ہے تمہیں یہ بندہ یا دماغی مریض۔"

رانجھے نے قہقہہ مارا "او یار' یہ تو کمال ہی ہو گیا۔ لگتا ہے اسی نے نرس کو یہ جملہ بولنے کے لیے کہا تھا یا سن رہی تھی یہ ادھر کھڑی۔ خیر جی' پھر میں نے کہا کہ میرا پتر ناصر عظیم داخل ہے یہاں۔ اس کے پاس جانا ہے مجھے۔ اب سمجھ میں آئی کہ تیرا نام لیتے ہی بند دروازہ ایسے کھل گیا تھا جیسے علی بابا کی کہانی میں کھلتا تھا' کھل جا سم سم کہنے سے۔ گارڈ نے کہا کہ سر' آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔ اچھا تو وی آئی پی صاحب کے علاوہ کون کون آیا آج؟"

میں نے کہا "گورنر۔ وزیر اعظم اور صدر مملکت!"

وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ "کارنامہ ہی ایسا سرانجام دیا ہے تو نے۔"

ہم نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ رئیس آ پہنچا۔ اس کی گارڈ سے باقاعدہ جھڑپ ہوئی تھی اور اجازت اسے بھی ناصر عظیم کے نام سے ہی ملی۔ اس کی حالت دیکھ کے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ رئیس کی ناک کچھ سوجی ہوئی تھی۔ ایک آنکھ پر بھی سوجن تھی۔ قمیص اس کی پتلون سے باہر تھی اور اس کے تین میں سے صرف درمیانی والا بٹن باقی بچا تھا۔ اس کے بال بھی نوچے ہوئے لگتے تھے۔

اس نے کھانا کھانے سے صاف انکار کر دیا "اتنی مار کھا کے آیا ہوں یار کہ اب تو جی چاہتا ہے زہر کھا لوں۔ سالے بے ایمان!"

میں نے کہا "کیا ہوا یار' عمران خان ہار گیا؟"

رئیس بھڑک اٹھا "بے عمران خان ہار سکتا تھا بھلا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے تو سالے گوسکر کی ٹانٹ تھپی کر دی تھی۔ ٹھوکیں مار مار کے۔ قسم اللہ کی۔ اندھے کو بھی نظر آ رہا تھا کہ فیصلہ ہونے والا ہے۔ ادھر ادھر بھاگ کے جان بچا رہا تھا گوسکر اور عمران خان شیر کا بچہ ایسے حملے کر رہا

تھا کہ ایک پانچ والے ایک دس پر آ گئے تھے۔"

"کیا مطلب ہوا اس بات کا عزیزم!" رانجھے نے دریافت کیا۔

"سو پر پانچ سو کی شرط تھی پہلے پھر سو کے ہزار ہو چکے تھے۔"

ماسی ہیر نے اسے گھور کے دیکھا "یعنی ہار کے آیا پورے ہزار؟ شکل اسی لیے پھٹے نوٹ جیسی ہو رہی ہے۔ میں کہتی ہوں چھوڑ دے یہ مرغے بازی خبیثہ۔ بعد میں خود لڑ کے آتا ہے اور مار کھاتا ہے ہمیشہ کمینے۔"

"ماسی۔ گالیاں مجھے کیوں دیتی ہو" رئیس نے دکھی لہجے میں فریاد کی "حرامی پن تو ان سالوں نے کیا جو گوسکر کے حمایتی تھے۔ سؤر کے بچے ایک ..... مرغی لے کر آئے تھے۔ عین وقت پر اس کو سامنے کر دیا۔"

"یعنی گوسکر کی جگہ مرغی کو لڑانے۔"

"اب نہیں یار۔ اپنا عمران خان مرد کا بچہ کسی عورت سے مقابلہ کر سکتا ہے۔ کہ تم بالنگ کراؤ اور میں چھکا مار کے دکھاتا ہوں۔ قسم اللہ کی کرکٹ چھوڑ کے گلی ڈنڈا کھیلنا شروع کر دے گا جس دن ایسا ہوا۔"

میں نے کہا "تیرے عمران خان کے ساتھ کیا ہوا؟"

"بہت برا ہوا یار۔ مخالفوں نے ..... مرغی اکھاڑے کے باہر بٹھا دی اور وہ سالی نخرے دکھانے لگی۔ کڑکڑ کرنے لگی عمران خان کو دیکھ کے۔ اسے رجھانے کے لیے۔ عمران خان کو تو جانتا ہے' لڑکیاں کیسی کلین بولڈ ہوتی تھیں اس پر اور وہ خود بھی بولڈ ہوتا رہتا تھا۔ یہ سالا مرغا بھی اس جیسا ہی عاشق مزاج تھا۔ بھول گیا ساری بہادری۔ سالے کی نظر جم کے رہ گئی اس مرغی پر۔ میں نے شور مچایا کہ یہ بے ایمانی ہے تو مرغی لانے والے ہنسنے لگے کہ یہ زینت امان ہے۔"

ہنستے ہنستے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے "مرغی کا نام زینت امان۔"

"زینت تو خیر وہ تھی مگر امان۔۔۔" رئیس بولا "یہ کیا نام ہوا؟"

"تو نہیں سمجھے گا۔۔۔" میں نے آنسو پونچھ کے کہا "یعنی آج تیرا عمران خان جیت جاتا مگر ہار گیا زینت امان کی وجہ سے۔"

"اب ہاں یار!" رئیس افسردگی سے بولا "سالا لڑائی چھوڑ کے بار بار ادھر لپکنے لگا ..... مرغی کی طرف۔"

ڈاکٹر رانجھا نے فرمایا۔ "برخوردار۔ وہ تو عقل و شعور سے بے بہرہ مرغ تھا۔ یہاں تو اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت جانے والے بھی سفید ولایتی عورت دیکھ کے سب بھول جاتے ہیں۔ گھر بار اور خاندان کو۔ ملک کو' اپنی کالی چمڑی کو۔"

میں نے کہا "کیا یہ ضروری ہے کہ مرغوں کی لڑائی کے بعد لڑانے والے خود لڑیں؟ دیکھ کیا حال ہو رہا ہے تیرا؟"

"قسم اللہ کی۔ آج تو چھریاں چل جاتیں۔ ذبح کر دیتا میں اس ..... نخرے دکھانے والی زینت امان کو۔ ایسی بے حیائی سے ورغلایا اس نے عمران خان کو۔ اگلی بار میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ گوا سکر کے سامنے کھڑا کر دوں گا زینت امان کو۔ اگر وہ جیتنے لگا۔"

"زینت امان!" مجھے پھر ہنسی آئی "وہ کون ہے؟"

"ابے ایک فاحشہ مرغی ہے۔ سارے محلے کے مرغ اس کے پیچھے پھرتے ہیں۔ میں تو دیکھتا رہتا ہوں۔"

ماسی ہیر نے جوتی اٹھا کے رئیس کی طرف پھینکی "نا تو یہی دیکھتا رہتا ہے' حرامی نہ ہو تو۔"

اسپتال کے کسی کمرے میں کوئی بھی وزیٹر رات گیارہ بجے تک نہیں ٹھہر سکتا تھا مگر میں اچانک تمام قاعدے قوانین سے بالاتر ایک وی آئی پی ہو گیا تھا۔ گیارہ بجے خود میں نے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو زبردستی رخصت کیا پھر میں اور رئیس بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔

میں نے کہا "رئیس تیرا نقصان ہو گیا ایک ہزار کا۔ مجھ سے لے لے۔"

"کیوں لے لوں تجھ سے۔ ایسے تو ہارنے کا مزہ نہ جیتنے کا" وہ بولا "اس کھیل کی یہی تو اصل چیز ہے یار۔ جیت کی خوشی اور ہار کا غم نہ ہو تو پھر مقابلے کا فائدہ؟ یہ جو مار ماری ہوتی ہے نا بعد میں۔ اس کا الگ ہی لطف ہے۔ جیسے اپنی ٹیم عمران خان کے ساتھ گئی تھی ویسٹ انڈیز' سن نواسی میں۔ وہ سالے کالی آندھی سمجھتے تھے خود کو۔ دس سال سے کسی نے ان کو ویسٹ انڈیز جا کے نہیں مارا تھا۔ اپنے عمران خان نے سالوں کا یہ غرور بھی توڑ دیا۔ تو یار ایک تو جیت کی خوشی اور پھر جیسے بھارت کو بھارت میں شکست دینے کی خوشی۔ ایسے ہی مرغوں کی لڑائی کے بعد جو آپس میں ہوتی ہے دے مارے ساڑھے چار۔ اس سے بڑی گرمی آتی ہے خون میں۔ جوش اور ولولہ کم نہیں ہوتا۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تجربہ تو نہیں ہے لیکن بات تیری سولہ آنے سو پیسے سچ لگتی ہے مجھے۔ اٹھائیس ہزار ڈالر میں سے چودہ پھر بھی تیرے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ابے میں کیا کروں گا چودہ ہزار ڈالر کا۔ یہ تو ہی رکھ لے اپنے پاس۔"

میں نے کہا "یار پیسہ ہی کام آتا ہے ضرورت میں۔"

"جب ضرورت پڑتی ہے پیارے تو پیسہ خود آجاتا ہے کہیں سے۔ اپن کو آج تک نہ کمی پڑی اور نہ کبھی مال ٹھہرا اپنے پاس۔ چودہ ہزار کیا چودہ لاکھ ڈالر بھی ہوں گے تو کل شام تک پرلگا کے اڑ جائیں گے۔ مجھے پتا ہے۔"

"تو بینک میں کیوں نہیں رکھتا۔ پیسہ جمع کرا لو کے بیٹھے۔"

"کیوں؟ کیا ہوگا پیسہ جمع ہونے سے؟" وہ بولا۔

"اچھی زندگی گزرے گی۔ تیرا دل نہیں چاہتا اچھے کپڑے پہننے' اچھے گھر میں رہنے' اچھی گاڑی میں گھومنے کو۔"

"نہیں۔" اس نے چھت کو گھورتے ہوئے مختصراً کہا "بس عیش سے زندگی گزر رہی ہے۔ اتنا کافی ہے۔"

ایسے شخص سے اور کیا کہا جا سکتا تھا جو یہ سمجھتا ہو کہ جیسی زندگی وہ گزار رہا ہے وہی عیش کی زندگی ہے۔ پہلے مجھے طیش آیا مگر بعد میں رشک۔ ایسا قناعت کا سکون میرے نصیب میں نہیں تھا۔ نگاہ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اگلے دن لازمی طور پر مجھے اسپتال سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔ میں بالکل فٹ تھا اور ٹیسٹ وغیرہ کی رسمی کارروائی محض اسپتال کے مالی مفادات کو مدِ نظر رکھنے کی پالیسی کا حصہ تھی۔ سارے دن بھی وسیم نے یا اس کی بیوی نے مجھے شکل نہیں دکھائی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آئندہ وہ خود بھی میری صورت دیکھنے سے گریز کریں گے۔ بشیر چوہدری کو ڈاکٹروں نے سکون کے لیے SEDATION میں رکھا تھا۔ ایک بار اس کی بیوی چند منٹ کے لیے آئی تھی۔ شاید بشیر چوہدری نے اسے مجبور کیا ہوگا کہ اپنے محسن کا شکریہ تو ادا کر آؤ ایک بار لیکن وہ صورت سے ہی سڑیل مزاج کی اور تنک چڑھی لگتی تھی۔ وہ دو منٹ بھی نہیں ٹھہری اور "کوئی ضرورت ہو تو بتا دینا" کہہ کے چلی گئی۔ غالباً اس نے میرا شکریہ ادا کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اپنی زنانہ منطق کے مطابق زندگی بچانے والا تو اللہ ہی تھا اور پھر اس کے شوہر کے ساتھ یہ حادثہ کس کی وجہ سے پیش آیا تھا؟ ظاہر ہے میری وجہ سے۔ نہ وہ مجھے چھوڑنے جاتا اور نہ نہر میں گاڑی گرتی۔ اگر میں ٹیکسی میں چلا جاتا تو کیا تھا۔ شاید وہ اس لیے بھی ناخوش ہوگی کہ میں نے اس کی نند کے ساتھ وہ سلوک نہیں کیا تھا جس کی وہ مستحق تھی۔ اگر میں وسیم کو پھانسی چڑھواتا اور اس کی بیوی کو اعانتِ مجرمانہ کے کیس میں جیل بھجواتا تو وہ میری تعریف کرتی کہ میں نے انصاف کا بول بالا کیا۔ نند بھاوج اور ساس بہو کے درمیان جو ایک فطری عداوت کے جذبات کا رشتہ ہوتا ہے اس کے لیے کتے بلی کے بیر کی مثال بہت ہلکی ہے۔

صبح میں سو کے بھی نہیں اٹھا تھا کہ جیسے قیامت آگئی۔ کسی نے زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا اور گھڑی دیکھی تو صبح کے سات بجے تھے۔ اسپتال کا عملہ اتنا بدتمیز نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہیرا رانجھا یوں حملہ آور ہو سکتے تھے۔

میں نے غصے میں دروازہ کھولا اور بے اختیار پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ساتھ ڈاکٹر مشہود' ان کی بیگم اور بچے سب اندر گھس آئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے تھے۔ ڈاکٹر مشہود نے اخبار لہراتے ہوئے مجھے گلے لگایا۔ ان کے پیچھے کیک اٹھائے کھڑی ہوئی بیگم صاحبہ مجھ پر اپنے پرانے مہربان مجسم اور نازوادا کی بجلیاں گراتی رہیں۔

مبارک باد کا شور سن کے رئیس بھی اٹھ بیٹھا تھا۔

"بھئی کمال کردیا تم نے تو؟" ڈاکٹر مشہود صوفے پر بیٹھ کے بولے۔

بیگم صاحبہ نے کیک میز پر رکھ دیا۔ دونوں بچوں نے مجھے گلدستے پیش کیے اور بڑے جوش و خروش سے مبارک باد دی۔

بے پناہ خلوص کے اس مظاہرے نے مجھے جذباتی کردیا۔ کتنے اچھے تھے وہ سب لوگ اور میں ان کے مقابلے میں کتنا کمینہ اور احسان فراموش تھا جو ان سے جھوٹ بولتا تھا۔ ایک کے بعد دوسرا' کبھی لوٹ کے گھر نہیں گیا تھا۔

میں نے کہا "ایسا کون ساتیر مارا ہے میں نے سر!"

ڈاکٹر مشہود نے کہا "ہمارے سامنے بھی انکساری کا ڈراما۔"

بیگم صاحبہ نے کہا "میرا خیال ہے ابھی اس کو معلوم ہی نہیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ کل اخبار والے بھی آئے تھے۔ وہی تصویر اخبار میں شائع ہوئی ہوگی۔"

ڈاکٹر مشہود نے ایک اور قہقہہ مارا۔ اتنا خوش میں نے انہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ "ٹھیک کہا تم نے بیگم' شہزادے! یہ دیکھو' جو اس میں ہے وہ بہت بڑی خبر ہے" انہوں نے اخبار کو ڈنڈے کی طرح اٹھا کے ہلایا "پاس ہو گئے

ہو تم۔"

دونوں بچوں نے کورس میں چلا کے کہا "اور آپ فرسٹ آئے ہیں۔ پرائیویٹ امیدواروں میں ٹاپ کیا ہے آپ نے۔"

میں دھم سے بیڈ پر گر گیا۔ میرا دل خوشی سے ایک قلابازی کھا کے کہیں معدے میں جا گرا تھا۔

"یہ دیکھو۔ یہ کس کا رول نمبر ہے؟" ڈاکٹر مشہود نے اخبار میرے سامنے پھیلا دیا "اور یہ دیکھو اپنی تصویر۔ کل رات فون آئے تھے دو تین اخبار والوں کے۔ تمہارے فارم پر پتا ہمارے ہی گھر کا تھا نا۔ وہ انٹرویو لینا چاہتے تھے تمہارا۔"

بیگم صاحب نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "ہم کیا بتاتے تمہارا پتا۔ ہمیں تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔"

"مگر اتفاق دیکھو۔ آج اخبار میں تمہارے دوسرے کارنامے کی تفصیل شائع ہوئی ہے۔ تصویر کے ساتھ۔ میں نے صبح صبح دیکھا تو پتا چلا کہ تم یہاں لیٹے ہوئے ہو۔ بس ہم فوراً نکل کھڑے ہوئے گھر سے۔"

کچھ دیر بعد جب میرے ہوش و حواس بحال ہوئے تو میں نے اخبار کو غور سے دیکھا۔ میرے کارنامے کی خبر زیادہ بڑی نہیں تھی۔ دو کالمی سرخی کے نیچے ایک کالم میں میری تصویر بہت واضح تھی "میں' ہیر رانجھا کے ساتھ کھڑا ڈی آئی جی سے ہاتھ ملا رہا تھا اور وہ مجھے گلدستہ پیش کر رہے تھے۔ رزلٹ کے صفحات الگ تھے۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ ہزاروں امیدواروں میں پہلی پوزیشن میری تھی۔ مجھے تو اپنے پاس ہونے کی امید بھی نہیں تھی۔ میں نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں مجھ پر شادو کے عشق کا بھوت سوار تھا۔ آخری پندرہ دن بھی میں شادو کی قسم سے مجبور ہو کے پڑھنے بیٹھا تھا اور جب آخری پرچا دے کے ہجر و فراق کے روز و شب کا عذاب جھیلنے والے دل کے ساتھ اس کے آستاں تک اس امید میں گیا تھا کہ اس کے دیدارِ حسن کی صبح مل گئی ہے تو مجھے پتا چلا تھا کہ میرے لیے تو تاریکی اتنی ہی گہری اور لامتناہی ہو گئی ہے جتنی قبر میں یومِ حساب کا انتظار کرنے والے کی رات۔

ڈاکٹر مشہود نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلایا "کیا سکتہ طاری ہو گیا اس خوشی کی خبر سے۔"

میں چونکا "کچھ ایسی ہی بات ہے۔ مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔"

"آجائے گا۔ لو کیک کاٹو۔" بیگم صاحبہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور ایک چھری میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔

ایک سیکنڈ۔ صرف ایک سیکنڈ کے لیے ان کے ہاتھ کا نرم گرم لمس میرے ہاتھ کی ٹھنڈک سے ہم آغوش ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس ایک سیکنڈ میں وہ پوری رات سمٹ آئی ہے جس میں بیگم صاحبہ کے وجود کی ساری مہک اور حرارت میرے وجود کا حصہ بنی تھی۔

صرف ایک بار نظر اٹھا کے انہوں نے مجھے دیکھا اور ایک لمحے کے لیے ان کی نظر میری نظر سے ملی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس ایک لمحے میں گزرے ہوئے وقت کے ہر ممنوعہ لمحے کے شجرِ گناہ کا تمام اقرار سمٹ آیا ہے۔

دوسرے لمحے میں۔ دوسرے سیکنڈ میں۔۔۔ میں آدم کی طرح جنت سے نکالا ہوا انساں رہ گیا۔ عرش سے فرش کی دوری ہی کتنی ہے۔

کیک پر مبارک باد کے الفاظ تھے۔ میرا نام تھا اور جب میں نے وہ کیک کاٹا تو میرے اندر جذبات کا ایک آتش فشاں ۔۔۔سا پھٹ گیا۔ مجھے بہت کچھ یاد آیا۔ میں نے بہت کچھ سوچا اور پھر آج کے دن کو دیکھا جب میں کامیابی کے راستے پر گامزن تھا۔ یتیم خانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور محرومی کا عذاب ختم ہو گیا تھا۔ میری تصویر اخبار میں چھپی تھی۔ ایک نہیں' میں نے دو کارنامے سرانجام دیے تھے۔ میں نے جو چاہا جسے چاہا پالیا تھا۔ ایک شادو نہ سہی۔ باقی سب تو خوش قسمتی کے خزانے سے مجھے ملتا جا رہا تھا۔ میں اتنے بڑے اسپتال میں وی آئی پی بنا لیٹا ہوا تھا۔ کل مجھ سے ڈی آئی جی خود ملنے آیا تھا۔ آج صبح صبح ڈاکٹر مشہود جیسے لوگ سب سے پہلے مجھے خوشخبری سنانے دوڑے چلے آئے تھے۔ کچھ دیر میں ہیر رانجھا آجائیں گے۔ اپنے ہونہار پر صدقے واری ہونے کے لیے۔ شاید نیلم بھی آئے گی۔۔۔ شاید۔۔۔ مگر وہ۔۔۔ نہیں' وہ نہیں آئے گی۔ اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو۔

"تم رو رہے ہو؟" ڈاکٹر مشہود نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ بچے ابھی تک تالیاں بجا رہے تھے۔

پیچھے دروازے میں ڈاکٹر مشہود کو پہچاننے والے ڈاکٹر آگئے تھے۔ دو نرسیں تھیں۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ رئیس میرا بازو تھامے کہہ رہا تھا۔ "ہمیں معلوم تھا پیارے' ہم تو جانتے تھے بہت بڑا آدمی بنے گا تو ایک دن۔"

پھر بیگم صاحبہ نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا۔ سب کے سامنے۔ کسی احساسِ جرم و ندامت کے بغیر۔ کیونکہ اس وقت کا جذبہ صرف ایک معصوم وجود رکھتا تھا۔ صرف محبت کا خلوص کا اور اپنائیت کا احساس رکھتا تھا۔ جو ماں میں ہوتا ہے اور بھائی کے لیے بہن کے پیار میں بھی۔ چنانچہ وہ کوئی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جواب نہیں رکھتا۔

پھر میں نے سب کے ہاتھوں سے کیک کھایا اور ان سب کو اپنے ہاتھوں سے کیک کھلایا اور ہم سب کے ہونٹ اور ناک کے سرے سفید کریم اور چاکلیٹ سے بھر گئے۔ ذرا سی دیر کے اس جشن میں چند ڈاکٹرز اور نرسیں بھی شامل ہوئے۔

پھر کسی نے بشیر چوہدری کو اطلاع دی اور وہ اٹھ کر آگیا۔ "بھئی واہ واہ۔ ایک ساتھ دو تیر مار دیے جوان کے بچے!" اس نے میری پیٹھ ٹھونکی۔ میں نے اسے ڈاکٹر مشہود سے ملوایا۔

انہوں نے کہا "بھئی اب ہم چلتے ہیں۔ کیا میں تم سے گھر آنے کے لیے کہوں؟"

میں نے شرمندہ ہو کے کہا "وہ میرا بھی گھر ہے۔"

"نہیں۔ تم وہاں رہنا نہیں چاہتے۔ اب آئندہ کوئی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" ڈاکٹر مشہود نے کہا "کل تک میں تم سے خفا تھا مگر اب میں نے سمجھ لیا ہے کہ تمہارا فیصلہ درست تھا۔ تم کو پابند نہیں کیا جاسکتا۔ اس سے تمہاری ترقی رک جائے گی۔"

"ہم کیا ناصر کی ترقی نہیں چاہتے تھے؟" بیگم صاحبہ نے کہا۔

"تم نہیں سمجھو گی۔ ہمارے لیے ترقی کا مطلب بہت محدود ہے۔ میں چاہتا تھا کہ یہ ڈاکٹر بن جائے میری طرح مگر ڈاکٹر کیا ہوتا ہے۔ اس کو زیادہ آگے جانا ہے۔ اور یہ جائے گا۔"

"خیر۔ تم کہیں بھی رہو" بیگم صاحبہ نے کہا "اتنے اجنبی مت بنو۔"

"ہاں انکل۔ ہم پارٹی دیں گے" بچوں نے کہا "آپ گھر آئیں۔"

وہ بڑا مبارک اور خوب صورت دن تھا۔ میں اچانک خود کو کسی پہاڑی کی چوٹی پر محسوس کرنے لگا تھا جہاں سے دنیا بہت دور تک افق کی حد کو چھوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ آسمان زیادہ پھیلا ہوا اور دسترس میں لگتا تھا۔ زندگی کے سارے راستے بہت واضح منزلوں کا نشان دیتے تھے۔

خلافِ معمول ڈاکٹر رانجھا کلینک جانے کے بجائے ماسی ہیر کے ساتھ اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر مشہود کی فیملی کو رخصت ہوئے دس منٹ ہی ہوئے تھے۔ مبارک باد والے بہت بڑے کیک کا تین چوتھائی حصہ کھالیا گیا تھا مگر ایک چوتھائی محفوظ تھا۔ کمرے میں ہڑبونگ کے بعد کا منظر تھا۔ بیڈ پر مبارک باد والا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر رانجھا کی نظر تو کیک پر جم گئی "واہ جی واہ۔ بڑی زوردار پارٹی چل رہی تھی یہاں تو۔"

ماسی ہیر نے کہا "یہ اسی جی آئی جی نے بھیجا ہے سب۔"

جواب دینے کے بجائے میں نے اخبار اس کے سامنے کردیا۔ ابھی وہ اپنی اور میری تصویر دیکھ ہی رہی تھی کہ میں نے صفحہ پلٹ دیا۔ اس پر میری میٹرک کے امتحان میں نمایاں کامیابی کی خبر تھی۔ ایک بار پھر کمرے میں طوفانِ بدتمیزی برپا ہوا۔ میں نے ماسی ہیر کو اٹھا کے گول گول گھمایا پھر یہی حرکت رئیس نے کی۔ رئیس نے مذاق میں بدتمیزی بھی کی۔ اس نے تھوڑی سی کریم ڈاکٹر رانجھا کے سر پر مل دی مگر اس نے برا نہیں مانا۔ پھر ماسی ہیر رونے لگی۔ دیکھنے میں آنکھ سے نکلنے والے سب آنسو ایک سے ہوتے ہیں۔ خوشی کے بھی اور غم کے بھی۔ ماسی ہیر بہت خوش تھی اس لیے رو رہی تھی مگر نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ ان میں کوئی چور آنسو دکھ کے احساس کا بھی ہو سکتا ہے۔ ہر خوشی میں کہیں غم کی کسک ضرور ہوتی ہے۔ کاش اماں بیٹے کا سہرا دیکھنے کے لیے زندہ ہوتیں۔ کاش ابا جو ساری عمر سائیکل نہ خرید سکے دیکھتے کہ بیٹے نے مرسیڈیز خریدلی ہے۔ کیا ماسی کو خیال تک نہ آیا ہوگا کہ کاش میں ماسی ہیر نہ ہوتی' ناصر کی ماں ہوتی۔ اور ڈاکٹر رانجھا نے بھی سوچا تو ہوگا کہ میرا جوان بیٹا ہوتا تو سب ایسے ہی ہوتا۔

خوشی فرسٹ اوریجن ہو سکتی ہے۔ ستراتی فیصد نسوانی ہو سکتی ہے مگر سو فیصد خوشی محض ایک تصور ہے۔

کچھ دیر بعد رئیس چلا گیا۔ وہ چنڈال چوکڑی کے سامنے اپنے یار کے کارناموں کا ڈھول پیٹنا چاہتا تھا۔ چاچا پتنگ باز کے ڈیرے پر قوالی اور لنگر کا خاصا شو منعقد کرانے کے چکر میں تھا۔ ڈاکٹر رانجھا بھی جلدی میں تھے۔ انہیں نئی عمارت کا قبضہ ملے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور آج باقی کام بھی ختم ہونے والا تھا۔ انہوں نے اوپر والے حصے میں رنگ روغن کرالیا تھا اور نیچے "ہیر جنرل اسپتال" کا نقشہ اپنی مرضی کے مطابق بنوانے کے لیے چاروں دکانوں کو ایک کردیا تھا۔ ایک ڈاکٹر رانجھے کے معائنے کا کمرا تھا۔ مردوں کے بیٹھنے کی جگہ الگ تھی۔ عورتوں کی الگ۔ آخری حصے میں دواخانہ تھا جس کے لیے سرکاری اسپتال سے ریٹائر ہونے والے ایک کمپاؤنڈر کو ملازم رکھا گیا تھا۔ وہ خود کو کسی ڈاکٹر سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ یہ سب باتیں مجھے ڈاکٹر رانجھا نے بتائی تھیں۔ اب آخری مرحلہ نقلِ مکانی کا تھا جس کے لیے صرف میری واپسی کا انتظار تھا۔

بڑا ڈاکٹر دوپہر کے وقت آتا تھا۔ اس کے آنے تک کمرا پھر صاف ہو گیا۔ ماسی ہیر اپنی منت کے مطابق چادر چڑھانے اور دیگ پہنچانے کے اخراجات کا حساب کرتی رہی اور مجھے یہ بھی سمجھاتی رہی کہ مجھے بی اے ایم اے کرکے ڈاکٹری کی طرف ضرور توجہ دینی چاہیے۔ ڈاکٹر رانجھا نے تو میٹرک بھی نہیں کیا تھا اور اتنا بڑا اسپتال اس کے بعد بھی تو کسی کو چلانا ہے۔ چنانچہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا چاہیے اور کام سیکھنا چاہیے۔ میرے شہر کا سب سے بڑا ڈاکٹر بننے کے امکانات بہت روشن ہیں۔

میں نے اس کی کسی بات کی تردید نہیں کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں نے اس کی ساری باتیں سنی ہی نہیں۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا مگر کسی سوچ کی کوئی واضح سمت نہیں تھی۔ یہ تو طے تھا کہ میں بی اے ایم اے کروں گا مگر یہ تو کوئی کام نہیں ہے۔ مجھے اور بھی کچھ کرنا ہوگا۔ کیا کرسکتا ہوں میں آخر؟ اب محنت مزدوری یا کلرکی کا تو سوال ہی نہیں۔ رکشا ٹیکسی میں خرید سکتا ہوں مگر چلا نہیں سکتا۔ میں بزنس کرسکتا ہوں۔ کیا بزنس؟ اگر پاسپورٹ بن جائے تو میں ہانگ کانگ' سنگاپور اور بنکاک کے چکر لگا سکتا ہوں۔ میرا کیا میرا بزنس۔ اسے کوئی اسمگلنگ کہتا ہے تو کہتا رہے۔ کہنے والے تو مسجد کے پیش امام کو بھی سب کچھ کہنے سے نہیں چوکتے اور پروا کون کرتا ہے..... کتے بھونکتے رہتے ہیں قافلہ چلتا رہتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ مجھے نیلم کے آنے کی امید تھی مگر اس کا انتظار نہیں تھا۔ یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ مجھے شادو کے آنے کا انتظار تھا مگر امید نہیں تھی۔ میں اس کے خیال کو بار بار ذہن سے جھٹک دیتا تھا مگر خلشِ انتظار کو جھٹکنا ناممکن تھا۔ وہ کیوں آئے گی آخر؟ وہ نہ آئے تو اچھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ آئے۔ میں اس کے خیال سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ایک ملازم ٹائپ وردی والا نوجوان پھولوں کا بہت بڑا گلدستہ لیے کھڑا تھا "مسٹر ناصر کھلیم!"

میں نے کہا "میں ہی ناصر کھلیم ہوں۔"

اس نے گلدستہ مجھے تھمایا "یہ آپ کے لیے ہے۔" وہ بولا اور رخصت ہو گیا۔ گلدستے پر پلاسٹک لپٹا ہوا تھا اور اس کی شفاف تہ کے نیچے ایک نام یوں جھلملا رہا تھا جیسے شفاف پانی والی جھیل پر دوپہر کی دھوپ اترے تو کسی کے کان سے گر کے کھو جانے والا آویزہ ریت کی تہ سے اپنی سنہری مسکراہٹ کے ساتھ بلانے لگے۔

اس نے لکھا تھا۔ "آنے والے دنوں میں ایسی ہزار کامیابیوں پر یقین کے ساتھ مبارکباد جو تمہاری ہیں' صرف تمہاری۔"

میں اس جملے کے سحر میں گرفتار کھڑا رہا۔ اس نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا اور یقین دلایا تھا کہ آج کے دن جیسے ہزاروں دن میری زندگی میں اور آئیں گے اور ایسی بہت سی کامیابیاں میری منتظر ہیں لیکن یہ کمال تھا لفظوں کے کھیل کا جو اس نے جانتے بوجھتے ادھورے چھوڑ دیے تھے۔ آخر میں اس نے صرف ایک لکیر رہنے دی تھی۔ وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا۔ اس کا نام تھا۔ میں اس کی تحریر پہچانتا تھا۔ اسے اپنا نام لکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ لکھتی تو میرا ردِعمل مختلف ہوتا۔ میں کہتا کہ جھوٹ ہے یہ۔ شادو کبھی میری نہ تھی مگر اس نے ایسا نہیں کہا تھا۔ آخری دو لفظ پہلے والے جملے کا حصہ بن گئے تھے مگر میں فرض کرسکتا تھا اور محسوس کرسکتا تھا۔ اس کی خواہش کرسکتا تھا کہ "صرف تمہاری" کے بعد وہ خود یہ بھی لکھتی کہ۔ شادو۔ اس نے میری آنکھوں کے خواب کو تعبیر نہیں دی تھی۔ ادھورا رکھا تھا۔

ماسی ہیر نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "کیا بات ہے؟ کس نے بھیجا ہے گلدستہ؟"

میں نے دل زدہ مایوس لہجے میں کہا "پتا نہیں۔ نام نہیں لکھا بھیجنے والے نے۔"

ماسی نے گلدستہ میرے ہاتھ سے چھین لیا "جھوٹ مت بول مجھ سے۔ میں اَن پڑھ ضرور ہوں مگر تیری آنکھوں میں پڑھ سکتی ہوں اس کا نام۔"

میں نے اس کے لہجے میں غصہ اور آنکھوں میں نفرت دیکھی پھر وہ تیزی سے پلٹ کے کھڑکی کی طرف گئی اور اس نے وہ گلدستہ کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے شادو آئی تھی' آنکھوں میں اشکِ ندامت۔ چہرے پر التجا اور لبوں پر حرفِ تمنا لے کر۔ تجدیدِ عہدِ وفا کے لیے اور ماسی نے اس کے سامنے میرے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ شادو کے چہرے پر تھوک دیا اور دروازہ بند کردیا۔

میں نے چیخ کے کہا "یہ کیا کیا تو نے سؤر کی بچی!"

اس نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی "ناصر' پاگل مت بن!"

"ہٹ میرے راستے سے ذلیل عورت" میں نے اسے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی اور گر گئی۔

میں کسی طوفانی بگولے کی طرح دروازے سے نکلا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوڑتا ہوا اسپتال کی سیڑھیوں سے اترا۔ اوپر آنے والی ایک نرس کے ہاتھ سے ٹرے گر گئی جس میں شاید دواؤں کی شیشیاں اور تھرمامیٹر وغیرہ تھے۔ ایک ڈاکٹر ٹائپ شخص نے رک کر مجھے حیرانی سے دیکھا۔ میں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر مختصر سے ہال کو عبور کیا اور گیٹ سے باہر نکل گیا۔ ایک گاڑی گیٹ سے اندر آ رہی تھی۔ ڈرائیور نے بریک نہ لگائے ہوتے تو میں اس سے ٹکرا جاتا۔

سڑک پر ٹریفک کے سیل رواں میں رکشا' موٹر سائیکل' کاریں' ویگنیں اور تانگے سب ہی شامل تھے۔ میں نے اس جگہ کو دیکھا جو میرے کمرے کی کھڑکی کے عین نیچے تھی لیکن پھول سڑک پر نہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ اتنی دیر میں گلدستے پر سے نہ جانے کتنی گاڑیوں کے پہیے گزر چکے ہوں گے اور کچلے ہوئے زخمی پھول وہاں کسی لاوارث بچے کی لاش کی طرح پڑے ہوں گے۔

مجھے زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں ملا۔ میں نے سفید وردی والے ایک ڈرائیور کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ گاڑی اسپتال کی طرف سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی پھر وہ گاڑی روانہ ہو گئی۔ وہ گاڑی مرحوم ہاشمی صاحب کی تھی۔ میں خود اس گاڑی میں شادو کے ساتھ گھوم چکا تھا۔

میں نے دور جاتی ہوئی کار کے پچھلے حصے میں سیاہ بالوں والے ایک سر کی جھلک سی دیکھی۔ اچانک میرے جذبات کا دھارا مخالف سمت میں پلٹ گیا۔ یوں جیسے آنکھیں بند کر کے دوڑنے والا شخص شیشے کی نظر نہ آنے والی دیوار سے ٹکرا کے واپس آئے۔ میں ایک دم ہوش میں آگیا اور میں نے اپنے دل میں شادو کے لیے بے پناہ و بے حساب نفرت محسوس کی۔

وہ چالاک اور عیار و مکار عورت میرے جذبات کے بارود میں چنگاری پھینک کر یہ دیکھنے آئی تھی کہ آج بھی اس کا نام میرے دل میں آتش شوق بھڑکاتا ہے یا نہیں۔ وہ نیچے اپنے سوال کے جواب کا انتظار کر رہی تھی حالانکہ سوال اس نے کیا ہی نہیں تھا۔ وہ آزمانا چاہتی تھی کہ کیا "صرف تمہاری۔۔۔" کا مطلب تھا آج بھی "صرف تمہاری شادو" لیتا ہوں۔ میں دیوانہ وار اس کے لیے آسکتا ہوں یا نہیں۔ اس کے لیے اتنا ہی پاگل ہوں یا نہیں۔

اگر وہ خود وہاں ملتی' اکیلی۔۔۔ خوف اور امید کے ساتھ راستہ تکتی ہوئی تو شاید بات کچھ اور ہوتی مگر سفید وردی والے ڈرائیور اور شاندار گاڑی کو دیکھ کے مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے بے وقوف بنایا تھا۔ اب میں تماشا بنا کھڑا تھا اور آتے جاتے لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے تمسخر اور تضحیک کے جذبات تھے اور پُر تحقیر ہنسی تھی۔ میں نے بچوں کو دیکھا تھا جو شرارت میں سوکے نوٹ کو راستے پر ڈال دیتے تھے اور جب کوئی راہ گیر اسے اٹھانے کے لیے لپکتا تھا تو وہ نظر نہ آنے والے دھاگے کو ایک دم کھینچ کے نوٹ اس کی دسترس سے دور کر دیتے تھے اور پھر خوب ہنستے تھے۔ خفت زدہ راہ گیر انہیں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ رسوا تو وہ اپنے لالچ کی وجہ سے ہوا تھا۔

اس وقت میری کیفیت اسی راہ گیر جیسی تھی اور مجھ پر ہنسنے والا سارا زمانہ تھا۔ کیسا دوڑتا ہوا آیا تھا سالے عشق کے مخبر۔ ہنساتا ہوا اپکا تھا کہ شادو نے پھر گھاس ڈالی ہے تو ساری چر جاؤں۔ اپنے عقل کے اندھے۔ لعنت تیری اس شکل پر جو تصویر میں نظر آ رہی ہے۔ ڈی آئی جی کے ساتھ۔ لعنت تیری ہمت مردانہ پر' لعنت تیرے اس ایک سو تیس کے آئی کیو پر جس نے تجھے پہلی پوزیشن دلا دی۔ وہ شادو نہیں مسز ہاشمی تھی۔ ایک لکھ پتی یا کروڑ پتی بیوہ۔ وہ کل ہی تجھے بے وقوف سمجھتی تھی اور آج بھی سمجھتی ہے۔

میں خود اپنی نظر سے گر کے لوٹا تو ماسی ہیر سوفے پر بت بنی بیٹھی رو رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے نکلتے جا رہے تھے۔ میں اس کے سامنے جا کے کھڑا ہو گیا تب بھی اس نے پلک نہیں جھپکائی۔

میں اس کے قدموں میں بیٹھ گیا "ماسی۔ مجھے معاف کر دو۔ میں پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے تمہارا دل دکھایا' بہت بدبخت بیٹا ہوں میں تمہارا۔"

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا "نہ تو بدبخت ہے اور نہ بیٹا ہے میرا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم میری ماں نہیں ہو؟"

"نہیں۔ تیری ماں کی جگہ ہوں میں' ماں نہیں ہوں۔ جگہ خالی تھی' تو نے مجھے دے دی۔ جیسے وہ گھر خالی تھا۔ تو نے رہنے کو دے دیا ترس کھا کے۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کہو" میں نے کہا۔

"اچھا کیا احساس دلایا تو نے کہ تو بیٹے کی جگہ ہے۔ بیٹا نہیں ہے۔ جیسے گھر سے نکال سکتا تھا' ایسے ہی دل سے بھی نکال سکتا ہے۔ اس گشتی شادو نے برباد کر دیا تجھے۔ ذلیل کیا کتے کی طرح اور اس کی خاطر تو نے مجھے گالیاں دیں۔ دھکے دیے۔ تیری ماں ہوتی تو ایسا کر سکتا تھا تو؟ میں نے کون سی برائی کی تھی تیرے ساتھ۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں نے اس کے پاؤں کی جوتی ماسی ہیر کے ہاتھ میں پکڑ کے سر جھکا دیا "مجھے میرے سر پر مارو۔ اسی قابل ہوں میں۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی بہت کوشش کی لیکن میں نے جوتی اسے ہی تھما کے اپنے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی تھی "چل دفع ہو۔ ڈراما مت کر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "اچھا۔ یہ ڈراما ہے؟ میں دکھاتا ہوں ابھی تجھے ڈراما کر کے۔ تو نے معاف نہ کیا مجھے تو میں اس کھڑکی سے باہر کود جاؤں گا۔"

میں تیزی سے آگے بڑھا اور کھڑکی پر چڑھ گیا۔ میرا ارادہ ہرگز باہر کود کے اپنی ٹانگ تڑوانے کا نہیں تھا۔ فرسٹ فلور سے کودنے والے کے مرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ یہ ڈراما کامیاب ہو گا۔ ماسی مجھے معاف کرنے میں نخرے کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی میں اور کچھ دیر اسے منکاؤں۔ اس کے سامنے ہاتھ جوڑوں۔ اس کی منت سماجت کروں اور معافی مانگوں۔ مجھے معاف نہ کرنا اس کے اختیار کی بات ہی کہاں تھی مگر وہ اپنے غصے کا بھرپور اظہار کرنے کا حق بہرحال رکھتی تھی۔

جان دینے کی دھمکی میں ماسی کے لیے لیت و لعل کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اس نے ایک دلدوز چیخ ماری اور میری طرف لپکی۔ ایک دو ہتڑ مار کے اس نے مجھے کھڑکی سے واپس کمرے میں گرا دیا "مت تنگ کر مجھے حرامی! مت جلا میری جان۔" وہ مجھے گلے لگا کے رونے لگی۔

میں نے مسکرا کے کہا "اچھا پھر کہو کہ تم ناراض نہیں ہو مجھ سے۔ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے "ارے پاگلا۔ میں بڑی مجبور ہوں۔ میری مجبوری کو سمجھ لے۔ اس مجبوری سے فائدہ مت اٹھا۔"

اسی وقت بڑا ڈاکٹر اندر آگیا۔ اس کے ساتھ ایک ماتحت ڈاکٹر تھا اور ایک نرس تھی "کیا حال ہے مسٹر ناصر!"

میں نے کہا "یہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔"

وہ ہنسا "مجھے معلوم ہے تم بھاگنا چاہتے ہو یہاں سے لیکن ابھی رونق رہی یہاں کچھ تمہارے دم سے۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ جانا چاہو تو جا سکتے ہو۔ رکنا چاہو تو ہمارے مہمان۔"

میں نے کہا "اور میرا بل۔"

"تو بل پلیز۔ سب تمہارے کارنامے کا اعتراف کر رہے ہیں تو ہم اتنا بھی نہ کریں۔ آج تمہاری وجہ سے ہمارے اسپتال کا ذکر بھی آیا اخباروں میں۔ ڈی آئی جی صاحب آئے۔ شکر گزار تو ہمیں ہونا چاہیے تمہارا۔"

سب وقت کی بات ہے۔ میں نے دل میں سوچا۔ ورنہ جب میں بشیر چوہدری کے ساتھ آیا تھا تو مجھے اسپتال والوں نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ میرے زخموں پر اسپرٹ بھی لگا دیں۔ لباس' صورت اور حلیے سے میں اس اسپتال میں علاج کرانے والے طبقۂ خواص کا نمائندہ نہیں لگتا تھا۔ میں غریب آدمی نظر آتا تھا اور جو غریب نظر آتا ہو اسے اندر کا نہیں باہر کا راستہ دکھانا چاہیے جو سرکاری اسپتال جاتا ہے۔

رخصت ہونے سے پہلے میں بشیر چوہدری کو دیکھنے گیا۔ وہ ایک وی آئی پی روم میں تھا جہاں اسے گھر کی ہر سہولت میسر تھی۔ وہ سیدھا بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا اور کسی انشورنس کمپنی والے سے بات کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ گاڑی کا حادثاتی بیمہ کرنے والی کمپنی کا سویئر ایک لاکھ کا نقصان دکھائے۔

"سرجی' گاڑی کو تو کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ پانی میں گرنے سے ذرا گندی ہو گئی ہے۔ سوس کرا دیں گے۔"

"اوئے یار۔ سوس کیا' میں خود نہیں کرا سکتا۔ دراصل مجھے اپنی دوسری گاڑی کا تھوڑا سا کام کرانا ہے۔ میری گھر والی نے ٹکریں مار مار کے اس کا حشر نشر کر دیا ہے۔"

"پھر تھوڑا سا کام کہاں ہوا سرجی!"

"اس لیے تو کہہ رہا ہوں پچاس ہزار سے کام نہیں بنے گا۔ یار گاڑی نہر میں گری تھی۔ تم رپورٹ دو کہ پل پر سے گری تھی۔ باقی بات میں خود کر لوں گا گیراج والوں سے کہو مل میری گاڑی کا بنائیں۔ کام میری دوسری گاڑی کا کریں۔ ان کو پیسے سے غرض ہے اور تمہاری جیب سے تو کچھ نہیں جا رہا ہے پھر تم کو کیا تکلیف ہے۔ تم اپنا فائدہ دیکھو یار' کمپنی کو دفع کرو۔ دس ہزار تم بھی کما سکتے ہو۔"

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ "اچھا چوہدری صاحب۔ آپ کا کام ہے۔ کرنا ہی پڑے گا۔ کوئی اور ہوتا تو صاف انکار کر دیتا میں۔ ایمان کی بات ہے سرجی' میں ایسے معاملے میں نہیں پڑتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ بڑے ایمان دار اور فرض شناس ہو تم میری طرح" بشیر چوہدری نے ہنس کے کہا اور ہاتھ ملا کے اسے رخصت کر دیا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ مجھے تو چھٹی مل گئی۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"چنگی بھلی ہے طبیعت لیکن ڈاکٹر نہیں مانتے۔"

میں نے کہا "آپ کی وسیم سے بات ہوئی۔ اس نے کچھ بتایا ہے آپ کو۔ میں نے کہا تھا چوہدری صاحب سے کچھ مت چھپانا ورنہ مارے جاؤ گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس ـــ نے تو کچھ نہیں بتایا۔ تم بتاؤ" اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں نے اسے مختصر الفاظ میں سب بتادیا۔ سوائے اس کے کہ میں نے وسیم کے اٹھائیس ہزار ڈالر ضبط کرلیے ہیں لیکن یہ ضرور بتادیا کہ اس نے اپنا پرانا مکان مجھ سے واپس خرید لیا ہے اور دو چار دن میں یہ مکان اس کے نام کرنے کی قانونی کارروائی بھی پوری ہوجائے گی۔

"ابھی تو میں نے اس کو گھر سے باہر نہیں جانے دینا اور کوئی ہوتا تو بند کرا دیتا حوالات میں یا جیل بھیج دیتا لیکن بہن کا معاملہ ہے۔ سوچ رہا ہوں کہ ان کو کہیں سیرو تفریح کے بہانے یہاں سے دور بھیج دوں۔"

میں نے کہا "یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ میرا تو اس کے معاملات سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس معاملے میں خواہ مخواہ میں بھی ملوث ہوا مگر آسکدہ کے لیے میں نہیں چاہتا کہ کبھی اس کے ساتھ میرا نام آئے۔"

"میں سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" بشیر چوہدری نے کہا۔ "اول تو ایسی کوئی بات ہوگی نہیں۔ ہو تو میرے پاس آجانا۔ مجھے فون پر بتادینا۔"

اسپتال کے ایک وارڈ بوائے نے اندر جھانک کے مجھے دیکھا۔ "آپ یہاں ہیں۔ آپ کا فون تھا۔"

فون ڈیوٹی روم میں تھا۔ میں بشیر چوہدری سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوا اور ڈیوٹی روم میں الگ رکھے ہوئے ریسیور کو اٹھالیا "ہیلو" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا "تم ناصر بول رہے ہو۔"

"جی!" میں نے اجنبی آواز پر غور کیا۔

"بھئی پہلے تو حال سناؤ اپنا۔ ہر طرف سے صحیح سالم ٹھیک ٹھاک ہو نا" وہ بولی۔

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"تو پھر ابھی مبارک باد لو میری طرف سے۔ میں بہت سخت مصروف ہوں رات تک۔ ورنہ خود آتی۔ رات کو موقع ملا تو ـــ دوسری ملاقات بھی اسپتال میں ہوگی تم سے۔"

میں نے کہا "جی میں تو گھر جارہا ہوں۔ چھٹی ہوگئی میری۔"

"اچھا تو پھر ـــ دیکھو ـــ میں آؤں گی گھر۔"

میں نے کہا "آپ؟ ہیں کون؟"

وہ ہنسی "ـــ اب پوچھ رہے ہو؟ بھئی میں نیلم ہوں۔ پہلے تو کوئی فلم ہی نہیں دیکھی تھی تم نے۔"

میں نے کہا "ابھی تک نہیں دیکھی۔ آپ کو دیکھ لیا کافی ہے۔"

وہ پھر ہنسی "کیا مطلب نکالوں آخر میں تمہاری بات کا؟ یعنی دوبارہ میری صورت نہیں دیکھنا چاہتے۔ بھئی اتنی بُری صورت تو نہیں ہے میری۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا ـــ میں خوش قسمت تھا کہ آپ کو اسکرین پر دیکھنے والے تو ترستے ہیں آپ کی ایک جھلک کے لیے اور جو آپ کو جانتا ہی نہیں تھا اس کو یہ اعزاز حاصل ہوا۔"

"چلو اب رہنے دو۔ باتیں مت بناؤ۔ اصل میں مجھے ایک کام تھا تم سے۔"

میں نے کہا "مجھ سے؟ میں کس قابل ہوں؟"

"یہ بعد میں بتاؤں گی کہ کس قابل ہو تم۔ ویسے کتنے قابل ہو' یہ آج میں نے اخبار میں بھی پڑھ لیا ہے۔ میں خود آتی مگر میرا شیڈول کچھ ایسا ہے۔"

میں نے کہا "اگر آپ دو چار دن بعد آئیں تو میں وہاں نہیں ملوں گا۔ میں تو گھر بھی بدل رہا ہوں۔"

"اچھا؟ تو تم آجاؤ کسی وقت۔ مجھے فون کرلینا پہلے۔"

میں نے کہا "آپ کا فون نمبر ـــ ویسے تو خیر سارا شہر بتادے گا' آپ کا پتا بھی۔"

"نہیں۔ میں پتا نہیں کس وقت کس اسٹوڈیو میں شفٹ پر جانا پڑجائے۔ تم موبائل فون کا نمبر لکھ لو۔ یہ میں ہر مہینے بدل دیتی ہوں۔ ورنہ لوگ معلوم کرلیتے ہیں کہیں نہ کہیں سے اور پریشان کرتے ہیں وقت بے وقت۔"

مجھے نیلم کے فون کا انتظار نہیں تھا۔ نہ یہ امید تھی کہ وہ میرا حال پوچھنے خود بھی آسکتی ہے۔ وہ اتنی بڑی اور معروف اسٹار تھی کہ جادوئی طور پر ملنے والے کسی ناصر عظیم کو یاد نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ حادثہ بھی ایسا تھا جس میں وہ خود ملوث ہوگئی تھی ورنہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ اس کی بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ آخر اسے مجھ سے کیا کام ہوسکتا ہے۔

گھر پہنچ کے میں نے ماسی کو بتایا تو اس کا دایاں چہرہ پھڑکنے لگا اٹھا "ہائے" اس کو کہنا تھا کہ ہیر بہت یاد کرتی ہے تجھے۔"

میں نے کہا "بلاوجہ اس سے جھوٹ بولتا۔"

"لے جھوٹ کیا ہے اس میں۔ کل رات ہی اس کا ذکر کیا تھا میں نے۔ مجھے تو بڑی چنگی لگی وہ کڑی۔"

میں نے کہا "ماسی۔ صرف صورت پر تو زمانہ مرتا ہے اس کی۔ اصل چیز ہوتی ہے سیرت۔ شریف زادیاں نہیں

پڑتیں ان دھندوں میں۔ لوگ اچھا نہیں سمجھتے انہیں۔"

ماسی بگڑ گئی "لوگوں کی تو رہنے دے۔ لوگ بخشتے ہیں بھلا کسی کو؟ لوگوں نے تو ولیا پر بھی تہمت لگائی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "ماسی۔ تمہیں پتا ہے وہ کیا کرتی ہے؟ وہ فلموں میں کام کرتی ہے۔ ناچتی گاتی ہے۔"

ماسی کی فراخ دلی اور روشن خیالی نے مجھے حیران کردیا "پھر کیا ہوا؟ اپنا اپنا کام ہے۔ اور کام کوئی چھوٹا بڑا یا اچھا برا نہیں ہوتا۔ اچھی نہ ہوتی وہ تو تیرا اتنا خیال کرتی۔ اس گلی محلے میں قدم رکھتی؟ اور دیکھ' بھولی نہیں وہ تجھے۔"

میں نے بات ختم کرنے کے لیے کہا "اسے کام پڑا تو یاد آئی۔ میں ذرا جارہا ہوں۔"

وہ شور کرنے لگی۔ "کہاں جارہا ہے؟ اسپتال سے آیا نہیں کہ پھر موجھ گئی آوارہ گردی کی۔ خبردار۔ لیٹ جا آرام سے۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اِدھر اُدھر نہیں جارہا ہوں میں۔"

"اِدھر ادھر کچھ نہیں" اس نے دروازے کی کنڈی لگا کے تالا ڈال دیا "باہر گیا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

کچھ دیر بعد مجھے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ میں نے دیوار پر چڑھ کے اسے آواز دی "ماسی' میں جارہا ہوں۔"

وہ جھنجلاتی ہوئی کچن سے نکلی "ہائے میں مرگئی" اس نے مجھے دیوار پر سوار دیکھ کے سینے پر ہاتھ رکھے "اوپر کیوں چڑھا ہے۔ ٹانگ ٹوٹ جائے گی۔"

"ٹانگیں تم ویسے بھی توڑنا چاہتی تھیں" میں نے قہقہہ مارا اور گلی میں کود گیا۔ ماسی نے یقیناً بڑی افراتفری میں چابی تلاش کی ہوگی اور تالا کھول کے دیکھا بھی ہوگا مگر اس وقت تک میں غائب ہوچکا تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ میں ڈاکٹر رانجھا کی طرف جاکے نئے گھر اور کلینک کا معائنہ کروں مگر پھر یہ ارادہ بدل گیا۔ میں اپنی امتحان میں کامیابی سے بہت خوش تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رئیس نے بڑے فخر کے ساتھ چنڈال چوکڑی کو میری کامیابی کے بارے میں بھی بتایا ہوگا اور میرے کارنامے کے متعلق بھی۔ شاید وہ ڈی آئی جی کے ساتھ میری تصویر والا اخبار ساتھ لیے پھر رہا ہوگا۔

پیر صاحب کی درگاہ پر پہنچنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ وہاں نہ سبز جھنڈے لہرا رہے تھے اور نہ مرید اور نہ پیر کے عقیدت مندوں کا میلہ نظر آرہا تھا۔ چاچا پتنگ باز کا ڈراما ختم ہوگیا تھا اور پیر صاحب کا ڈیرا ہی غائب تھا۔ اس کی جگہ بلڈوز کیے ملبے کا ایک ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ اس اندوہناک سانحے سے جذباتی طور پر متاثر ہونے والے کچھ احمق دور کھڑے ساری کارروائی کو قرب قیامت کی نشانیوں سے تعبیر کرتے نظر آتے تھے۔ ملبے کے قریب ایک چارپائی پر اندیشۂ نقص امن کے پیش نظر پولیس کی مسلح نفری موجود تھی مگر ان کی مستعدی کا یہ عالم تھا کہ ان کی دقیانوسی رائفلیں ایک چارپائی کے سہارے کھڑی تھیں اور وہ ایک اسٹول سامنے رکھے کچھ کھانے میں مگن تھے۔ انہیں اطمینان تھا کہ کارروائی انہدام تعمیرات غیر قانونی برائے قابضین براملاک سرکار" کے دوران میں نے "رخنہ اندازی کی جرات نہیں کی تو اب کس کا ڈر۔

خاموش تماشائیوں میں سب پیر صاحب سے عقیدت رکھنے والے نہیں تھے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خوش تھے کہ ایک ڈبا پیر کا بروقت خانہ خراب ہوا ورنہ اس کے قدم جم جاتے تو پھر وہ پاؤں ہر طرف پھیلاتا اور اسے ہٹانا مشکل ہوجاتا۔

ایک ریٹائرڈ پہلوان نے جو اب ماضی کا فسانۂ عبرت ہوگئے تھے' اعلان کیا "اوئے گھہ نئیں جے رہنا ایناں ظالماں دا۔ اللہ والیاں نوں ناں نئیں کردے۔"

ایک بندے نے اس سے اختلاف کیا "خاک اللہ والے۔ اوئے سارے فراڈیے تھے۔ راتوں رات جگہ پکڑ کے بیٹھ گئے۔ یہ تو کیکر ہوتے ہیں کیکر۔ فوراً اکھاڑو تو ٹھیک ہے ورنہ پھیل جاتے ہیں۔"

میں نے ایک خاموش تماشائی سے کہا "یہ کارروائی کس کی شکایت پر ہوئی۔"

اس نے کہا "ظاہر ہے زمین کے مالک نے ناجائز قبضے کے خلاف ایک درخواست لگائی۔ فوجی بندہ تھا' کوئی میجر ہے۔"

میں نے کہا "اور وہ جو پیر تھا۔ کیا وہ پکڑا گیا؟"

"سب پکڑے گئے۔ آٹھ دس بندے۔"

دوسروں کی مجھے فکر نہیں تھی۔ صرف رئیس کا خیال تھا کہ گرفتار ہونے والوں میں کہیں وہ تو شامل نہیں ہے۔ باقی کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ سب دو چار دن میں ٹک مکا کرکے نکل آئیں گے۔ چاچا پتنگ باز بڑی کائیاں چیز تھا اور اس کے گرگے بھی کسی سے کم نہ تھے۔

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ گرفتار شدگان کی کس تھانے کی حوالات میں خاطر تواضع کا انتظام کیا گیا ہے۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں سیدھا جائے واردات پر موجود پولیس والوں سے رجوع کروں اور خود تھانے جاکے رئیس کو چھڑا لاؤں۔ دوسرا طریقہ بشیر چوہدری کے اثر رسوخ کو استعمال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کا تھا لیکن میں نے پہلے خود کوشش کرنے کو ترجیح دی۔

میں سیدھا پولیس والوں کی طرف گیا تو وہ چونکے ہوئے اور انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر رائفلیں پکڑلیں۔ میں بے خوفی سے آگے بڑھتا گیا۔ قریب جاکے میں نے ان کے "افسر اعلیٰ" ایک حوالدار سے پوچھا "یہاں سے کتنے لوگ پکڑے گئے ہیں اور انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟"

میرے اعتماد سے وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوا "کیوں۔ تو کیوں پوچھ رہا ہے بھئی کیا اخبار والا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے اپنا ایک بندہ چھڑانا ہے۔"

حوالدار کو یہ بات پسند نہیں آئی "اچھا۔ یعنی تو بھی انہی کا ساتھی ہے۔ کون ہے تیرا بندہ اور تو چھڑائے گا کیسے؟"

میں نے کہا "چلو تم مجھے گرفتار کرکے اسی تھانے پہنچادو۔ یہاں فون نہیں ہے' تھانے میں تو ہوگا۔"

حوالدار معنی خیز انداز میں مسکرایا "ڈی آئی جی صاحب سے بات کرے گا؟"

"ہاں۔" میں نے اخبار ان کے سامنے کردیا "ناصر عظیم ہے میرا نام۔ یہ آج کا اخبار ہے اور اس میں میری تصویر ان کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ کل شام وہ مجھ سے ملنے اسپتال آئے تھے۔"

حوالدار نے بے یقینی سے اخبار لیا۔ ایک دم چار سر اس پر جھک گئے۔ تصویر بہت صاف اور واضح تھی۔ حوالدار پر تو جیسے سکتہ سا طاری ہوگیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مجھ سے اس طرح مصافحہ کیا جیسے عقیدت مند پیر صاحب سے ملتے تھے "بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کے۔"

باری باری ماتحت نفری نے بھی میرا ہاتھ تھاما۔ اگر افسر اعلیٰ میرے ہاتھ چومتا تو وہ بھی چومتے پھر افسر اعلیٰ نے مجھے مطلع کیا کہ جائے وقوعہ سے بیس افراد حراست میں لیے گئے تھے۔ ان میں ایک پیر صاحب تھے۔ باقی کے ساتھ انہیں بھی ہتھکڑی لگا کے تھانہ باغبانپورہ لے جایا گیا ہے۔ انہیں کسی کا نام معلوم نہیں تھا۔ وہ وہاں مجسٹریٹ کے حکم سے بیٹھے تھے کہ کوئی ہنگامہ نہ ہو اور دوبارہ کوئی جگہ پر قابض ہونے کی کوشش نہ کرے۔

باغبانپورہ کے تھانے پہنچتے ہوئے مجھے شام ہوگئی۔ وہاں حوالات میں چنڈال چوکڑی کے تمام معزز احباب بڑے مزے سے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے پیر صاحب کا روحانیات پر صوفیانہ درس سن رہے تھے' ان کے خشوع و خضوع اور چاچا پتنگ باز کی درویشانہ بے نیازی اور قناعت کا انداز دیکھ کے مجھے ہنسی بھی آئی اور حیرت بھی ہوئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس وقت بھی درگاہ میں بیٹھے ہیں۔ پولیس حوالات میں ہوں یا حالاتِ معرفت میں' انہیں فرق نہیں پڑتا۔

چاچا پتنگ باز زبردست ایکٹر اور حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ سارے زمانے کو چکر دینے والا اور دنیا کا ہر اچھا برا کام کرنے والا یہ بوڑھا اپنی ہمت اور ذہانت میں ان جوانوں کے کان کترتا تھا جو اس کی بکواس سن رہے تھے اسی لیے وہ ان کا لیڈر بنا ہوا تھا کہ باقی اس جیسے چالاک نہیں تھے۔

چند منٹ میں حوالات کے باہر کھڑا چاچا پتنگ باز کے اخلاقی تعلیمات اور ارشاداتِ عالیہ پر مبنی درس سنتا رہا مگر اس نے نظر اٹھا کے مجھے نہیں دیکھا یا دیکھا بھی تو نظر انداز کردیا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ میں ان سب کے لیے خیر سگالی کے جذبات رکھتا ہوں اور باہر رہ کے ان کی گلوخلاصی کا ثواب حاصل کرنے کے لیے بہت کچھ کرسکتا ہوں۔ مجھ سے اپنائیت کا اظہار مجھے اندر مدعو کرنے کے مترادف ہوتا۔ جانی جن' رئیس' چیرا بلیڈ اور بولی سب آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے اور بار بار "سبحان اللہ" "حق ہو" کا نعرہ لگاتے تھے۔ یہ سب چاچا کی ہدایت کاری کا کمال تھا کہ دیگر لوگ جو درگاہ پر موجودگی کے جرم عقیدت میں پکڑے گئے تھے' متفکر ہونے کے باوجود خاموشی سے درس سن رہے تھے اور خود تھانے کی دہشت ناک اور آسیب زدہ محسوس ہونے والی فضا میں ایک پُرتقدس روحانی ماحول پیدا ہوگیا تھا۔ پولیس کا جو سنتری حوالات کے باہر پہرے پر مامور تھا وہ بھی اس فضا سے متاثر نظر آتا تھا اور تھانے کا عملہ جو عام طور پر نووارد روں کا استقبال بڑے جوش و خروش کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں منفرد گالیوں سے اور جوتا کاری سے کرتا ہے۔ ان کو اللہ کے خاص بندوں والا پروٹوکول دے رہا تھا۔ عام طور پر وہ معمولی تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں اور ان کی سوچ بھی انقلابی نہیں ہوتی چنانچہ پیری فقیری کے معاملے میں وہ بھی عام لوگوں کی طرح لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔

افسرانِ بالا کے حکم کی تعمیل میں تھانے کا عملہ اس کارروائی پر مجبور تھا مگر خوش نہیں تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ درگاہ پر اچانک حملے کے وقت چاچا پتنگ باز نے بڑی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے نہ مدافعت کی تھی اور نہ فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس نے سب کو روک دیا تھا "کوئی نہ ہلے اپنی جگہ سے۔ یہ دنیا دار لوگ ہیں۔ ان کو یہ جگہ چاہیے۔ جگہ دے دو۔ بالآخر سب کے لیے وہی جگہ ہے۔ ہم اللہ کی زمین پر اس کی مرضی سے رہیں گے۔ وہ جہاں چاہے

رکھے۔"

اس کی جلالی تقریر نے پولیس کے جارحانہ رویے کی راہ میں دیوار کھڑی کردی تھی اور وہ رک کا مؤدبانہ انداز میں یہ درخواست کرنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ باہر مجسٹریٹ کے ساتھ زمین کا مالک میجر موجود ہے اس لیے وہ مجبور ہیں کہ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں اور کسی گستاخی کے مرتکب ہونا نہیں چاہتے۔ یہ بات سن کے چاچا اٹھ کھڑا ہوا تھا "چلو رب کے حقیر بندو۔ اس جگہ سے آب ودانہ اٹھ گیا۔ اوپر والے کا حکم ہے ہجرت کا۔ ہجرت پیارے نبی کی سنت ہے۔ سب چھوڑدو کیونکہ ساتھ کچھ نہیں جانا۔ سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔"

پلاٹ کے مالک نے بڑا شور مچایا کہ سب ڈرامے باز ہیں۔ پبلک کو بے وقوف بناتے ہیں۔ جوتے پڑنے چاہئیں ایسے لوگوں کے سب کے سامنے مگر خود مجسٹریٹ کا خیال تھا کہ ایسی بے ادبی سے محض اشتعال پھیلے گا۔ جو کام گڑ سے ہوجائے وہاں زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ کہ چاچا "اللہ ہو۔ اللہ ہو" کرتا نکلا اور اس کے پیچھے باقی سب نکل آئے۔ چاچا کہتا تھا "اللہ ہو" تو باقی لوگ بولتے تھے "اللہ ہی اللہ" وہ اسی طرح قلندرانہ شان سے پولیس ٹرک میں سوار ہوئے اور اب حوالات میں بھی پیری مریدی کا ڈراما بڑی کامیابی سے جاری تھا۔

چنڈال چوکڑی کے ساتھ پکڑے جانے والوں کے علاوہ وہاں پہلے سے کچھ مجرم بند تھے۔ چوری چکاری اور دیگر چھوٹے موٹے الزامات میں پکڑے جانے والے۔ اس درس سے وہ بھی مستفید ہو رہے تھے۔ رئیس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور مجھے آنکھ ماری۔ اس کا مطلب واضح طور پر یہی تھا کہ میں اس سے بے تکلفی کا اظہار نہ کروں۔

حالات دیکھ کر میری بھی تشویش رفع ہوگئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ زمین پر قبضہ مل جانے کے بعد مالک بھی مزید قانونی کارروائی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہے گا چنانچہ وہ سب باعزت طور پر مک مکا کرکے نکل آئیں گے مگر رئیس کے معاملے میں تاخیر مجھے گوارا نہ تھی اور میں کوئی رسک بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیا پتا ایس ایچ او کس مزاج کا آدمی ہو۔ رات کو وہ سب سے انگلوانے پر تل جائے کہ بتاؤ یہ پیری مریدی کا دھندا کب سے کررہے ہو؟ کتنا مال کھینچا ہے پبلک کا۔ کس کس کی بیوی کو صاحب اولاد کیا ہے اب تک اور جن بھوت اتارنے کے بہانے کس کس کی عزت اتاری ہے۔ پرانے ایس ایچ او بڑے گھاگ اور قیافہ شناس ہوتے ہیں۔ اصلی نقلی کا فرق ان کی نظر سے چھپا نہیں رہ سکتا۔

میں نے معلوم کیا تو وہاں اس وقت ایک سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے بتایا کہ انچارج صاحب تو گشت پر ہیں۔ یہ جواب بالکل متوقع تھا چنانچہ میں نے دوسرا سوال کیا کہ کیا وہ موبائل میں ہیں اور اگر ایسا ہے تو ان سے وائرلیس پر بات ہوسکتی ہے؟

سب انسپکٹر نے مجھے گھورا "تم کون ہو اوئے۔ پہلے مجھ سے بات کرو۔"

میں نے کہا "حوالات میں تم نے میرے بھائی کو بلاوجہ بند کر رکھا ہے۔ اس لیے تم اس کو چھوڑدو۔"

وہ غصے میں غرانے لگا "ورنہ کیا کرے گا تو۔؟"

میں نے اخبار اس کے سامنے پھیلادیا "میں ابھی اور اسی وقت ڈی آئی جی صاحب سے بات کروں گا۔"

اس نے پہلے تصویر دیکھی پھر میری صورت۔ اس کے بعد خبر پڑھ کے وہ سوچ میں پڑگیا "قانونی کارروائی کے بغیر کسی کو چھوڑا نہیں جاسکتا۔"

میں نے کہا "ابھی تو کچا اندراج بھی نہیں ہوا۔ میں باقی سب کی بات نہیں کرتا۔ بس رئیس کو چھوڑدو۔ میرے بھائی کو۔"

"اس کا فیصلہ انچارج صاحب کریں گے۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

میں اخبار سمیٹ کر کھڑا ہوگیا "ٹھیک ہے۔ ڈی آئی جی صاحب نے مجھے آج تعریفی سند دینے کے لیے بلایا تھا۔ میں وہیں جارہا ہوں۔ ویسے تو بشیر چوہدری سے تم خود بھی بات کرسکتے ہو۔ وہ تصدیق کریں گے۔"

سب انسپکٹر نے سمجھ لیا کہ اس معاملے میں مک مکا کا فارمولا نہیں چلے گا۔ اس نے فوراً اپنا رویہ بدل لیا "اچھا یار' بلاتا ہوں تمہارے بھائی کو۔ ناراضگی کی اس میں کون سی بات ہے۔ ہوتا ہے کبھی ایسا بھی کہ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں۔"

میں نے کہا "گھن کو صحیح سالم میرے حوالے کردو۔ گیہوں پیستے رہو۔"

دس منٹ بعد میں رئیس کو ساتھ لے کر تھانے سے نکل آیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرا شکر گزار ہوگا مگر وہ خفا ہونے لگا "یار کیا پریشانی تھی تجھے ایسی۔ میرا خیال تھا کہ تو بات سمجھ جائے گا۔"

میں نے کہا "تو خوش نہیں ہے باہر آکے؟"

"بات خوشی کی نہیں۔ سب کے ساتھ میں بھی نکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتا۔ یا تو سب کے لیے کوشش کرتا ورنہ چھوڑ دیتا مجھے بھی۔"

"اچھا تو جا کے پھر اندر بیٹھ جا۔" میں نے بگڑ کے کہا "بیٹا رات کو تیرا نمبر کے جوتے سے چھترول ہوتی ہے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "ابے نہیں۔ صبح تک سب معاملہ طے ہو جاتا۔ ایک رات کی تو بات تھی۔ آخر وہ بھی اپنے یار ہیں پرانے۔ جیسے تو ہے۔ اب تیری خاطر میں انہیں چھوڑ دوں۔ بڑی غلط بات ہے۔"

میں نے کہا "رئیس۔ وہ آدمی اثر رسوخ والا ہے۔ اگر اس نے کیس سی آئی اے والوں کے سپرد کرا دیا تو چاچا کی چالاکی دھری رہ جائے گی۔ کک مکا نہیں چلے گا پھر۔"

لیکن اس دن جب میں نے رئیس کو حوالات سے نکالا تو وہ اس بات پر خفا تھا کہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت۔ یہ اس کا جذباتی اندازِ فکر تھا جس سے مجھے بھی کوفت ہوئی۔

میں نے کہا "یار! اب اپنی طرف سے تو اچھا ہی کیا تھا میں نے۔ میرے لیے سب کو رہا کرانا ممکن نہیں تھا۔"

"ایک رات میں بھی گزار لیتا یاروں کے ساتھ حوالات میں تو کون سا مر جاتا۔" وہ بولا "وہ کیا کہیں گے۔"

میں نے کہا "ابے جو کہیں گے مجھے کہیں گے نا۔"

"نہیں۔۔۔ وہ سمجھیں گے کہ میں نے صرف اپنے لیے کوشش کی۔ کسی طرح تجھے پیغام بھجوا دیا اور تو آ گیا مجھے چھڑانے۔"

میں نے کہا "چل یار صبح باقی لوگوں کے لیے بھی کوشش کریں گے۔ ابھی میں نے نہ بشیر چوہدری سے بات کی اور نہ۔۔۔ ڈی آئی جی سے۔"

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ڈی آئی جی سے بات کرے گا تو؟ بڑا طرم خاں کا سالا ہے نا۔"

میں نے کہا "ابے اس نے خود کہا تھا مجھ سے کہ مجھے بہادری کی سند دی جائے گی۔"

"پتا نہیں کون سی دنیا میں رہتا ہے تو" رئیس بولا "ابے اخبار والوں کے سامنے ایسے ہی کہہ دیتے ہیں سب۔ یہاں کا تو۔۔۔ بابا آدم ہی نرالا ہے۔ وزیرِ اعظم اور صدر جیسے لوگ سرِعام کسی کو انعام میں پلاٹ دیتے ہیں۔ کوئی انسپکٹر پولیس مارا جائے تو اس کی بہادری پر بیوہ کو نقد رقم اور کسی بیٹے کو ملازمت دینے کا اعلان کر دیتے ہیں۔ پبلک میں واہ واہ ہو گئی۔ بعد میں وہ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "دیکھ لیں گے صبح یار!"

رئیس نے تلخی سے کہا "گھر یا دفتر جا کے دیکھ۔ کوئی تجھے ملنے بھی نہیں دے گا اس سے اور اگر غلطی سے کہیں تو اس کے سامنے آ گیا تو بیٹا شرط لگا لے مجھ سے۔ وہ تجھے پہچانے گا بھی نہیں۔"

میں نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے کہا "یار، شرط لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ سمجھ لے تو شرط جیت گیا اور میں تجھے لے جا رہا ہوں ڈنر کے لیے۔ بول کہاں چلیں۔"

وہ کچھ نرم پڑا "یار دعوت تو زبردست ہونی چاہیے سب کی۔ فرسٹ آیا ہے تو۔"

میں سمجھ گیا کہ سب سے اس کی مراد کیا ہے "دعوت بھی ہو گی۔ کل ہم زمین آسمان ایک کر دیں گے۔ بشیر چوہدری سے بھی کہیں گے اور جائیں گے ضرور ڈی آئی جی کے پاس۔ کیا پتا یار، یہ ویسا آدمی نہ ہو جیسا تو سمجھ رہا ہے۔ چٹکی بجاتے ہی ہمارا کام ہو جائے۔"

اس نے سہلایا "پھر تو یار اپنی بھی عزت رہ جائے گی۔ میں کہہ دوں گا کہ آخر میں ناصر کے ساتھ کیوں گیا تھا۔ اسی لیے کہ اسے پکڑ کے اپنے ساتھ لے جاؤں، سفارش کرانے۔ چل آج چرغا ہو جائے کہیں۔ کسی شاندار ہوٹل میں۔"

"یار رئیس۔ شادو آئی تھی" میں نے کھانے کے دوران کہا۔

وہ اچھل پڑا "ابے نہیں؟ مذاق کر رہا ہے تو۔؟"

میں نے کہا "وہ آئی تھی مگر مسز ہاشمی بن کے۔ شوفر کے ساتھ کار میں گلدستہ لے کر۔ گلدستہ اس نے اوپر بھیج دیا۔ وہ ذاتی ملازم تھا کوئی۔۔۔ جو اُس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ میں سمجھا ہوٹل والوں کا ملازم ہے۔ وہ خود نہیں آئی اوپر مجھ سے۔ ملنے۔"

"پھر تجھے کیسے معلوم ہوا؟"

ماسی نے غصے میں گلدستہ نیچے سڑک پر پھینک دیا تھا۔ مجھے آگیا کیش بلاوجہ۔ میں نے ماسی ہیر کو برا بھلا کہا۔ گالیاں دیں اور دوڑا نیچے گلدستہ اٹھانے مگر نیچے پہنچا تو اس کا شوفر سڑک پر گرنے والا گلدستہ اٹھا چکا تھا۔ وہ میری طرف پلٹ کر دیکھے بغیر گاڑی میں روانہ ہو گئی۔

رئیس سوچ میں پڑ گیا۔ "لیکن یار، وہ نیچے کیوں کھڑی رہی اتنی دیر تک؟ گاڑی میں بیٹھ کے کس کا انتظار کر رہی تھی۔"

"یہی دیکھنا چاہتی ہو گی وہ۔ کہ میرا ردِ عمل کیا ہوتا ہے۔ اگر میں سمجھ لیتا کہ گلدستہ لانے والا اسی کے ساتھ آیا ہے تو

میں خود دوڑتا ہوا اس سے ملنے جاتا۔ وردی سے دھوکا ہوا مجھے۔"

"تیرے دماغ پر ابھی تک اس کا بھوت سوار ہے اُلّو کے پٹھے۔ اتنا ذلیل ہو کے بھی عقل نہیں آئی تجھے" رئیس بگڑ گیا۔

میں نے کہا "عقل؟ یہی تو سارا رونا ہے رئیس۔ یہ معاملہ ہے دل کا۔ عقل ماری جاتی ہے بندے کی۔"

"میں تو کہتا ہوں بہت اچھا ہوا اس کے ساتھ۔ بالکل ٹھیک کیا ماسی نے کہ گلدستہ پھینک دیا۔"

میں نے کہا "اس کو انتظار ہو گا میرا۔"

"یہ بھی خوش فہمی ہے تیری۔ کوئی اسپتال جائے بیمار کو دیکھنے۔۔۔ تو گلدستہ بھیج کے خود باہر انتظار کرتا ہے بھلا کہ ابھی بیمار خود اس سے ملنے آئے گا؟ نہیں نہیں، اسے اوپر آنا ہی نہیں تھا۔"

رئیس کی بات مجھے دلیل کے اعتبار سے ٹھیک لگی "جب گلدستہ سڑک پر گرا ہو گا تو وہ سمجھی ہو گی کہ خود میں نے پھینک دیا۔ نفرت اور غصے کا اظہار کرنے کے لیے۔ غصہ مجھے بھی بہت آیا جب بیگم صاحبہ نے ڈرائیور سے کہا کہ گلدستہ اٹھاؤ اور چلو۔ وہ مسز ہاشمی تھی رئیس۔ شادو ہوتی تو خود نہ آ جاتی اوپر اور وہ ایسے آئی کہ کسی کو پتا بھی نہ چلتا، اکیلی آئی۔"

"قسم اللہ کی اپنا تو دل خوش ہو گیا۔ منہ پر جوتے کی طرح پڑا ہو گا اپنا ہی گلدستہ۔ جیسے اوپر تھوکا ہوا اپنے ہی منہ پر آتا ہے۔" رئیس نے کہا "اور پیارے، تو بھی سمجھ لے۔ وہ بڈھا مر گیا مگر اس کی بیوہ مسز ہاشمی ہی رہے گی جب تک کہ دوسرا خصم نہیں کر لیتی۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ٹھیک کہہ رہا ہے تو یار!"

"ایسے آہیں مت بھر جیسے تیرے دل میں حسرت ہے دوسرا خصم بننے کی۔ ویسے تو کسی بیوہ سے شادی کر لینا ثواب کی بات ہے اور وہ کون بادشاہ تھا ولایت کا جس نے لات ماردی تھی تخت و تاج کو۔ ایک بیوہ کے چکر میں۔"

میں نے کہا "ایڈورڈ ہشتم۔ یہ جو ملکہ ہے نا۔ اس کا تایا تھا۔ منحنی سمپسن سے شادی نہیں کر سکتا تھا وہ کیونکہ وہ عام عورت تھی۔ شاہی خاندان کی نہیں تھی۔ ایڈورڈ ہشتم نے بادشاہت چھوڑ دی تھی پھر ملکہ الزبتھ کا باپ جارج پنجم تخت پر بیٹھا تھا۔"

"یار ساری تاریخ مت پڑھا مجھے۔ یہ پنجم اور ہشتم کیسے کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "پانچواں اور آٹھواں۔"

"کیا سالوں کو اور کوئی نام ہی نہیں ملتا یا ضروری ہے یہ بھی کہ بادشاہ دو میں سے ایک نام رکھ لے ورنہ چھٹی کرے۔ ایڈورڈ جارج؟" رئیس ہنس پڑا۔

"ماسی ہیر سخت ناراض ہو گئی تھی مجھ سے" میں نے کہا۔

"ناراض ہونے کی بات ہے۔ کہاں وہ فقیر کی ناجائز اولاد، فاحشہ محبت کا مالک کہاں ہیر سے ساتھ۔ شادی رچائی اس رئیس بڈھے سے۔۔۔ اس کا ماسی ہیر سے کیا مقابلہ۔ اپنی بیوی بھی ہو پیارے تو سالی پاؤں کی جوتی ہوتی ہے اور ماں کے پاؤں کے نیچے تو ہوتی ہے جنت۔ تو نے معافی مانگی اس کے پاؤں پکڑ کے یا نہیں؟"

"مانگ لی تھی اسی وقت یار لیکن اس کی ایک بات کانٹے کی طرح میرے دل میں چبھ گئی کہ میں بیٹے کی طرح ہوں۔ اسے ماں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں بیٹا نہیں ہوں اور وہ ماں نہیں ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ رشتہ حقیقی نہیں ہے۔ یہ احساس ہوا اسے میرے رویے سے۔"

"اس احساس کو ختم کرنا تیرا کام ہے۔ کیوں ہوا آخر یہ احساس اسے۔ جتنا اس نے کیا، تو نے بھی اس سے زیادہ ہی کیا تھا ان کے لیے۔ قسم اللہ کی اپنی اولاد ناخلف ہو تو بڑھاپے میں ماں باپ دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ تو نے تو ان کو اپنا سب کچھ دے دیا۔"

میں نے کہا "وہ سب اپنی جگہ مگر جذبات کا رشتہ ہوتا ہے آئینے کی طرح۔ اس میں بال آ جائے تو پھر کچھ نہیں رہتا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا "کیسے کھیل ہیں تقدیر کے یار۔ اپن سالے دنیا میں ماں باپ کے بغیر ہی آ گئے۔ اب ڈھونڈتے پھرتے ہیں ماں باپ کو۔ کوئی بازار میں ملنے والی چیز ہے یہ بھی؟ اور اپنے ماں باپ ہمیں کون دے سکتا ہے۔ دوسری طرف ماسی ہیر اور رانجھا جیسے ترستے ہیں اولاد کو مگر مجبور ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں یار۔ رشتے خون کے نہ ہوں تو پھر مصنوعی رہتے ہیں ہمیشہ۔ خواہ ساری عمر ایک چھت کے نیچے گزر جائے۔ چل چھوڑ، ایسے خوشی کے موقع پر یہ دل جلانے والی باتیں کیوں کریں، ایک اور خبر ہے جس پر تو پھڑا چھلے گا۔"

وہ اچھلا اور آرام سے بیٹھ گیا "چل اب سنا دے۔"

"نیلم نے بلایا ہے مجھے، فون کیا تھا۔"

اس کا منہ کھلا رہ گیا "ابے نہیں؟ قسم کھا۔؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اسے مجھ سے کوئی کام ہے۔ کیا کام ہو سکتا ہے آخر؟" میں نے کہا "کہہ رہی تھی کہ فرصت نہیں ورنہ اسپتال آتی یا گھر۔ اپنا فون نمبر بھی دیا ہے۔ پرائیویٹ والا۔ کھانا مت چھوڑ سالے۔ منہ بند کر۔"

وہ جھینپ کر پھر کھانے لگا۔ "کیا فون نمبر ہے یار، مجھے بتا۔"

"کیوں؟ اس نے مجھے ہر ایک کو بتانے کے لیے نہیں دیا ہے۔"

رئیس نے دکھی لہجے میں کہا "بے۔ اب ہم ہر ایک ہو گئے؟ قسم اللہ کی پیار نے۔ بس ایک بار بات کروں گا اس سے۔ صرف ایک منٹ۔"

"کیا کہے گا ایک منٹ میں؟" میں نے ہنس کے کہا "شادی کرنے کے لیے۔"

"نہیں یار۔ اپنے پاس کیا ہے کہنے کو؟ اور ایک منٹ تو بہت ہوتا ہے۔ وہ ایک سیکنڈ میں فون بند کر دے گی" وہ بولا "کہہ دیں گے تم پر مرتے ہیں۔"

میں نے اسے تسلی دی "جب میں جاؤں گا تو میرے ساتھ چلنا۔"

اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے کسی غریب آدمی کی ایک لاکھ کا... پرائز بانڈ کا انعام ملنے کی خبر سن کے ہوتی ہے۔ اس کا چہرہ فرطِ جذبات سے اور خوشی سے دمکنے لگا "سچ کہہ رہا ہے؟ یا بے وقوف بنا رہا ہے یاروں کو؟"

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا "وعدہ کر رہا ہوں تجھ سے یار۔ اکیلا نہیں جاؤں گا۔"

رئیس کا بے چین دل شاید سینے میں لوٹن کبوتر ہو گیا تھا "ابے کب جائے گا تو۔ کیا خیال ہے کل چلیں۔؟"

میں نے کہا "کل تو ناممکن ہے۔ شفٹ کرنا ہے۔ ماسی ہیر منت پوری کرنے داتا صاحب کے دربار ضرور جائے گی۔ ہیر جنرل اسپتال کا افتتاح بھی ہو گا۔"

"اپنے یاروں کے لیے بھی کچھ کرنا ہے" اس نے مجھے یاد دلایا۔

حسبِ توقع ماسی نے میرا استقبال پیار بھری گالیوں سے کیا اور رئیس کو میرے ساتھ دیکھ کے ایک قصیدہ اس کی شان میں بھی پڑھا "مجھے پتا تھا کہ دیوار ٹپ کے یہ اس منحوس شکل والے کے پاس گیا ہو گا۔ گھر میں پاؤں نہیں ٹکتا ایک دن بھی۔"

رئیس نے کہا "کیا کرے گھر میں رہ کے۔ ہر وقت مداری کی ڈگڈگی کی طرح بجتی رہتی ہو تم۔"

رانجھا بہت ہنسا "اڑے ڈگڈگی؟ پھنا ڈھول کہتے ہوئے ڈرتا ہے؟"

ماسی نے چمٹا کھینچ کے مارا "حرامی۔ ڈگڈگی بولتا ہے مجھے؟ میں شرافت سے بات کرتی ہوں تو کہتا ہے بجتی ہو۔"

رئیس نے چمٹا کیچ کر لیا اور اسے بجا کے ناچنے لگا۔ "او ماسی ہیر بنی ڈگڈگی۔ رانجھا بنا مداری۔ میں بندر نا صر بندر۔ ہوئے بلے بلے۔"

اب میں نے اس کا ساتھ دیا "کیا بولے بندر ماسی۔ سن بندر کی فریاد۔ بلے بلے۔"

رئیس نے جھٹنی کے اسٹائل میں کہا "کہاں ہے میری بندریا۔ ہوئے۔"

میں نے گا کے کہا "بندریا لا دے ماسی۔ ہوئے بلے۔"

رانجھا تو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گیا پھر ماسی بھی کھلکھلا کے ہنسی اور چلانے لگی "اچھا اچھا۔ سن لیا میں نے۔ آجائے گی بندریا بھی۔"

رئیس نے اسے چمٹا پیش کیا "قسم اللہ کی ماسی پھر جو گھر سے قدم بھی نکالے وہ کافر۔ جیسے رانجھا تیرے گوڑے سے لگا بیٹھا رہتا تھا چوبیس گھنٹے۔"

ماسی نے اسے چمٹا رسید کیا "یہ کس نے بتایا تجھے بے شرم؟"

رئیس نے چلا کے کہا "ہائے۔ اب مجھے بے شرم کہہ رہی ہو، خود ہی بتایا تھا۔"

صبح سے شفٹنگ کا مرحلہ شروع ہوا۔ ماسی نے مختصر سا سامان باندھا اور ایک ریڑھے پر رکھ دیا۔ دروازے کو قفل لگاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جذبات کی نمی آ گئی "یاد ہے رانجھے۔ ہم کس حال میں آئے تھے یہاں؟ کیسے فٹ پاتھ پر بیٹھے تھے۔ ہمارا گھر کوئی نہیں رہا تھا۔"

رانجھے نے ٹوپی ہٹا کے سر پر سے پسینہ صاف کیا۔ "ہزار شکر ہے اس مالک کا کہ آج خود اپنی مرضی سے یہ گھر چھوڑ کے جا رہے ہیں۔ کسی کے نکالنے سے نہیں اور عزت کی جگہ جا رہے ہیں۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

میں نے کہا "ابھی دیکھتی جاؤ ماسی۔ ایک دن تم ڈیفنس کی کوٹھی میں جاؤ گی۔ چار کنال رقبہ ہو گا اس کا۔ دو کنال کا باغ ہو گا۔"

وہ جیسے ڈر گئی "نا پتر۔ بس یہی بہت ہے ہمیں۔ اتنے اونچے خواب دیکھنے سے لالچ پیدا ہوتا ہے دل میں اور لالچ سے بڑی خرابی آتی ہے۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "نیک بخت۔ ترقی کی خواہش کرنا کوئی گناہ نہیں۔ فرق پڑتا ہے خواہش کے لیے جائز اور ناجائز راستہ اختیار کرنے سے۔"

"رہنے دے رانجھے۔ سب پتا ہے مجھے۔ آج کل حق حلال کی کمائی سے کون کھڑے کر سکتا ہے محل۔ میں تو کہتی ہوں کہ چھوڑ یہ ڈاکٹری کا فراڈ۔ کوئی اور کام کر۔ یہ بڑا غلط کام ہے جو تو کر رہا ہے۔"

رانجھا سخت جز بز ہوا۔ "کیسی بے وقوف عورت ہے۔ اللہ نے شفا دی ہے میرے ہاتھ میں۔ ڈاکٹری چھوڑ کے جوتے گانٹھوں؟ گدھے چراؤں؟"

"نا۔ تو ڈاکٹر ہے؟ کدھر سے پڑھی ہے تو نے ڈاکٹری؟"

"کتابوں سے۔ اور علم کتابوں سے ہی ملتا ہے۔ ڈگری تو کاغذ کا پرزہ ہوتی ہے۔ اب یہ شاعرِ مشرق تھے، تجھے کیا معلوم۔ کتنے مشہور ڈاکٹر تھے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ انہوں نے کون سا ایم بی بی ایس کیا تھا۔"

میں نے ان کی بحث بڑی مشکل سے ختم کی۔ رئیس سارے سامان کے ساتھ ریڑھے پر لد گیا تھا۔ ہم ٹیکسی کے انتظار میں تھے۔ مجھے اپنے پیچھے دیکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ناصر کی ماں کا لہو میرا دامن پکڑ رہا ہے کہ فرار ہو رہے ہو تم بھی؟ تمہارے انصاف اور انتقام کے سارے دعوے کیا ہوئے؟ اس گھر کے آنگن میں جو کبھی میرا اپنا تھا، آج بھی میرا ڈھانچا سیمنٹ کے فرش کے نیچے دبا ہوا ہے۔ وہیں جہاں اسے میرے قاتل نے گاڑا تھا۔ تم نے بڑا مایوس کیا ہے ناصر۔ میں نے تو سارے ثبوت فراہم کر دیے تھے تمہیں مگر تم نے میرے مدفن پر اسی قاتل کو اماں دے دی۔ میرا معاملہ یومِ حساب تک ٹال دیا۔

یہ سب میرے احساس کی خلش تھی ورنہ میں جانتا تھا کہ اس دنیا کے نظامِ انصاف میں میرا دعویٰ لاحاصل تھا۔ میری سچائی کے ثبوت بے نتیجہ تھے اور میرے پاس کوئی قابلِ قبول گواہی نہیں تھی۔ انصاف اور انتقام کی جنگ چھیڑ کے مجھے کچھ بھی حاصل نہ ہوتا۔

ایک اخبار والا میرے پاس سے آواز لگاتا گزرا۔ "جعلی پیر کی درگاہ پر چھاپا۔ سات افراد گرفتار۔" اس نے میرے خیالات کی رو توڑ دی۔ میں نے اخبار خرید لیا مگر اسی وقت ڈاکٹر رانجھا ایک ٹیکسی روکنے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے آگے بیٹھ کے اپنی دلچسپی کی خبر دیکھی۔

پولیس نے ساتویں رات کیس کی نوعیت ہی بدل ڈالی تھی۔ افسرانِ بالا کو مطمئن کرنے کے لیے پولیس نے اصل مجرم چاچا پتنگ باز کے خلاف دھوکے بازی، جعلسازی اور فراڈ کے الزام میں ایف آئی آر درج کی تھی اور سات افراد کے خلافِ امانت مجرمانہ کی۔ میں نے ان سب کے نام دیکھے۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ تھے۔ اخباری نمائندہ ان کی تصویریں حاصل کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ میرے لیے وہ سب اجنبی چہرے تھے۔ ان میں چنڈال چوکڑی کا ایک بھی رکن شامل نہیں تھا۔ پکڑے جانے والوں کے بارے میں بھی یہ بات یقینی تھی کہ وہ سب ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔

رئیس ہمارے انتظار میں ریڑھے کے قریب کھڑا سامان اتروا رہا تھا۔ اس وقت سامان ہی کتنا تھا۔ تین چارپائیاں۔ ایک میز دو کرسیاں اور کچھ برتن۔ ماسی کی سخت تاکید تھی کہ اس کے پہنچنے تک وہ گھر میں داخل نہ ہو۔ سے پہلے وہ قرآن ہاتھ میں لے کر اندر گئی۔ اس کے پیچھے رانجھا تھا۔ ماسی نے قرآن کو چوم کر ایک طاق پر رکھ دیا اور ایک طرف مصلی بچھا کے دو نفل شکرانے کے ادا کیے پھر وہ ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتی رہی۔ ہم مجبوراً خاموش کھڑے رہے۔

بالآخر ماسی نے سلام پھیر کے کہا "اب لے آؤ سامان۔"

ڈاکٹر رانجھا نے کہا "یہ سب پہلے آ کے کرنا تھا۔ وہ ریڑھے والا شور کر رہا ہے۔ پانچ روپے زیادہ دینے پڑیں گے اسے۔"

"ہائے، تو دے دینا" ماسی برا مان کے بولی "پانچ میری طرف سے بھی دینا کہ گھر جا کے بیوی بچوں کا منہ میٹھا کرائے۔ سب سے پہلے تو دی آیا ہے ہمارے نئے گھر۔"

جب ہم سامان اوپر پہنچا چکے تو میں نے کہا "ماسی۔ یہ سامان اس گھر کے لائق نہیں ہے۔ خواہ مخواہ اٹھا کے لائی تو یہ سارا کباڑا۔"

"پھر کیا کرتی، پھینک دیتی، آیا بڑا نواب صاحب۔"

میں نے کہا "میں ابھی لے کر آتا ہوں کچھ سامان۔ اس کے بعد پھینک دینا۔"

وہ مجھے روکتی ہی رہ گئی۔ میں اور رئیس نکل گئے۔ رئیس نے اخبار میرے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔ "کیا خبر آئی ہے اپنے یاروں کی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مبارک ہو، سب چھوٹ گئے سوائے چاچا کے۔"

اس نے مجھ سے لے کے اخبار پڑھا اور مسکرانے لگا "دیکھا۔ میں کہتا تھا نا۔ بس ایک رات کی بات ہے، صبح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں بھی نکل جاتا۔"

"چاچا بہت حرامی ہے۔ عقیدت مندوں کو پھنسادیا۔ اپنے سارے بندے نکلوادیے۔" میں نے کہا "پولیس نے بیس آدمی گھیرے تھے۔ سات پر کیس بنا ہے۔ تیرہ راتوں رات نکل گئے۔"

رئیس ہنسا "ابے ایسا ہی ہوتا ہے ہمیشہ۔ اس معاملے میں اوپر کے افسروں کا دباؤ تھا۔ پولیس نے کہا ہوگا کہ بس رات رات میں بندوبست رکھو۔ اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی۔ بڑے افسروں کے ریٹ بھی بڑے ہوتے ہیں۔ جس نے بے گناہی کی قیمت ادا کردی وہ بچ گیا۔"

رئیس کا کہنا درست تھا۔ یہ سارے معاملات افسرانِ بالا کو لاعلم رکھتے ہوئے چاچا پتنگ باز اور تھانے والوں کی پرانی "ورکنگ ریلیشن شپ" کی بنیاد پر طے پائے ہوں گے۔ جیرا بلیڈ یعنی تھانے دار محمد نذیر۔ بوبی اور جانی جن جیسے خاص بندے "تفتیش" کے بعد بے گناہ پکڑے جانے والوں میں شامل کیے گئے کہ یہ بے چارے تو جعلی پیر کے پاس مراد پانے اور نذرانہ دینے آتے تھے۔ پیر صاحب نے انہیں شناخت کرنے سے بھی انکار کردیا ہوگا کہ میں نے ان میں سے کسی کی صورت پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ مارے گئے سادہ لوح عقیدت مند جو اچانک پڑنے والے چھاپے کے وقت موجود تھے اور بھاگ بھی نہیں سکے۔ پولیس نے بالآخر سات افراد کی گرفتاری ظاہر کرکے کاغذی کارروائی پوری کی۔ مجھے یقین تھا کہ کچھ عرصے بعد ان سب کے کیس بھی قانون کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کے بعد سرد خانے میں چلے جائیں گے۔ وہ فوجی افسر جو پیچھے پڑگیا تھا کہ صرف اس کی زمین کا قبضہ واپس ملنا کافی نہیں۔ وہ جعلسازوں کو جیل پہنچا کے دم لے گا۔ وہ بھی بالآخر ٹھنڈا پڑجائے گا۔ معاملات کی سست رفتاری اس کا سارا جوش و خروش ختم کردے گی اور وہ سمجھ لے گا کہ وہ محض اپنا وقت ضائع کررہا ہے۔ کیس داخلِ دفتر ہوجائیں گے خود بخود۔ نہ مدعی نہ شہادت' حساب صاف ہوا۔

چاچا پتنگ باز کے لیے میرے جذبات بالکل مختلف تھے۔ میری دلی خواہش تھی کہ اسے سخت سے سخت سزا ہو۔ پولیس اس پر کوئی قتل کا کیس ڈال کے ساری عمر کے لیے اسے جیل میں ڈال دے یا پھانسی چڑھادے' میرے نزدیک اس کا جرم قتل سے زیادہ سنگین تھا۔ قتل بعض اوقات غیرت و حمیت کے جذبات کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی وقتی اشتعال کا اور اس وقت قاتل کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہتی۔

چاچا عقل سے سوچ سمجھ کے ہر کام کرتا تھا۔ خود ساری زندگی ایسے ہی غیر قانونی چکروں میں گزار دی۔ بال سفید ہوگئے۔ اب نوجوانوں کو غلط راستے پر چلنے سے روکنے کے بجائے الٹا وہ انہیں چکربازی سکھا رہا تھا اور سب کا گرو گھنٹال بنا ہوا تھا۔ ابھی وہ صرف ایک گروہ کا سرغنہ تھا۔ یہی بڑھ جائے تو مافیا کہلاتی ہے۔

میرے پاس نقد رقم نہیں تھی۔ بینک جاکے پیسہ نکلوانے کے بجائے میں نے ماسی کے پاس رکھوائے ہوئے ڈالر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دیکھے بغیر سارے نوٹ پوٹلی میں باندھ کے ڈال دیے تھے۔

اس نے مجھے دینے کے لیے نوٹ نکالے تو بڑی حیران تھی "ناصر' یہ کیسے نوٹ ہیں۔ نئے آئے ہیں کیا؟"

میں نے ایک نوٹ اٹھا کے کہا "ہاں۔ پتا ہے یہ کتنے کا نوٹ ہے' سولہ سترہ سو کا۔"

وہ سمجھی میں مذاق کررہا ہوں "سب سے بڑا نوٹ تو ہزار کا ہوسکتا ہے اور یہ سولہ سترہ سو بھلا کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا "ماسی۔ یہ ایک سپر پاور کی کرنسی ہے۔ بڑی طاقت ہے اس میں۔ آج سولہ سترہ سو کا ہے یہ نوٹ۔ کل پچاس ہزار کا بھی ہوسکتا ہے۔"

"چل پاگل مت بنا مجھے۔ منگا صرف سونا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "صرف تو نہیں۔ ہم سب پاگل ہیں ماسی۔ اس نوٹ کے پیچھے۔ یہ ڈالر کا نوٹ ہے۔ دنیا کی کسی قوم کو اس کے اصول اور ایمان سمیت خریدنے کے لیے یہی کرنسی کام آتی ہے مگر تو نہیں سمجھے گی یہ باتیں۔"

بازار میں مجھے ایک ڈالر کا بھاؤ ساڑھے اٹھارہ روپے لگا اور میں نے پانچ سو ڈالر کے بدلے نو ہزار دو سو پچاس روپے حاصل کرلیے۔ ڈالر خریدنے والا کرنسی کا دلال مجھے ایک طرف لے گیا۔ اس گلی میں لوگوں کی آمد و رفت بہت کم تھی مگر وہ پھر بھی محتاط تھا۔ اس نے ایک عام سے گھر کے دروازے پر دستک دی تو چند منٹ کے بعد کسی عورت نے دروازہ کھولا۔

رئیس کی اور میری آنکھیں اس عورت کو دیکھ کر چکاچوند ہوگئیں۔ وہ جوان اور حسین ہونے کے ساتھ بڑی گوری چٹی اور بھرپور بدن کی عورت تھی جس کے بارے میں یہ محاورہ کافی نہیں تھا کہ شباب کا جوبن پھٹا پڑرہا تھا۔ اس کا شباب جامے سے باہر ہورہا تھا اور اتنا باہر تھا کہ اندر کم تھا۔ عام عورت گھر میں اکیلی ہو اور جھاڑو برتن یا نہانے دھونے میں مصروف ہو تو کچھ بھی پہن لے مگر وہ ہرگز کسی کے لیے

برائے نام لباس میں دروازہ کھولنے نہیں آتی اور بالفرض محال وہ نیکر بنیان میں اپنے ذاتی شوہر کے لیے کنڈی کھول بھی دے تو ایسی بے تکلفی سے سامنے کھڑی نہیں رہتی۔ دلال نے خفگی سے کہا "چل ہٹ۔ اندر جا۔" تو وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دلال ہمیں ایک نیم تاریک کمرے میں لے گیا جو اس کے نزدیک "ڈرائنگ روم" تھا۔

رئیس اس پُراسرار ماحول میں ہونے والے سودے سے کچھ خائف نظر آرہا تھا مگر خاتونِ خانہ کو دیکھتے ہی اس کا "چشم ما روشن دل ماشاد" والا حال ہوگیا تھا اور اس کی نظر آگے سے زیادہ پیچھے دیکھنے پر مجبور تھی۔

کرنسی ڈیلر نے کچھ خفت سے کہا "بیوی ہے میری۔ گھر میں ایسے ہی رہتی ہے۔"

رئیس نے کہا "ماشاءاللہ۔"

میں نے اسے ٹوکا دیا مگر مبینہ شوہر صاحب نے نہیں دیکھا۔ اس نے ایک الماری میں ڈالر رکھنے کے بعد مجھے ساڑھے نو ہزار روپے دیے۔ میں نے اسے ڈھائی سو۔

"اور بھی ہے کچھ؟" ڈیلر نے دلچسپی سے کہا۔

میں اچانک ایک چالاک آدمی بن گیا "ہے تو سہی لیکن اس دام پر نہیں ہے۔"

اس نے بڑی فیاضی دکھائی "چار آنے اوپر کرلو۔"

میں نے کہا "بیس پورے۔"

اس نے انکار کردیا "ابھی انیس سے اوپر کوئی دے تو لے لینا۔"

میں نے کہا "کچھ دن بعد سہی۔ انتخابات قریب ہیں۔ بھاؤ تو چڑھے گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ مقابلے پر اناڑی نہیں ہے۔ اس نے بیس کا بھاؤ قبول کرلیا۔ "کب لاؤ گے؟ میں تمہارا انتظار کروں یہاں؟"

میں نے کہا "انتظار مت کرنا۔ کیا پتا میرا ارادہ بدل جائے۔ میں دو چار مہینے ڈالر روک کے رکھوں۔ ضرورت مند اور بے وقوف بہت ہیں۔"

رئیس نے باہر آتے وقت پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں کہ وہ نیک بی بی اسے پھر اس شریفانہ لباس میں جلوہ نما نظر آجائے جس کے بارے میں کرنسی کے بروکر نے بڑی ڈھٹائی اور بے غیرتی سے جھوٹ بولا تھا کہ اس کی بیوی ہے۔ وہ صرف کرنسی کا نہیں اس عورت کے بدن کا بھی دلال تھا۔ عورت نائٹ شفٹ میں ڈیوٹی دینے والوں کی طرح دن میں آرام کررہی تھی۔

باہر آتے ہی رئیس کی رال ٹپک پڑی "ابے یار۔ کیا ایٹم بم عورت تھی۔"

"ابے ایک تو عورت نہیں طوائف تھی وہ۔ دوسرے گوشت اور چربی کتنی تھی اس پر۔ نزاکت تو نام کو نہیں تھی۔ باقاعدہ موٹی تھی۔"

"اپنی اپنی پسند ہے پیارے۔ کچھ لوگ روٹی کھاتے ہیں۔ کچھ ڈبل روٹی پسند کرتے ہیں۔ قسم اللہ کی اپنا تو دل سالا مرغِ مسلم کی طرح تڑپ رہا ہے۔"

"مرغِ بسمل کی طرح جاہل۔"

"ابے ہاں وہی۔ سمجھ لے لوٹن کبوتر ہورہا ہے ابھی تک۔ کل پھر آئیں گے ہم۔"

میں نے کہا "پاگل نہیں ہوں میں۔ اسے پتا کے آتا تو وہ پولیس کے ساتھ مل کے چھاپے کا انتظام کرلیتا۔ سارے ڈالر وہ آدھے آدھے بانٹ لیتے۔ ہم جان چھڑا کے شکر ادا کرتے۔ لینے والے بہت۔ کسی کو بھی دے دیں گے۔"

رئیس نے سوچ کے کہا "کل میں سو ڈالر خرید نے آؤں گا۔"

"دو ہزار کے دے گا بیٹا۔ تو مجھ سے کیوں نہیں لے لیتا۔"

وہ آنکھ مار کے ہنسا "تو سمجھتا کیوں نہیں پیارے پھر پرسوں میں سو ڈالر بیچنے آؤں گا۔ کیا ہے پانچ سو ہزار کا گھاٹا اس کی خاطر۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا "پانچ سو ہزار۔ ابے دو چار سو ہیں جیب میں تو ابھی چلا جا۔ کل کا انتظار کیوں کرتا ہے۔ کل رات وہ پتا نہیں کہاں تھی اور کل نہ جانے کہاں ہوگی۔ بیچ میں آج کا دن ہے۔ تیرا رعایتی سودا ہوجائے گا اور پیسہ اسی پر لٹانا ہے تو سب لے جا مجھ سے۔ مہینے کے خرچے پر داشتہ بنالے اسے اپنی۔ نام کا تو پہلے ہی رئیس تھا۔ سچ مچ کا رئیس بن کے دکھادے۔ اعمال سے بھی۔"

وہ شرم سے کھسیانا ہوگیا "ابے تو سیریس ہوگیا۔ اپن تو مذاق کررہے تھے پیارے۔ اب دیکھنے میں اچھی لگی ایک چیز تو کہہ دیا تھا ہے۔ برتنے کی نہیں ہے۔ یہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ چاہے مہینے کے حساب سے لو مگر ٹیکسی تو ٹیکسی ہی رہتی ہے۔ پرائیویٹ کار نہیں بن جاتی اپنی۔"

اس کی صفائی پیش کرنا ایسا ہی تھا جیسے گھر کا ملازم چوری کرتا پکڑا جائے تو فوراً کپڑا مار کے صفائی کرنے لگے اور نوٹ پیش کردے کہ یہ نیچے پڑے ہوئے ملے ہیں۔ میں نے اسے مزید شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر بعد میں وہ مجھے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتائے بغیر ہی ڈبل روٹی کھانے آجاتا تو مجھے کیا پتا چلتا۔

اگلے دو روز میں نے اور ماسی ہیر نے اوپر والے حصے کو واجبی طور پر فرنش کرنے میں صرف کیے۔ اس کے خیال میں وہ بھی میری فضول خرچی تھی کہ میں نے چارپائیوں کی جگہ بیڈ لگوا دیے تھے جن پر مولٹی فوم کے گدے تھے۔ پردوں کا آرڈر دے دیا تھا اور کمروں میں قالین بچھوا دیا تھا۔ اوپر ایک کمرا میری مرضی کا بیڈ روم بن گیا تھا۔ یہ ویسا شاہانہ بیڈ روم تو نہیں تھا جیسا مجھے ڈاکٹر مشہود کے گھر میں ملا ہوا تھا مگر اس میں میرے آرام کی ہر چیز تھی۔

ماسی ہیر تو خوشی سے پاگل ہوئی پھر رہی تھی۔ یہ زیادہ دن کی بات نہیں تھی جب وہ ایک تنگ گندی گلی میں ناجائز طور پر تعمیر کیے ہوئے پیکے تاریک ایک کمرے کے گھر میں رہتی تھی جہاں غلاظت گلی کے بیچ میں بہتی تھی۔ میں نے جب سے پہلی بار دیکھا تھا تو وہ اس نامعلوم حرامی کو اعلانیہ گالیاں دے رہی تھی جو اسے تنگ کرنے کے لیے ہر رات اس کے دروازے پر کھایا پیا نکال جاتا تھا۔ اوپر نین کی چھت والے کمرے کے ڈھانچے میں رئیس بطور کرایہ دار مقیم تھا۔

میرا اس گھر میں قدم رکھنا ان کی زندگی میں ایک ایسے انقلاب کا سبب بن گیا تھا جس کا وہ خواب بھی نہیں دیکھتی تھی۔ آج وہ اپنے بڑے ذاتی گھر کی مالک ہو گئی تھی جس کے نیچے چار دکانیں تھیں اور شہرت فروش رانجھا کا "ہیر جنرل اسپتال" قائم ہو چکا تھا۔

اس نے کئی بار مجھ سے کہا "مجھے یہ سب خواب جیسا لگتا ہے پتر۔ ڈر لگتا ہے کہ آنکھ کھلی تو پھر وہی جگہ ہوگی جہاں سے تو لے کر آیا تھا۔"

میں نے کہا "ماسی۔ اللہ ایسے ہی مہربان ہوتا ہے۔ اس نے مجھے بھی ایک گھر دے دیا۔ کل تک تو میں بھی یتیم خانے میں لاوارثوں کی طرح پل رہا تھا۔"

ماسی کو خوش دیکھ کے میری خوشی اور بڑھ جاتی تھی اور میں نے اس خوشی کو ایک کھیل بنا لیا تھا۔ ایک ایک کر کے میں اپنی چیزیں گھر میں لا رہا تھا۔ جن کے بارے میں ماسی خریدنے کا سوچتی بھی نہیں تھی۔ سب کچھ ہو گیا تو میں نے اسے ایک اور سرپرائز دیا۔ میں اکیلا گیا اور دو رنگین ٹی وی لے آیا۔ ایک ماسی ہیر کے کمرے کے لیے اور ایک چھوٹا اپنے لیے۔ جب ٹی وی لانے والا انسٹالیشن فٹ کر کے اور ٹی وی آن کر کے چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ ماسی ہیر کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی ٹی وی کی رنگین تصویر کو پلک جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی یہ خواب ہی نظر آ رہا تھا۔

اگلی صبح رئیس کے ساتھ میں چنڈال چوکڑی کے سرپرستِ اعلیٰ چاچا چنگ باز سے ملنے تھانے گیا تو وہ تھانے کے ایک کمرے میں بستر پر استراحت فرما رہے تھے۔ چند کانسٹیبل جن کی ڈیوٹی نہیں تھی اس کے سامنے مؤدب بیٹھے تھے اور چاچا انہیں اپنی روحانی علمیت اور صوفیانہ کلام سے متاثر کر چکا تھا۔ رئیس کے ساتھ مجھے بھی عقیدت کے اظہار کا ڈراما کرنا پڑا اور پیر صاحب نے میرے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھ کے دعا دی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیں اور رئیس سے رخصت کی اجازت لے کر تھانے سے نکل آیا۔ رئیس کا پروگرام آج چنڈال چوکڑی کے سب ارکان کو جمع کر کے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے ایک اجلاس منعقد کرنے کا تھا جس میں شرکت مجھے کسی صورت منظور نہ تھی۔

میں نے ماسی سے صبح باقی ڈالر بھی لے لیے تھے۔ میرا خیال تھا کہ سب کو کیش کرا کے اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں پھر میں نے بینک منیجر سے مشورہ کرنا بہتر سمجھا۔ وہ ڈاکٹر مشہود کا بھی دوست تھا اور انہی کے حوالے سے مجھے جانتا تھا۔

ساڑھے چھبیس ہزار ڈالر کا سن کے وہ حیران رہ گیا "اتنے ڈالر کہاں سے آئے تمہارے پاس؟"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے ڈاکا نہیں ڈالا۔"

"وہ تم ڈال بھی نہیں سکتے۔" وہ بولا "پھر بھی۔"

میں نے کہا "آپ یوں سمجھ لیں کہ میں نے اپنا مکان بیچا تھا۔ جس میں میری رہائش تھی۔ پارٹی نے پتا نہیں کیوں مجھے پاکستانی کرنسی نہیں دی۔ میں نے بھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اب پتا نہیں کہ ان کا کیا کروں۔"

"مجھے دکھاؤ۔ ڈالر اصلی تو نہیں تھما دیے ہیں کسی نے؟"

میں نے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیے "اس کا کوئی امکان تو نہیں مگر آپ دیکھ سکتے ہیں۔"

اس نے نوٹ دیکھ کر تصدیق کی "نوٹ اصلی ہیں۔ کسی اسمگلر نے خریدا ہے تمہارا گھر؟"

"ہو گا۔ مجھے معلوم نہیں۔"

"اسمگلر بھی بے وقوف بہرحال نہیں ہوتے۔ خیر تم ایسا کرو کہ فارن ایکس چینج اکاؤنٹ کھول لو۔" وہ بولا "بہت فائدے میں رہو گے۔ ڈالر کی قیمت خود بڑھتی رہتی ہے۔ سال بھر بعد پتا نہیں کیا ہو گا۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔ پانچ سو ڈالر کل بیچے تھے۔"

"بڑی غلطی کی تم نے۔ خیر، پیسہ اپنے اکاؤنٹ سے نکالو اور یہ اکاؤنٹ الگ کھولو۔ تمہارا اکاؤنٹ ڈاکٹر مشہود نے کھلوایا تھا اس لیے میں تمہارا ضامن بن سکتا ہوں۔" منیجر نے دراز میں سے فارم نکال کے میرے سامنے رکھ دیا "اور ابھی حالات ایسے ہیں کہ خود حکومت کوئی سوال جواب نہیں کرتی کہ ڈالر کہاں سے آئے۔ اس لیے فائدہ اٹھاؤ موقع سے۔"

آدھے گھنٹے بعد میں بینک سے باہر آیا تو میری خود اعتمادی کا گراف کچھ اور اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں بینک کا عام اکاؤنٹ ہولڈر نہیں رہا تھا۔ ایک اہم کلائنٹ بن گیا تھا۔ فارن کرنسی اکاؤنٹ ہولڈر۔ منیجر نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ "دیکھو ناصر۔ ویسے تو مجھے صرف ڈپازٹ چاہیے۔ پیسہ جہاں سے آئے۔ اگر بینک میں آتا ہے تو میری اچھی کارکردگی ثابت کرتا ہے۔ کالے سفید دھن اور حرام حلال کی کمائی سے مجھے کیا لیکن تم کو ایک نصیحت ہے میری۔ اگر تم سننا پسند کرو۔ آثار بتاتے ہیں کہ تم ترقی کرو گے۔ بہت ترقی کرو گے لیکن ذرا سنبھل کے چلو اور آہستہ چلو۔ SLOW AND STEADY شارٹ کٹ AVOID کرتے ہوئے، وِش یُو گڈ لک۔"

اس کی نظر میں میرے لیے رشک آمیز احترام تھا۔ شک نہیں تھا۔ اس نے مجھے وہ عزت نہیں دی تھی جو وہ کالا دھن جمع کرانے والے بڑے بڑے اکاؤنٹ ہولڈرز کو اپنے پیشہ ورانہ انداز میں دیتا تھا۔ اس نے مجھے بڑے بھائی جیسی شفقت سے ایک بات سمجھائی تھی۔

اب میری جیب میں پچاس ہزار روپے تھے جو میں نے بہت سوچ سمجھ کے ایک فیصلہ کرنے کے بعد نکلوائے تھے۔ ابھی تک میں نے جو خرچ کیا تھا، وہ ایک طرح سے ڈالروں کا منافع تھا۔ گھر کے ساز و سامان پر میرے تیس ہزار ہی اٹھے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اب ڈاکٹر رانجھا کی آمدنی میں اضافہ ہو گا تو وہ خود بھی اپنے معیارِ زندگی کے اخراجات پورے کر سکے گا۔ میں تمام عمر کے لیے ان کو اپنا محتاج رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

ماسی ہیر داتا صاحبؒ کے دربار پر چادر لے کر گئی ہوئی تھی کہ میں نے ڈاکٹر رانجھا کو کلینک سے اٹھا لیا۔ ابھی کلینک سیٹ ہو رہا تھا لیکن ڈاکٹر رانجھا وقت نکال کے مریضوں کو دیکھ لیتا تھا۔ دوپہر سے شام تک کا وقت فراغت کا ہوتا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا کا خیال تھا کہ اب وہ صبح دس بجے کھول کے دو بجے کلینک بند کر دے گا۔ کھانا کھا کے آرام کرے گا اور پھر شام پانچ بجے سے دس بجے تک بیٹھے گا۔

وہ کسی حیل و حجت کے بغیر میرے ساتھ چل پڑا۔ "خیر تو ہے۔ کل سارا دن اکیلے جا کے پتا نہیں کیا کچھ لے آئے۔ میں نے تو رات کو دیکھا۔"

"آج ایک چیز آپ کے ساتھ جا کے لینی ہے" میں نے کہا "آپ کی پسند سے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگا "تو یار۔ ہم نے تو اپنی پسند کی ہی ایک چیز تھی، وہ بہت پہلے لے لی تھی مگر میں سمجھ گیا۔"

میں نے کہا "آپ نہیں سمجھے۔ یا غلط سمجھے۔"

اس نے کہا "یار ناصر۔ اپنی سمجھ ایسی ہی ہے۔ آج تک سمجھ نہیں آئی ہمیں کہ۔۔۔ اتنا پیسہ کہاں سے لائے ہو تم۔"

"آپ کے خیال میں کیا کرتا ہوں میں؟"

وہ بولا "کچھ کرتے نظر نہیں آتے اس لیے تو یہ پوچھ رہا ہوں۔ اپنی ساری عمر گزر گئی جھک مارتے۔ سمجھ نہیں آئی کبھی کہ لوگوں کے پاس کہاں سے آجاتا ہے اتنا پیسہ۔ بس اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ قسمت کے کھیل ہیں سب۔"

میں نے کہا "بڑے پاپڑ بیلے ہیں میں نے بھی۔"

وہ ہنسنے لگا "اتنی چھوٹی سی عمر ہے تمہاری۔ بڑے پاپڑ کیسے بیلے۔ مجھے تو شک ہے کہ تم اپنی شناخت چھپاتے رہے۔ جیسا کہ فلموں میں ہوتا ہے۔ آخر میں پتا چلے گا کہ تم ہو کوئی راجکمار۔ کسی صنعت کار یا ارب پتی کے بیٹے۔ اچانک تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔ یا تمہارے گھر والے تلاش کر لیں گے تمہیں۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ یہ صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ میرا تو سارا ماضی ایک یتیم خانے میں محفوظ ہے۔ سب ہے میری یادداشت میں۔ ایک ایک دن کا ایک ایک لمحہ۔ دن تاریخ اور وقت سب پوچھ لو مجھ سے۔ یا رئیس سے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہتے ہو تم" وہ ٹوپی اٹھا کے سر کا پسینہ صاف کرنے لگا۔

"کیا آپ کے خیال میں کوئی غلط کام کرتا ہوں میں؟"

اس نے کہا "ہرگز نہیں۔ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ دنیا میں رہ کے ہم نے سب دیکھا ہے پتر۔ دنیا والوں کو بھی اور ان کے نسب بھی۔ خالی نبض نہیں دیکھی۔ شکل دیکھی، عقل دیکھی۔ دماغ کے ساتھ دل کا حال دیکھا۔ کردار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھا اور کرتوت دیکھے۔ جدھر رانجھا شہرت فروش کھڑا ہوتا تھا وہاں سے ایک زمانہ گزرتا تھا۔ رانجھا کی آنکھیں اب زمانے کو پہچانتی ہیں۔۔۔ اس لیے تو میں کچھ بولتا نہیں اور ہیر کو بھی منع نہیں کرتا۔ رئیس یہ سب کرتا۔۔۔ یا کوئی اور۔۔۔ تو میں ہاتھ جوڑ کے کہتا کہ میں ایسے ہی خوش ہوں۔ جس حال میں بھی ہوں۔ کچھ بھی قبول نہ کرتا اگر مجھے اعتماد نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "آپ کا اعتماد کبھی غلط ثابت نہیں ہوگا۔"

جب میں اسے معمولی کاروں کے ایک شوروم میں لے گیا تو وہ نروس ہوگیا "یہاں کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "ہم ایک گاڑی خریدیں گے۔"

وہ رسی تڑا کے بھاگنے لگا "گاڑی۔۔۔ نہیں ناصر۔۔۔ میری یہ اوقات نہیں۔"

میں نے کہا "تماشا مت کرو سب کے سامنے۔ ہم کوئی لاکھوں کی گاڑی نہیں لے رہے ہیں۔ بس اپنے گزارے لائق کوئی چھوٹی کار پسند کریں گے۔"

"اوجی چترجی! چھوٹی موٹی کار بھی سائیکل تو نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "نئی سوزوکی باون ہزار کی ہے۔ ہم تھوڑی پرانی لے لیں گے۔ چالیس بیالیس کی۔ ایک سال پرانی۔"

وہ گم صم کھڑا رہا "اچھا۔۔۔ تم دیکھو۔"

میں نے کہا "آپ پسند کرو۔ ماسی ہیر کے واپس آنے سے پہلے میں چاہتا ہوں کہ گاڑی گھر کے دروازے پر پہنچ جائے۔"

آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں اعتماد کی روشنی آنے لگی اور اس کا چہرہ ناقابلِ یقین خوشی کے احساس سے دمکنے لگا۔ وہ مجھ سے آگے ہو کے مختلف گاڑیوں کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہاں بہت سی پرانی گاڑیوں کے شوروم تھے اور ان میں ایسی گاڑیاں بھی تھیں جن کی قیمت پرانی ہونے کے باوجود لاکھوں میں تھی۔ رانجھا ان کے بارے میں پوچھتا تھا "بھئی اس کا کیا مول ہے؟" وہ کسی گاڑی پر پسندیدگی کے جذبات سے ہاتھ رکھ کے پوچھتا تھا اور سیلز مین قیمت بتاتا تو ایسے ہاتھ کھینچتا تھا جیسے غلطی سے گرم توے پر رکھ دیا تھا۔

وقت کم تھا۔ ایک گھنٹے میں ہم نے آٹھ دس گاڑیاں دیکھ لیں اور بالآخر انیس سو بیاسی ماڈل کی ایک سوزوکی کار پر ہمارا اتفاقِ رائے ہوگیا جو بالکل اور بجنل کنڈیشن میں تھی۔ یہ جاپان اسمبلڈ تھی اور ایک ہی مالک کے ہاتھ میں ایک سال چلی تھی۔ ڈیلر کے کہنے کے مطابق یہ اس کے گھر میں سیکنڈ کار تھی یعنی بڑی گاڑی نہیں ہوتی تھی تو بیوی یا بچی استعمال کرتی تھیں اور اس کے چالیس ہزار کلومیٹر جینوین تھے۔

میں نے کاغذات کے ڈیلوری لیٹر پر دستخط کیے اور گاڑی ڈرائیو کر کے سڑک پر آگیا۔ میں نے ڈاکٹر مشہود کی گاڑی بہت چلائی تھی لیکن۔۔۔ وہ سب ڈاکٹر رانجھا نے کہاں دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ میری پُراعتماد ڈرائیونگ پر دم بخود بیٹھا تھا۔ اس نے دوبار تعریفی انداز میں سر ہلا کے کہا "او یار! تم تو پہلے بھی گاڑی چلاتے رہے ہو۔ کمال ہوگیا یہ تو۔"

میں نے کہا "یہ کم خرچ گاڑی ہے۔ پٹرول بھی زیادہ نہیں کھاتی۔ آپ کے لیے اسے MAINTAIN کرنا مشکل نہیں ہوگا۔"

وہ سر ہلاتا رہا "اللہ کا بڑا فضل ہے۔ گزارا پہلے بھی ہو تھا مگر اب تم دیکھنا' یہاں میری پریکٹس کیسے چلتی ہے۔ چلے نہیں دوڑے گی۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ ایک بات کہوں اگر بُرا مانو۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم چترجی۔ برا آج تک کسی کی بات کا نہیں مانا۔ تمہاری ماسی ہیر ہر وقت بولتی رہتی ہے۔ تمہارے سامنے کہہ رہی تھی کہ یہ کام چھوڑ دو۔"

میں نے کہا "وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی۔"

اس کا چہرہ اتر گیا "تم بھی ایسا ہی سمجھتے ہو کہ میں۔۔۔ ابھی تک وہی ریڑھی پر شہرت بیچنے والا رانجھا ہوں۔ جو ایسے ہی دو چار جڑی بوٹیوں سے چھوٹے موٹے علاج کر لیتا تھا۔ وہ بھی بڑا علم تھا۔ ایک سائنس تھی چترجی۔ لوگ ایویں ٹھیک نہیں ہو جاتے تھے۔ میرے ایک پیرو مرشد تھے۔ اللہ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ مرتے وقت اپنا سب علم و فضل کا خزانہ اس ناچیز کو بخش گئے تھے۔ اس میں جدی پشتی تجربات کی ایک کتاب تھی۔ ہاتھ سے لکھی ہوئی۔"

میں نے کہا "گستاخی معاف۔ پیرو مرشد مرحوم کرتے کیا تھے؟ میرا مطلب ہے حکیم تھے کوئی؟"

وہ سوچ کے بولا "نہیں۔ باقاعدہ حکمت نہیں فرماتے تھے۔ فال نکالتے تھے۔ نجومی اور دست شناس تھے۔ لیکن خلقِ خدا کے لیے شفا تھی ان کے ہاتھ میں اور چترجی' تجربہ بڑی چیز ہے۔ ڈگری سے کیا ہوتا ہے۔ نقل کر کے بھی حاصل کر لیتے ہیں' آج کل کے ڈاکٹر۔ بے شک سب ایسا نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "وہ پانچ سال لگاتے ہیں میڈیکل کالج میں پھر انہیں اجازت ہوتی ہے کہ وہ مریضوں کا علاج کریں۔"

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا "اب تو میں نے بھی بہت کتابیں پڑھ لی ہیں۔ سب دواؤں کے بارے میں جانتا ہوں۔ بخار اور بلڈ پریشر دیکھ سکتا ہوں اور سینے کے اندر بلغم کی آواز بھی سن سکتا ہوں اس آلے سے۔ کیا کہتے ہیں اسے۔"

"اسٹیتھس کوپ!" میں نے مدد کی۔

"ہاں۔ اس کے علاوہ۔ خون اور پیشاب کی رپورٹیں دیکھ لیتا ہوں۔۔۔ ایکس رے دیکھنا بھی سیکھ رہا ہوں۔"

میں نے کہا "اس کے باوجود تم اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھتے ہو تو یہ جرم ہے۔ تم پکڑے جا سکتے ہو۔ لوگوں کی صحت اور زندگی سے کھیلنے کی اجازت نہیں ہے تمہیں۔ کسی دن غلطی سے تمہاری دوا سے کوئی مریض اللہ کو پیارا ہوگیا تو پھنس جاؤ گے تم۔"

اس نے مردہ آواز میں کہا "انسان فانی ہے۔ قضا آجائے تو بڑے بڑے اسپیشلسٹ ڈاکٹر فیل ہو جاتے ہیں۔"

"دیکھو ڈاکٹر رانجھا۔ میں تمہاری بھلائی کے لیے ایک مشورہ دے رہا ہوں۔ خدانخواستہ تم پر کیس بن گیا کوئی تو ادھر اسپتال بند ہو جائے گا ادھر تم بند ہو جاؤ گے۔ سات سال کے لیے۔ ہیر کیا کرے گی پھر؟ میری مانو تو اپنے ساتھ کسی ڈاکٹر کو رکھ لو۔ ایک سند یافتہ ڈاکٹر کو اپنا پارٹنر بنا لو یا ملازم رکھ لو اگر چاہو۔ تین ہزار روپے ماہانہ میں مل جائے گا۔"

اس نے ٹوپی اٹھا کے سر کا پسینہ صاف کیا "بات تو لاکھ روپے کی کی ہے تم نے۔ مگر پھر بھی کیا کروں گا۔ ڈاکٹر کوئی اور ہوگا تو میں کیا کمپاؤنڈر بن جاؤں یا صرف پیسے وصول کرنے والا منشی۔۔۔!"

میں نے کہا "تم مالک ہو اسپتال کے۔"

"لیکن میرے پرانے مریضوں کی نظر میں جو عزت ہے میری۔۔۔ جن کا اعتقاد ہے مجھ پر۔۔۔ جو سمجھتے ہیں کہ میرے ہاتھ میں شفا ہے۔ وہ کیا سمجھیں گے؟" اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔

میں نے کہا "اچھا ایک طریقہ ہے اس کا بھی۔۔۔ مریض تم دیکھو۔ نسخہ لکھے وہ ڈاکٹر۔ اب تم نیا اسپتال کھول رہے ہو۔ یہاں نیا نظام رائج کرو۔ ایک کیبن میں بٹھا دو ڈاکٹر کو۔ پہلے مریض اس کے پاس جائے پھر بڑے ڈاکٹر صاحب اس کا معائنہ کریں یعنی تم اور تم اپنا نسخہ لکھو مگر کمپاؤنڈر وہی دوا دے جو ایم بی بی ایس ڈاکٹر نے لکھی ہو۔ تمہارا لکھا ہوا نسخہ کمپاؤنڈر اپنے پاس رکھے اور بعد میں تمہیں لوٹا دے۔ اس کے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ مستند ڈاکٹر کا علاج کیا ہے۔ دوسرے خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ نسخہ ہوگا ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر کا۔"

اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ "اوئے واہ واہ یار۔ کیا آئیڈیا آیا ہے تیرے دماغ میں پھر تو انجکشن بھی لگا سکتے ہیں ہم۔"

"انجکشن لگانا اصل مسئلہ نہیں۔۔۔"

"مسئلہ ہے چترجی۔ میں نہیں لگاتا کسی کو انجکشن۔ کچھ پتا نہیں بندہ ادھر ہی پھڑک کے فوت ہو جائے۔ انجکشن دو تو مریض کو بڑا اطمینان ہوتا ہے۔ اکثر مریض کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب سوئی لگا دو تاکہ جلدی آرام آجائے۔ اس طرح سب کو انجکشن لگانے میں بڑا فائدہ ہے۔"

"جس کو نہیں ضرورت اسے بھی؟"

"کیا حرج ہے یار۔ دو روپے کا تو کیمیکس والا انجکشن کسی کا نقصان نہیں کر سکتا۔ انہیں خوشی خوشی دس روپے دے جائے گا پھر تو میں تین ہزار روپے مہینہ دے سکتا ہوں۔ ڈاکٹر بہت' ڈگری لے کر بے روزگار پھر رہے ہیں۔ اسپتال چل جائے تو لیڈی ڈاکٹر بھی رکھ سکتا ہوں میں۔ سال کے سال جن کا پیٹ پھول جاتا ہے۔ وہ سب آئیں گی۔ واہ او میرے یار۔ کیا ترکیب بتائی ہے تو نے۔ میں حیران ہوں کہ مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ اس میں تو وارے نیارے ہیں۔ ملازم ڈاکٹر کو وہی تنخواہ ملتی ہے گلی بندھی۔ باقی سب اپنا۔ ایک۔ کے دس بھی وصول کروں تو میرے۔۔۔"

میں اپنا سر پیٹ کے رہ گیا۔ پہلے اگر وہ لوگوں کی صحت اور زندگی سے کھیل رہا تھا تو اب انہیں لوٹنے کے چکر میں تھا پھر بھی جان کے مقابلے میں مال لینا اتنا خطرناک جرم نہیں تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ مسئلے کا قانونی پہلو ڈاکٹر رانجھا نے سمجھ لیا تھا۔ اخلاقی پہلو پر اس سے بعد میں بات کی جا سکتی تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ ماسی ہیر کے آنے تک گاڑی دروازے پر کھڑی ہو۔ دروازہ اس زینے کا تھا جو اوپر کی منزل تک جاتا تھا۔ ابھی میں نے گاڑی روکی بھی نہیں تھی کہ میں نے کلینک میں سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی کو دیکھا۔ وہی دو بدمعاش جو وسیم سے اپنا مال وصول کرنے آئے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا خون خشک ہوگیا۔

مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے سوچا۔ میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا۔

○☆○

میرے سامنے صرف ایک ہی راستہ تھا اور صرف اسی پر میرے لیے سلامتی کی ضمانت تھی۔

یہ واپسی کا راستہ تھا۔ الٹے پاؤں اپنی پرانی زندگی کی طرف جانے والا جانا پہچانا' مہربان اور دلدار راستہ۔ جس پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسانیت کی پُرسکون پناہ فراہم کرنے والے خلوص اور محبت کے شجر سایہ فگن تھے۔ بغض وعداوت کی کڑی دھوپ میں تنہا اور آبلہ سفر کی صعوبت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔

ہر سمت سے جاں کے طلب گار دشمنوں کے حصار میں گھرے ہوئے' بے یارومددگار رہ جانے والے اور موت کے خوف سے مسلسل فرار کی حالت میں جینے والے شاہ عالم کو آخر جینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کسے ضرورت ہے شاہ عالم کی؟ کسی کو بھی نہیں۔ وہ جیئے یا مرے۔ غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں لیکن خود شاہ عالم کے لیے بالآخر ایک حقیقی موت کو تسلیم کر لینے میں سکون اور راحت ہے۔

کیونکہ اس کے بعد ہی شاہ عالم کے دکھ' ندامتوں کے آزار اور پچھتاوے ختم ہوں گے اور پرائی زندگی جینے کا عذاب ختم ہوگا۔ وہ اپنے بچھڑے ہوئے ماضی سے سارے رشتے پھر استوار کر سکے گا۔ وہ پل لوٹ گیا ہے جو اس کے گزرے ہوئے وقت کو آنے والے وقت سے ملاتا تھا اور شاہ عالم کے لیے جو وقت گزر رہا ہے' وہ ایک اندھی کھائی جیسا ہے۔

میں نے ٹیکسی نکالی۔ اس وقت تک میں کچھ پُرسکون ہو گیا تھا۔ بے چینی کے اندیشوں سے نجات کے لیے مایوسی کے گھپ اندھیرے میں امید کی ایک کرن جھلملانے لگی تھی۔

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ بالآخر اپنی ناکامی اور شکست کے اعتراف میں ہی عافیت نظر آتی ہے۔ لاحاصل عذاب مسلسل کی زندگی کی مجبوری سے نجات دہندہ موت ہی بہتر ہے۔

اگر اور کچھ نہیں ہو سکتا تو شاہ عالم' یو ایڈیٹ۔ تمہیں خودکشی کر لینی چاہیے۔ باعزت طور پر حرام موت تمہاری اس دیوانگی کے تماشے سے بہتر ہے جسے تم اپنی زندگی کہنے پر مصر ہو۔ اپنی زندگی۔ مائی فٹ۔ اب وقت آگیا ہے کہ تم خود فریبی کا یہ ڈراؤنا کھیل ختم کرو۔ یہ HORROR اسٹوری خود تمہارے لیے آسیب بن گئی ہے۔

ٹیکسی چلاتے ہوئے مجھے ایسا لگا جیسے میں بہت عرصے بعد اس شہر کی سڑکوں پر سے گزر رہا ہوں۔ یہ ناقابلِ یقین سی بات لگتی تھی کہ میں اسی شہر میں ہوں۔ میں نے کبھی راستوں پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اجنبی ہو گئے ہیں اور صرف راستے ہی کیا' ہر چیز اجنبی تھی۔ یہ رات' اس رات کا نمناک اندھیرا۔ اسٹریٹ لائٹس' عمارتیں۔ میں نے مدت سے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ یا پھر پہچانا نہیں تھا۔ کیا میں اندھا ہو گیا تھا یا میری یادداشت چلی گئی تھی۔

کچھ دیر بعد جب میں نے بریک لگائے تو ٹیکسی دروازے پر رک گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں نے اپنے دشمنوں کو حیران اور پریشان کرنے کے لیے اور اپنی طاقت کی دھاک بٹھانے کے لیے دو بندے گرائے تھے۔ انہیں یقیناً اٹھا لیا گیا تھا اور اندر کہیں میرے دشمن زخم خوردہ ناگ کی طرح بل کھا رہے تھے۔

میں نے ڈکی کھول کے ڈرائیور کو باہر نکالا۔ وہ پوری طرح ہوش میں آچکا تھا مگر حرکت کرنے سے معذور تھا۔ میں نے اسے آزاد کیا تب بھی وہ مفلوج سا پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے۔

میں نے کہا "میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم کو ایک چانس دوں گا۔ تم فائدہ اٹھانا چاہتے ہو اس چانس سے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "پھر اٹھ کے کال بیل دباؤ۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ میں ایک طرف کھڑا رہوں گا۔ تمہارے سر سے میرے ریوالور کی گولی کا فاصلہ اتنا کم ہوگا کہ تمہارے حلق سے ایک لفظ بھی غلط نکلا تو دوسرا لفظ نکلنے سے پہلے تمہاری جان نکل جائے گی۔"

اس نے دوبارہ سر ہلا کے کال بیل کا بٹن دبایا۔ میں گیٹ کے دوسرے پلر کی آڑ میں چھپ گیا اور ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹا کے اس کا رخ ڈرائیور کے سر کی طرف کر دیا۔

کوٹھی کے اندر ایک دروازہ کھلا۔ تھوڑی سی روشنی باہر آئی۔ دیوار کے اوپر سے میں نے خادم کو باہر آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ اس نے گیٹ کھولا تو ڈرائیور اس کے قدموں میں گر پڑا۔ خادم نے ریوالور جیب میں رکھا اور اس پر جھک گیا۔ پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور عثمان کو آواز دی۔ عثمان بھی ریوالور لے کر نکلا۔

"ڈرائیور بھی آگیا مگر یہ بے ہوش ہو گیا ہے" خادم نے کہا "پتا نہیں یہاں تک کیسے پہنچا؟"

"یہ زندہ ہے؟" عثمان نے تشویش سے کہا۔

"ہاں مگر حالت خراب ہے اس کی۔" خادم نے کہا۔ "اسے اٹھاؤ۔ اندر لے چلتے ہیں۔"

عثمان نے بھی ریوالور جیب میں رکھا اور انہوں نے دونوں طرف سے سہارا دے کر بے ہوش ڈرائیور کو اٹھا لیا۔ معلوم نہیں وہ خاموش رہنے کے لیے بے ہوشی کی اداکاری کر رہا تھا یا سچ مچ بے ہوش تھا۔

ڈرائیور کا بایاں ہاتھ عثمان کے بائیں کندھے پر تھا اور دایاں ہاتھ خادم کے دائیں کندھے پر۔ وہ ان دونوں کے درمیان بڑی مشکل سے چل رہا تھا۔

کوئی آہٹ کیے بغیر میں ان کے پیچھے پہنچ گیا۔ "بس ایسے ہی چلتے جاؤ' مڑ کر دیکھے بغیر" میں نے کہا۔

وہ سب اپنی اپنی جگہ پر منجمد ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کراہا۔

میں نے خادم کو ریوالور کی نال کمر پر لگا کے دھکیلا۔ "میں یہاں تم کو قتل کرنے نہیں آیا کیونکہ تم تو پہلے ہی قتل ہو چکے ہو۔ میں قاتل ہوں تمہارا۔"

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ برآمدے کی چند سیڑھیاں چڑھ کے وہ کمرے کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے تو میں ان کے پیچھے تھا۔ اس کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ خادم اور عثمان اسی کمرے میں موجود تھے جب ٹیکسی ڈرائیور نے گھنٹی بجائی تھی۔ یہ کسی کا بیڈ روم تھا۔ بیڈ کے علاوہ یہاں ایک دیوار کے ساتھ صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے سینٹر ٹیبل تھی۔ ٹیبل پر چائے کے دو خالی کپ رکھے ہوئے تھے۔

"اس کو فرش پر لٹا دو" میں نے کہا "بہت آہستہ آہستہ پھرتی مت دکھانا۔ جو بھی میں کہوں وہ سلوموشن میں ہونا چاہیے۔ اسے لٹا کے اچھے بچوں کی طرح میرے سامنے صوفے پر بیٹھ جاؤ۔"

انہوں نے تعمیل کی۔ ڈرائیور ان کے پیروں کے پاس چت لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

"میں یہاں ہرگز اس لیے نہیں آیا کہ تمہیں سچ مچ قتل کر دوں۔ حالانکہ اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کوئی دوبار کیسے قتل ہو سکتا ہے؟"

عثمان نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری "شاہ جی۔ تم چاہو تو سب کچھ پھر ویسے ہی ہو سکتا ہے۔"

خادم نے سر ہلایا "جیسا پہلے تھا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ یہی سوچ کے آیا تھا میں یہاں۔"

عثمان کے چہرے پر امید جھلکی "اگر ایسی بات ہے۔۔۔ تو پھر اسے رکھو ایک طرف۔ بات کرو زبان سے۔"

خادم نے کہا "ورنہ یہ سمجھ لو کہ ہمیں مار کے بھی تم زندہ نہیں رہ سکتے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ اگر میں نے تمہیں نہ مارا تب بھی میں مارا جاؤں گا بالآخر۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے میں خادم نے بے چینی سے پہلو بدلا "کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شاہ عالم کو مرجانا چاہیے۔ خودکشی کر لینی چاہیے۔" میں نے کہا۔

آہستہ آہستہ میرا ریوالور والا ہاتھ اوپر اٹھا۔

عثمان کا رنگ اڑ گیا "کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"

خادم ہنسنے لگا "پاگل تم ہو کہ اس ڈرامے کو حقیقت سمجھ رہے ہو۔ اپنے شاہ جی ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو خود اپنے ہاتھوں

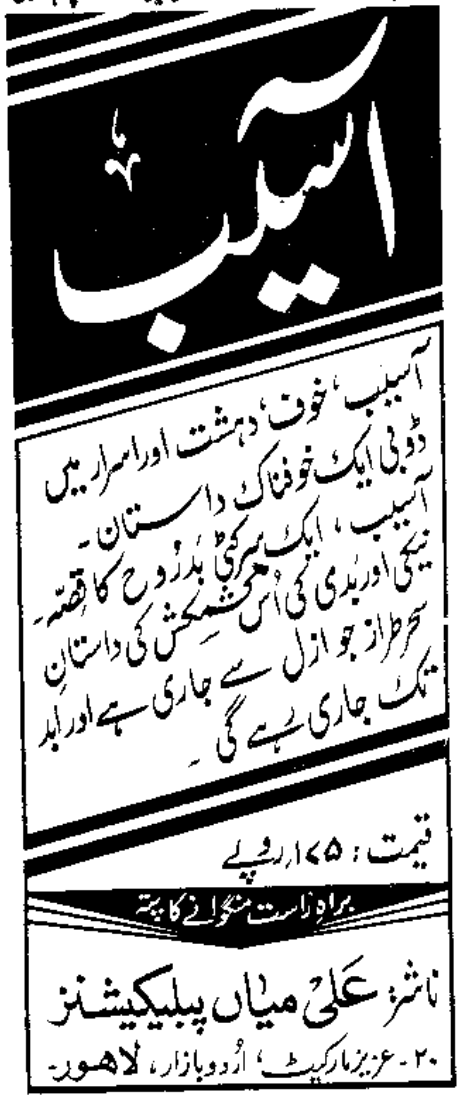
آسیب
آسیب' خوف' دہشت اور اسرار میں ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
آسیب، ایک سرکش بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی۔
قیمت: ۱۷۵ روپے
برادر است منگوانے کا پتہ
ناشر: علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار، لاہور۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی جان لے لیں۔ انہیں تو ان کی جان کے دشمن بھی نہیں مار پائے۔"

عثمان کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ "دیکھو شاہ صاحب۔ اپنے حالات کے ذمے دار تم خود ہو۔ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں۔"

میں نے ریوالور کا رخ پھر ان کی طرف کر دیا "کبھی یہ سوال خود تم نے اپنے آپ سے کیا کہ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں پیدا ہونے کی؟"

"ظاہر ہے۔ یہ میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔"

"لیکن پھر ایک وقت ایسا آیا جب تم کو اپنی ہر ضرورت کے تعین کا اختیار حاصل ہو گیا۔ آج تم جو بھی کر رہے ہو اپنی مرضی سے کر رہے ہو۔ اپنی ضرورت کے مطابق تم خود طے کرتے ہو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے یا نہیں۔"

خادم نے پہلو بدلا "کسی حد تک۔۔۔"

میں نے کہا "تم دوسری تیسری اور چوتھی شادی بھی کر سکتے ہو۔ قانونی یا شرعی طور پر رکاوٹ کوئی نہیں۔ پہلی بیوی کیا بگاڑ سکتی ہے تمہارا اور تم بیک وقت چار بیویاں افورڈ بھی کر سکتے ہو مگر تم نے ایسا نہیں کیا' آخر کیوں؟ اس لیے کہ تم ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ تم اپنی بیٹی کو انگلینڈ یا امریکا بھیج سکتے ہو حصول تعلیم کے لیے مگر تم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ تم کراچی جا رہتے ہو۔ ایک کوٹھی وہاں بھی بنا سکتے ہو۔ تم چاہو تو نیا بزنس بھی شروع کر سکتے ہو۔ یہ مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں کہ تم میرا مجبوری کو سمجھ سکو۔"

عثمان نے کہا "شاہ صاحب۔ تمہیں کیسی مجبوری' مجبور تو ہیں تمہارے مقابلے میں۔"

"نہیں۔ تم نے مجھے مجبوری کی اس انتہا تک پہنچا دیا ہے کہ میں بالکل ناامید' اکیلا اور DESPERATE ہو گیا ہوں۔ میرے لیے اب اپنی مرضی سے جینا بھی ممکن نہیں رہا۔ مجھے بالکل دیوار کے ساتھ لگا دیا گیا ہے اور میرے لیے وہ نوبت آ گئی ہے کہ میں مرجاؤں یا ماروں' نجات کی اور کوئی صورت باقی نہیں رہی۔"

خادم نے آہستہ سے کہا "حالات کو اس انتہا تک لانے کے ذمے دار تم خود ہو شاہ عالم۔"

عثمان نے سر ہلایا "ہاں۔ ورنہ سب ٹھیک تھا اور ایسے ہی چلتا رہتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"

"ایسے ہی کا مطلب ہے جیسے تم چاہتے تھے" میں نے کہا۔

"جس میں ہم سب کا فائدہ تھا۔" عثمان بولا۔

"میں اب نہیں چاہتا اپنا فائدہ۔"

عثمان نے نفی میں سر ہلایا "ہم سب کے مشترکہ مفادات ہیں۔ فائدے اور نقصانات ایک ہیں۔ تم یک طرفہ طور پر کوئی بھی فیصلہ کیسے کر سکتے ہو۔"

میں نے ریوالور اپنے ہاتھ میں رکھا "مگر یہ میری زندگی ہے۔ سے میں نے غیر مشروط طور پر تمہارے پاس گروی نہیں رکھا۔ میں اپنی زندگی کے سارے فیصلے خود کرنے اور بدلنے کا اختیار چاہتا ہوں۔ آدمی وقت کے ساتھ بدلتا ہے۔ اس کی ضروریات بدل جاتی ہیں۔ خیالات اور نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ تبدیلی عمر کے تجربات کے ساتھ آتی ہے مگر آدمی کی شخصیت میں راتوں رات انقلاب آ جائے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے لیے نفع نقصان کا تصور وہ نہ رہے جو پہلے تھا۔ وہ محسوس کرے کہ جسے وہ اپنی کم عقلی یا کوتاہ اندیشی سے آج تک فائدہ سمجھتا رہا' وہ تو سراسر خسارے کا سودا تھا۔"

"کیا تم ایسا سمجھنے لگے ہو؟"

"ہاں اور اسی لیے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں اس راستے پر نہیں چل سکتا جس پر تم چل رہے ہو" میں نے کہا۔

"اگر اچانک تمہارے ضمیر صاحب جاگ اٹھے ہیں' شرافت کا دورہ پڑ گیا ہے تمہیں تو ہمارا کیا قصور ہے اس میں؟" خادم نے کہا "ہم سے کیوں توقع رکھتے ہو تم کہ ہم اس ذہنی انقلاب میں تمہارا ساتھ دیں گے۔"

"میں نے ایسا کب کہا ہے؟ یہ پریشانی صرف میرے لیے ہے کہ تم مجھے چوائس نہیں دے رہے ہو۔ تم مجھ پر اپنا فیصلہ مسلط کرتے ہو کہ جیو تو ہماری طرح ورنہ ہم تمہیں جینے ہی نہیں دیں گے۔"

"ہر شخص جینا چاہتا ہے شاہ جی!" عثمان نے کہا "لیکن تمہارے اس فیصلے سے صرف ہم نہیں' اور بھی بہت سے لوگ احساس عدم تحفظ کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ فنا اور بقا کا مسئلہ ہے ہمارے لیے بھی" خادم بولا۔

عثمان نے اس کی تائید کی "یار' تم بچے تو نہیں ہو کہ تمہیں یہ بات سمجھائی جائے۔ ایک بار اس راہ پر قدم رکھنے کے بعد واپسی ناممکن ہو جاتی ہے اور تمہاری تو بات ہی مختلف ہے۔ تم بہت زیادہ جانتے ہو۔ تم کوئی عام آدمی نہیں ہو جو محدود علم رکھتا ہے۔ تمہارے پاس ایک پورے نیٹ ورک کے بارے میں مکمل انفارمیشن ہے۔"

خادم نے کہا "ہمیں کیا معلوم تم سچ بول رہے ہو یا نہیں۔ کیا پتا تمہیں ہمارے دشمنوں نے خرید لیا ہو۔"

میں نے کہا "کیا میں اتنا کم قیمت ہوں یا ضرورت مند ہوں کہ مجھے کوئی آسانی سے خرید سکے؟ کس چیز کی ضرورت ہے مجھے کہ میں اپنی وفاداری بدلنے کا خطرہ مول لوں۔"

خادم نے کہا "پیسے کی ضرورت آدمی کو ہمیشہ رہتی ہے۔ دنیا کا سب سے دولت مند آدمی بھی یہ نہیں کہتا کہ بس بہت دولت ہو گئی۔ آج کے بعد کمائی بند۔ باقی عمر لمبی تان کے سوئیں گے اور عیش کریں گے۔"

عثمان نے کہا "چلو ہم مان لیتے ہیں کہ حقیقت وہی ہے جو تم بتا رہے ہو مگر یہ زیادہ خطرناک بات ہے۔ اگر تم لکیر کے اس طرف رہتے جس طرف ہم ہیں اور ہم جیسے دوسرے بہت سے لوگ ہیں۔ تم ہمارا ساتھ چھوڑ کے اپنا کوئی دھندا شروع کر دیتے جس میں زیادہ کمائی ہوتی۔ تم کسی کے لیے نہیں خود اپنے لیے کام کرتے۔ خود اپنا باس کہلانے کی خواہش ایک فطری بات ہے۔ تو شاید ہمارے لیے اتنی پریشانی کی بات نہ ہوتی۔"

خادم نے اس کی بات آگے بڑھائی "چور اگر ڈاکو بن جائے' ہیروئن کا اسمگلر زیادہ فائدے کے لیے اسلحہ اسمگل کرنے لگے تو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ ایک حمام میں سب ننگے تھے۔ دوسرے میں بھی سارے ننگے ہی ہیں لیکن تم لکیر کے دوسری طرف چلے گئے ہو جہاں سب نے کپڑے پہن رکھے ہیں۔"

میں نے کہا "اگر احساس زندہ ہو تو موقع ملنے پر طوائف بھی اپنا پیشہ چھوڑ کے شادی کر لیتی ہے اور گھر میں بند ہو کے بیٹھ جاتی ہے۔ ایک حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ میں ساری عمر احساس جرم کا عذاب نہیں جھیل سکتا۔ ہر جگہ ہر وقت پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا رہنے سے میرے اعصاب جواب دے چکے ہیں۔"

"یہ محض ایک نفسیاتی خوف ہے۔ ورنہ ایسی تو کوئی خطرے کی بات نظر نہیں آتی۔ نیچے سے اوپر تک سب ہمارے ہی ساتھی ہیں۔ خواہ وہ قانون بنانے والے ہوں یا نافذ کرنے والے" خادم بولا۔

عثمان نے سر ہلایا "یار' پاکستان میں آج تک کوئی پکڑا گیا ہے۔ سوائے بے گناہ اور شریف آدمی کے۔"

"تم کچھ بھی کہو میں نے گزشتہ چند ماہ کے تلخ تجربات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرے ساتھ کیا نہیں ہوا۔ قاتلانہ حملے تو سیاست دانوں پر ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے وہ خود بھی اپنے اوپر قاتلانہ حملے کراتے ہیں مگر مجھے تو قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے مار کے میرا مزار تک بنا دیا گیا تھا۔ کیا اس دنیا کی سیاسی تاریخ میں ایسی کوئی مثال ملتی ہے کہ کسی لیڈر کو عدالت میں حاضر ہو کے ثابت کرنا پڑا ہو کہ وہ زندہ ہے؟ اور عدالت کے حکم پر اسے زندہ تسلیم کیا گیا ہو؟"

عثمان نے افسوس سے سر ہلایا "تم کو سمجھ لینا چاہیے تھا شاہ جی کہ جو کچھ پاکستان میں ہوا اور ہو سکتا ہے' وہ واقعی دنیا میں اور کہیں نہیں ہو سکتا۔"

"تاہم ایک بات ہے جو ہر جگہ سچ ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی سچائی ہے شاہ صاحب کہ ایک آدمی کے پاس جذبۂ ایمانی' قوتِ ارادی یا تائید غیبی سب ہو پھر بھی وہ ایک مافیا سے نہیں لڑ سکتا۔ مافیا ہر جگہ ہے۔ ٹھیکے داروں کی' بدعنوان بیوروکریٹس کی' وڈیروں کی' فرقہ پرستوں کی۔ تم کس کس کا مقابلہ کرو گے؟"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک کہا تم نے مگر میرا مقابلے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں صرف اپنا راستہ الگ کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی کا زر خرید غلام نہیں رہنا چاہتا۔ کوئی مجھ سے میری مرضی کے خلاف ہر کام کرائے' یہ مجھے منظور نہیں۔"

"کام کا معاوضہ تو تمہیں منہ مانگا ملتا ہے" خادم نے کہا۔

میں نے کہا "نہیں چاہیے مجھے ایسا معاوضہ۔"

عثمان نے طنز سے کہا "یار خادم۔ اب اپنے شاہ صاحب کو عزت اور شرافت کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ یہ ایک پرچون کی دکان کھولیں گے جہاں لکھا ہو گا' سچا بول' پورا تول۔"

"اور ادھار محبت کی قینچی ہے" خادم ہنس پڑا۔

"میں دنیا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ بات مجھے بہت اچھی طرح سمجھا دی گئی ہے۔ مجھے سیاست سے باہر کر دیا گیا ہے۔ میری سیاسی پارٹی ہائی جیک کر لی گئی ہے۔ میرے وفادار مروا دیے گئے ہیں یا انہیں میرا ساتھ چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ میرا گھر تباہ ہو گیا ہے اور میں وہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ میری بیوی نے مجھے چھوڑ دیا۔ میرے خلاف مقدمات کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ تم دونوں کے قتل کا الزام بھی مجھ پر ہے حالانکہ تم میرے سامنے اسی دنیا میں زندہ سلامت بیٹھے ہو۔ میں نے خدا بخش مندرانی کے ساتھ سیاسی اتحاد کیا تھا۔ اسے بھی ہلاک کرا دیا گیا اور اب مجھے دوسرے قتل کے الزام کا سامنا ہے۔ ایک گواہ نے مرنے سے پہلے یہ بیان دیا کہ دستی بم میں نے تحفے میں بھجوایا تھا۔ اللہ مرنے والے جھوٹے گواہ سے خود نمٹے گا جو مرتے مرتے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈال گیا۔ پولیس تو آخری وقت میں دیے جانے والے بیان کو سچ تسلیم کرتی ہے۔"

"وہ مجبور تھا۔ اپنے بیوی بچوں کی وجہ سے۔ سچ بول کے مرتا تو بعد میں مصیبت ان پر آتی" خادم نے کہا۔

"ان حالات میں میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ میں خود کو تمام معاملات سے الگ کر لوں۔ سیاست بھی چھوڑ دوں اور اس کی آڑ میں چلنے والے کاروبار سے بھی الگ ہو جاؤں۔ ہم بیٹھ کے حساب کر لیں جس کا بھی کسی کی طرف جو نکلتا ہو' وہ ادا کر دے۔ اگر تمہیں مجھ سے کچھ لینا ہے تو مجھے بتا دو۔ میں کوئی سوال کیے بغیر دینے کے لیے تیار ہوں۔ اگر تمہیں دینا ہے تو میں سب چھوڑتا ہوں۔"

عثمان نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ "تمہاری فراخ دلی اپنی جگہ مگر یہ معاملہ پیسے کا نہیں ہے۔ حساب کتاب چلتا رہتا ہے۔ ادھر یا ادھر کسی کے ذمے دو چار لاکھ ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل مسئلہ ہے کہ تم نے دھوکے سے وہ ساری انفارمیشن ہم سے چھین لی جس کا کسی غیر متعلقہ شخص کے ہاتھ میں جانا ہمارے کاروبار کو تباہ کر سکتا ہے۔ اس کاروبار سے کتنے لوگ وابستہ ہیں' یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ ان سب کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے تمہاری وجہ سے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خادم نے کہا "اگر تم کو ڈانگ ہونا تھا تو یہ بات تم شرافت سے بھی بتا سکتے تھے۔ مگر تم نے بڑی چالاکی سے ہمارے بریف کیس اپنے قبضے میں کر لیے۔ وہ بریف کیس نہیں لیپ ٹاپ کمپیوٹر تھے۔ ہماری کاروباری معلومات ان میں محفوظ تھیں۔ یہی نہیں' تم نے ساری معلومات کی ڈسک تک کہیں چھپا دی ہے۔ تمہارے گھر میں اور آفس میں ہم نے ہر جگہ دیکھ لیا۔ اگر ایک سوئی بھی ہوتی تو مل جاتی۔"

"اسی سے تمہاری بدنیتی ثابت ہوتی ہے۔ تم ہمیں بلیک میل کرنا چاہتے ہو یا پھر ساری انفارمیشن کسی اور کو دینا چاہتے ہو۔ اس کاروبار میں ہمارے دوست کم ہیں' دشمن ساری دنیا ہو جائے گی اگر حقیقت ظاہر ہو جائے۔ وہ معلومات پریس کے ذریعے پبلک تک پہنچ جائے تو پولیس بھی مجبور ہو جائے گی حالانکہ وہ کاروبار میں برابر کے شریک ہیں۔ ایک طوفان اٹھ کھڑا ہو گا پورے ملک میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں۔ ہر ملک میں کتنے لوگ متاثر ہوں گے۔"

میں نے کہا "میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"تمہارے کہنے سے اب کچھ نہیں ہوتا۔ جس طرح تم نے ساری انفارمیشن حاصل کی اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ اگر تم نے وہ انفارمیشن منہ مانگی قیمت پر ہمارے دشمنوں کو فروخت کرنے کی کوشش کی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ تمہیں حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ بس تم اپنی جان سے جاؤ گے" عثمان نے کہا۔

خادم نے سہلایا "اور اگر واقعی تمہارے ضمیر صاحب کا مسئلہ ہے اور تمہیں ایمانداری' شرافت اور حب الوطنی جیسے امراض لاحق ہو گئے ہیں اچانک' تب بھی یہ ہمارے لیے انتہائی خطرناک بات ہے۔"

میں نے آخری کوشش کے طور پر کہا "دیکھو مسٹر خادم اور عثمان۔ میں نے اس بات کی پوری کوشش کر کے دیکھ لی کہ تم کو اعتبار آ جائے۔ نہ میں تم سے دشمنی کرنا چاہتا ہوں اور نہ تمہارے کاروبار کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں پاگل نہیں ہوں کہ اکیلا سب کے لیے چیلنج بن جاؤں اور اعلانِ جہاد کر دوں۔ یہ اتنی ہی احمقانہ بات ہو گی جیسے کوئی ڈنڈا اٹھا کے مسلح ڈاکوؤں کے گروہ کے ٹھکانے پر حملہ کرنے نکل کھڑا ہو۔ پیسے کے لالچ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو میرے پاس ہے وہ بھی بہت ہے اور میں تم سے جتنا چاہوں لے سکتا ہوں۔"

"پھر کیا بات ہے؟" خادم نے مشکوک لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں تمہارے کمپیوٹر اور ڈسک وغیرہ بھی تمہیں واپس کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

عثمان تلخی سے مسکرایا "کیونکہ ساری انفارمیشن تم اب تک دوسرے کمپیوٹر پر ڈاؤن لوڈ کر چکے ہو۔ اتنے عرصے میں تم نے نہ جانے کتنے پرنٹ نکال لیے ہوں گے۔ تو مسٹر شاہ عالم۔ یہ چکر کسی اور کو دینا۔"

"اوکے۔ تم اعتبار کرنا نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ بعد میں مجھے الزام مت دینا کہ میں نے صلح صفائی کے ساتھ معاملات طے کرنے کی کوشش نہیں کی تھی" میں نے اپنے ریوالور کا رخ ان کی طرف رکھتے ہوئے جیب سے موبائل فون نکال لیا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" خادم کچھ پریشان ہوا۔

"تم مجھے چوہے دان میں پکڑے جانے والے چوہے کی طرح نہیں مار سکتے۔ میں اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے سب کچھ کروں گا جہاں تک ممکن ہوا۔ اگر مقابلہ نہ کر سکا تو جان بچا کے بھاگ جاؤں گا۔ روپوش ہو جاؤں گا کہیں۔ پاکستان میں یا ملک سے باہر۔ میں تمہارے لیے ایک خطرے کا احساس بن کے زندہ رہوں گا۔ تم مجھے تلاش کرتے رہو گے اور خوف میں مبتلا رہو گے اور یہ میں بتا دوں کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔"

خادم ان دونوں میں سے نسبتاً احمق اور بزدل تھا۔ وہ کچھ پریشان نظر آنے لگا تھا مگر عثمان مسکراتا رہا "کیا کرو گے تم؟ کوئی منتر پڑھ کے آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ گے یا سلیمانی ٹوپی ہے تمہارے پاس؟"

"وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔" میں نے ایک نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

"تم فون کسے کر رہے ہو آخر؟" خادم بولا۔

"یار پریشانی کی کون سی بات ہے۔ گلاکی دو ڈھائی سو تک۔ یہ بلا میں گے اپنے حمایتی اخبار والوں کو اور ہمیں ان کے سامنے پیش کر دیں گے کہ دیکھ لو' مقتولین زندہ سلامت آپ کے سامنے ہیں۔" عثمان بولا۔

میں نے کہا "ہاں۔ کم سے کم ایک پھانسی کا پھندا تو نہ رہے میری گردن میں۔"

عثمان مسکرایا "یہ گردن سلامت رہے۔ پھندوں کی کیا کمی۔"

میں نے کہا "عثمان۔ کیا میرے لیے تمہیں گولی مار کے اس آڈیو قتل سمیت فرار ہو جانا زیادہ آسان نہیں تھا؟ مجھ پر تمہارے قتل کا الزام تو بہت پرانا ہو گیا۔ اب لاشیں مل جانے کے بعد پوسٹ مارٹم رپورٹ سے ثابت ہو جاتا کہ واردات کب ہوئی۔ ڈاکٹر کسی دشواری کے بغیر بتا دیتے کہ موت کو ایک گھنٹا ہوا یا دو اور میرے لیے اس قتل کے وقت خود کو جائے واردات سے بہت دور کسی بھی جگہ کسی معزز اور معتبر گواہ کے ساتھ موجود ثابت کرنا بھی مشکل نہ ہوتا۔"

"پھر ایسا کیوں نہیں کیا تم نے؟" عثمان نے اپنا ظاہری سکون کا انداز برقرار رکھا۔

میں آزاد صاحب کا نمبر ملاتا رہا "اس لیے کہ میری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ میں کیوں تمہارے قتل سے خواہ مخواہ اپنا دامن داغ دار کروں۔ خدا نے مجھے ایک موقع دیا ہے کہ میں اپنے خلاف کی جانے والی سازش کا ایک ثبوت دنیا کے سامنے پیش کر دوں۔ پولیس بھی اس معاملے میں تمہاری زیادہ مدد نہیں کر سکے گی کیونکہ پہلے تمہیں اخبار والوں کے سوالات کا سامنا ہو گا۔"

"میں کسی کو کچھ بتانے اور کسی اخبار والے کے سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں" عثمان نے برہمی سے کہا۔

"وہ تمہاری خاموشی اور انکار سے بھی کوئی نتیجہ اخذ کر لیں گے اور تم انہیں کچھ نہ بتاؤ مگر عدالت کے سوال بھی وہی ہوں گے کہ حضرت' عالم بالا سے واپسی کب اور کیسے ہوئی؟ مقتولین اس کوٹھی میں کیوں روپوش تھے؟ کیا اس انتظار میں تھے کہ دہرے قتل کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد شاہ عالم پھانسی چڑھ جائے تو مناسب موقع دیکھ کے آپ سامنے آ جائیں اور کوئی اچھی سی قابلِ یقین اور دردناک اسٹوری سنا کے سب کو قائل کر لیں کہ اس روپوشی میں آپ کے ارادے اور نیت کا کوئی دخل نہیں تھا اور آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ الزام کیسے شاہ عالم پر آ گیا۔ اگر تم ایسا سمجھتے تھے تو مجھے افسوس ہوتا ہے تمہاری بچکانا سوچ پر۔ کوئی عدالت محض الزام پر کسی کو بھی پھانسی کا حکم نہیں سناتی۔"

بالآخر آزاد صاحب کا نمبر مل گیا۔ انہوں نے ریسیور اٹھاتے ہی دہاڑنا شروع کیا "میاں تم تو ہو وہ گویا... خرزاد کے عم زاد۔ کیا کہتے ہیں اسے عرفِ عام میں گویا فچر۔ ہمارے نزدیک تو تمہاری ولادت بھی ایک المناک سانحہ ہو گئی گویا۔ تمہاری نامعقولیت کے سبب ہمارا اتنا وقت ضائع ہوتا ہے۔ بخدا کسی دن تم کو ضائع کر دیں گے ہم۔"

میں نے کہا "حضرت یہ کیا فرما رہے ہیں آپ۔ ایسی کیا تقصیر ہوئی مجھ سے آخر۔"

"تم سے..... کس نامعقول نے کہا کہ تم سے تقصیر ہو سکتی ہے۔ تم تو مجسم تقصیر ہو گویا۔" انہوں نے ڈانٹ کے کہا "وہ سب جو ہم ابھی فرما رہے تھے' تم سے نہیں فرما رہے تھے۔ یہ جو ہمارے اعصاب پر آسیب کی طرح مسلط ہے گویا۔ جواہر قلم اس کا سر ہم بقلم خود قلم کر دیں گے کسی دن اچانک۔"

"ایسی کیا خطا ہو گئی اس سے؟"

"بھئی ایک خطا؟ یہ جسنی تو گویا مسلسل خطا کار ہے۔ اس کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے ہیں ہم نے اور غالب کی روح نے۔ ابھی لکھ رہا تھا' کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اور نظر کو اس نے لکھا نذر۔ بخدا تین سو ملی لیٹر خون جل گیا گویا۔ خیر تم بولو' کہاں ہو کس طرف کو ہو کدھر ہو۔"

میں نے کہا "حضرت آپ کے لیے ایک انتہائی اہم اور خفیہ

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

قیمت 125 روپے

راکھشس

ساحر جمیل سید

راکھشس کی بھٹکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا گل کھلائے۔

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔ وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ایسے کیریکٹر کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر ارسال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہو گا

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر

علی میاں پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ
اُردو بازار لاہور
7247414

اسٹاکسٹ

علی بکسٹال
نسبت روڈ
چوک میو ہسپتال، لاہور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خبر ہے۔ کیا حرج ہے اگر صبح صرف آپ کے اخبار کی زینت بنے۔"

"خبر کیا ہے۔ ذرا کان میں بتاؤ گویا" انہوں نے سرگوشی میں کہا۔

"خبر کی سرخی کچھ یوں ہوگی 'مُردہ زندہ ہوگیا۔'"

"لاحول ولا قوۃ۔۔۔ خبر نہ ہوئی اشتہار ہوگیا کسی فراڈ کا گویا۔ کسی قبرستان کی دیوار پر بقلم خود لکھ آؤ۔ ایسے بدروح قسم کے عامل دیکھے ہیں ہم نے بھی بہت۔۔۔ اور حکیم بھی۔"

میں نے عرض کی "آزاد صاحب۔ میں نے دو مقتولین دریافت کرلیے ہیں۔ جن کا قاتل کہلانے کا شرف مجھے حاصل تھا گویا۔"

انہوں نے بڑی مسرت سے کہا "بھئی مبارک ہو۔ کہاں ملاقات ہوئی۔ زیرِ زمین کسی مدفن میں یا برسرِ زمین۔"

میں نے انہیں مختصراً ساری بات بتائی جو انہوں نے بڑی دلچسپی سے سنی۔

پھر میں نے کہا "تو مجھے لگتا ہے میں نے انہیں گن پوائنٹ پر رکھ لیا ہے۔ پہلے میرا خیال تھا کہ انہیں سچ مچ کو ویسٹ کون کردوں۔"

"کیا کردوں؟" آزاد صاحب بولے "دوبارہ عرض کرو۔"

میں نے کہا "میں نے سوچا تھا کہ جو اتنی کوشش سے بیتے جی مقتول ہوئے تھے، انہیں سچ مچ کا مقتول کردوں لیکن پھر آپ کا خیال آیا کہ کیوں نہ یہ خبر آپ ہی دیں زمانے کو۔ اتنا عرصہ مقتول رہنے والوں سے کچھ عالمِ بالا کا حال احوال دریافت کریں۔ یہ پوچھیں کہ کیسے گئے تھے اور کتنا عرصہ رہے وہاں؟ وقت کیسا گزرا اور آخر لوٹ کے اسی دنیا میں کیوں آگئے؟"

"بالکل۔۔۔ بھئی کہیں اور چلے جاتے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں گویا۔" آزاد صاحب چہکے "مگر یہ انٹرویو بھی خوب ہوگا گویا۔۔۔ اب تم یہ کرو کہ انہیں اسی طرح بٹھائے رکھو توپ کے دہانے پر۔۔۔ گن پوائنٹ کا تڑکہ کچھ ایسا ہی ہوگا غالباً۔ ہم چلبلی کے ہمرکاب پہنچتے ہیں گویا برق رفتاری سے۔"

میں نے کہا "خراماں خراماں کیجئے۔ ایک گزارش اور ہے کہ وہ جو آپ کی معنوی دخترِ نیک اختر ہیں، ان کے کوتوال چچا کو بھی خبر کردیں۔"

"بھئی کیوں کنفیوز کررہے ہو گویا۔ پہیلیاں مت بجھاؤ۔"

میں نے کہا "شبنم کے چچا ایس پی غلام محمد مقتولین کو زندہ سلامت اپنی تحویل میں لیں تو اس کے گواہ بھی ہونے چاہئیں لیکن میں کسی گواہی کے چکر میں نہیں پڑسکتا۔"

وہ ہنسے "بھئی یہ معاملات تم ہم پر چھوڑ دو۔ جھوٹے سچے گواہ ہم ساتھ لائیں گے۔ دو گواہ تو سانحۂ نکاح کے بھی ہوتے ہیں گویا مگر پہلے ذرا یہ خصوصی خبر ہو جائے بالتصویر۔ ہم آخری کاپی روک لیتے ہیں تھوڑی دیر کے لیے۔ اب یہ عرض کرو کہ تم کہاں سے بول رہے ہو اور جواب اس کا ہے کہ اپنے منہ سے تو یہ فرماؤ کہ منہ دیکھنا ہو سارا تو ہم کہاں قدم رنجہ فرمائیں۔ چلبلی کو راستہ سمجھاؤ گویا۔"

میں نے انہیں پتا بتا کے فون بند کردیا۔ خادم اور عثمان کے لیے یہ صورتِ حال قطعی غیر متوقع تھی۔ انہوں نے اپنی طرف سے پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ اس رازدارانہ ملاقات کا اہتمام کیا تھا مگر الٹی ہوگئیں سب تدبیریں۔ اصل شاہ عالم ہوتا تو اسے ساتھ لانے کے لیے دو مسلح محافظ بہت تھے۔ وہ خاموشی سے ان کے ساتھ آجاتا اور پھر یہاں اس کے ساتھ جو بھی ہوتا اس کا گواہ کوئی نہ ہوتا۔ ٹیکسی ڈرائیور بھی انہی کا آدمی تھا۔ ان تینوں کی موجودگی میں بیرونی مداخلت کا امکان بھی نہیں تھا۔ یہ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا نتیجہ تھا کہ جب میں قمر کی شادی میں شرکت کے لیے جاتے ہوئے دو بندے اس کی کوٹھی کے دروازے پر گرا گیا تب بھی خادم اور عثمان نے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا اور اس یقین کے ساتھ بیٹھے رہے کہ تیسرا ضرور مجھے دست بستہ ان کی خدمت میں پیش کردے گا پھر پتا چلے گا کہ تین میں سے دو کیسے مارے گئے تھے۔ شاہ عالم اکیلا ہی تین مسلح بدمعاشوں پر حاوی آجائے گا، اس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اب صورتِ حال بدل گئی تھی۔ وہ اپنے سامنے ایک مختلف شاہ عالم کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین آچکا تھا کہ میری گرفتاری اور پیشی کے مشن پر روانہ کیے جانے والے تین کمانڈوز میں سے دو میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے تھے اور تیسرا ان کے سامنے بے سدھ پڑا تھا۔ خادم اور عثمان کچھ مرعوب اور دہشت زدہ سے خاموش بیٹھے یہ تاثر دینے کی ناکام کوشش کرتے رہے کہ صورتِ حال کے پلٹ جانے سے نہ وہ مایوس ہیں اور نہ پریشان۔ تاہم انہوں نے جیب سے ریوالور نکالنے یا اچانک مجھ پر حملہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

"یہ تم نے اچھا نہیں کیا شاہ عالم" عثمان نے ایک گہری سانس لی۔

"کس کے ساتھ؟ اپنے ساتھ یا تمہارے ساتھ؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "تم نے اپنی موت کو دعوت دی ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ موت کا فرشتہ کسی کے دعوت نامے پر کہیں نہیں جاتا۔ قسامِ اجل نے اسے ایک شیڈول پہلے سے دے رکھا ہے جس میں یہ واضح طور پر تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ اسے کب کہاں کس کی جان لینی ہے اور کیسے۔ میرے عقیدے کے مطابق ہر شب برات پر آنے والے سال کے بارے میں سب کچھ طے ہوجاتا ہے۔ زندگی یا موت اور رزق کے معاملات پر قدرت اپنی مہرِ تصدیق ثبت کردیتی ہے پھر تم خود ہی سوچو کہ میرے یا تمہارے موت کو دعوت دینے سے کیا فرق پڑتا ہے اور بالفرض محال ایسا ہے تو تمہیں پریشان نہیں خوش ہونا چاہیے۔ خود تم بھی یہی چاہتے تھے۔"

"ہم تو معاملات کو سلجھانا چاہتے تھے" خادم مایوسی سے بولا۔ "تم نے اور الجھا دیا ہے۔"

میں نے کہا "تمہارے معاملات سے اب میرا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ آج کے بعد میں تمہیں نظر بھی نہ آؤں۔"

عثمان نے نفی میں سر ہلایا "یہ ناممکن ہوگا تمہارے لیے؟"

"یہ تمہارا ہی آئیڈیا تھا۔ تم کتنا عرصہ غائب رہے؟"

عثمان نے کہا "ہماری بات اور تھی۔ ہم صرف پس پردہ چلے گئے تھے۔ ویسے ہمارا سب سے رابطہ تھا۔ گھر والوں کو اور کچھ خاص لوگوں کو معلوم تھا کہ ہم کہاں ہیں۔ ان سے ٹیلی فون پر بات بھی ہوجاتی تھی۔"

خادم نے کہا "بڑی اچھی چیز ہے موبائل فون، خفیہ رابطے کے لیے۔"

"ہم رات کے وقت سیاہ شیشوں والی گاڑی میں پھرتے تھے۔ گاڑی ہر روز ایک ہی نہیں ہوتی تھی اور ہم مخصوص خفیہ ٹھکانوں کے سوا کہیں کسی سے ملاقات نہیں کرتے تھے۔ اپنے گھر یا کسی عام جگہ جانے کا رسک نہیں لیتے تھے جہاں ہمارے پہچانے جانے کا ایک فیصد امکان بھی ہو۔ تم کوئی عام آدمی نہیں ہو۔ تمہیں تلاش کرنے والی ہزاروں آنکھیں ہر جگہ ہوں گی۔"

"مجھے معلوم ہے اور وہ سب دشمنوں کی آنکھیں ہوں گی۔ میرے سیاسی دشمن کاروباری دشمن، قانون کے رکھوالے سرکاری دشمن مگر میں اس چیلنج کو قبول کرتا ہوں۔ دیکھتے ہیں یہ آنکھ مچولی کب تک چلتی ہے۔ ایک بات میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں چوہے دان میں پکڑے جانے والے چوہے کی طرح کسی کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک اور بحرالکاہل سے ماؤنٹ ایورسٹ تک اربوں انسان بستے ہیں۔ ان کے درمیان میں کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔"

"یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ محض خود فریبی۔ اکیلا کوئی نہیں رہ سکتا۔ رشتوں کے بغیر زندگی کا تصور بے معنی ہے۔"

خادم نے سر ہلایا "کسی فلسفی نے کہا تھا کہ صرف آسمان پر خدا اکیلا ہے اور دنیا میں شیطان۔"

"انسانی رشتے بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔ میرے لیے یہاں صرف ایک زمین کا رشتہ باقی ہے۔ میرے ماں باپ نہیں ہیں۔ بھائی بہن نہیں ہیں۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔ میں نے پارٹی چھوڑ دی۔ سیاست چھوڑ دی۔ اب میرا ساتھ دینے والا ہے صرف پیسہ۔ یہ پیسہ کہاں کہاں میرا سہارا بن سکتا ہے، کچھ تم جانتے ہوگے مگر بہت کچھ تم نہیں جانتے۔ یہ پیسہ مجھے تحفظ فراہم کرے گا۔ میرے لیے نام اور شخصیت، ملک اور شہریت بدلنے میں کام آئے گا۔ یہ اندازہ بھی ہوگا تمہیں کہ شاہ عالم کے لیے یہ ناممکن نہیں۔"

"کل کیا ہوگا۔ یہ تو بہت دور کی بات ہے شاہ جی۔ تم ابھی کی فکر کرو کہ ایس پی غلام محمد کو تم کیا جواب دوگے۔ وہ پوچھے گا نہیں کہ جناب، یہاں کیسے تشریف لائے آخر" خادم نے سوچ کے کہا۔

عثمان مسکرانے لگا "یار اسے جو بھی پوچھنا ہوگا شاہ جی کو وہ اپنے ساتھ لے جاکے پوچھے گا۔ اطمینان سے تفتیش کرے گا۔ دو مقتولین کی بازیابی سے کوئی قیامت نہیں آئے گی۔ ہمارا بیان بہت پہلے سے تیار ہے۔ ہم وہی کہیں گے جو ہمارے وکیلوں نے سمجھا دیا تھا۔"

خادم مطمئن ہوگیا "ہاں۔ ہم پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوتا۔"

"ہوا بھی تو ہمیں کوئی پھانسی نہیں چڑھا سکتا لیکن اپنے شاہ صاحب پر خدا بخش مندرانی کے قتل کا جو نیا الزام ہے، وہ بہت سنگین ہے۔ غلام محمد کی اصل کامیابی ہوگی اس کے قاتل کی گرفتاری۔"

میں نے کہا "یار عثمان۔ اگر غلام محمد نے مجھ سے پوچھا کہ بتاؤ ان بندوں کو بھی تم نے مارا ہے؟ تو میں کیا کہوں؟ ایک لاش یہاں پڑی ہے، ایک ٹیکسی کی ڈکی میں ہے۔ اگر میں نے کہا کہ میں نے نہیں مارا خدا کی قسم تو جھوٹی قسم کھانے کا عذاب الگ ہوگا اور ڈرائیور ہوش میں آنے کے بعد سچ بتادے گا تو میرے خلاف ہو جائیں گے تین کیس۔ مجھے تین بار پھانسی ہو جائے گی۔"

میرے غیر سنجیدہ رویے نے عثمان کو کھسیانا کردیا "مجھے معلوم ہے شاہ جی کہ پولیس کے آنے سے پہلے ہی تم بھاگ جاؤ گے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اگر معلوم ہے تو پھر ایسی احمقانہ خوش فہمی میں کیوں مبتلا ہو۔ اب ذرا مہربانی کرو اور کھڑے ہو جاؤ۔ دیوار کی طرف منہ کرکے۔"

عثمان مشتعل ہوگیا "آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں مگر وہ سب ناقابلِ اشاعت ہے۔

اس کا پارا اور چڑھ گیا۔ اس نے چیخ کے کہا "شٹ اپ۔۔۔!"

میں نے ریوالور میز پر رکھا اور کھڑا ہوگیا "تم وہی ہو، لاتوں کے بھوت۔ باتوں سے نہیں مانو گے۔"

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو خادم اور عثمان دونوں گھبرا کے کھڑے ہوگئے۔ خادم نے کہا "دیکھو، بدمعاشی مت دکھاؤ۔"

عثمان نے بڑی پھرتی سے ریوالور نکالنے کی کوشش کی۔ مجھے اس کی توقع تھی چنانچہ میری نظر اس کے ہاتھوں کی حرکت پر تھی۔ ابھی اس کا ہاتھ جیب سے باہر آیا ہی تھا کہ میری لک اس کی کلائی پر پڑی۔ ریوالور اس کی گرفت سے چھوٹ کے اڑتا ہوا اوپر گیا اور پھر دیوار سے ٹکرا کے پیچھے گر گیا۔ عثمان کے حلق سے گالی کے ساتھ ایک کربناک چیخ سی نکلی اور اس کے دوسرے ہاتھ نے کلائی پر سے ٹوٹ کر لٹک جانے والے ہاتھ کو تھام لیا۔

خادم کی حالت غیر ہوگئی "اچھا۔۔۔ اچھا، تم تلاشی لینا چاہتے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہونا... کیا میں خود تمہیں ریوالور پیش کردوں؟"

"ہاتھ اوپر اٹھا کے گھوم جاؤ۔" میں نے دہاڑ کے کہا اور عثمان کو بھی ایک جھٹکے سے اٹھا کے دیوار کی طرف دھکیل دیا۔

ابھی میں نے خادم کی ایک جیب سے ریوالور برآمد کیا ہی تھا کہ مجھے باہر سے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی سیمنٹ کے فرش پر تارکول کا ڈرم گھسیٹ کرلے جارہا ہو۔ یہ چلبلی کی آواز تھی پھر اس کا بکری کے بچے کی آواز سے مشابہ ہارن سنائی دیا۔ ایک بیک فائر کے ساتھ چلبلی کا انجن خاموش ہوا اور تقریباً ایک ساتھ اس کے چاروں دروازوں کے بند ہونے کے دھماکے سنائی دیے۔ "بھئی کوئی ویرانی سی ویرانی ہے" آزاد صاحب نے کہا۔

میں نے اپنی نگاہ خادم اور عثمان پر رکھتے ہوئے الٹے قدم جاکے دروازہ کھول دیا "ادھر آیئے آبادی کی طرف۔"

آزاد صاحب کی قیادت میں چار افراد اندر آگئے۔ ان میں ایک شمی تھی۔ اس نے بڑی ممنونیت سے میری طرف دیکھا۔ باقی دو کو میں صورت سے پہچانتا تھا۔ ایک رپورٹر اور دوسرا فوٹوگرافر تھا جو ہمیشہ آزاد صاحب کے ساتھ نظر آتا تھا۔

آزاد صاحب نے اندر قدم رکھتے ہی بڑی مسرت کا اظہار کیا "بھئی واہ۔ یہ تو اپنے وہی ہیں... متقولین گویا۔ بخدا ہمیں اب بھی یقین نہیں آرہا ہے اپنی ان گناہگار آنکھوں پر۔ کہیں یہ عالمِ برادراج تو نہیں۔"

شمی نے میرے قریب آکے اور سب کی نظر بچاکے کاغذ کا ایک پرزہ میرے ہاتھ میں تھمادیا۔ میں نے اسے آزاد صاحب کی اوٹ میں رہتے ہوئے پڑھا۔ اس پر ایک سطر لکھی ہوئی تھی "نہ تم یہاں ہو نہ ہمیں نظر آرہے ہو۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آئی مگر میں نے روک لی۔

آزاد صاحب نے عثمان کے کندھے پر ہاتھ رکھا "میاں' ایسی بھی کیا بے رخی۔ یوں منہ پھیر کے کھڑے ہو مشتاقانِ دید سے۔"

عثمان اور خادم نے غصّے سے میری طرف دیکھا اور پھر پلٹ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ آزاد صاحب اور ہمنوا ایک طے شدہ پلان کے تحت پوری تیاری سے آئے تھے۔ فوٹوگرافر نے اپنا کیمرا سنبھالا تو شمی نے اپنا حوال داغ دیا۔

"ہم اخبار والوں کو کچھ بتانے کے پابند نہیں ہیں" عثمان نے چراغ پا ہوکے کہا "ہم جو بتائیں گے' پولیس کو بتائیں گے یا عدالت میں کہیں گے۔"

"اخبار والے وہاں بھی ہوں گے۔ آخر کیا حرج ہے یہ بتانے میں کہ اتنا عرصہ آپ کہاں روپوش رہے اور کیوں؟" شمی نے کہا۔

"میں جانتا ہوں' آپ لوگ ایک سازش کے تحت شاہ عالم کے کہنے پر آئے ہیں" عثمان نے برہمی سے کہا "پریس ہمیشہ سیاست دانوں کو سپورٹ کرتا ہے۔"

شمی نے کہا "ہم کسی شاہ عالم کے کہنے پر نہیں آئے ہیں۔"

دوسرے رپورٹر نے شمی کی تائید کی "ہمیں کسی نے فون پر اطلاع دی تھی۔"

"خود شاہ عالم نے فون کیا تھا آزاد صاحب کو۔ پوچھ لیں ان سے۔" عثمان نے کہا۔

"بھئی کیا فرق پڑتا ہے اس سے گویا... جھوٹ بہرحال نہیں بولا تھا اس نے۔" آزاد صاحب نے کہا۔

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" عثمان بولا "یہ انتہا ہے دیدہ دلیری کی۔ اس شخص کے ہاتھوں آج ہی خدا بخش مندرال کا خون ہوا ہے۔ آپ اس سے سوال کیوں نہیں کرتے کہ یہ یہاں کیسے موجود ہے؟ کیا اس نے فون نہیں کیا تھا آپ کو؟"

آزاد صاحب نے دائیں بائیں دیکھا "بھئی یہ کیا سلسلہ ہے۔ آخر اپنے عثمان صاحب! کس کی طرف ہے روئے سخن گویا۔"

"آپ شاہ عالم کے بلانے پر آئے ہیں یا نہیں؟ اس پر الزام ہے ایک سیاسی قتل کا۔" خادم بولا "کیا آپ کا فرض نہیں بنتا کہ قاتل کو پولیس کے حوالے کریں۔"

"جہاں تک الزام کا سوال ہے تو شاہ عالم پر آپ دونوں کے قتل کا الزام بھی تھا۔" شمی نے کہا "لیکن آپ دونوں سو فیصد زندہ ہیں۔"

"پھر بھی ہم متفق ہیں تم سے گویا۔ پوچھیں گے ضرور شاہ عالم سے کہ میاں' سچ کہو یہ قتلِ عام آخر کس لیے؟" آزاد صاحب نے کہا۔

عثمان نے بگڑ کے کہا "کب پوچھیں گے۔ اسے فرار کرانے کے بعد؟"

"یہ تو گویا ہم پر بھی الزام آگیا۔ کیا کہتے ہیں اسے... اعانتِ مجرمانہ کا۔ میاں برخوردار' جو پہلے سے مفرور ہو اسے ہم کیسے فرار کرا سکتے ہیں؟" آزاد صاحب ناراض ہوگئے "پھر بھی فون کیا اس نے یا شرفِ ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو ہم یقیناً اس سے حقیقتِ حال معلوم کریں گے گویا۔"

خادم نے غصّے سے کہا "آزاد صاحب' یہ کیا مذاق ہے آخر؟"

عثمان نے چلا کے کہا "آج ہی دو قتل اور بھی ہوئے ہیں اس شخص کے ہاتھوں۔ ایک لاش باہر ٹیکسی میں بھی پڑی ہے مگر یہ ٹیکسی ڈرائیور زندہ ہے۔ یہ بھی بتا سکتا ہے آپ کو مگر شاہ عالم سے پوچھیں... کیا یہ بات غلط ہے؟"

آزاد صاحب کے لبوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ تھی "بھئی یہ عجیب معاملہ ہے۔ اس وقت ہم کیسے پوچھیں آخر؟"

"کیوں؟ اتنا ڈرتے ہیں آپ شاہ عالم سے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ اگر ہماری وہ ہوتی' کیا کہتے ہیں اسے... نصف بہتر گویا' تو خدا کے بعد ہم اس سے ضرور ڈرتے۔ شاہ [illegible] ہے۔ اس جیسے ہماری جیب میں پڑے رہتے ہیں

دو چار۔" آزاد صاحب نے کہا۔

شمی نے کہا "آپ اپنی بات کریں... شاہ عالم سے ملاقات ہوگی کبھی تو اس سے بھی پوچھ لیں گے۔"

عثمان نے اسے شعلہ بار نظروں سے دیکھا "کبھی کا کیا مطلب ہے خاتون؟ ابھی کیوں نہیں۔ شاہ عالم آپ کے سامنے موجود ہے اور آپ فراری ہیں کبھی۔"

"سامنے موجود ہے؟" شمی نے حیرانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"بھئی نورِ چشم راحتِ جاں۔ تمہارے سامنے تو خیر سے ہم ہیں اور ہمارے سامنے ہو تم گویا" آزاد صاحب بولے "یہ شاہ عالم کہاں ہے آخر؟ نظر کیوں نہیں آتا۔"

خادم اور عثمان نے بے یقینی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "یہ کس قسم کا ڈراما ہے آزاد صاحب!"

آزاد صاحب کے ساتھ آنے والا فوٹوگرافر مستعد ہوگیا "کیا شاہ عالم صاحب بھی موجود ہیں یہاں' کہاں ہیں وہ؟"

"پاگل کے بچے' یہ کون کھڑا ہے ادھر۔ یہ تمہارا باپ شاہ عالم نہیں ہے؟" عثمان نے چیخ کے کہا۔

فوٹوگرافر نے کہا "میرے باپ کا نام اکرام علی تھا۔ انہیں فوت ہوئے چار سال ہوگئے۔ ادھر سے کیا مراد ہے آپ کی؟"

"کیا ادھر کوئی نظر آرہا ہے تمہیں؟" شمی نے دوسرے رپورٹر سے پوچھا۔

"میری دور کی نظر خراب ہے۔ دیوار ضرور نظر آرہی ہے" وہ بولا۔

آزاد صاحب نے بھی سر ہلایا "غالباً اتنا عرصہ مقتول رہنے کا اثر دماغ پر پڑا ہے۔ انہیں یہاں بھی شاہ عالم نظر آرہا ہے گویا۔"

شمی نے مجھے اشارہ کیا کہ اب مجھے وہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جانے سے پہلے عثمان کا فرش پر پڑا ہوا ریوالور اٹھاکے اسے دے دیا۔ اس نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا "بہت اچھا ہے۔"

"تمہارا نشانہ کیسا ہے' کبھی چلایا ہے ریوالور؟"

شمی نے اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا "آزما کے دیکھو۔ یہ کپ رکھو عثمان صاحب کے سر عزیز پر۔"

آزاد صاحب نے فرمایا "عزیزہ... اگر تمہارا نشانہ چوک گیا تو بلاوجہ ایک گولی ضائع ہوجائے گی گویا۔"

عثمان اور خادم کی حالت قابلِ رحم ہورہی تھی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ مذاق نہیں۔ مجھے اس جگہ غیر موجود ثابت کرنے کے لیے یہ سارا کھیل مُدّا ہورہا ہے۔ ان کا چیخنا چلانا لاحاصل تھا۔ اخبار والے کھل کر میری مدد کررہے تھے اور یہ ثابت کرنے کے لیے آئے تھے کہ جائے واردات پر ان میں سے کسی نے بھی شاہ عالم کو نہیں دیکھا۔ جب پولیس آئے گی تو وہی معتبر ہوں گے۔ ان کی گواہی کو پولیس بھی مسترد نہیں کرسکے گی۔ وہ صرف اتنا کہہ کے چھوٹ جائیں گے کہ کسی نے انہیں گمنام کال کے ذریعے یہاں خادم اور عثمان کے موجود ہونے کی اطلاع دی تھی جو تصدیق پر درست ثابت ہوئی۔

میں نے کہا "تمہیں شکایت نہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے مسٹر عثمان اور خادم مجھے انتقامی جذبات نے اس حد تک مغلوب نہیں کیا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس تمام پریشانی کا حساب برابر کردیتا جو میں نے تمہاری وجہ سے اٹھائی۔ ورنہ اس وقت یہاں اخبار والے نہیں' تمہاری لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اٹھانے والے آتے۔ یہ بدمعاشی کا کھیل تم نے ہی شروع کیا تھا۔ اس کا انجام اور کیا ہوسکتا تھا۔ بدمعاشی کے سوا۔"

شمی میرے ساتھ باہر تک آئی "شاہ صاحب!"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ جب دیگر انتظامات مکمل ہوجائیں تو مجھے بتادینا بلکہ آزاد صاحب کو بتادینا۔ میں تمہیں ٹریولرز چیک کی صورت میں رقم فراہم کردوں گا یا تم چاہو تو لندن میں بھی تم کو نقد۔"

"ویٹ از یور ایم۔ وہ بات اب ختم ہوگئی۔ میں تو بس شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی" اس نے اداسی سے کہا۔

میں نے کہا "چھوڑو۔ کتنی بار شکریہ ادا کروگی پھر شکریہ مجھے بھی ادا کرنا پڑے گا بار بار کہ تم نے مجھے قانونی مشکلات سے بچالیا۔ یہ دونوں بدمعاش آج پکڑے گئے ہیں لیکن تمہاری دو تصویروں نے اس سازش کا بھانڈا پہلے ہی پھوڑ دیا تھا۔"

"کاش میں آپ کے لیے اس سے زیادہ کرسکتی... لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ اتنی سلمت ہی کہاں ہے۔"

میں نے کہا "تم بلاوجہ اتنی مایوس ہو۔ دیکھ لینا چند ماہ بعد تم بالکل ٹھیک ہوکے واپس آؤگی۔"

وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی "مجھے معلوم ہے کہ آپ میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ جھوٹ بولتے ہیں' اخلاقاً۔ آپ سے ایک بات کہوں؟"

"یہ کیا آپ آپ لگا رکھی ہے آج تم نے شمی!"

"بس۔ اس لیے نہیں کہ آپ عمر میں بڑے ہیں مجھ سے۔ یا دنیا کی نظر میں بڑے آدمی ہیں۔ بڑے انسان ہیں آپ۔ میں بہت بداخلاق اور بداطوار' بدتمیز اور... اور... بدکردار مشہور تھی۔ کسی کی عزت محفوظ نہیں تھی میری زبان سے۔ میرے قلم سے... اور مجھ سے۔"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا "یہ وقت نہیں ہے ایسی باتوں کے لیے۔ اور نہ یہ جگہ ہے۔"

"پلیز۔ جو میں کہنا چاہتی ہوں... وہ سن لیں" میں نے محسوس کیا کہ وہ رونے کے قریب تھی "آپ سب کچھ جانتے تھے۔ اس کے باوجود آپ نے مجھے ایک بار سمجھایا تھا کہ میں ایڈز کے اس مریض کے ساتھ... نہ رہوں۔ اس سے شادی نہ کروں۔ لیکن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے آپ کی بات نہیں مانی تھی۔ اس لیے کہ میں مجبور تھی۔ میں اسے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ تھا' مایوس اور دل شکستہ مر جائے۔ خودکشی کرنا آسان تھا میرے لیے۔ چنانچہ میں نے شادی کرلی اس سے۔۔۔ میں سب جانتی تھی۔ سب سمجھتی تھی۔ اور آج مجھے افسوس یا پچھتاوا کوئی نہیں۔"

"چلو' خدا جو کرے گا بہتر کرے گا۔" میں نے کہا۔

"آج میں ایک ڈاکٹر سے ملی تھی۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "وہ لندن سے آیا ہوا ایک اسپیشلسٹ ہے۔ اخبار میں تھا کہ وہ تین دن مشورے کے لیے دستیاب ہوگا۔۔۔ ایک پرائیویٹ کلینک میں۔"

"اچھا۔۔۔ کیا کہا اس نے؟"

"وہی۔۔۔ جو مجھے معلوم تھا" شمی نے کہا "اس نے کہا کہ لندن آجاؤ۔ ہم تمہیں بچانے کی گارنٹی نہیں دے سکتے۔۔۔ لیکن اتنی سہولت ضرور مل جائے گی تمہیں۔۔۔ کہ تم اپنے بچے کو جنم دے سکو۔۔۔ اور کیا پتا اس کے بعد بھی ایک عرصہ گزر جائے۔"

میں نے شمی کے لیے اپنے دل میں بہت دکھ محسوس کیا۔ اب وہ اپنے لیے نہیں' اپنے بچے کے لیے رو رہی تھی۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے لندن نہ جانے کا۔" اس نے اپنی آنکھیں صاف کرکے کہا۔

"یہ کیا پاگل پن کی بات ہے؟"

"یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کے کیا ہے شاہ صاحب۔ مجھے اس ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ پیدائشی طور پر بچے کے خون میں بھی ایڈز کے جراثیم ہو سکتے ہیں۔ ففٹی ففٹی چانس ہے کہ وہ بھی HIV پازیٹو ہو۔ بس اس کے بعد میرا ارادہ بدل گیا۔ میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ پیدا ہی نہ ہو۔ بجائے اس کے۔۔۔ کہ وہ بھی میری طرح مرے اور مرنے سے پہلے جب تک جیئے میرے اعمال کی سزا بھگتے۔ اپنی ماں کو اور اپنے باپ کو بددعائیں دیتا رہے۔ کوستا رہے۔ وہ میرے ساتھ ہی دفن ہو جائے تو اچھا ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب آپ کی مدد کی ضرورت نہیں مجھے۔۔۔" وہ ایک دم پلٹی۔

میں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر نہ روک سکا۔

وہ دروازے کے قریب رکی۔ "شاہ عالم صاحب۔ معلوم نہیں کیوں' آپ وہ پہلے والے شاہ عالم نہیں رہے۔ شاہ عالم کو برسوں سے جانتی ہوں میں۔ اب تو میری اوقات ہی دو ٹکے کی رنڈی جیسی ہو گئی تھی لیکن دو سال پہلے تک۔۔۔ آپ نے ان رات جب مجھے یاد کیا' میں ہر جگہ آجاتی تھی۔ کوئی سوال کیے بغیر۔ میری زندگی کی بہت سی راتیں اور بہت سی باتیں آپ سے منسوب ہیں۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں۔۔۔ مگر آپ وہ شاہ عالم نہیں ہیں۔۔۔ ایسا کیوں لگتا ہے مجھے؟"

وہ پلٹ کے اندر چلی گئی اور میں سوچتا رہ گیا کہ شمی نے مجھ سے یہ سوال کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ اگر اس کو میرے رویے میں فرق کا احساس ہوا تھا تب بھی میرے ماضی کے کسی حوالے کی ضرورت بہرحال نہیں تھی۔ وقت کے ساتھ سب کچھ بدلتا ہے۔ انسان بھی بدل جاتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اپنے یقین کا اظہار کرنا چاہتی تھی کہ وہ مجھے اصل شاہ عالم نہیں مانتی حالانکہ اس بات کو عدالت نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ ایسے ہی شبنم کا یقین متزلزل نہیں ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس' اندر کے احساس کی آنکھ۔ وہ غیر معمولی صلاحیت جو باطن کو اور آدمی کے خیالات کو بھی سمجھ سکتی ہے۔ سب سے جدا تھی۔ جذبات کی بھرپور توانائی کے ساتھ من توشدم تو من شدی والی کیفیت میں بھلا کون اپنی اصلیت چھپا سکتا ہے۔ اپنی شخصیت پر نقاب ڈال کے کون کسی شریکِ خلوت کو دھوکا دے سکتا ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ اچھا کیا میں نے کہ شاہ عالم کی زندگی کے قول سے باہر آگیا۔ ورنہ رخشی اور شبنم کے بعد صرف شمی ہی نہیں تھی۔ شاہ عالم کی عمر رفتہ کے روز و شب کے نہ جانے کتنے ایسے سربستہ راز تھے جو میری نظر سے اوجھل تھے مگر ان کو دوسروں کی نگاہ نے چھپ کے دیکھا تھا۔ رازداری سے دیکھا تھا جب کوئی اور دیکھنے والا نہ تھا۔ ان گنت راتوں کی ایسی نہ جانے کتنی کہانیاں ہوں گی جو شاہ عالم کی کہانی کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ میں۔۔۔ جو کہ ناصر عظیم تھا۔ ان کے بارے میں کیسے جان سکتا تھا۔ میں نہ جانے کہاں کہاں اپنی حیرانی سے مشکوک ہوتا۔ لاعلمی کے اعتراف سے چور رہتا۔ ناآشنائی کے اظہار سے جھوٹا سمجھا جاتا۔

اس حقیقت کو قبول کرلینے کے بعد کہ خواہ سارا زمانہ مجھے شاہ عالم تسلیم کرے' میں ایک ایسے شخص کی زندگی نہیں جی سکتا جو مر چکا ہے کیونکہ میں صرف ناصر عظیم ہوں۔ مجھے خاصا ذہنی سکون اور اعتماد حاصل ہو گیا تھا۔ اس سافر کی طرح جو صحرا کے سفر کے آغاز میں ہی بھٹک جائے اور بروقت طے کرلے کہ اسے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ واپسی مشکل ضرور ہوگی مگر اس میں سلامتی کا یقین ہے۔ آگے بڑھتے جانے میں کوئی عقلمندی نہیں۔ صرف مشکلات ہیں اور خطرات ہیں اور بالآخر عذاب ناک موت ہے۔

میں جلد از جلد اس جگہ سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ جیب میں سے موبائل فون نکال کے میں نے رئیس سے رابطہ کیا۔

وہ چلانے لگا "ابے کہاں مر گیا تو؟"

میں نے کہا "جملہ درست کرلے۔ یہ پوچھ مر کے کہاں گیا تو؟ جواب اس کا یہ ہے کہ وہیں جہاں تجھے بھی جانا ہے۔"

"قسم اللہ کی ایک گھنٹے سے زیادہ ہو گیا۔ اپنی تو پریشانی سے جان عذاب میں تھی۔ آخر تو کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس وقت کہاں ہے؟"

میں نے کہا "سڑک پر ہوں اور پیدل ہوں۔"

"تو نے اپنا موبائل فون بھی بند کر رکھا تھا۔ میں نے تیرے اس خان اعظم سے بھی پوچھا تھا۔ وہ تو میرے پیچھے پڑ گیا کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو' تم بتاؤ مجھے کہ کہاں ہے ناصر عظیم۔ تم ہو اس کے دوست پچپن سے۔ اس کے رازدار اور مشیر ہو۔ ہم سے کیا تعلق اس کا۔"

میں نے کہا "خان اعظم نے کوئی غلط بات تو نہیں کی؟"

"دیکھ پیارے۔ برا مت ماننا' یہ تیرا خان صاحب اپنی سمجھ میں نہیں آیا کبھی۔ خبطی پہلے بھی تھا' اب تو قسم اللہ کی پاگل ہو گیا ہے بالکل۔ میں نے کہا کہ اچھا اپنا شاہ عالم وہاں پہنچایا نہیں۔ قمر اور ڈاکٹر فاروقی کی شادی میں تو چلانے لگا کہ میں نہیں جانتا کسی شاہ عالم کو اور نہ اس نام کے کسی شخص کو میں نے بلایا تھا۔ خبردار جو آئندہ فون کیا مجھے فضول باتوں کے لیے۔"

میں نے کہا "ان کو جتنا غصہ ہے اس سے زیادہ صدمہ ہے۔"

"مگر یار' اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ آدمی سب کو کاٹ کھانے کے لیے دوڑے۔ اصل بات یہ ہے یار کہ سنبھالا گیا ہے وہ۔ ساری عمر پرہیز کرتے یا کراتے گزری۔ ستر سال کی عمر میں بھی کرنل صاحب ساری دنیا کو اپنی رجمنٹ سمجھتے ہیں۔ خیر میں نے پھر تیرے یار ڈاکٹر فاروقی کو فون کیا تو دلی کو تسلی ہوئی۔ اس وقت تو وہیں تھا۔"

میں نے کہا "رئیس' تو کہاں سے بات کر رہا ہے۔ اپنے رئیس خانے میں ریڑی کھا رہا ہے کیا؟ اکیلے اکیلے۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے یار' بڑے دھکے کھائے زندگی میں اور جوتے کھائے زمانے کے۔ اب رس ملائی' ریڑی کھانے کو مل رہی ہے تو کیوں نہ کھائیں اور یہ اکیلے اکیلے کا کیا مطلب ہے آخر؟"

"میرا مطلب تھا کہ میں بھی آرہا ہوں۔ دھکے تو ہم نے بھی تیرے ساتھ ہی کھائے تھے یار اور زمانے کے جوتے بھی۔۔۔" میں نے کہا اور فون بند کرکے ایک گزرتے ہوئے رکشے میں بیٹھ گیا۔

رئیس خانے کے بند دروازے پر ساڑھے چار فٹ قد اور چھ انچ لمبی مونچھوں والا تیس مار خان بے حد مستعد کھڑا تھا۔ رکشے کے لیے بھی اس نے اپنی کلاشنکوف سنبھال لی اور پھر مجھے دیکھ کے حیران ہوا "جناب عالی' آپ رکشا میں آئی؟" اس نے بڑے پُرملال لہجے میں کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں یار۔ برا وقت آتا ہے تو سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ پہلے چار پہیوں کی سواری تھی۔ اب تین سے گزارا ہے۔ کیا پتا کل دو ہی رہ جائیں۔ پرانی سائیکل پر آنا پڑے۔"

اس نے اپنے مخصوص لہجے میں مجھے تسلی دی "اللہ اپنا فضل کرتی۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یار' کیا بات ہے۔ تم نے اونچی ایڑھی والی زنانہ سینڈل پہن رکھی ہے کیا۔"

وہ جھینپ کے مسکرانے لگا "صاحب جی۔ آپ مذاق کرتی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ آخر تمہارا قد اچانک کیسے بڑھ گیا۔"

اس کی مسکراہٹ جبڑوں تک پھیل گئی "آپ سچ بولتی صاحب! ہم آپ کو بتاتی' ایک فقیر آتی آج بہت بزرگ سو سال کا۔ سفید داڑھی ایک فٹ کا۔ اس کا ایک آنکھ ٹماٹر جیسا لال ہوتی۔ دوسرا آنکھ طوطے جیسی ہرا سبز۔ لمبا پیلا قمیص پہنتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "بڑا رنگین فقیر تھا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "وہ صاحب ہم کو بولتی۔ ایک دم ٹھیک بولتی کہ والایتی دوائی ولایت میں کام کرتی۔ دیسی آدمی پر الٹا اثر کرتی۔ وہ ہم کو تارزن کا طاقت والی دوائی دیتی۔ بولتی اب تم اللہ کا حکم سے چار شادی کرتی۔ ہم بولتی کہ ابھی ایک نہیں ملتی جو ملتی ہم سے اونچا ہوتی۔ صاحب وہ ہم کو اونچا کرنے کی چالیس گولی دیتی' رات کا بارہ بجے ایک گولی کھاتی چالیس بار درود [illegible] کے۔ سورج نکلتی تو روز قد آدھا انچ بڑھ جاتی۔"

میں نے کہا "یعنی چالیس دن میں تمہارا قد بیس انچ بڑھ جائے گا تو چھ فٹ سے بھی نکل جائے گا۔"

"بالکل ایسا ہوتی صاحب۔ ابھی چار دن کھاتی۔ آپ کو اونچا لگتی۔" اس نے بڑے یقین اور مسرت آمیز لہجے میں کہا "صرف دس روپیہ ایک گولی کا لیتی۔"

"یعنی چار سو ٹھگ کے لے گیا وہ تم سے؟" میں نے افسوس سے کہا "کہاں ہیں وہ گولیاں' مجھے دکھاؤ۔"

تیس مار خان نے بڑی عقیدت کے ساتھ جیب سے ڈبیا برآمد کی "وہ بڑا درویش ہوتی صاحب۔ چار رنگ کی گولی ہوتی اس کے پاس۔"

میں نے گولیوں کو غور سے دیکھا۔ وہ عجیب سی بدوضع شکل کی گولیاں تھیں۔ غالباً اس نے عام ملٹی وٹامن یا بی کمپلیکس کی بے ضرر گولیوں پر مختلف رنگوں والا پینٹ کا سفوف چڑھا دیا تھا۔ بقول تیس مار خان کے لال گولی جنگل کی ان جڑی بوٹیوں کا مرکب تھی۔ اس کو کھا کے آدمی تارزن بن جاتا ہے۔ سبز گولیاں کھا کے سو سال کی عمر میں چار شادیاں کرنا ممکن تھا۔ زرد گولی سے انسان کا دماغ اتنا تیز ہو سکتا تھا کہ وہ دنیا کی ہر زبان سمجھ لے۔ تیس مار خان کو اس نے نیلی گولی دی تھی جو اس کے کہنے کے مطابق زرافے کے خون میں شامل مخصوص اجزا سے تیار کی گئی تھی اور زرافے کی طویل قامتی کا راز انہی گولیوں میں تھا۔

قابل داد تھیں مار خان کی مستقل مزاجی تھی کہ دو ہزار روپے سے نو نے نو ٹکے تک سب کچھ کرتا رہتا تھا۔ اصل کے قد میں کبھی ایک سوت کا اضافہ بھی نہیں ہوا تھا مگر مایوسی اس کے مذہب میں حرام تھی۔ قد بڑھانے کے ہر طریقے پر اس کا اعتبار بڑی جلدی قائم ہوتا تھا اور ناکامی سے بددل ہونے کے بجائے وہ کوئی نیا طریقہ زیادہ یقین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور امید کے ساتھ اختیار کرتا تھا۔ اس کا دوسرا شوق البتہ رنگ لا رہا تھا۔ اس کی مونچھیں مختلف ریزر ٹانک پی پی کے بتدریج بڑھ رہی تھیں۔

میں نے ڈبیا اسے واپس کی اور اندر چلا گیا۔ وہ اپنے سلیپنگ سوٹ یعنی لٹھے کے نیکر ٹائپ انڈرویئر میں ملبوس بڑی پُر شفقت دلچسپی کے ساتھ دو مرغیوں کو زبردستی کچھ کھلا رہا تھا۔

"ابے کھا سالے نہیں تو قسم اللہ کی دوں گا ایک جھانپڑ۔"

میں نے کہا "یہ کیا ظلم ہو رہا ہے بے زبانوں پر۔"

"یار یہ ظلم ہے' دیکھ یہ کیا کھا رہے ہیں۔ انسان کے بچوں کو سوکھی روٹی نصیب نہیں۔ ان جیسے لاکھوں مرغے ڈربوں میں بند ہیں اور کھاتے ہیں کوڑے کرکٹ میں سے چن کر۔ یہ عمران خان بادام پستے کی چوری نہیں کھاتا۔ حالانکہ اس میں دیسی گھی اور کھویا بھی ہے۔ خمیرہ مروارید ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا ہو گیا اس سے؟"

"بات یہ ہے پیارے کہ اگلے مہینے ایک بڑا کانٹے کا مقابلہ ہے۔ بھارت سے آرہی ہے ایک بڑی دھانسو پارٹی۔ سنا ہے بڑی خاص خوراک کھلاتی ہے اپنے مرغے کو جس کا نسخہ کسی کو معلوم نہیں۔ میں نے ایک حکیم' ایک ڈاکٹر اور ایک استاد سے مشورہ کیا۔ اس ایک مرغے کو دے رہا ہوں پسلوانوں والی خوراک اور ایک کو فری اسٹائل کشتی لڑنے والوں کی۔ اس کا پیٹ بھر جائے تو یہ پتے گاما' امتیاز نسخہ دو خاص دو آتشہ۔ دوسرا کھاتا ہے ڈبل روٹی مکھن اور پنیر کے ساتھ ملٹی وٹامن کی گولیوں کا چورا اور پیتا ہے تین قسم کے ٹانک۔"

"رئیس خبیث تو پاگل ہو گیا ہے" میں نے کہا۔

"ایک لاکھ کی شرط ہے پیارے اور بات لاکھ کی نہیں ناک کی ہے۔ اپنا تو ہو گا عمران خان قوم کی شان۔ بھارتی سالے لا رہے ہیں اس بار کپل دیو کو مقابلے پر۔ گو اسکور نام رکھنے پر راضی نہیں۔ کہتے ہیں وہ آؤٹ آف فارم ہے۔"

میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ "تو نے مجھے فون پر بتایا تھا کہ ریزی بھی ہے۔"

"ابے نام مت لے اس کا۔ قسم اللہ کی یاروں کی یاری پر سب کچھ قربان ہے اپنا۔" وہ غصے میں آگیا "اپنے ہاتھوں سے ایک کلو ریزی کھلا دی۔ خود چکھی تک نہیں۔ تیرا فون آیا تو سالی بک بک کرنے لگی کہ یہ حرام خور مرغ ہی کیا کم تھے کہ ایک اور الو کا پٹھا آگیا رنگ میں بھنگ ڈالنے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "یار یہ سب عورتیں ایک سا رویہ رکھتی ہیں محبت کے معاملے میں۔ مکمل اجارہ داری مانگتی ہیں۔ شوہر ان کے سوا کسی کا نہ ہو۔ نہ ماں باپ کا اور نہ کسی اور کا۔"

"ابے اپن ایسے جورو کے غلام ٹائپ نہیں ہیں۔ ہم نے اچھی طرح سمجھا دیا اسے کہ پہلے اپنے یار پھر اپنا شوق۔ اس کے بعد گھر والی اس لیے یہ گڑبڑ کی کہ گھر والی بھی کسی یار کو ہی بنالے۔ سالی نے شادی کی دعوت نامے کا مضمون پھاڑ دیا۔ بس آگیا ہمیں بھی جلال۔ ایک جھانپڑ مارا ایسا کہ ہوش ٹھکانے آگئے ہوں گے۔ میں نے کہا کہ تیری ہمت کیسے ہوئی اپنے یار کو الو کا پٹھا کہنے کی اور عمران خان کو حرام خور کہنے کی۔"

میں نے کہا "خادم اور عثمان گرفتار ہو گئے ہیں۔"

وہ اپنی رو میں بولے جا رہا تھا۔ اچانک اس کی زبان رک گئی اور وہ ہڑبڑا کے اٹھا "کیا کہا تو نے..... پھر بول' شاید غلط سنا میں نے۔"

"تو نے وہی سنا جو میں نے کہا۔ یہاں بیٹھ آرام سے تو میں پوری بات بتاؤں تجھے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں عمران خان کو مرغی خانے میں چھوڑ آؤں۔"

میں نے اٹھ کے کچن کا رخ کیا "میں اتنی دیر میں کافی بنا کے لاتا ہوں۔"

رئیس نے میری ساری بات بڑے دھیان سے سنی۔ میرے اغوا کیے جانے اور پھر اغوا کرنے والوں سے مقابلے کی روداد کے دوران میں وہ فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کے بھی بے اختیار گالی دیتا تھا اور کبھی چلا کے کہتا تھا "ارے واہ!" شادی کی تقریب میں خان اعظم کے رویے پر بھی وہ بہت خفا ہوا لیکن آخر میں آزاد صاحب کی باتوں پر وہ اتنا ہی خوش ہوا۔

"چل ایک ذرا سا تو ختم ہوا لیکن یہ دوسرا فساد جو کھڑا ہو گیا ہے۔ خواہ مخواہ تیرا نام ڈال دیا گیا ہے خدا بخش مندرانی کے قتل کی ایف آئی آر میں۔ پولیس کو پھر تیری تلاش ہے۔"

میں نے کہا "یار رئیس۔ بہت سے معاملات اب بالکل واضح ہو گئے ہیں مجھ پر۔ اگر میں نے کوئی فیصلہ کن قدم نہ اٹھایا تو میں اس دلدل میں اترتا چلا جاؤں گا۔ آج خادم اور عثمان کا معاملہ ختم ہوا ہے۔ کل اگر خدا بخش مندرانی کا معاملہ نہیں ہو گا تو کچھ اور ہو گا۔ یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچا اپنے مسائل کے بارے میں اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ اس میں نہ قصور تقدیر کا ہے نہ میری تدبیر کا۔ ایک باقاعدہ سازش اور منظم کوشش سے میرے لیے مسائل کا جال پھیلایا جا رہا ہے۔ جو نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہیں اور آسانی سے یہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا کہ ان کا آپس میں کیا ربط ہے..... ہر آدمی خواہ وہ کتنا ہی ذہین ہو اور حوصلہ مند ہو۔ اس کی مقابلے اور مزاحمت کی طاقت محدود ہوتی ہے۔ وہ زندگی کی مشکلات اور مسائل سے ایک حد تک نمٹ سکتا ہے۔"

"اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟" رئیس خان نے ایک منطقی سوال کیا۔

"ہاں۔ اگر ایک آدمی کی زندگی کے روز و شب دوسروں کے

پیدا کیے ہوئے مسائل سے نمٹنے میں ہی صرف ہوتے جائیں گے تو وہ دنیا میں ترقی کیا خاک کرے گا۔ اس کی اپنی ذہنی صلاحیت اور قوت تو فضول کاموں میں ضائع ہو جائے گی۔ وہ کوئی تخلیقی یا تعمیری کام کب کرے گا اور کیسے۔ الجھنوں اور پریشانیوں میں آہستہ آہستہ اس کی توانائی ختم ہونے لگے گی۔ اس کے اعصاب پر دباؤ بڑھتا جائے گا۔ ناکامی کی فرسٹریشن کا شکار ہو کے وہ اتنا مایوس ہو جائے گا کہ کسی کامیابی کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دے گا۔ عملاً ناکارہ ہو جائے گا۔"

"یار تو بہت جلد ہمت ہار بیٹھا۔"

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے سمجھنے میں غلطی مت کر۔ ابھی تو یہ سلسلہ شروع ہوا ہے اور نتائج ابھی سے میرے سامنے آگئے ہیں۔ قانونی مقدمات کا طومار ایک طرف ہے۔ محرومی کا عذاب دوسری طرف..... یہ بات بہت دیر سے میری سمجھ میں آئی کہ میرے دشمن دو ہیں..... بلکہ تین۔"

رئیس نے سر کھجایا "یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آئی۔"

میں نے کہا "سب سے پہلے تو آدمی خود اپنا دشمن ہوتا ہے۔ ایک دشمن میں خود تھا اپنا۔ میں نے ایک مجبوری سے سمجھوتا کر لیا۔ بڑی ہوشیاری سے بلیک میل کیا اور کما کر دیے تو تم ناصر عظیم ہو مگر تم شاہ عالم بن سکتے ہو اور تمہیں شاہ عالم بننا ہی پڑے گا ورنہ ہم تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑیں گے۔ تمہاری دنیا اور عاقبت سب برباد کر دیں گے۔ ان کے پاس کچھ فلمیں تھیں اور کچھ ایسا مواد تھا جو واقعی بہت خطرناک تھا۔ مجھے ڈر نہیں چاہیے تھا مگر میں ڈر گیا۔ ایک بات اور بھی تھی۔ مجھے یقین دلایا گیا کہ یہ کام میرے جیسے باصلاحیت شخص کے لیے بالکل بھی مشکل نہیں ہو گا۔ میں کامیاب ہو گیا تو مجھے اپنے مستقبل میں ان سب خوابوں کی تعبیر مل سکتی ہے جو میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس ملک کا وزیراعظم بھی بن سکتا ہوں۔ شاہ عالم کے اس سینئر نائب صدر نے مجھے قائل کر لیا کہ یہ کام آسان ہے اور اس کھیل میں حالات خود میرے مددگار ثابت ہوں گے۔ بس یار' میں نے مجبوری کو قبول کر لیا۔ کیا ہوتا اگر میں انکار کر دیتا۔ اس سے برا تو نہ ہوتا۔ جو بعد میں ہوا۔ جو آج ہو رہا ہے مگر خوف اور لالچ دونوں سے مغلوب ہو گیا میں۔ میں نے ایک ایسے کام کی ہامی بھر لی جو..... جو ناممکن تھا۔"

"یہ تو سب نے ہی سمجھایا تھا تجھے پیارے!"

"میں نے کہا نا..... اپنا ایک دشمن تو میں خود تھا۔ خوش فہمی تھی مجھے کہ یہ کام کر سکتا ہوں میں۔ چھ مہینے میں عقل ٹھکانے آگئی جب اپنی ہر تدبیر الٹی ہونے لگی۔ مشکلات اور پریشانیوں کا پہاڑ اونچا ہونے لگا۔ اسے کاٹنا یا عبور کرنا میرے لیے ناممکن ہو گیا۔ دراصل تیمور نے مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ وہ اصل حالات سے واقف تھا مگر میرے سامنے اس نے حالات کی مختلف تصویر پیش کی۔ سازشی عناصر نے ملکی اور غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر شاہ عالم کو سیاسی منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ تیمور کے لیے بڑی مایوسی کی بات تھی۔"

"یار' کیا خود شاہ عالم ان معاملات سے بے خبر تھا؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ حد سے زیادہ خود اعتمادی کے مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ بہت زیادہ خود پرستی اور انانیت کا شکار لوگ کامیابی کی ایک سطح پر پہنچ کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ سچ اور صحیح سوچ وہی ہے جو ان کی ہے۔ باقی سب کی نظر حقیقت کو مستقبل کے آئینے میں اس طرح نہیں دیکھ سکتی جیسے وہ دیکھنے کی غیر معمولی بلکہ مافوق الفطرت صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"ابے یار اردو میں فارسی مت ملایا کر ہمارے سامنے" رئیس بولا۔

میں نے کہا "مطلب یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ عام آدمی تو عام آدمی ہے۔ وہ خاص بندے ہیں اور خدا نے انہیں خاصی صلاحیت سے نوازا ہے۔ وہ نعوذ باللہ ولی یا پیغمبروں کی طرح غیب کا اور اندر کا حال بھی جانتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔ سب کے اسباب ان پر عیاں ہیں۔ جب یہ حالت ہو تو پھر وہ کسی کی معقول بات بھی نہیں سنتے۔ کسی کا مشورہ نہیں مانتے اور یہی غرور ان کو لے ڈوبتا ہے۔ تو اپنے حکمرانوں کی مثال لے' ایوب خان سے بھٹو اور ضیاء الحق۔ سب پہلے عوام کی سطح پر ان کے مسائل کو سمجھتے تھے اور خود حالات کی خبر رکھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے مشیروں' وزیروں پر سب چھوڑ دیا اور "سب ٹھیک ہے" کی رپورٹوں پر بھروسا کرنے لگے۔ ایک وقت آیا جب وہ عوام سے اتنی دور ہو گئے اور خود کو سب سے برتر اور آسمانی قسم کی مخلوق سمجھنے لگے۔ ان کی گردن اتنی اکڑ گئی غرور سے کہ ان کو اپنی ناک کے نیچے ہونے والی خرابی دکھائی نہیں دی اور پھر ان کا جو انجام ہوا....."

"مگر یار۔ بعد میں آنے والوں نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔"

"یہی تو المیہ ہے ہمارا مگر ہم تاریخ کو الزام دیتے ہیں کہ اس نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ خیر' یہ تو ایک فلسفیانہ سی بحث ہے۔ بات تھی شاہ عالم کی۔ ممکن ہے تیمور نے اسے بتایا ہو کہ اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے اور اسے سیاست کے میدان سے بے دخل کرنے والے سرگرم ہیں مگر اس نے یقین نہ کیا ہو۔ وہ اس خوش فہمی کے جال سے باہر نہ نکل پایا ہو کہ پارٹی اس کی ہے۔ پارٹی پر اس کی گرفت مضبوط ہے۔ سب اس کے وفادار ہیں بلکہ اس کو پوجتے ہیں۔ اس کا اشارہ بھی حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے بغیر پارٹی کا تصور ہی نہیں۔ شاہ عالم نے بری خبریں سنانے والوں کو ٹال دیا ہو ہنس کے کہ سب وہم ہے تمہارا۔ حقیقت مجھے معلوم ہے۔ شاہ عالم کے اس رویے نے تیمور کو مایوس کیا ہو گا اور مایوسی کے اس زمانے میں اچانک اس کی ملاقات مجھ سے ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ مجھ میں کوئی صلاحیت ہے جسے وہ استعمال کر سکتا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ اپنا کوئی مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پارٹی کے سازشی عناصر کی کوشش کو ناکام کرنا چاہتا تھا یا شاہ عالم کو سزا دینا مقصود تھا۔ بہرحال اس نے مجھے پھانس لیا۔ اپنی باتوں سے' میری کمزوری سے فائدہ اٹھا کے یا بلیک میل کرکے اور میں پھنس گیا۔ بعد میں شاہ عالم کو مارنے والوں نے قتل کرکے اپنے راستے سے ہٹا دیا لیکن شاہ عالم نہیں مرا۔ وہ پھر زندہ ہو کے ان کے سامنے آگیا۔ زیادہ خطرناک بن کے۔ اس کے دشمنوں کا یہ گروہ بہت طاقتور تھا اور اسے بیوروکریسی کی حمایت حاصل تھی۔"

"قسم اللہ کی یار' مرحوم خدا بخش مندرانی بھی یہی کہتا تھا۔"

"کیا کہتا تھا؟"

"یہی کہ ہمارے ملک میں جو حکومت اور اپوزیشن کا ڈراما چلتا ہے نا۔ اس کے پروڈیوسر ڈائریکٹر بیوروکریسی کے ٹولے ہیں۔ انتخابات کا چکر تو مداری کا کھیل ہے۔ جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک برسراقتدار ٹولہ خود کو سچ مچ طاقت کا مالک سمجھنے لگا ہے اور ان کی مرضی کے خلاف فیصلے کرنے لگا ہے تو وہ دوسرے ٹولے کو اشارہ کردیتے ہیں کہ بس اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔ نعرے جلسے جلوس' ہڑتالیں اور ہنگامے کرو۔ اب تمہاری باری ہے۔ حکومتی ٹولہ انتخابات کے کھیل میں ہرا دیا جاتا ہے اور اسے اپوزیشن میں بیٹھنا پڑتا ہے۔"

"ہاں۔ دو چار سال یا اس سے بھی پہلے انہیں پھر موقع مل جاتا ہے۔ کوئی مداری ڈگڈگی بجا کے پھر انتخابات اور حکومت کی تبدیلی اور انقلاب کا کھیل رچاتا ہے۔ اس کے لیے کچھ بڑے معقول بہانے ہیں۔ روٹی' کپڑا اور مکان کا نعرہ ہے۔ اسلام اور شریعت کے نفاذ کا نعرہ ہے۔ سستے اور فوری انصاف کا نعرہ جس سے عوام کو امیدوں کے خواب دکھا کے ووٹ دینے کے لیے گھر سے لایا جاسکتا ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "اب یار' عوام بھی سمجھ گئے ہیں اب۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکثریت سیاسی چالبازیوں کی طرح عیار نہیں ہوئی۔ مداری ایک ہوتا ہے اور بے وقوف بن کے جادو کے کمال پر ہکا بکا کھڑا ہوا پورا مجمع۔ جادو کیا ہے اس کے ہاتھ کی صفائی ہوتی ہے جسے کوئی دیکھ اور سمجھ نہیں پاتا مگر ایک ہی تماشا بار بار ہو تو آہستہ آہستہ سب کو پتا چل جاتا ہے کہ اصلیت کیا ہے پھر بے وقوف کوئی نہیں بنتا۔ دیکھ لے اب ووٹ دینے والوں کا تناسب کتنا کم ہو گیا ہے اور روز بروز گھٹتا ہی جارہا ہے۔ اکثریت مایوس ہے اور جانتی ہے کہ نہ حکومت بدلے گی اور نہ نظام بدلے گا۔ انتخابات مداری کا کھیل ہیں اور مداری کے ہاتھ کی صفائی سے جیتنے والا ہار سکتا ہے' ہارنے والا جیت جاتا ہے۔"

میں نے کہا "یار' بالکل صحیح تجزیہ کیا تو نے۔ انتخابات کے نتائج تو پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ ماہرین کی ٹیم اعداد و شمار کے سارے گوشوارے مرتب کرلیتی ہے جو ٹی وی پر پیش کردیے جاتے ہیں اور اخباروں کو جاری ہو جاتے ہیں پھر دوسرے ماہرین کی ٹیم واہ واہ کا ڈھول پیٹتی رہتی ہے کہ کیا آزادانہ' منصفانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات تھے۔ یہ تین لفظ گویا سکہ رائج الوقت ہیں۔ اب ایک لفظ اور آگیا ہے۔ شفاف۔ نظام مصطفیٰ یا پھر نفاذِ شریعت جیسی اصطلاح کا کوئی مطلب ہے؟ قرآن اور سنت کے ہوتے اسلام کے نفاذ کی کوئی ضرورت ہے؟ کتنے اسلامی ممالک ہیں' کہیں کسی حکومت کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ لوگوں کو مسلمان بنانے کے لیے اسلام نافذ کرے۔ اسلام تو چودہ سو سال پہلے نافذ ہو چکا پھر احتساب کا نعرہ ہے۔ صوبائی محتسب بیٹھے ہیں۔ وفاقی محتسب ہے۔ آڈٹ اور اکاؤنٹ کے سیکڑوں محکمے ہیں۔ اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی ہے۔ اینٹی کرپشن کے ادارے ہیں۔ وہ سب آخر کس لیے ہیں مگر احتساب نہیں ہوتا۔ نیچے سے اوپر تک عدالتیں ہیں مگر انصاف نہیں ملتا تو "انصاف آپ کی دہلیز پر" کا نعرہ مقبول ہو جاتا ہے۔ خیر یار' یہ دل جلانے والی باتیں ہیں۔ میں بھی جذبات کی رو میں بہہ گیا۔ بات ہو رہی تھی شاہ عالم کی۔ اسے جب بیوروکریسی نے سیاسی منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کیا تو پھر وہ سیاست میں کیسے رہ سکتا تھا۔ ایک بار قتل کی کوشش ناکام ہو گئی تو اسے سیاسی موت مار دیا گیا۔ اس کے خلاف مقدمات بنا دیے گئے۔ پارٹی پر اس کے مخالفوں کا قبضہ کرا دیا گیا۔ اسے ہراساں اور بدنام کیا گیا۔ آج شاہ عالم اکیلا ہے۔ اس کا سیاسی کیریر ختم ہو چکا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں۔"

"آخر کوئی وجہ تو ہو گی اس کی۔"

"ضرور ہو گی اور شاہ عالم جانتا ہو گا کہ اس سے کوئی خطا ہے۔ امریکا' آرمی یا اسلام آباد۔ یہ تین الف راضی تو اللہ بھی راضی۔" میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "استغفراللہ۔ مایوسی نے کیسی کافرانہ سوچ پیدا کردی ہے۔ اب میں نے سیاست کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ خدا بخش مندرانی کے قتل نے میری ہر خوش فہمی دور کردی ہے۔ اپنی پارٹی سے میں پہلے ہی دستبردار ہو گیا تھا' اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھ میں سیاسی مداری بننے کی نہ صلاحیت ہے نہ طاقت اور مجھے ضرورت بھی کیا ہے۔"

رئیس ہنسنے لگا "بے بس اتنا ہی دم خم تھا؟ وزیراعظم کے گھوڑے۔"

میں نے کہا "یار رئیس۔ ویسے تو ہر بچہ خواب دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر انجینئر یا پائلٹ بننے کے۔ وزیراعظم کا عہدہ بہت بڑا اور قابل تعظیم ہوتا ہے۔ ذمے داری کے ساتھ ایک ملک اور قوم کا انتظام چلانا اور اس کی قیادت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ مگر جو کچھ یہاں ہو رہا ہے اس میں صلاحیت کا کوئی کام نہیں۔ صلاحیت کا مقابلہ ایماندارانہ ہو تو میں بھی مقابلے میں شامل رہتا۔ شاید کئی دن محنت اور مستقل مزاجی سے جیت بھی جاتا مگر یہاں وزیراعظم منتخب نہیں ہوتے' بنائے جاتے ہیں۔ یہ

SELECTION کا معاملہ ہے ELECTION کا نہیں اور میں جانتا ہوں کہ میرے جیسے اور مجھ سے لاکھ درجہ بہتر لوگ ہیں جو صرف اس لیے SELECT نہیں کیے جاسکتے کہ وہ الیکٹ کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ایماندار' محبِ وطن اور فرض شناس یا باضمیر آدمی کو اس نظام میں غیر ضروری اور خطرناک قرار دے دیا گیا ہے۔ رہی عزت کی بات تو جسٹس ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی کو حاصل ہے یا عمران خان کو ملی اور ستار ایدھی نے کمائی' اس کا عشرِ عشیر بھی کسی پاکستانی سیاست داں کو نہ مل سکتی ہے۔"

رئیس بڑی سنجیدگی سے منتظر نظر آرہا تھا "یار سیاست چھوڑ کے تو کیا کرے گا؟ یہ بھی سوچا ہے؟"

"ہاں' میں دوسرے دشمنوں سے نمٹوں گا۔"

"کون دوسرے دشمن؟"

"شاہ عالم کے دوسرے دشمن۔ کاروباری دشمن۔ جن کا اس کی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے اصل خطرہ انہی سے ہے کیونکہ وہ دو چار افراد نہیں۔ ایک پوری مافیا ہے۔ خادم اور عثمان اس کا ایک حصہ ہیں۔ میں نے بتایا تھا تجھے کہ یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ مافیا نہ منشیات اسمگل کررہی ہے اور نہ اسلحہ۔ یہ اس ملک کے تاریخی' تہذیبی اور ثقافتی ورثے کو اسمگل کررہی ہے۔ بڑی خاموشی سے اس ملک کے نوادرات کا خزانہ خالی کررہی ہے اور اپنے خزانے بھر رہی ہے۔ جب میں اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے تصور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس میں کون لوگ شامل ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ مختلف آثارِ قدیمہ کے معمولی چپراسی سے کسی میوزیم کے ڈائریکٹر تک۔ قومی ورثے کے نگراں' یعنی ARCHIVES۔ لائبریریاں' تاریخی مقامات' عجائب خانے' کون سی جگہ ہے جہاں یہ چور ڈاکو موجود نہیں۔ انہیں کوئی جانتا نہیں' پہچانتا نہیں۔ عام لوگ ناواقف ہیں کہ یہ ملک کے دشمن کیا کررہے ہیں۔ وہ جعلسازی سے اصل کی جگہ نقل رکھ کے اور اصل کو فروخت کرکے لاکھوں کروڑوں کمارہے ہیں۔ اس پر اخباروں نے واویلا کیا تھا۔ کچھ دردمند پاکستانیوں نے حکومت کی توجہ دلائی تھی۔ سرکاری تفتیشی اداروں نے اس کارروائی کا آغاز بھی کیا تھا مگر بعد میں سارے معاملات دبا دیے گئے اور سب خاموش ہو گئے۔ ہم نے خادم اور عثمان سے جو کمپیوٹر حاصل کیے تھے' اس میں یقیناً بہت کارآمد اور تفصیلی اظہاریہ ہے۔ اس لیے وہ شاہ عالم کے یعنی میرے دشمن ہو رہے ہیں کہ میں نے ان کے لیے کام کرنے سے انکار کردیا تھا۔ یہ ان کے لیے انتہائی غیر متوقع جھٹکا تھا۔ شاہ عالم ان کا سب سے اہم رابطہ تھا جس پر ان کے کاروبار کا انحصار تھا۔ وہ یہاں کی مافیا کا بگ باس تھا۔ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ جب میں نے اس دشمن کاروبار سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا تو اس مافیا کے ایوانوں کی بنیادیں ہل گئیں پھر میں نے خادم اور عثمان پر یہ بھی واضح کردیا کہ میرے عزائم کیا ہیں۔ اگر ان کا ریکارڈ میرے پاس نہ ہوتا تو وہ یقیناً مجھے کب کا مار چکے ہوتے لیکن انہیں یہ ڈر تھا کہ اس طرح مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ انہوں نے مجھے ہر طرف سے کارنر کیا اور بالآخر کل انہوں نے یہ کیا۔ انہوں نے میرے سامنے کوئی متبادل یا OPTION نہیں رکھا۔ مجھے صاف بتا دیا گیا ہے کہ نہ میرے لیے معافی ہے نہ تلافی۔ میری کوئی یقین دہانی کافی نہیں۔ ان کا سارا ریکارڈ انہیں واپس کرنے سے بھی بات نہیں بنتی۔ نہ میں اس کاروبار سے الگ ہو سکتا ہوں اور نہ بھاگ کے کہیں جاسکتا ہوں۔ میرا زندہ رہنا صرف ایک صورت میں ممکن ہے کہ میں حسبِ سابق ان کے لیے کام کرتا رہوں۔ ورنہ دوسری صورت میں موت میرا مقدر ہے اور موت بھی آسان نہیں ہو گی۔ اس سے پہلے نہ جانے کتنے عذاب سے گزرنا ہو گا مجھے۔"

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے تو نے پیارے؟" رئیس بولا۔

"یار' ان کا ساتھ دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاہ عالم کو مرنا ہی ہو گا اور مرنا ہے تو مشکل موت کیوں.... وہ خود مرجائے۔"

"یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟"

میں نے کہا "میں کوئی فاری تو نہیں بول رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ شاہ عالم کی وجہ سے اس کے لواحقین پر بھی عذاب آئے۔ اس کی بیوی رخشی' میرا مطلب ہے سابق بیوی' فرید عباسی یا ایک پاگل لڑکی منجم۔ یہ سب ایک جرائم پیشہ گروہ کی چیرہ دستی کا شکار ہوں۔ انہیں بھی فون پر ویسی ہی دھمکیاں دے کر ہراساں کیا جائے

جناب ایم اے راحت کے پراسرار قلم سے ایک پُراسرار داستان

نایاب

- برف کی وادیوں سے ابھرنے والے برف زادوں کی داستانِ حیرت۔
- دو دوستوں کی داستان' ایک شیر کی طرح بہادر اور دوسرا لومڑی کی طرح چالاک اور عیار۔
- شیر کی طاقت اور لومڑی کی مکاری رکھنے والے مل کر کالی طاقتوں سے ٹکرائے تو موت کو بھی پسینہ آگیا۔

ملنے کا پتہ: قیمت 100 اڈاک خرچ 20

ناشر: علی میاں پبلی کیشنز
۴۰، عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون: ۷۲۳۷۴۰۳
اسٹاکسٹ: علی بک سٹال
نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور۔ فون: ۷۲۳۸۵۴

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسے میری وکالت کرنے والے پرانے وکیل کو کیا گیا تھا' شاہ عالم کو مرجانا چاہیے۔ اس میں خود شاہ عالم کا اور اس سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔"

رئیس نے سرہلایا "مگر کیا شاہ عالم کا مرنا اتنا آسان ہوگا؟"

"یار' جب شاہ عالم مرے گے اور ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں دفن ہو کے پھر زندہ سلامت دنیا میں واپس آسکتا ہے۔ اور ثبوت فراہم کر کے عدالت سے اپنے اصل شاہ عالم ہونے کی سند حاصل کرسکتا ہے۔ تو اس کا مرنا کیا مشکل ہے؟ بس ایک پوسٹ مارٹم رپورٹ ہی تو چاہیے۔ اصل شاہ عالم کی موت کی تصدیق کرنے والی پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کیا گیا تھا۔ اس کے لیے دوسری بار پوسٹ مارٹم ہوا اور ایک اعلیٰ اختیاراتی' ماہر ڈاکٹروں پر مشتمل بورڈ تشکیل دیا گیا۔ اس کی رپورٹ ہم نے اپنی مرضی کے مطابق حاصل کرلی تھی لیکن رپورٹ چیلنج ہی نہ ہو تو کوئی چکر نہیں۔ شاہ عالم اب مرگیا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ سوئم' چہلم اور تمت بالخیر۔"

"شاہ عالم کے مرجانے کے بعد تیرا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں ہوگا۔ یہ چھ مہینے میں اپنی زندگی میں سے خارج کردوں گا۔ یہ سمجھ لوں گا کہ ضائع ہوگئے۔ جیسے جیب کٹ جائے تو حلال کی کمائی بھی نکل جاتی ہے۔ آدمی صبر کرتا ہے کہ نقصان ہوا تھا' ہوگیا۔ یہ ایک تجربہ تھا یا پاگل پن تھا۔ یا ناصر عظیم نے مجبوری میں چھ مہینے تک شاہ عالم بن کے زندگی گزارنے کی کوشش کی۔ چالاکی' عیاری' اداکاری' جوڑ توڑ' میرا پھیری' چکربازی۔ سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔ اس کا ساتھ دینے والے بھی تھے مگر بالآخر جو ناممکن تھا وہ ناممکن ثابت ہوگیا اور ناصر عظیم نے اسے تسلیم کرلیا۔ اس نے اپنی ہار مان لی اور الٹے پاؤں اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ آیا۔ واپسی کے راستے پہلے بھی بند نہ تھے مگر وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک وقت آتا ہے جب کوہ پیما جو کسی پہاڑ کی چوٹی کو تسخیر کرنے نکلتے ہیں' یہ محسوس کرتے ہیں کہ اب پیش قدمی خودکشی ہے۔ وہ پہلے ہی کیمپ سے لوٹ آئیں یا آخری کیمپ تک پہنچ کے واپسی کا طے کرلیں۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔ اس وقت جب آگے جانے کا مطلب موت ہو تب پلٹ آنا ہی عقلمندی ہے۔"

"تم اللہ کی۔ اپن تو تیرے ساتھ ہیں۔ تو اپنا نام ناصر عظیم سے بدل کے شاہ عالم رکھ یا شاہ عالم سے بدل کے وسیم اکرم رکھ لے۔ ہمیں نہ تیرے نام سے غرض نہ تیرے کام سے مگر یار' میں یہ سوچ کے خوش ہو رہا ہوں کہ اور سب کتنے خوش ہوں گے۔"

"اور سب کون؟"

اعظم۔ "ایسے جو چھ مہینے پہلے ناصر عظیم کے لیے سب کچھ تھے' خان محمد۔ ان کا فیصلہ نہیں بدلتا۔"

"یار' سب بدل جاتا ہے۔ آدمی کرنل ہو یا جرنل۔ اس کا دل تو پتھر کا نہیں ہوتا اور جب کسی نے باپ کی طرح پالا ہو تو دھری رہ جاتی ہے اکڑفوں۔ تو مجھ سے شرط لگالے۔ میں ابھی فون کرتا ہوں کرنل صاحب کو کہ شاہ عالم کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ بے ہوش پڑا ہے فلاں اسپتال میں اور آپ کو یاد کررہا ہے۔ دیکھ کیسے دوڑتا ہوا آتا ہے گھوڑے کی طرح تیرا خان اعظم۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایسی بات سن کے تو خود ان پر دل کا دورہ پڑجائے گا۔ وہ ساتھ والے بیڈ پر آکے لیٹ جائیں گے۔"

"اس عمر میں سب بے وقوفی کرتے ہیں۔ ایسے ہی لڑبھڑ کے گھر سے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کسی لونڈیا کے چکر میں گھر چھوڑ دیتے ہیں تو کبھی ہیرو بننے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ مگر سب لوٹ کے آتے ہیں اپنے گھر اور انہیں دروازے کھلے ملتے ہیں اور یار' تیرے لیے تو وہ خود کھولے گی سب دروازے" وہ ہنسا۔

میں نے کہا "کون ...چندا... نہیں یار' پتا نہیں کیوں' اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں اس کے قابل نہیں رہا۔ وہ ناصر عظیم نہیں رہا جس کو چندا چاہتی تھی۔ وہ بڑی حساس اور بہت نازک دل لڑکی تھی... میں نے جو بھی کیا' اس کے بعد... بڑا فرق پڑگیا ہے... درمیان میں یہ چھ مہینے ایک خلیج کی طرح حائل ہوگئے ہیں۔ ہاں قمر کی بات اور ہے۔ سب سے پہلے وہ گلے لگ کے روئے گی اور خوب روئے گی۔ گلے شکوے کرے گی۔ ڈاکٹر فاروقی بہت ذلیل کرے گا مجھے۔ بہت گالیاں دے گا مگر اس کی ناراضی کچھ نہیں۔ انہیں منانا آسان ہوگا میرے لیے۔ وہ خود ہی من جائیں گے۔"

"پھر ٹھیک کام میں دیر کیسی پیارے' صبح مرجا۔"

میں نے کہا "اب اتنا آسان بھی نہیں ہے ایک مشہور آدمی کا مرنا۔ خادم اور عثمان سے تو میں نے یہی کہا ہے کہ میں ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میں یا تو خودکشی کرلوں گا یا روپوش ہوجاؤں گا کسی بہانے کے لیے۔ وہ کسی طرح جان چھوڑنے پر راضی ہی نہیں تھے اور میں انہیں قبل ازوقت کوئی چیلنج دے کر ہوشیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

"روپوشی والا آئیڈیا بھی برا نہیں مگر ہوسکتا ہے وہ اتنی جلدی مایوس نہ ہوں۔ وہ تجھے تلاش کرتے رہیں۔ جب تک تو ناصر عظیم تھا ایک گمنام آدمی تھا۔ اب اسی شہر میں اور اسی ملک میں رہ کے تو کب تک لوگوں کی نظر سے چھپ سکتا ہے۔ سیاسی کارکن' اخبار والے' پولیس اور تیرے سب دشمن؟"

"انہوں نے کہا تھا کہ مجھے تلاش کرنے والی ہزار آنکھیں ہوں گی ہر جگہ" میں نے کہا "غائب ہونے کا بس ایک ہی طریقہ ہے کہ میں اپنا حلیہ بدل لوں۔"

"کیسے؟ میک اَپ سے...؟"

"میک اَپ کے ساتھ زندگی نہیں گزاری جاسکتی۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں شیو کرنا چھوڑ دوں تو دو مہینے میں صوفی نظر آؤں گا۔

ایک مشت سے زیادہ ہی ہوجائے گی داڑھی۔ اس کے ساتھ مونچھیں بھی چھوڑ دوں تو چہرہ خاصا بدل جائے گا۔ سر کے بالوں کا ہیراسٹائل بدلا جاسکتا ہے۔ اگر میں درمیان سے مانگ نکالنے لگوں اور بال لمبے رکھ لوں۔ رات کو زیرو نمبر کا چشمہ اور دن میں گاگلز لگا کے پھروں تو کسی کو مجھ پر شاہ عالم ہونے کا شک نہیں ہوگا۔"

رئیس قہقہہ مار کے ہنسا۔ "قسم اللہ کی۔ مجھے تو تصور میں تیرا چہرہ دیکھ کے ہنسی آرہی ہے۔ اس کے ساتھ تو لباس بھی بدل لے تو گارنٹی میری' یہ سالے خادم اور عثمان دوربین لگا کے بھی تیرا معائنہ کریں تو تجھے پہچان نہیں سکتے۔ باندھ لے چارخانے والی لنگی' اوپر بنین لے کھدر کا کرتہ۔"

"سر پر پگڑی اور ہاتھ میں حقہ" میں نے کہا "پیروں میں ملتانی کھسہ۔ مگر یار' اتنا کرنے کی ضرورت نہیں ابھی کچھ دن تو مجھے شاہ عالم کے کام نمٹانے ہیں۔ ان کی ساری جائداد ارخشی کے نام کرنی ہے۔ پیسہ اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرنا ہے۔ اس کے لیے مجھے عباسی کو اپنے ساتھ لے کر اس کے کزن فیصل کے پاس جانا ہوگا۔ نہ جانے کب اور کیوں شاہ عالم نے فیصل کو بے عزت کیا تھا۔ مجھے تو معلوم نہیں تھا۔ عجیب صورت حال ہوگئی اس سے۔ اس نے انکار بھی کردیا میرا وکیل بننے سے اور اچھا خاصا ذلیل بھی کیا۔ فرید عباسی کو وہ انکار نہیں کرے گا اور معاملہ بھی ہوگا رخشی کا۔ میرے اپنے مقدمات کی اب کوئی اہمیت نہیں رہی۔ کچھ ختم ہوجائیں گے کچھ واپس ہوجائیں گے۔ پارٹی کے معاملات میں نے پہلے ہی چھوڑ دیے ہیں۔ اب مصالحت اور دستبرداری کی رسمی کارروائی باقی ہے۔ دو دن میں یہ سب ہوجائے تو میں شاہ عالم کے مسائل اور اس کی ذمے داریوں سے آزاد۔ پھر میں سوچوں گا روپوشی کا کوئی مؤثر طریقہ۔ شاہ عالم کے پاس بیک وقت تین پاسپورٹ ہیں۔ برطانیہ اور کینیڈا کی شہریت ہے۔ میں کہیں بھی چلا جاؤں اور جانے سے پہلے پریس کانفرنس میں یا وہاں جاکے اعلان کردوں کہ میرا ارادہ اب لوٹ کے پاکستان آنے کا نہیں ہے تو اس کی میں ایک سو ایک وجوہات بتا سکتا ہوں کہ یہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ سیاست دانوں نے اور بیوروکریسی نے' پولیس نے اور میرے اپنے ساتھیوں نے مجھے جیتے جی مارا اور اب پھر مجھے خطرہ تھا کہ میں پاکستان میں رہا تو مجھے خود سرکاری مشینری قتل کرادے گی پھر کچھ عرصہ باہر خاموشی سے گزار کے میں ایسے پاکستان لوٹ آؤں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ تین ملکوں کا شہری کہیں بھی آسانی سے غائب ہوسکتا ہے۔ دو چار مہینے پس منظر میں رہنے والے شاہ عالم کو یہاں سب بھول جائیں گے۔ بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ میں اسی شہر میں اطمینان سے رہ کے وہ سب پھر کرسکتا ہوں جو ناصر عظیم کرتا تھا۔ یا اب کرنا چاہتا ہے۔ اس روپوشی اور خاموشی سے ایک اور فائدہ یہ ہوگا کہ میرے دشمن بھی مطمئن ہوکے بیٹھ جائیں گے۔ انہیں مجھ سے کوئی خطرہ لاحق نہیں رہے گا تو وہ میری تلاش ترک کردیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ میں بھاگ گیا۔ میں بزدل تھا اس لیے میں نے روپوشی میں ہی عافیت جانی۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ وہ بے فکر ہوکے اپنے کاروبار میں لگ جائیں۔ دو چار مہینے میں اگر کوئی طریقہ سمجھ میں آگیا تو شاہ عالم کی موت واقع کرنے کا تو یہ قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کردیں گے۔ تب تک وہ ایک غیر معروف شخص ہوگا۔ اس کی موت سے کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوگی اور شاید اخبار میں اس کی تدفین کی خبر بھی کالی ہوگی۔ لوگ پڑھ کے کہیں گے کہ اچھا؟ وہ بچ بچ مرگیا اس بار؟ چلو خس کم جہاں پاک۔"

"تو سب ایسے ہی ہوسکتا ہے پیارے جیسے تو چاہتا ہے۔ چھ مہینے کے الجھے ہوئے معاملات سال بھر میں سدھر جائیں گے مگر ایک مسئلہ اور بھی ہے جس کی تو بات ہی نہیں کرتا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "تیری مراد ہے شبنم؟"

"ہاں۔ شاہ عالم کے ایک بار مرنے سے اس کی یہ حالت ہوگئی۔ کیا وہ دوسری بار اس کی موت کا صدمہ برداشت کرلے گی۔ بڑی مشکل سے تو نے یقین دلایا تھا اسے... کہ تو ہی شاہ عالم ہے۔"

"میں نے نہیں یار' میرے یا عدالت کے کہنے سے وہ قائل نہیں ہوئی تھی۔ خواہ ساری دنیا مجھے شاہ عالم جان لیتی۔ اگر وہ خود مجبور نہ ہوتی اپنے دل کے ہاتھوں تو جھوٹ کو جھوٹ ہی کہتی۔"

"پھر اب کیا بنے گا اس کے مجبور دل کا؟"

"یار' یہ انسان کی نفسیات ہے۔ کسی کے بچھڑنے کا صدمہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو لیکن مرنے والوں کے ساتھ مرتا کوئی نہیں۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کے ہم اسے قبول کرلیتے ہیں۔ اصل اذیت ہوتی ہے جیتے جی بچھڑ جانے والوں کے خیال سے۔ جب کسی ماں کا لال کھو جائے۔ کسی کی بیٹی غائب ہوجائے۔ کسی کا محبوب لاپتا ہوجائے اور پھر اس کی زندگی اور موت کے بارے میں کوئی خبر ہی نہ ملے۔ آدمی امید اور ناامیدی کے درمیان بے یقینی کے پُل صراط پر چلنے کے لیے مجبور ہو۔"

رئیس نے سرہلایا "ہاں یار۔ یہ تو ہے۔ مرنے والوں کو آدمی رو دھو کے بالآخر صبر کرلیتا ہے۔"

"شاہ عالم مرجائے گا تو شبنم خودکشی نہیں کرے گی۔ اس کے لیے جذباتی صدمہ زیادہ شدید ہوگا کہ شاہ عالم کو اس نے کھو کے پایا لیا تھا اور اس بار اپنانے میں بھی کامیاب ہوگئی تھی کہ موت نے اسے پھر چھین لیا۔ ممکن ہے یہ صدمہ وقتی طور پر اس کو پاگل کردے مگر وہ بڑی مضبوط قوت ارادی رکھنے والی لڑکی ہے۔ ایسے لوگ خودکشی نہیں کرتے۔ وہ بالآخر حقائق سے سمجھوتا کرلے گی اور سب کچھ بھول جائے گی۔ زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی موت کو بھول جائے۔"

رئیس کو رات کے آخری پہر میں نیند آگئی مگر میں جاگتا رہا۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان بلاخیز موجزن تھا جس میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرا وجود کسی بیکھے کی طرح ماضی اور حال کے نصیب و فراز میں بھٹک رہا تھا۔ یہ رات اس لمبی طرح تھی جس نے مجھے یقین کے ساحل کی طرف اچھال دیا تھا۔ سراب کی طرح نظر آنے والے بے وجود مستقبل کے پیچھے دوڑنے والا ناصر عظیم یقین کے سارے ساحلوں اور اعتبار کے سب رشتوں سے محروم ہو کے اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ خود اپنی نظر میں اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا اور ڈرتا تھا کہ اس کا اپنا سایہ بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔ شاہ عالم بن کے وہ ایک ہجوم میں گھر گیا تھا جس میں صرف خود غرض' بے مروت اور نامہرباں چہرے تھے۔ خلوص و مہر و وفا سے نا آشنا بے حس آنکھیں تھیں۔ زہریلی زبانیں تھیں اور چھرا اٹھانے والے ہاتھ تھے۔

لیکن وہ رات جو اب ختم ہو رہی تھی' طوفان کے آخری تھپیڑے کے بعد سلامتی کے ساحل کی امید رکھتی تھی اور ناامیدی کے تاریک افق پر صبح کے آثار میں میری نگاہ امید کا روشن کنارہ دیکھ سکتی تھی۔ اس رات نے مجھے حوصلہ دیا تھا کہ میں پُرفریب مجبوریوں کی ہر زنجیر کو توڑ سکوں۔ میں خود فریبی کے حصار سے نکل آیا تھا اور اب مجھے اپنی اصل زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر جوڑنا بالکل ناممکن نہیں لگتا تھا۔

قمر اور ڈاکٹر فاروقی کی شادی میں ناصر عظیم کو کسی نے نہیں بلایا تھا مگر وہاں شاہ عالم کے ساتھ غیریت کا اظہار اور دیدہ دانستہ بداخلاقی کا مظاہرہ' درحقیقت کیا تھا؟ کیا وہ شکایت کے رنج اور دکھ کے غصے کا اظہار نہیں تھا؟ یا اس انکار کے پردے میں کیا اپنائیت کا اقرار پنہاں نہیں تھا؟ یا احتجاج کا اعتراف نہیں تھا کہ وہ شاہ عالم کے آنے پر نہیں ناصر عظیم کے نہ آنے پر غم زدہ ہیں۔ اس خوشی کے موقع پر دکھی ہیں کیونکہ ناصر عظیم ان کی خوشیوں میں شریک نہیں ہے۔ وہ سب رنجیدہ تھے اور خفا تھے۔ اس لیے کہ ابھی تک وہ ناصر عظیم کو بھولے نہیں تھے۔ ان کے احساس کے زخم تازہ تھے۔ درد کا رشتہ ابھی باقی تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا' اگر شاہ عالم کوئی اجنبی ہوتا یا وہ ناصر عظیم کو بیچ بیچ بھول چکے ہوتے تو ان کا یہ رویہ نہ ہوتا۔ بن بلائے اگر مسلم لیگ یا پیپلز پارٹی کا کوئی راہنما آجاتا تو انہیں کیا فرق پڑتا لیکن شاہ عالم کوئی سیاسی لیڈر نہیں تھا۔ وہ ناصر عظیم تھا جسے دیکھ کے ان کو یوں لگا تھا جیسے وہ ان کے زخموں پر نمک پاشی کرنے آیا ہے۔ انہوں نے نہ جانے کتنی مشکل سے اس کو نظر انداز کر کے بھول جانے اور مدعو نہ کرنے کے فیصلے پر عمل کیا تھا اور ناصر عظیم پھر بھی شاہ عالم کے بھیس میں آگیا تھا۔ جیسے چور ڈاکو اور مفرور مجرم قانون کی نظر سے بچ کے بہنوں کی رخصتی کے وقت پہنچ جائیں تب بھی اپنا اصل چہرہ کسی کو نہیں دکھاتے۔

ڈاکٹر فاروقی نے مجبوری میں مجھے خوش آمدید نہیں کہا تھا مگر سب کے سامنے اس نے مجھے بے عزت بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے جذبات میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ قمر سے میں ملا ہی نہیں تھا مگر خان اعظم اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تھے اور چند انے بھی بے اختیائی کا شعوری انداز اپنا کے مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ میری تقصیر قابلِ معافی نہیں لیکن ان کا یہی رویہ اس بات کا ثبوت تھا کہ ابھی تک وہ مجھے اپنے دل سے نکال نہیں سکے اور ناصر عظیم کے لیے دوبارہ ان کے دل میں جگہ بنانا مشکل ضرور ہوگا' ناممکن نہیں۔ وہ کب تک اپنے دل کے دروازے بند کیے ناصر عظیم کی دستک کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ کب تک اسے انکار کر سکتے ہیں۔ کب تک اس کے ساتھ غیریت کا جھوٹا ڈراما رچانے کی اذیت برداشت کر سکتے ہیں۔ بالآخر انہیں اس کو اپنانا ہی ہوگا۔ وہ بے بس ہو جائیں گے اور مجبور ہوں گے کہ گھر لوٹ آنے والے کے لیے گھر کے دروازے کھول دیں اور اسے پرانی اپنائیت بھرے آنسوؤں کے ساتھ گلے لگا لیں۔

نہ جانے کب میں نے محسوس کیا کہ میں رو رہا ہوں۔ یہ دکھ اور پچھتاوے کے ہی نہیں' خوشی کے آنسو بھی تھے جو امید کے ایک خواب آنکھوں میں اتر آئے تھے۔ کھڑکیوں پر صبح کے اجالے کی سفیدی پھیلنے لگی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آزمائش اور عذاب کی آخری رات کے بعد یہ میری اپنی زندگی کی وہی پرانی جانی پہچانی دلدار صبح ہے جس میں سب کچھ وہی ہے اور ویسا ہی جیسا ناصر عظیم کے لیے تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کال کوٹھری میں چھ مہینے تک پھانسی گھاٹ پر اپنی موت کا منظر سوتے جاگتے دیکھنے والا وہ قیدی ہوں جو اچانک بے گناہی کی سند پر رہا ہو کے اپنے گھر پہنچ گیا ہو اور اپنے گھر کے آنگن میں اترنے والی اس صبح کو پھر دیکھ رہا ہو جس کا تصور بھی پھانسی گھاٹ کے کنوئیں کی تاریکی میں ناممکن تھا۔

اس گزر جانے والی رات نے مجھ پر ایک احسان یہ بھی کیا تھا کہ مجھے خادم اور عثمان جیسے سفاک اور بے ضمیر دشمنوں کی زنجیرِ غلامی سے رہائی عطا کی تھی۔ وہ میرے اغوا کی کوشش میں کامیاب ہو جاتے تو شاید اس صبح کا اجالا شاہ عالم کے کسی گمنام بے نشاں مدفن کی گہرائی تک نہ پہنچ پاتا اور کوئی نہ جان پاتا کہ وہ شاہ عالم نہیں ناصر عظیم تھا جو لوٹ کے اپنی زندگی کی طرف' اپنے گھر کی طرف' اپنے خوابوں کی تعبیر کی طرف' سچائی کی طرف اور سکون و عافیت کی طرف جانا چاہتا تھا۔

لیکن قدرت کے بچانے والے ہاتھ نے مارنے والے ہاتھ کو روک لیا تھا اور مجھے بخش دیا تھا۔ میرے لیے ایک جھوٹی' مصنوعی' مکروفریب' لالچ اور ہوسِ اقتدار سے بھری ہوئی شاہ عالم کے بہروپ میں گزاری ہوئی زندگی کی سزا کو قدرت نے کافی سمجھا۔ جس میں مجھے نفرت کی بے سکونی' خوف کی اذیت اور اکیلے پن کے عذاب کو چھ ماہ کی قید کے ساتھ ملنے والی مشقت کی طرح برداشت کرنا پڑا مگر میرے اعمال کی خرابی اور گناہوں کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے یہ بھی مجھے اپنی خوش قسمتی اور خدا کی رحمت و عنایت نظر آئی تھی کہ میں نے پھر اپنی زندگی جینے کا حق حاصل کر لیا۔ میں خادم

اور عثمان جیسے خطرناک دشمنوں کی سازش کے جال کو توڑ کے نکل آیا۔

میں رئیس کو سوتا چھوڑ کے باہر نکل آیا۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا مگر آسمان روشن تھا۔ بیرونی گیٹ مقفل تھا اور اندر کیبن میں تعینات مارخان کرسی پر مستعد بیٹھا اپنی مونچھوں کو نہ جانے کون سا طلسماتی ہیئر ٹانک پلاتے ہوئے شیشے میں اپنی صورت ملاحظہ فرما رہا تھا۔ وہ عجیب شخص تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ سپرے پر دیکھا اور وہ مجھے کبھی سوتا ہوا یا غافل نظر نہیں آیا۔ عام طور پر رات اور دن کے چوکیدار الگ ہوتے ہیں اور جو دن میں چوکیدار کی ضرورت محسوس نہیں کرتے وہ رات کے چوکیدار کو بارہ گھنٹے سے زیادہ نہیں رکھتے۔ ایک تیس مارخان تھا جو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی دیتا تھا۔

مجھے دیکھ کے اس نے مونچھیں ہلائیں اور مسکرایا "السلام علیکم ہوتی صاحب۔"

میں نے کہا "وعلیکم السلام۔ کیا بات ہے تیس مارخان۔ تم سوتے نہیں ہو۔ نیند کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تمہیں؟"

اس نے آئینہ رکھ دیا "جناب عالی۔ ہم ادھر چھ گھنٹے سوتی روز۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کب سوتے ہو تم' میں نے تو کبھی نہیں دیکھا؟"

اس نے کہا "ہم سوتی صاحب۔ ایک گھنٹا میں پندرہ منٹ سوتی۔ چار گھنٹا میں ایک گھنٹا پورا کرتی۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا مطلب؟ تم چوبیس گھنٹے یہی کرتے ہو؟ پندرہ پندرہ منٹ سو کے چھ گھنٹے پورے کر لیتے ہو؟"

اس نے سمجھایا "آپ کاغذ پر حساب کرتی۔ جواب ٹھیک آتی۔"

میں نے کہا "بندۂ خدا۔ حساب کے قاعدے کی رو سے تو چھ گھنٹے پورے ہو جاتے ہیں اس طرح مگر یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟"

وہ مسکرانے لگا "اپنا اپنا طریقہ ہوتی جناب۔ آپ صبح کا سیر کے واسطے جاتی' ہم اجازت نہیں دیتی۔"

"کیا؟ باہر جانے کے لیے مجھے تم سے اجازت لینی ہوگی؟"

"ہم گیٹ نہیں کھول سکتی جناب عالی۔ رئیس خان صاحب کا حکم ہوتی۔"

میں نے خفگی سے کہا "فضول باتیں مت کرو' چابی نکالو۔"

اس نے تلاشی دینے کے انداز میں ہاتھ اٹھا دیے "چابی ہمارے پاس نہیں ہوتی' رئیس خان صاحب لیتی۔"

میں غصے میں اندر گیا اور لات مار کے رئیس کو جگایا "ارے یہ کیا ہے۔ تو نے قید کر رکھا ہے مجھے یہاں۔"

وہ آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا "رات بھر جاگنے کے بعد تو منہ اندھیرے کیا مسجد جا رہا ہے نماز پڑھنے؟"

میں نے کہا "میں جا رہا ہوں ریوڑی کھانے' تجھے کیا؟"

"دیکھ یار' رات کو کیا کہا تھا تو نے اور صبح کیا ضد کر رہا ہے۔ سالے شکر کر زندہ سلامت یہاں پہنچ گیا تھا۔ باہر گیا تو لوٹ کے آنا نصیب نہیں ہوگا۔ سارے شہر کی پولیس اور ان کے مخبر تلاش کرتے پھر رہے ہیں تجھے۔ خدا بخش مندرانی کے نمک خوار بھی تیرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ تجھے کچھ دن ایسے غائب رہنا چاہیے۔"

میں نے ہار مان کے کہا "لیکن یار۔ مجھے کچھ کام نمٹانے ہیں۔"

اس نے میری دلیل کو مسترد کر دیا "ویسا کوئی کام نہیں اور ہے تو ہمیں بتا' ہم سے نہ ہو تو کہنا۔"

میں نے کہا "میں بات کرنا چاہتا تھا فرید عباسی سے۔"

"ابھی وہ سو رہا ہوگا اور بات کرنے کے لیے باہر جانا ضروری نہیں ہے' موبائل فون آخر کس لیے ہیں؟"

میں نے میز پر رکھے ہوئے اپنے اور اس کے موبائل فونوں کو دیکھا "بات کی حد تک ٹھیک ہے مگر مجھے عباسی کے ساتھ وکیل کے آفس تو خود ہی جانا پڑے گا۔"

"دیکھ پیارے۔ اب تو ہے ہمارا مہمان۔ دل جگر جان سب پہلے بھی تھا مگر اب تیری حفاظت کرنا اپنی ذمے داری ہے۔ تو نے جو کہا وہ اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہے اپنی اور مجھے بھی اس کے مطابق چلنا ہے۔ احتیاط کے ساتھ اور سوچ سمجھ کے قدم نہ اٹھایا تو سب چوپٹ ہو جائے گا بیٹا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ دھوبی کا گدھا۔ نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔"

"گدھا نہیں' کتا ہے محاورے میں۔"

"ابے محاورہ غلط ہے۔ اپن نے تو دیکھا نہیں کسی دھوبی کے پاس کتا۔ ایک گدھا ضرور ہوتا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ابھی شاہ عالم کی پوزیشن بہت خطرناک ہے۔ تجھے بہت سنبھل کے رہنا ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں پیارے کہ اب ہم چوبیس گھنٹے رئیس خانے سے باہر نہیں نکلیں گے۔ آج میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔ ایک تو مجھے یہ جگہ بھی محفوظ نہیں لگتی۔ کچھ دن کہیں اور رہیں گے۔ ایک جگہ ہے میری نظر میں۔ کیا پتا تجھے کسی نے میرے ساتھ یہاں آتے جاتے دیکھا ہو۔"

"دیکھا تو کل شام بھی تھا۔ وہ موٹر سائیکل والا لونڈا جس کی شرٹ پر لکھا ہوا تھا "نومی بے بی"۔ وہ یہیں سے ہمارے پیچھے لگا تھا۔ اس کے علاوہ... خدا بخش مندرانی کے گھر میں اس کے ملازم' سیاسی مشیر اور دوست بھی شاید جانتے ہوں گے کہ تو نے ہی ہماری ملاقات کے معاملے میں اہم کردار ادا کیا تھا" میں نے کہا۔

"تیرا میرا تعلق کسی سے چھپا ہوا ہے یار؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "پھر تو یہاں کوئی بھی آسکتا ہے۔ کسی بھی وقت۔"

"یار' تو پریشان مت ہو۔ پولیس چھاپا مارے یہاں' گرفتار کر لے مجھے تفتیش کے لیے۔ خانہ تلاشی لے سگر تجھے برآمد نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر سکتی یہاں سے۔"

میں نے کہا "تو کیا مجھے بادو سے غائب کروے گا؟"

"جادو سے نہیں پیارے۔ یہ اپنی دور اندیشی تھی کہ جب رئیس خانے کا نقشہ بنایا تو یہ بات نہیں بھولے کہ آنے جانے کا ایک خفیہ راستہ ضرور ہونا چاہیے۔ ہم جیسے لوگوں کا کیا ہے' کبھی ایک دم سر پر پاؤں رکھ کے بھاگنا پڑے اور لگتا ہے کچھ ایسا کہ تیرے ساتھ ہمیں بھی روپوش ہونا ہی پڑے گا۔"

میں نے کہا "یار' کیوں نہ ہم ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلیں؟"

رئیس نے انکار میں سر ہلایا "بہت مشکل ہے۔ ان حالات میں اگر تو ایک بار پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو پھر بیٹا کوئی امید مت رکھنا۔ یہ جو خادم اور عثمان اینڈ کمپنی ہے نا۔۔۔ انہی کا دیا کھاتی ہے پولیس۔ رات کو تو نکل آیا بارد ھاڑ کرکے اور کچھ اخبار والوں کی مدد سے۔۔۔ مگر پولیس تجھے خود باندھ کے ان کے سامنے ڈال دے گی۔ ضمانت قبل از گرفتاری اس کیس میں اول تو ہوگی نہیں۔ تجھے اور مجھے ریمانڈ پر سی آئی اے کے حوالے کردیا جائے گا۔ کم سے کم پندرہ دن کے لیے اور اس کے بعد اگر وکیلوں کی بھاگ دوڑ سے ہائی کورٹ نے ضمانت کردی تو وہ ہوگی صرف پولیس کی حد تک۔ یہ جو شاہ عالم کے دو سرے دشمن ہیں' وہ کہاں چھوڑیں گے تجھے۔"

میں نے کہا "تو کس جگہ کی بات کررہا تھا' جو محفوظ ہے۔"

"میرے بلیڈ کا اڈا ہے۔ وہ سٹہ کراتا ہے وہاں۔ فیروز پور روڈ پر ایک نامکمل کوٹھی ہے۔ کئی سال سے ایسے ہی پڑی ہے۔ وہ خود پورا نہیں کراتا اسے مگر اندر سے رہنے کے قابل ہے اور ایک کرائے دار کے پاس ہے۔ کرائے دار صورت شکل سے بڑا مسکین اور مولوی ٹائپ لگتا ہے مگر دھندا کرتا ہے پرائز بانڈز کے نمبروں کا اور کرنسی کا۔ فیملی کے ساتھ رہتا ہے اس لیے کسی کو شک نہیں۔ آس پاس کے لوگ مسجد میں بھی آتے جاتے دیکھتے ہیں اور شریف آدمی سمجھتے ہیں۔ گیراج ہے جیرے کے پاس۔ وہ گاڑی اندر کھڑی کرتا ہے اور اندر سے ہی نیچے تہ خانے میں اتر جاتا ہے۔ نیچے کے آدھے حصے میں ایک بڑا ہال ہے اور دو بیڈ روم ہیں۔ کچن باتھ روم ہر چیز موجود ہے۔ وہ سب سے اچھا ٹھکانا ہے۔ جیرے کی گاڑی کے شیشے بھی کالے ہیں۔ باہر نکلیں گے تو اسی کو استعمال کریں گے۔"

میں نے کہا "یار' سارا بندوبست ہے تو پھر دیر کیسی۔ کیا تو چھاپا پڑنے کا انتظار کررہا ہے؟"

"ہاں۔ جلدی کیا ہے' کچھ اندازہ تو ہو کہ پولیس کو واقعی ہماری تلاش ہے۔ ہم ایسے ہی ڈر کے بھاگ جائیں پہلے سے۔"

میں نے کہا "نہیں رئیس خان۔ اب مجھے وحشت ہونے لگی ہے' یہ جگہ واقعی کسی طرح سے بھی محفوظ نہیں۔"

رئیس نے تمیں مار خان کو طلب کیا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ "باہر سے تالے لگا۔ گیٹ بند کرا اور گاڑی لے کر دفع ہوجا۔ جب تک میں نہ بلاؤں' خبردار جو ادھر کا رخ بھی کیا۔"

"ہم دفع ہوتی جناب رئیس اعظم" اس نے سیلیوٹ مارا اور چلا گیا۔

اس کے جانے کے آدھے گھنٹے بعد پولیس کی نفری نے وہاں چھاپا مارا مگر وہ گھنٹیاں بجا کے اور دروازے کو پیٹ کر ناکام لوٹ گئے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ گھر مقفل ہے اور اندر کوئی بھی نہیں ہے۔ تالے توڑ کے اندر آنے کی حماقت انہوں نے نہیں کی۔ رئیس نے بڑے اطمینان سے نہا دھو کے کپڑے بدلے۔ اس وقت تک سورج خاصا اوپر آچکا تھا۔ میرا بھوک سے بھی برا حال تھا اور مجھے صبح کے اخبار دیکھنے کی جلدی تھی۔ آزاد صاحب گواہ بنانے کے لیے دو سرے اخباری نمائندوں کو بھی ساتھ لے آئے تھے۔ اس طرح انہوں نے ایک خصوصی خبر کی قربانی دی تھی ورنہ خادم اور عثمان کے بازیاب ہونے کی سنسنی خیز اطلاع صرف ان کا اخبار دیتا۔ دو سرے سب اخبارات نے کیا خبر دی اور پولیس کے آنے کے بعد خادم اور عثمان نے کیا بیان دیا' یہ سب مجھے معلوم نہیں تھا۔ ثبوت اور گواہی کے بغیر بھی وہ کہہ سکتے تھے کہ ساری قتل و غارت گری کا ذمے دار شاہ عالم ہے جس نے ان کے سامنے دو بندے مار دیے اور تیسرے کو ناک آؤٹ کردیا جو ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور تھا اور شاہ عالم کو وہاں لایا تھا۔ اشتعال کی کیفیت میں وہ سوچے سمجھے بغیر کچھ بھی بک سکتے تھے خواہ بعد میں اپنی کہی ہوئی بات خود ان کے لیے مصیبت کا سبب بن جائے۔ وہ بہت سے سوالوں کا کوئی جواب دے کر کسی کو مطمئن نہیں کرسکتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ اتنا عرصہ کہاں روپوش رہے اور کیوں؟ اس کوٹھی میں وہ کیا کررہے تھے۔ شاہ عالم وہاں کیسے پہنچ گیا اور مرنے والے دونوں آخر کون لوگ تھے؟

اس کے علاوہ مجھے خدا بخش مندرانی کے کیس کی پیش رفت سے بھی دلچسپی تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ پولیس نے اس کیس میں مجھے یا رئیس کو کس حد تک ملوث کیا ہے۔ اسی حساب سے ہمیں اپنی دفاعی حکمت عملی تیار کرنا تھی اور اپنے لیے حفاظتی اقدامات کرنے تھے۔ رئیس کی بے فکری کسی حد تک جائز تھی کیونکہ وہ اس قتل میں براہ راست ملوث نہیں تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ ملک خدا بخش کا خاص آدمی تھا اور اس سے کس قسم کے خاص کام لیے جاتے تھے۔ خدا بخش کے ساتھ مجھے ملوانے سے اس کے خلاف کوئی کیس نہیں بن سکتا تھا۔ وہ نہ جانے کتنے لوگوں کو خدا بخش سے ملواتا تھا اور اس جیسی معمولی حیثیت کے ملازم اور نمک خوار پر اپنے مالک کے قتل کی سازش کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ خود میرے خلاف اس قتل کا منطقی جواز ہو کوئی نہیں بنتا تھا مگر پولیس کے طریقۂ تفتیش میں منطق کا کیا سوال۔ یہ ان کی مرضی یا اوپر والوں کے حکم کا معاملہ ہوتا ہے کہ فرد جرم کس پر عائد کرنا ہے۔ اعتراف کس سے کرانا ہے اور سزا کس کو دینی ہے۔

رئیس نے کچھ کپڑے ایک سوٹ کیس میں ڈالے جس میں اہم کاغذات پہلے سے رکھے ہوئے تھے پھر وہ مجھے مرغی خانے میں لے گیا۔ وہاں اس وقت آئندہ ماہ کے معرکۂ کفر و اسلام کے لیے تیار ہونے والے دو ہی مرغ تھے۔ ان کے لیے دو صاف ستھرے اور وسیع پنجرے آمنے سامنے تھے۔ ہر پنجرے کے تین طرف کی دیواروں پر مضبوط آئینے نصب تھے۔ یہ رئیس خان کا آئیڈیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ لڑاکا اور خونخوار مرغے ہیں۔ انہیں ایک ساتھ رکھا جائے تو یہ ایک دو سرے کی جان لے لیں۔ روشنی میں انہیں جوش چڑھتا تھا تو وہ آئینے میں نظر آنے والے حریف پر حملے کرتے تھے۔ اپنے ہی عکس سے خود لڑ کے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا لیکن وہ پینترے بدلنا سیکھ جاتے تھے۔ اندھیرا ہو تو وہ آرام فرماتے تھے ورنہ مسلسل کئی گھنٹے اپنے آپ سے لڑتے رہتے تھے۔

میں نے کہا "ان کو داؤ پیچ کون سکھاتا ہے؟"

"بے ہم سے بڑا استاد کون ہوگا۔ ساری عمر کیا ہے یہ کام۔"

میں نے کہا "ساری عمر کرکٹ میچ دیکھنے والا نہ کرکٹ کھیل سکتا ہے اور نہ کرکٹ کا کوچ بن سکتا ہے۔"

"ایک استاد بھی ہیں اپنے" رئیس نے اعتراف کیا "لاہوری دروازے کے اندر رہتے ہیں۔ سب کے چاچا ہیں۔ اپنے خاص شاگردوں کو تجربے کی باتیں اور خاص گُر سکھا دیتے ہیں۔ بڑا علم اور تجربہ ہے ان کا۔ اس مرتبہ مجھے بھی پس وپے ہیں ایسے کہ۔۔۔"

"پس۔۔۔ پس۔۔۔ TIPS کہتے ہیں ابو جہل کی اولاد۔"

"بے ہاں وہی۔" اس نے کہا "اس بار معاملہ صرف عمران خان کا ہی نہیں' پاکستان کا بھی ہے۔"

میں نے کہا "یار' یہاں مرغیاں کوئی نہیں۔۔۔ یہ بچلر مرغ ہیں۔"

"بے یہ عام انڈے پیدا کرنے والے مرغ نہیں ہیں۔"

میں نے کہا "مگر یار' یہ تو ظلم ہے۔ ان کے جذبات۔۔۔"

"یار' پہلوان جب لنگوٹ کس لیتے ہیں تو پھر کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتے۔ سوائے اپنے حریف کے۔ آنکھیں لڑانے لگیں اور عشق لڑانے لگیں تو پھر خود نہیں لڑ سکتے۔" اس نے ایک خالی پنجرے میں داخل ہو کے دیوار اور فرش کے سنگم پر پاؤں سے دباؤ ڈالا۔ فرش پر بڑی خاموشی سے تین فٹ مربع کا خلا نمودار ہوگیا۔ اس کے نیچے سیڑھیاں نظر آرہی تھیں۔ مرغی خانے کی لائٹ بجھا کے اس نے مجھے اشارہ کیا "چل اتر جا اللہ کا نام لے کے۔ ڈر مت۔ میں بھی آرہا ہوں تیرے پیچھے۔"

"ڈر کیسا یار!" میں نے کہا اور احتیاط سے زینے پر اترگیا جو آخر تک روشن تھا۔ یہ زینہ ایک تہ خانے میں ختم ہوا۔ رئیس نے نیچے اتر کے اوپر کا فرش برابر کردیا تھا اور زینے میں قبر جیسی تاریکی پھیل گئی تھی۔ رئیس نے آگے بڑھ کے تہ خانے کا مقفل دروازہ کھولا تو ہم ایک آراستہ بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ نیچے ایسے ہی دو بیڈ روم تھے اور ان کے ساتھ آرام و آسائش کی ہر چیز تھی۔ بلاشبہ اس تہ خانے میں کوئی مہینوں روپوش رہ سکتا تھا۔ زندگی کی ہر نعمت جو اوپر میسر تھی نیچے بھی فراہم کی گئی تھی۔

رئیس مجھے کچن کے ساتھ والے اسٹور میں لے گیا۔ وہاں ایک اور سلائڈنگ گیٹ سے ہم پھر اوپر جانے والے زینے پر چڑھے۔

رئیس نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا "پیارے' تو نے دیکھا سائنس کا کمال۔"

میں نے کہا "ہر گاڑی میں اب پاور ونڈو ہوتی ہے۔ ایک بٹن پر انگلی رکھنے سے شیشہ چڑھتا اترتا ہے۔ بڑے شہروں میں ایسے دروازے بھی عام ہیں جو کسی کے قریب آنے پر خود کھل جاتے ہیں اور پھر خود ہی بند ہوجاتے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ تیرا حفاظتی انتظام پسند آیا مجھے۔"

اس نے اوپر کا دروازہ کھولا اور ہم ایک تاریک کمرے میں طلوع ہوئے۔ رئیس نے لائٹ جلائی تو مجھے وہاں کھڑی ہوئی چھوٹی سی گاڑی نظر آئی۔ یہ سب سے عام سفید رنگ کی سوزوکی مہران تھی جس کے شیشے سیاہ تھے۔ رئیس نے گیراج کا شٹر والا گیٹ اٹھانے سے پہلے کار کی چابی مجھے دی۔

"تو اسٹارٹ کرا اسے اور باہر نکال" رئیس نے کہا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور پیچھے دیکھا تو مجھے ایک گلی دکھائی دی۔ رئیس نے شٹر گرا کے لاک کیا اور میرے ساتھ آبیٹھا "پہلے یہ دکان تھی۔ میں نے خرید لی اور اس کا راستہ تہ خانے سے بنا دیا۔"

میں نے کہا "اسی کی وجہ سے آج ہم بچ گئے۔ پولیس کا کیا پتا' باہر ڈیرا ڈال کے بیٹھے ہوں۔"

وہ ہنسا "بیٹھے رہیں سالے جب تک جی چاہے۔ اپن چاہیں تو گھر میں رہیں۔ جب چاہیں آئیں جائیں۔ کسی کا باپ نہیں دیکھ سکتا مگر کیا ضرورت ہے خطرہ مول لینے کی۔ بس اپنے شیروں کی دیکھ بھال کے لیے ایک چکر لگانا پڑے گا۔"

میں نے سڑک پر آگے گاڑی کا رخ سابق پولیس انسپکٹر فرید عباسی کے گھر کی طرف کردیا۔ "بازار سے کیوں۔ گھر چل کے ناشتا کریں گے۔ اپنی بیوی کے ہاتھ کا بنایا ہوا۔"

رئیس ہنسنے لگا "سالے اسے کہتے ہیں رام رام جپنا پرایا مال اپنا۔ مرنے والے کی روح کو کتنی تکلیف ہوگی اس بات سے۔"

"مرنے والے کی وجہ سے نہ جانے کتنے بے گناہ اور مظلوموں کی روح بے چین ہوگی اور ان کے لواحقین اس جہاں میں روحانی عذاب کا شکار ہیں۔"

رئیس بولا "یار' ویسے عورت ہر لحاظ سے اے ون تھی۔ شاہ عالم نے قدر نہیں کی۔۔۔ مگر اسے قدر دانوں کی کیا کمی۔ تیرے ریٹائر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوتے ہی دوسرا آگیا میدانِ عشق میں چھلانگ لگا کے۔ ہے جمالو کرنے۔"

"میں ہر گز اس کا ہے جمالو کرنے والا پرستار نہیں تھا۔"

"ایک بات پوچھوں' اپنے ایمان سے بتا۔"

"یہی پوچھنے گا ناکہ میں نے کبھی موقع سے فائدہ اٹھایا یا اس کی کوشش کی اور کسی کو اپنی پارسائی کا یقین دلانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھے۔ آدمی کا سب سے بڑا محتسب ہوتا ہے خود اس کا ضمیر ورنہ اوپر خدا تو سب دیکھ ہی رہا ہے مگر تو یہ بات پوچھے تو مجھے تکلیف ہوگی۔ تو جانتا ہے مجھے روز اول سے۔ تجھ سے کچھ چھپایا ہے میں نے کبھی۔"

وہ کچھ شرمسار ہوا "یار' خیال تو آیا ہوگا۔"

"ہاں... شیطان ورغلاتا ضرور ہے آدم کو بھی اور حوا کو بھی۔ اس کا تو روزِ ازل سے یہی کام ہے مگر یار' وہ بھی مضبوط کردار والی عورت ہے ورنہ ہم اتنا عرصہ دن رات ساتھ رہے۔ تنہائی بھی میسر تھی اور کسی ایک طرف سے کوئی بھی جذباتی یلغار کرتا تو دوسرے کے ضبط کی دیوار پہلے ہی ریلے میں گر جاتی۔ مرد یا عورت دو انتہائی آتش گیر قسم کے مادوں سے بنے ہیں۔ بے احتیاطی کی ایک چنگاری سے بھی دھماکا ہو جانا عین ممکن ہے اور بالکل فطری بات ہے۔ یہ بات میں نے بھی اسے دوٹوک الفاظ میں سمجھادی تھی کہ میں آدم زاد خطا کا پتلا اور بہت کمزور ہوں۔ میرے سارے دعوے اپنی کوشش کی حد تک ہیں۔ وہ سمجھ گئی اور اس نے کبھی خلوت میں بھی اتنا قریب آنے کی کوشش نہیں کی کہ میری کوشش بے معنی ہو جاتی لیکن میں اتفاق کرتا ہوں تیری بات سے۔ رخشی بلاشبہ شاندار عورت ہے۔ حسن صورت سے بھی اور سیرت میں بھی۔"

"مجھے کیا لگتا ہے۔ اپنے عباسی صاحب پر عشق کے زکام کا حملہ ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا "خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ یہ فیصلے تو آسمان پر ہوتے ہیں مگر مجھے یہ خیال ضرور آتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے۔ دونوں ایک جیسے حالات کی آزمائش سے گزرے۔ ایک ناآسودہ اور ناکام ازدواجی زندگی دونوں نے گزاری۔ شاید وہ ایک دوسرے کے زخموں کا مداوا بن سکتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرے کے درد کو سمجھنا ضروری ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کی فطرت میں اتنی لچک ہے کہ وہ ایڈجسٹ کر لیں گے اور بہت خوش رہیں گے۔"

میری یہ بات جن حالات کی پیش گوئی تھی وہ نوشتۂ تقدیر کی طرح خود سامنے آرہے تھے۔ عباسی کا یہ گھر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ کوٹھی جو اس کی پہلی بیوی اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھی' قانونی طور پر عباسی کی ملکیت ضرور تھی مگر وہ وہاں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ راوی پارک اسکیم میں اس کا تین مرلے کے پلاٹ پر بنا ہوا خوب صورت گھر ان کی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ اس میں ایک ماسٹر بیڈروم تھا جو عباسی کی ماں کے تصرف میں رہتا تھا۔ دوسرا بیڈ روم عباسی کا تھا۔ تیسرا گیسٹ بیڈ خالی پڑا رہتا تھا مگر اب رخشی کے پاس تھا۔ رات کے وقت وہ عباسی کی ماں کے کمرے میں سوتی تھی۔ اسے اکیلے میں ڈر نہیں لگتا تھا۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو اس کی اور عباسی کی ماں کی آپس میں خوب بن رہی تھی۔ عباسی کی ماں کو بہت عرصے بعد کوئی رفیقِ تنہائی ملا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتی تھیں اور رخشی ایک صابر اور ہمدرد سامع ثابت ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ رخشی اپنے اور عباسی کے تعلقات کی نوعیت کے بارے میں اس کی ماں کے دل کو شکوک سے پاک رکھنا چاہتی تھی۔

باہر کا گیٹ رئیس نے کھولا تو میں گاڑی اندر لے گیا۔ گیٹ کے سامنے والے پختہ فرش کے نیچے واٹر ٹینک تھا۔ اس کے بعد گیراج تھا جہاں گاڑی رات کے وقت شٹر گرا کے بحفاظت کھڑی کی جا سکتی تھی۔ گیراج کی عقبی دیوار میں سے ایک دروازہ اندر کی طرف گیلری میں کھلتا تھا۔ دائیں ہاتھ پر مختصر سا باغیچہ اور لان تھا۔ تقریباً دس فٹ چوڑا اور بیس فٹ لمبا۔ اس کے وسط میں بید کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔

گاڑی کی آواز پر خود رخشی باہر آئی "ارے تم... آؤ۔"

میں نے کہا "ہم تو خیر آگئے مگر گھر والوں کو خبر نہیں۔ گھر میں ڈاکو آجائیں یا بن بلائے مہمان۔"

"تم ان میں سے کچھ بھی نہیں ہو" وہ مسکرائی "تم گھر والے ہو۔"

رئیس خان نے آہ بھر کے فرمایا "ایک گھر والا ہے۔ ایک گھر والی ہے۔ مگر اپنے گھر میں نہیں' کمال ہے یار!"

رخشی ہنسی۔ وہ سیدھے سادے لباس میں بھی بہت تروتازہ اور حسین لگ رہی تھی۔ "تم بیٹھو' میں اماں کو بلاتی ہوں' وہ کچن میں ہیں۔"

"ہم بیٹھنے نہیں ناشتا کرنے آئے ہیں" میں نے کہا۔

"ناشتا بھی بیٹھ کے ہی کرو گے نا" رخشی نے جاتے جاتے پلٹ کے کہا۔

چند منٹ بعد عباسی کی ماں اندر آئی۔ میں نے اور رئیس نے اٹھ کے سلام کیا اور انہوں نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کے دعائیں دیں۔ وہ پرانی وضع کی خاتون تھیں۔ ان کی عمر شاید پچاس سال ہوگی مگر وہ اپنی فطری جسمانی ساخت اور اچھی صحت کے باعث چالیس کی بھی نہیں لگتی تھیں۔ ان کا بے داغ سفید لباس بیوگی کی علامت تھا مگر ان کی شخصیت کے وقار میں ایک پُرتقدس اضافہ کر رہا تھا۔

"مجھے تو جانتی ہیں آپ۔ میں شاہ عالم ہوں۔"

وہ ہنسنے لگیں "اچھا؟ یعنی میں ناصر عظیم نہ کہوں تجھے؟"

میں نے رئیس کی طرف دیکھا۔ وہی سوال اس کی آنکھوں

میں بھی تھا۔ کیا رخشی نے انہیں میری اصلیت کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے یا اس سے پہلے ہی عباسی اپنی ماں کو شریکِ راز کر چکا تھا۔ اس عمر رسیدہ شفیق عورت سے میں کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرتا تھا مگر شاہ عالم کی حیثیت سے میرا کردار تمام مجبوریوں کے باوجود پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ کسی حد تک یہ ایک مجرمانہ پسِ منظر کا حامل تھا اور معاشرے کی اخلاقی اقدار کے پیمانے پر انتہائی معیوب۔ خان اعظم اور چندا کے نزدیک یہ میری مجبوری نہیں ناقابلِ معافی خطا تھی کہ میں نے ناصر عظیم کی شخصیت کو شاہ عالم بنا کے ساری دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس کے لیے صرف اپنے مفاد کو پیشِ نظر رکھا۔

"کسی پریشانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں بیٹا۔ جب فرید نے بتایا مجھے تو اندازہ ہو گیا تھا مجھے تمہاری بے بسی کا۔ تمہاری جگہ وہ خود بھی ایسا ہی کرنے پر مجبور ہوتا... اصل بات یہ ہے کہ تمہارے اخلاق و کردار کو حالات نے متاثر نہیں کیا..." عباسی کی ماں نے کہا۔

میں نے سکون کا سانس لیا "ناکامی اپنا کوئی جواز نہیں رکھتی ماں جی اور کامیابی خود اپنا جواز ہوتی ہے۔ اگر سب ویسے ہی ہوتا جیسے میں نے سوچا تھا تو کیا میں اپنی غلطی مانتا؟ اپنے آپ سے شرمندہ ہوتا اور اپنے کیے پر پچھتاتا؟"

"چلو چھوڑو... جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ غلطی بھی انسان سے ہی ہوتی ہے اور اس غلطی میں تمہاری اپنی مرضی کا دخل کہاں تھا؟" انہوں نے مجھے تسلی دینے کے لیے کہا "یہ کون ہے؟"

میں نے کہا "یہ رئیس ہے' میرا دوست۔"

"یہ کس قسم کا رئیس ہے؟ خاندانی تو دولتیا۔ یا بس نام کا؟"

انہوں نے مسکرا کے پوچھا۔

رئیس جھینپنے لگا "اپن تو ماں جی کسی طرح بھی رئیس نہیں' فقیر تھے تب بھی ہاتھ پھیلاتے تھے' آج بھی آپ کے در پر آئے ہیں سوالی بن کے۔"

"اچھے وقت پر آئے ہو۔ میں رخشی کو آلو کی بھجیا بنانا سکھا رہی تھی۔ اسے بہت پسند آئی تھی۔ وہ بنا کے لا رہی ہے وہی کی پوریاں۔ تم نے کھائی ہیں پہلے کبھی؟" ماں جی نے کہا۔

"ماں جی۔ بھوک سے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے بھی بے ہوش ہو گئے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کریں کہ ہم بھی بے ہوش ہو جائیں" میں نے کہا۔

ماں جی نے رخشی کو آواز دی "رخشی۔ بھئی بڑے ندیدے اور بھوکے مہمان آئے ہیں' جلدی سے لے آؤ۔"

اندر سے رخشی کی آواز آئی "بس پانچ منٹ ماں جی۔ چائے کا پانی ابل جائے۔"

میں نے کہا "فرید کیا سو رہا ہے ابھی تک؟"

وہ ہنسنے لگیں "ہمارے گھر میں اتنی دیر تک سونا نحوست سمجھا جاتا ہے۔ ابھی تک باقاعدہ نماز کی عادت تو نہیں پڑی اسے مگر میں ایک بار کہتی ضرور ہوں پھر نماز کے بعد چائے بنا کے اسے اٹھاتی ہوں۔ صبح کے وقت ہم ماں بیٹے باہر بیٹھ کے چائے پیتے تھے۔ اب رخشی مجھ سے بھی پہلے اٹھ جاتی ہے۔ چائے بھی وہ بناتی ہے۔"

میں نے کہا "فرید بھی اٹھنے لگا ہوگا نماز کے لیے۔"

وہ ہنس پڑیں "بالکل ٹھیک ہے تمہارا اندازہ۔ آخر دوست ہوتا اس کے۔ چلو وجہ کوئی بھی ہو۔ خدا نے کسی بہانے توفیق دی۔ وہ ابھی ناشتا کر کے گیا ہے فیصل کے پاس۔"

"فیصل کے پاس۔ کوئی کام تھا؟"

"کام کیے بغیر جوان آدمی کتنے دن رہ سکتا ہے۔ میں تو شروع سے مخالف تھی پولیس کی نوکری کے۔ کیا فائدہ... رات کو چوروں بدمعاشوں کے پیچھے جان ہتھیلی پر رکھ کے پھرو اور لاکھ رزقِ حلال کمانے کے دعوے کرو' کون مانتا ہے۔ بدنامی اور ذلت مفت میں۔ بھاڑ میں گئی ایسی فرض شناسی۔ بیٹا کام آدمی کرنا چاہے تو کوئی بھی کام محنت اور ایمانداری سے کر سکتا ہے ورنہ بیٹھا دو پہریں گنتے پر تو وہاں بھی حرام کھانے کا راستہ نکال لے گا۔ فیصل نے بھی کہا تھا کہ میرے ساتھ رہو۔ دونوں میں بس دو مہینے کی چھوٹائی بڑائی ہے۔ فیصل پیدا ہوا تھا' تیئس ستمبر کو۔ بھارت سے پاکستان کی جنگ اسی دن بند ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ میں اس دن پیدا ہوا تھا جس دن یہ جنگ شروع ہوئی تھی۔ چھ ستمبر سن پینسٹھ۔"

"پھر تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوئے تم... فیصل کی پیدائش ہے بائیس نومبر کی۔ اس نے چھ سال پولیس کی نوکری میں ضائع کیے۔ میں تو ضائع کرنا ہی کہوں گی۔ اتنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ ہاتھ کیا آیا اوپر والوں کی ناراضی..... اور بالآخر نکال دیا انہوں نے تو لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ اب فیصل کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ چھ سال پہلے ہوتا تو اب تک بڑا نام بھی کماتا اور پیسہ بھی۔"

ان کی گفتگو بے تکان جاری رہی۔ فرید کے معاملے سے ہٹ کر وہ اس کی ناکام شادی پر آئیں جسے وہ سراسر اپنی غلطی قرار دیتی تھیں اور خود کو اپنے بیٹے کے آلام و مصائب کا ذمے دار سمجھتی تھیں۔ جب رخشی ایپرن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے نمودار ہوئی اور اس نے میز پر ناشتا لگائے جانے کا اعلان کیا تو ان کی گفتگو میں وقتی طور پر کچھ تعطل آیا۔ ہم میز پر جا کے بیٹھے اور ناشتے پر ٹوٹ پڑے۔ رخشی نے میز پر سب سجا دیا تھا۔ ناشتے میں سلائس اور مکھن' آملیٹ اور جام۔ سب ہی کچھ تھا مگر پوری اور آلو کی بھجیا کے سامنے ہم نے کسی اور چیز کی طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا۔ شاید رخشی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم جس ندیدے پن سے پوریاں ہڑپ کر رہے ہیں وہ... پوریاں ہمارا پیٹ بھرنے کے لئے ناکافی ہوں گی۔ اس نے چائے کا ایک کپ بنا کے ماں جی کو دیا اور اپنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کپ لے کر کچن میں چلی گئی۔

ماں جی نے ہمیں شفقت سے کئی بار ڈانٹا۔ "ارے آرام سے کھاؤ۔ حلق میں پھندا لگ جائے گا۔"

میں نے کہا "پوریاں ختم ہو جائیں گی ماں جی۔"

"بھئی اور بنانے گئی ہے رخشی۔" وہ بولیں اور اس کے بعد انہوں نے رخشی کو موضوعِ سخن بنالیا۔ رخشی کی صورت کے علاوہ..... جو کسی تعریف کی محتاج نہ تھی۔ وہ اس کی ایک ایک عادت کی تعریف کر رہی تھیں۔ اس کی شرافت اور سعادت مندی' سلیقہ اور تمیز۔ حسنِ ذوق اور خدمت گزاری۔

مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہیں لگی کہ دنیاداری کے تقاضے نبھانے کے لیے وہ چار ماہ دس دن کی عدت پوری کرنے کا انتظار ضرور کریں گی مگر اس کے بعد رخشی کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ وہ کر چکی ہیں جو ان کے نزدیک خود کو ہر طرح سے ایک مثالی بیٹی ثابت کر چکی تھی۔

جب رخشی گرم پوریوں کی نئی کھیپ لائی تو ماں جی نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا "بیٹا' یہ آج کے اخبار میں کیا چھاپ دیا ہے ان اخبار والوں نے؟"

میں نے کہا "دیکھا تو نہیں میں نے ابھی تک لیکن اندازہ ہے مجھے اور میں اسی سلسلے میں فرید سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اب وکیل صاحب سے ان کے آفس میں ہی بات ہوگی۔"

"یہ سب کچھ ہو رہا ہے تمہارے خلاف اور تم یوں بے فکری سے گھوم رہے ہو" ماں جی نے کہا۔

"بے فکری سے کہاں ماں جی۔ سخت فکرمند ہوں میں۔ اس کے علاوہ میں گھوم نہیں رہا ہوں۔ ناشتا کر رہا ہوں کرسی پر بیٹھ کے۔ کیا آپ کو لٹو کی طرح گھومتا ہوا نظر آ رہا ہوں؟" میں نے کہا۔

"ابے لٹو۔ ماں جی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ پکڑا گیا نا تو پولیس مار مار کے نٹو بنا دے گی۔" رئیس نے کہا۔

"یار' تو جانتا ہے میں روپوش ہوں۔ ماں جی کو بتا کیوں نہیں دیتا۔"

رخشی ہنسنے لگی "اگر یہ روپوشی ہے تو منہ دکھائی کیا ہوگی؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا "یہ فرید سے پوچھنا..... میرا مطلب ہے تھانے دار صاحب کو تفصیل سے بتا دوں گا۔"

لیکن میری بات کا دوسرا مطلب سمجھ کے پل بھر کے لیے رخشی کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا "وہ اب تھانے دار نہیں' وکیل صاحب ہیں۔"

"وہ!" میں نے بھولپن سے پوچھا "اچھا تمہارا مطلب ہے فرید.....؟"

رخشی نے مجھے گھورا اور ماں جی نے میری بات کو ایسے نظرانداز کر دیا جیسے وہ سمجھی ہی نہیں۔ کسی نیت اور ارادے کے بغیر رخشی نے روایتی بیویوں کے انداز میں جو شوہر کا نام نہیں لیتی ہیں'

فرید کو وہ کہہ دیا تھا۔ میری معنی آفرینی سے اس کا رنگ گلابی ہو گیا تھا۔ رئیس ہنس پڑا تو وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی "میں اور چائے لاتی ہوں۔"

"اب پوریاں لانا" میں نے نیپکن سے ہاتھ منہ صاف کیا۔

"پر سوں کیا ہے بیٹا؟" ماں جی نے سادگی سے پوچھا۔

"دو دن کا ناشتا تو ہم نے کر لیا ہے ماں جی" میں نے کہا۔

ہم وہاں سے رخصت ہوئے تو رخشی نے ایک انگریزی کا اور ایک اردو کا اخبار مجھے تھما دیا تھا۔ میں نے رئیس سے کہا کہ گاڑی اب وہ چلائے۔ شیدے پستول کے ٹھکانے پر پہنچنے تک میں نے اردو کے اخبار کی ہر سرخی اور حاشیہ آرائی دیکھ لی تھی جس کا تعلق شاہ عالم کی زندگی سے ہو سکتا تھا۔

خادم اور عثمان کو سوچ سمجھ کے اپنا بیان تیار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ انہوں نے ایک کہانی بنانے کی کوشش ضرور کی تھی کہ نامعلوم افراد ان کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور کسی نامعلوم مقام پر قید کر دیا تھا۔ انہوں نے صحافیوں کے بہت سے سوالات کے جواب میں یہ کہا تھا کہ وہ ہر بات نہیں بتا سکتے۔ اس کوٹھی میں اپنی موجودگی کے بارے میں خادم نے کہا کہ شاید وہ اسی کوٹھی میں ماردیے جاتے لیکن وہ چند دن پہلے اپنے بارے میں ایک اطلاع خفیہ ذرائع سے باہر بھجوا چکے تھے اور ان کے محافظ پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے۔ اس سوال پر کہ محافظوں نے ان کا سراغ کیسے لگایا' عثمان نے کہا کہ شاید پولیس کی مدد سے مگر اس سے پوچھا گیا کہ پولیس پھر یہاں کیوں نہیں پہنچی خادم نے اس بات کی تردید کر دی اور کہا کہ محافظ خود ہی یہ بات بتا سکتے تھے مگر وہ مارے جا چکے ہیں۔ شاہ عالم اچانک یہاں پہنچ گیا تھا اور اس کی ہمارے محافظوں سے دست بدست جنگ ہوئی۔ اس نے دونوں محافظوں کو مار دیا اور جس ٹیکسی میں وہ آیا تھا' اس کا ڈرائیور بھی عینی گواہ ہونے کے باعث ہی مارا گیا۔

ڈرائیور کو میں نے صرف ٹاک آؤٹ کیا تھا لیکن خادم اور عثمان کے بیان میں اس کی ہلاکت کا بھی ذکر تھا۔ کیا اسے بعد میں پولیس کے ہاتھوں مروا دیا گیا تھا کہ وہ لب نہ کھول سکے یا وہ اسپتال پہنچ کے مرا تھا۔ یہ خبر سے واضح نہیں تھا۔

اس سوال پر کہ شاہ عالم یہاں کیسے پہنچا تھا اور کیوں آیا تھا۔ ان کا مؤقف ایک ہی تھا۔ یہ آپ شاہ عالم سے معلوم کریں۔ ہو سکتا ہے ہمیں اغوا کر کے اتنا عرصہ حبس بے جا میں رکھنے والا بھی وہی ہو۔ خادم اور عثمان کے بیانوں میں بہت جھول تھا اور تضاد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فوری طور پر گھڑ کے سفید جھوٹ بول رہے تھے۔ سچ بولنے والا ہزار بار کہے گا تو سچ ہی کہے گا اور جب بھی پوچھا جائے گا ایک ہی بات بتائے گا مگر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنی طرف سے وہ بہت سوچ سمجھ کے اور بہت کم بولے تھے۔ بعد میں جب پولیس کے ایس پی غلام محمد صاحب پہنچے تو

وہ اخبار والوں پر بہت گرجے برسے کہ ان کا فرض پہلے پولیس کو مطلع کرنا تھا۔ وہ اس کے بعد جائے واردات پر پہنچ کے رپورٹ لے سکتے تھے مگر اخبار والوں نے اس بات کو چٹکیوں میں اڑا دیا۔ آزاد صاحب نے کہا کہ کیا پولیس اب گمنام کال پر بھی فوراً پہنچنے لگی ہے؟ اگر ایسا ہے تو سبحان اللہ اور جزاک اللہ کہا۔ ایسی مستعدی اور فرض شناسی کا مظاہرہ تو معجزہ بھی سمجھا جاتا۔ شمی زیادہ منہ پھٹ تھی۔ اس نے صاف کہا کہ پھر آپ ہمیں بتاتے؟ آپ تو اس خبر کی تصدیق بھی خاموشی سے۔ اخباری فوٹو گرافر اور رپورٹر پولیس کے آنے سے قبل ہی نکل گئے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ پولیس حسبِ روایت ان سے کیمرے چھین کر توڑ دے گی یا فلم کی ریل ضائع کر دے گی۔

اخبار والے محجانہ حقائق کو سمجھتے تھے اور غالباً خادم اور عثمان کے گروہ کے پس پردہ وطن دشمن سرگرمیوں سے بھی بے خبر نہیں تھے مگر ٹھوس ثبوت نہ ہونے کے باعث ابھی تک اس گروہ کی سرگرمیوں کو بے نقاب کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس کی کچھ اور افسوسناک وجوہات بھی تھیں۔ ایک یہ کہ ابھی تک پاکستان میں سنجیدہ پیشہ ورانہ انویسٹی گیٹو ..... رپورٹنگ کو کسی نے نہیں اپنایا تھا۔ صحافیوں کی وہ کلاس ناپید تھی جو سارے خطرات مول لے کر اور جان جوکھوں میں ڈال کے سراغ رسانوں کی طرح ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں اور اندر کی خبر پوری تفصیلات اور ناقابلِ تردید ثبوت کے ساتھ نکال لاتے ہیں اور پوری پیشہ ورانہ دیانت داری کے ساتھ من و عن شائع بھی کر دیتے ہیں۔ بالفرض محال کوئی صحافی ایسی کوشش کرے تو اسے ہر طرف سے مزاحمت اور حوصلہ شکنی کا سامنا ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ملزم اور پھر تفتیشی ادارے افشائے راز کے لیے اس کی راہ میں مشکلات اور رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اخبار مالکان پر دباؤ ہو تو وہ بھی رپورٹر کو تفتیش سے روک دیتے ہیں یا اس کی خصوصی رپورٹ کو خطرناک قرار دیتے ہوئے دبا دیتے ہیں۔ صحافی کو نہ مالی فائدہ ہوتا ہے نہ محنت سے سچ سامنے لانے پر ستائش کا انعام ملتا ہے۔ خبر کو دبانے کے لیے صحافی کو یا اخبار کو دبانے کی روایت سے ہر تلخ حقیقت کا چہرہ یوں مسخ کر دیا جاتا ہے کہ وہ ایک قابلِ قبول جھوٹ بن جاتا ہے۔ مزید یہ کہ کوئی رپورٹ شائع ہو جائے تو اس پر بیان بازی ضرور ہوتی ہے مگر قانونی کارروائی نہیں ہوتی۔ برسوں پہلے عمران خان نے کہا تھا کہ ایک بہت بڑی مافیا اس ملک کے جنگلات کو غیر قانونی طریقے پر صاف کر رہی ہے۔ خاموشی سے کروڑوں اربوں کمانے والی اس مافیا نے ملک کے ماحولیاتی مستقبل کو داؤ پر لگا دیا ہے مگر محکمۂ جنگلات سے ماحولیات تک سب کرتا دھرتا چپ بیٹھے ہیں۔ آخر کیوں؟ ایک بچہ بھی اس سوال کا جواب جانتا ہے کہ قانون سے صرفِ نظر کرنے والوں کو اس کی قیمت اچھی مل جاتی ہے تو انہیں کیا ضرورت ہے ملک کے مستقبل کے چکر میں پڑنے کی۔

ملک خدا بخش مندرال کے قتل کی تفصیلات دیکھ کے مجھے بہت دکھ ہوا۔ بے شک وہ ایک ناکام سیاست داں تھا۔ دولت مندی اور جاگیردارانہ سوچ اسے سیاست میں لے آئی تھی جہاں اس جیسے وڈیرے اور چوہدری' خان اور سردار' مخدوم اور پیر اپنے فیوڈل گروپ کی طاقت اور اثر رسوخ سے ملک' حکومت اور قوم کے مالک بنے بیٹھے تھے۔ اس کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ تھا کہ وہ اپنے طبقے کے دوسرے دیوتاؤں کی طرح خود غرض اور منافق نہیں تھا جو ملک و قوم اور اسلام کی خاطر جان و مال کی مسلسل قربانی دیتے چلے آتے ہیں مگر عوام کے جان و مال کی۔

ملک خدا بخش کا موازنہ مسلم لیگی لیڈروں سے کیا جا سکتا تھا جو واقعی خاندانی اور جدی پشتی نواب تھے۔ پاکستان کے نصب العین کی خاطر انہوں نے واقعی جان و مال کی قربانی دی تھی اور اس کے بدلے میں پاکستان سے کچھ بھی نہیں لیا تھا۔ اور رئیسوں کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ پاکستان ہی سے بنے تھے اور بنتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ بگڑا تھا تو بٹوارے پر پورے پاکستان کا۔

تاہم ناکامی سے دل برداشتہ نہ ہونے والا ملک خدا بخش مجھ سے ملاقات ہونے تک زندہ تھا۔ میرے ساتھ سیاسی اتحاد اسے مہنگا پڑا تھا اور وہ بے سبب مارا گیا تھا۔ اس کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اسے میرے دشمنوں نے مجھے ڈرانے کے لیے مارا تھا۔ اس طرح انہوں نے اپنا پیغام واضح کیا تھا کہ سیاست کے اس کھیل میں جس نے تمہارا ساتھ دینے کی حماقت کی اس کا یہی انجام ہوگا۔

خبر کے ساتھ شائع ہونے والی تصاویر زیادہ افسوسناک تھیں۔ ایک تصویر اس جگہ کی تھی جہاں پارسل بم کا دھماکا ہوا تھا۔ وہاں خدا بخش مندرال کی خون آلود اور ناقابلِ شناخت چہرے والی لاش پڑی تھی۔ تباہی کے آثار بتاتے تھے کہ بم کتنا طاقتور ہوگا۔ دوسری تصویر میں وہ کفن پہنے لیٹا ہوا تھا اور اس کے گھر والے آہ و زاری کر رہے تھے۔

آتش گیر اسلحے کے ماہرین کے اندازے کے مطابق بم میں تقریباً ڈھائی سو گرام بارودی مادہ تھا اور بم کے ٹکڑوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دیسی ساخت کا تھا۔ خبر میں سب وہی تھا جو مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ یہ قاتل تحفہ لانے والے نے کہا تھا کہ یہ شاہ عالم صاحب نے ملک صاحب کے لیے بطور خاص بھجوایا ہے۔ پولیس نے تحفہ لانے والے کا حلیہ بھی شائع کیا تھا۔ حلیہ بتانے والا ملازم بھی پولیس کی تحویل تھا۔

پولیس کے ذرائع نے تو آنکھ بند کر کے مجھے مجرم قرار دے دیا تھا اور اپنی ضابطے کی کارروائی کا آغاز خصوصی تفتیشی ٹیم بنا کے کیا تھا جس کا سربراہ میری بدقسمتی کے باعث پھر وہی ایس پی غلام محمد تھا جس کا بس چلتا تو وہ مجھے کسی عدالت کے فیصلے کے بغیر ہی خود پھانسی دے دیتا۔ اچھی بات یہ تھی کہ کچھ سیاسی لیڈروں نے پولیس کے مؤقف سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ ان کے خیال میں یہ قتل شاہ عالم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے خلاف ایک سیاسی سازش کا حصہ نظر آتا تھا۔ آزاد صاحب نے تو بقلم خود جو اداریہ رقم فرمایا تھا اس میں صاف کہا تھا کہ شاہ عالم کا نام لینے سے شاہ عالم قاتل ثابت نہیں ہوتا۔ اس حرکت کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے قربانی کا بکرا بنا کے اصل قاتلوں کو بے نقاب ہونے سے بچایا جائے۔ پولیس کو ساری توجہ پارسل لانے والے کو تلاش کرنے پر صرف کرنی چاہیے۔

تاہم پولیس کو رائے عامہ' صائب مشورے یا معقولیت پسندی سے کیا' ان کے پاس کسی بے گناہ کو ملزم بنانے اور مجرم کو باعزت قرار دینے کی اپنی وجوہ تمام باتوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ سوائے ان کے جو بدقسمتی سے مجرم بھی ہوتے ہیں اور لاوارث و مفلس بھی۔ باقی سب سیاسی وذاتی عداوتوں' افسران بالا کے اشاروں یا نظریۂ ضرورت کے تحت پکڑے بھی جاتے ہیں اور چھوڑ بھی دیے جاتے ہیں۔

اب اگر قتل کا الزام مجھ پر آگیا تھا تو میں قاتل' باقی سب باتیں لاحاصل۔ گرفتاری کے بعد مجھ سے تفتیش میں بہت کچھ پوچھا جاسکتا تھا جس کے بارے میں میرے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا مگر میں لکھ کر دے سکتا تھا کہ مجھے معلوم ہے اور اگر انصاف کے طویل عمل کے دوران میں تقدیر کا اشارہ نہ ہو تو پھانسی کا پھندا میرے گلے میں فٹ کیا جاسکتا تھا اس کے لیے صرف فٹ آنے کی شرط تھی۔ جرم کی نہیں مگر میں مایوس نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حقائق بالآخر سامنے آجائیں گے۔ ویسے میں عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ تک پہنچنے کے وسائل رکھتا تھا چنانچہ مجھے پورا انصاف ملنے کی پوری توقع تھی۔

اگلے روز اخبار کا اندر والا صفحہ دیکھتے ہوئے میری نظر ایک تصویر پر گئی تو میں چونک پڑا۔ تصویریں آزاد صاحب کے اخبار میں شائع ہوئی تھیں۔ اس میں فاروقی اور قمر کو دولہا دلہن کی حیثیت سے اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ دلہن کے ساتھ کرنل خان بھی تھے اور دولہا کے ساتھ روزی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے نیچے لکھا ہوا تھا "مشہور سماجی کارکن قمر بانو اور ڈاکٹر فاروقی اپنی شادی کے موقع پر عزیز واقارب کے ہمراہ۔ تقریب میں شاہ عالم صاحب نے بھی شرکت کی۔"

تصویر کے نیچے خبر زیادہ تفصیل سے تھی اور اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شرکا میں شہر کے معززین' ریٹائرڈ فوجی افسران اور ہائی کورٹ کے جج بھی شامل تھے۔ چند تعارفی جملوں میں بتایا گیا تھا کہ ڈاکٹر فاروقی کتنے سال سے ایک پسماندہ علاقے میں رفاہی کلینک چلا رہے ہیں جہاں مستحق مریضوں سے علاج اور دوا کے لیے ایک پیسہ نہیں لیا جاتا اور اب وہ ایک بہت بڑا رفاہی اسپتال قائم کررہے ہیں جس میں قمر بانو ان کی دست راست ہوں گی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر خبر میں ایک جملے کا اضافہ بقلم آزاد صاحب نے بقلم خود واپس پنچ کے فرمایا تھا "شاہ عالم صاحب نے جو رخصتی تک موجود رہے' رفاہی اسپتال کے لیے دس ہزار کا چیک بھی دیا۔"

میں نے کہا "صرف دس ہزار۔ یہ بے عزتی ہے رئیس۔ ناصر عظیم کی الگ اور شاہ عالم کی الگ۔ کم سے کم ایک لاکھ تو لکھتے۔"

رئیس نے خبر سن کے مجھ سے اتفاق کیا "ہاں' جب جھوٹ لکھنا ہی تھا پھر دس ہزار کیوں' دس لاکھ' دس کروڑ' کچھ بھی لکھ دیتے۔"

خادم اور عثمان کی حالت کا تصور کرکے مجھے ہنسی آئی۔ شمی کے انگریزی اخبار میں مجھے یہی خبر آگے والے صفحات میں مل گئی۔

رئیس نے کہا "اس میں اتنا خوش ہونے کی کون سی بات ہے؟"

میں نے کہا "کتنی آسانی سے آزاد صاحب نے خادم اور عثمان کی ایسی تیسی کردی۔ کیا حیثیت رہ گئی اب ان کے بیان کی جو انہوں نے پولیس کے ایس پی غلام محمد کے سامنے دیا؟ اس سے تو یہ ثابت ہوگیا کہ میں کم سے کم بارہ بجے رات تک وہیں تھا۔ اس سے پہلے رخصتی نہیں ہوئی ہوگی اور میری وہاں موجودگی کے گواہ بھی عام لوگ نہیں' معززین' ریٹائرڈ فوجی افسران اور ہائی کورٹ کے جج۔ بے شک وہ چلے گئے ہوں گے مگر دیکھا ضرور ہوگا ان سب نے مجھے۔ میں انہیں نہیں پہچانتا لیکن حال ہی میں جو شہرت مجھے مرکے زندہ ہوجانے کی وجہ سے ملی اس کی وجہ سے میں بہت زیادہ خبروں میں رہا اور میری تصاویر بھی بہت شائع ہوتی رہیں۔ پہلے انتقال' سوگ اور شاندار تدفین کی اور اس کے بعد عدالت سے زندہ پیش ہوکے خود کو شاہ عالم ثابت کرنے کی۔"

"یہ تو ہے۔ پبلسٹی بہت ملی تجھے پچھلے دنوں۔"

"اب ملاحظہ ہو آزاد صاحب کی معصوم سی شرارت۔ دس ہزار کے چیک کا بھی ذکر فرمادیا۔"

"تو نے کوئی چیک نہیں دیا تھا؟"

"نہیں یار مگر کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔ نہ فاروقی تردید کرے گا اور نہ قمر کرے گی کہ یہ جھوٹ ہے۔ ایک تو اب وہ مسز فاروقی ہے چنانچہ شوہر کی مرضی اس کی مرضی پھر یہ کہ گھر پہنچتے ہی اسے میرا چالیٹ کا تحفہ مل گیا ہوگا اور یہ بھی پتا چل گیا ہوگا کہ بھائی پہنچا تھا۔ ممکن ہے فاروقی نے یہ بھی بتادیا ہو کہ خان اعظم نے اسے بن بلائے اجنبی مہمان کی طرح سمجھا اور اس سے بداخلاقی کے ساتھ پیش آئے ورنہ وہاں وہ بہن کو دلہن بنا دیکھنے ہی آیا ہوگا اور رخصت بھی کرتا۔۔۔ قمر کو میں جانتا ہوں۔ وہ بہت روئی ہوگی۔ بہت نازک ہے اس کا دل۔ وہ پہلے بھی خفا ہوجاتی تھی مجھ سے لیکن اس کا یہ غصہ بھی بھائی سے پیار جتانے کا ایک انداز تھا۔ نفرت تو وہ کسی سے بھی کرہی نہیں سکتی۔" میں قمر کی باتیں کرکے اس کی یادوں میں کھو کے سا گیا تھا۔

رئیس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "بڑا خوش نصیب ہے تو یار کہ ایک بہن ہے تیری۔۔۔ ماں کے برابر تو کوئی نہیں لیکن جو معصوم اور سچا پیار یہ دیتی ہیں نا۔۔۔ بہنیں اور بیٹیاں' اس کا مقابلہ بھی کوئی نہیں۔ کسی عورت کی محبت اس کے مقابلے میں ایسی ہی ہے۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے بارش کے پانی کے مقابلے میں شبنم۔"

"ابے واہ۔ کیا زبردست شاعرانہ مثال دی ہے تو نے۔" میں نے کہا۔

وہ خوش ہوکے بولا "سب تیری صحبت میں سیکھا ہے یار۔ وہ کیا کہتے ہیں۔۔۔ قاضی جی کے گھر کے کتے بھی سیانے ہوتے ہیں۔"

"اُف۔۔۔ کتے نہیں چوہے۔ جاہل کی اولاد" میں نے سر پر ہاتھ مارا۔

"ابے چل رہنے دے۔ قاضی ہوتا ہے جج۔ اس کے گھر میں چوہے ہوسکتے ہیں بھلا؟ ہاں کتے ہوسکتے ہیں اور کتا ہی ہوتا ہے سیانا۔ چوہا نہیں۔ یہ ضرب المثل ہی غلط ہے" وہ اپنی بات پر اڑ گیا "مگر یار' تیرا وہ خوں خوار خان تردید نہ کردے۔"

میں نے کہا "وہ کیسے تردید کرسکتا ہے۔ وہ کون سا سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ۔۔۔ آج میں فاروقی کو چیک پہنچا سکتا ہوں۔ آج نہ سہی کل کی تاریخ میں کسی وقت بھی دے سکتا ہوں۔۔۔ اصل فائدہ یہ ہوا ہے خبر اور تصویر کا کہ خادم اور عثمان کا بیان جھوٹا ہوگیا۔ میں تو سارا وقت وہاں موجود تھا اور یار' خان جی بھی بس خونخوار نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ مجھے پتا ہے سب اداکاری تھی۔ اوور ایکٹنگ کررہے تھے وہ ظلے میں۔ ایک بار میں جوتا ہاتھ میں لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور سر جھکا کے بیٹھ گیا کہ ماریے' تو بس ختم ہوجائے گی ساری ناراضی۔"

گاڑی فیروز پور روڈ پر بھی شہر سے کئی میل باہر آکے بالآخر الٹے ہاتھ پر جانے والی ایک نیم پختہ سڑک پر مڑگئی۔ یہاں آبادی بھی بہت چھدری تھی۔ مکانات ایک دوسرے سے یوں نہیں ملے ہوئے تھے کہ گلیاں بن جائیں۔ آدھے ادھورے مکانات کے رہیان مکمل گھر بھی تھے جو مکینوں کی موجودگی کا پتا دیتے تھے۔ جنوبی طور پر ویرانی کا تاثر غالب تھا۔

رئیس نے گاڑی ایک ایسے گھر کے سامنے روک لی جس کا رخ مخالف سمت میں تھا۔ اس کا مین گیٹ بند تھا۔ سائڈ میں بنا ہوا چھوٹا گیٹ کھلے کے بغیر تھا اور اس کے سامنے لکڑی کا پرانا دروازہ ایسے ہی کھڑا کردیا گیا تھا تاکہ جانور اندر نہ آئیں۔ ہم اسی راستے سے اندر گئے۔

گیراج کا شٹر گرا ہوا تھا۔ رئیس نے اسے اعتماد کے ساتھ اوپر کیا اور مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ گیراج میں ایک فور وہیل ڈرائیو' تین دروازوں والی پجیرو کھڑی تھی۔ اس کا تیسرا دروازہ پیچھے تھا جس پر باہر کی طرف اسپیئر وہیل لگادیا جاتا ہے۔ سائڈ میں مشکل سے دو فٹ چوڑی جگہ رہ گئی تھی جس میں رئیس اور میں ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے تھے۔

رئیس نے آگے قدم بڑھاکے کہا "یار' شٹر تو گرادے پیچھے۔ بلکہ نیچے سے کنڈا بھی پھنسادے۔"

میں پلٹا ہی تھا کہ پولیس ایک دم اندر گھس آئی۔ آگے آنے والے کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ میری طرف تھا "مسٹر شاہ عالم۔ آپ زیر حراست ہیں۔ ہاتھ اوپر اٹھالیں۔"

میں اس تنگ جگہ میں نہ پلٹ کے بھاگ سکتا تھا اور نہ آگے جاسکتا تھا۔ میں بُری طرح پھنس گیا تھا۔

○☆○

میں بُری طرح پھنس گیا تھا اور میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ کچھ سوچ سکوں۔ قسمت اچھی تھی کہ میں نے ان اجل کے فرشتوں کو پہلے دیکھ لیا۔ اگر وہ مجھے پہلے دیکھ لیتے تو اسی وقت باہر آکے میرا استقبال کرتے اور اپنی توپوں کا رخ میری طرف کرکے پوچھتے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ شرافت سے گرفتار کا پتا بتائے گا یا سویا رمع سوجوتے کھانے کے بعد؟

خود کو سلطان راہی اور مصطفیٰ قریشی جیسا بہادر ولن اور ہیرو سمجھنے والے ان دونوں کرداروں سے دوبارہ ملاقات اتنی جلدی پھر ہوگی' یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ پہلی بار تو میں اور رئیس بے وقوف اور بزدل ہونے کی لاجواب اداکاری سے ان کو چکر دے کر نکل گئے تھے اور خود انہوں نے بھی اسلحے کے بغیر مقابلے سے دستبردار ہوکے فرار ہوجانا ہی بہتر سمجھا تھا مگر مجھے یقین تھا کہ یہاں وہ زیادہ تیاری کے ساتھ آئے ہوں گے اور انہیں پھر چکر دینا ناممکن ہوگا۔

اگر میں گاڑی آہستہ کرتا تو ان کی نظر مجھ پر ضرور پڑجاتی۔ اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے میں نے آخری وقت میں پاؤں کا دباؤ ایکسیلریٹر پر بڑھایا اور اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے ہاتھ میں رومال ایسے تھام لیا کہ اگر وہ ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہوجائیں تو انہیں میری صورت صاف دکھائی نہ دے۔

گاڑی دکان کے سامنے سے گزری تو ایک بڑی گاڑی نے مجھے بائیں طرف سے اوورٹیک کیا۔ اس نے چھوٹی سی سوزوکی کو اور مجھے پوری طرح چھپالیا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور غلط سائڈ سے اوورٹیک کرنے والے ڈرائیور کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر رانجھا نے یہ سمجھا کہ میں بے خیالی میں آگے نکل گیا ہوں "او پتر۔ کدھر ہے تیرا دھیان۔ اپنا کلینک پیچھے چھوڑ دیا ہے تو نے۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر رانجھا۔ میں نے کلینک بھی دیکھ لیا تھا اور ملک الموت کو بھی۔"

اس نے بُرا مان کے کہا "اوئے۔ ہیر کلینک میں تو آتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آگے مریض اور ملک الموت ہوتا ہے ان کے پیچھے مگر وہ دروازے سے لوٹ جاتا ہے۔ آگے اپنا دستِ شفا سنبھال لیتا ہے' مریض کو۔"

میں نے کہا "ابھی کلینک میں دو شکلیں دیکھی ہیں میں نے۔ انہیں پہچانتا ہوں میں۔"

ڈاکٹر رانجھا مسکرا دیا "اویار' ان کو ہم بھی پہچانتے ہیں' روک گاڑی۔"

میں نے گاڑی روک لی "آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟"

"اپنے پرانے عقیدت مند ہیں یار۔ سارے شہر کے ڈاکٹروں کو چھوڑ کر دس سال سے اپنے ہی پاس آتے ہیں علاج کرانے۔"

"وہ۔ آپ کے مریض ہیں۔ یقین ہے آپ کو؟"

"اوئے جھلا ہوگیا ہے۔ یقین کی بات کرتا ہے۔ چل واپس۔ میں تجھے ملواتا ہوں ان سے۔"

میں نے کہا "ایک منٹ۔ ڈاکٹر رانجھا' مجھے شک ہے کہ ان کے ارادے کچھ ٹھیک نہیں۔ آج وہ دوا لینے نہیں' مجھے لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

"تجھے لے جاکے کیا کریں گے وہ؟" اس نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"گھر داماد بنائیں گے" میں نے کہا "ایسے لوگ کیا کرسکتے ہیں سوائے پھانسی کے' قتل کردیں گے وہ مجھے۔"

وہ ہنسنے لگا "تو نے کیا ان کی کڑی بھگائی ہے؟ چل ابویں نہ ڈر۔ جب ایسا کوئی کام نہیں کیا تو نے۔۔۔ یا کیا ہے تو بتادے مجھے۔"

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔ جو لوگ میری تلاش میں یہاں تک آگئے تھے وہ ٹلنے والے نہیں تھے۔ اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے ایک سوال کا جواب بھی مجھے آسانی سے مل گیا کہ آخر وہ یہاں تک پہنچے کیسے۔ اتنے بڑے شہر کی لاکھوں کی آبادی میں انہوں نے ناصر عظیم کو کیسے تلاش کرلیا اور سیدھے اس کے ٹھکانے پر اس کا حال پوچھنے کیسے آگئے؟

وہ اخبار میں میری تصویر ملاحظہ فرما کے آئے تھے۔ وہ تصویر جس میں میرے ساتھ ہیر رانجھا موجود تھے اور میں ڈی آئی جی صاحب سے مسکراتے ہوئے پھولوں کا گلدستہ لے رہا تھا۔ اخبار میں میرے کارنامے کی تفصیل بھی تھی اور اس سے کوئی بھی میرا سراغ لگا سکتا تھا۔ میرا وہ کارنامہ جس نے میری خوش قسمتی پر مہرِ تصدیق ثبت کردی تھی' میری بدبختی کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ یہ تصویر شائع نہ ہوتی تو شاید وہ ساری عمر گلی گلی بھٹکتے رہتے انہیں نہ میرا نام معلوم تھا اور نہ پتا لیکن اس بار تقدیر کا پانسا پلٹ گیا۔

اب قرار بھی لاحاصل تھا۔ وہ ڈاکٹر رانجھا کو جانتے تھے اور اس سے میرے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے کسی بھی انتہا تک جاسکتے تھے۔ اگر ابھی میں جان بچا کے نکل جاتا تو ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کی جان عذاب میں آجاتی۔ ان کے لیے ایک ذہنی صدمہ یہ ہوتا کہ میں کسی غلط فہمی کے خطرناک کا میں ملوث تھا اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کررہا تھا۔ میں نے ان کے لیے جو کچھ کیا تھا اسی آمدنی سے کیا تھا۔ شاید میرا پتا نہ بتانے کی صورت میں ان کی جان دہرے عذاب میں پڑجاتی۔

میں نے صورتِ حال کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کو موڑ کے واپس لے گیا۔ پورے اعتماد کے ساتھ نیچے اتر کے میں نے گاڑی کو لاک کیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر رانجھا اپنے مریضانِ خاص سے معانقے کے بعد اس کرسی پر بیٹھ چکا تھا جو اسی کے لیے مخصوص تھی۔

"ہاں بھئی' خیر تو ہے نا؟" رانجھا نے ایک کو مخاطب کیا۔

ان دونوں کی نظر مجھ پر جم کے رہ گئی تھی "یہ ناصر ہے؟"

جواب میں نے دیا "ہاں۔ میرا نام ناصر عظیم ہے۔ آپ کیسے جانتے ہیں مجھے؟"

ان میں سے ایک اٹھ کھڑا ہوا "بتادیں گے یہ بھی۔ ذرا ما کرنے کی ضرورت نہیں ہمارے ساتھ۔ حرامی' چکرباز۔"

دوسرے نے میرا بازو پکڑلیا "ہم سے پوچھتا ہے کہ ہم کیسے جانتے ہیں؟ تو نہیں جانتا ہمیں؟"

میں نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑالیا "یہ کیا بدمعاشی ہے؟ کون ہو آخر تم لوگ۔ کیا چاہتے ہو؟"

ڈاکٹر رانجھا نے بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ میں کہا "بھئی آخر معاملہ کیا ہے' دیکھو یہ برخوردار ہے اپنا۔ ہیر کا بھانجا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحب' آپ بیچ میں مت بولو" ان میں سے ایک نے رکھائی سے کہا "ہم اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

"مگر کیوں۔۔۔؟ اور ایسے زبردستی تم کیسے لے جاسکتے ہو مجھے؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا دن دہاڑے اغوا کرو گے؟"

"ہاں۔ چل شرافت سے ہمارے ساتھ۔۔۔" ایک نے ریوالور نکال لیا۔

ڈاکٹر رانجھا کی سٹی گم ہوگئی "او میاں جی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ کیا۔۔۔ کچھ مجھے بھی بتاؤ' معاملہ کیا ہے آخر؟"

دوسرے نے دھکا دے کر اسے پھر کرسی پر گرادیا۔ "چپ کرکے بیٹھ معالے واپتر۔ ہم بڑے خطرناک بندے ہیں۔"

ڈاکٹر رانجھا کے لیے اپنے اعجازِ مسیحائی پر اعتقاد رکھنے والوں کا یہ رویہ انتہائی دکھ دینے والا اور باعثِ تذلیل تھا۔ "اوئی۔۔۔ میری عرض بھی سن لو۔ آخر آپ جانتے ہو مجھے۔ یہ ضرور غلط فہمی ہوئی ہے آپ کو۔"

دوسرے نے اپنے ساتھی کے غیر شائستہ اور بے مروت رویے پر معذرت کی "معاف کرنا ڈاکٹر صاحب۔ اس معاملے میں ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ ہاں اتنا وعدہ کرسکتے ہیں کہ آپ کے اس بھانجے نے تعاون کیا ہمارے ساتھ تو اسے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم

واپس چھوڑ جائیں گے خیر خیریت کے ساتھ۔"

میں نے اب بحث کو لاحاصل سمجھتے ہوئے مزاحمت ترک کردی "اوکے۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

"او پتر ناصر۔ مجھے تو بتادے۔۔۔" ڈاکٹر رانجھا نے خوف سے کانپتی آواز میں کہا۔ اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہوگیا تھا۔

میں نے کہا "آپ بالکل فکر مت کریں۔ پریشان مت ہوں۔"

"ہیر پوچھے گی مجھ سے تو کیا بتاؤں گا میں اسے۔۔۔" وہ ایک دم کھڑا ہوگیا "اچھا سنو۔۔۔ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ کہاں جانا ہے؟"

"جانا ہے جہنم میں۔۔۔" پہلے والے شخص نے پھر اسے نیچے دھکیل دیا "مگر ابھی تیری باری نہیں آئی اور خبردار جو شور کیا۔ ہم بڑے خطرناک بندے ہیں۔"

خطرناک کو وہ خطرے ناک کہتا تھا اور ناک میں بولتا تھا۔ ڈاکٹر رانجھا پریشانی' خوف اور بے بسی کی تصویر بنا کھڑا رہا۔ میں نے مسکرا کے اس کا اعتبار بحال کرنے کی ناکام کوشش کی اور ان دونوں کے ساتھ باہر آگیا جہاں ان کی سفید ٹویوٹا چند قدم پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک شخص پہلے سے موجود تھا۔ میرے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ دائیں بائیں کے دروازے سے ایک ساتھ اندر آئے اور مجھے درمیان میں دبوچ کے بیٹھ گئے۔

"وہ دوسرا ایکٹر کدھر ہے؟" سلطان راہی نے کہا۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں ان سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوں "کیا تمہاری قریب کی نظر کمزور ہے؟ یہ بیٹھا تو ہے میرے ساتھ ہی بائیں طرف۔"

بائیں طرف بیٹھے ہوئے مصطفیٰ قریشی نے حلق سے پُرغضب احتجاجی آوازیں نکالیں "مخول کرتا ہے۔ ہمارے ساتھ مخول کرتا ہے۔"

میں نے کہا "مخول کیا ہے اس میں؟ تم ایکٹر نہیں ہو؟"

اس نے اپنا ریوالور میری پسلیوں میں دبایا "اوئے ہم بڑے خطرناک بندے ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے تو تمہارے بندے ہونے پر بھی شک ہے۔ تم صرف حکم کے غلام ہو۔ تمہیں بھیجا گیا ہے مجھے لانے کے لیے۔ تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور میں اس نقلی ریوالور سے ڈرتا نہیں۔"

مصطفیٰ قریشی نے مجھے گالی دی۔ "اوئے گولی ادھر سے گھس کے ادھر سے نکلے گی تو اصلی نقلی کا پتا چل جائے گا۔ ہم بڑے۔۔۔"

میں نے کہا "خطرناک بندے ہیں۔۔۔ آخر ہر ایک منٹ کے بعد یہ ٹیپ کیوں چل پڑتا ہے تمہارا۔ ایسا لگتا ہے کہ تم اندر سے خوف زدہ ہو۔ لاشعوری طور پر تمہیں احساس ہے کہ شکل سے تم جوکر لگتے ہو اور ایک بچہ بھی تم سے نہیں ڈرے گا اسی لیے تم بار بار اپنے خطرناک ہونے کا اعلان دہراتے رہتے ہو مگر گرد گرد اعا بار بار کہے کہ وہ گھوڑا ہے تو اسے نہ کوئی تانگے میں لگاتا ہے اور نہ کوئی دولھا اس پر سہرا باندھ کے بیٹھتا ہے۔"

سلطان راہی جو میرے دائیں طرف بیٹھا تھا بہ نسبت خاموش تھا اور شاید اپنے ساتھی کی عادت اور مزاج سے واقف تھا۔ اس نے ابھی تک اس فضول بحث میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا "گلزار کے گھر میں تیرے ساتھ ایک اور بندہ تھا' وہ کہاں ہے؟"

میں نے اسے سچ بتانے کا فیصلہ کیا "اس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں ہے۔ ایک جعلی پیر کی درگاہ پر تھا چند دن پہلے پھر پیر اپنے سارے مریدوں کے ساتھ پکڑا گیا۔ وہ بھی اندر ہوگیا تھا۔ اگر تم اخبار کی ہر سطر غور سے پڑھتے ہو اور ہر تصویر غور سے دیکھتے ہو تو تمہیں معلوم ہوگا۔"

مصطفیٰ قریشی بولا "بڑا چالاک ہے تو۔ ہم نے اخبار میں ہی دیکھی تھی تیری تصویر۔"

میں نے بے نیازی سے کہا "وہ دراصل۔۔۔ ماموں آئے تھے اسپتال میں مجھے دیکھنے کے لیے۔ ان کے ساتھ آگئے اخبار والے بھی۔"

مصطفیٰ قریشی متاثر ہوگیا "ڈی آئی جی تیرا ماما ہے؟ سگا؟"

میں نے کہا "سگا ماما اور ہونے والا سسر۔"

سلطان راہی نے غرا کے کہا "اوئے بند کرا اپنی بکواس طافو' میں بات کررہا ہوں اس سے۔"

طافو نے خفگی سے کہا "تو میں نے تیری زبان پکڑی ہے یار جمیل۔"

انہوں نے بے خیالی میں ایسا کیا تھا یا وہ اپنے نام اخفائے راز میں رکھنا ضروری نہیں سمجھتے تھے مگر ان کے اصل نام جان کے مجھے خوشی ہوئی "مسٹر طافو اور مسٹر جمیل۔ آپس میں مت لڑو۔ ایسا نہ ہو کہ مشتعل ہوکے تم ایک دوسرے کو گولی مار دو۔ ڈرائیور جان بچا کے فرار ہوجائے اور میں مشکل میں پڑجاؤں۔"

"تیرا ماما اور سسرا ڈی آئی جی ہے' تو کیسے پڑسکتا ہے مشکل میں؟" طافو نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے۔ ماما جی کہیں گے کہ شرافت سے کیوں نہیں رہتا؟ روز پکڑکا دیتا ہے دو چار بندے۔ کب تک بچاؤں گا میں تجھے۔"

جمیل نام کے شخص نے بڑی پھرتی سے میرے سر پر ریوالور مارا۔ مجھے اندھیرے میں تارے سے چمکتے دکھائی دیے پھر تارے غائب ہوگئے۔ طافو اور جمیل بھی غائب ہوگئے۔

ان کی شکل پھر مجھے ایک کمرے میں نظر آئی۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور کچھ پریشان تھے۔ میں خود فرش پر بچھے ہوئے قالین پر لیٹا ہوا تھا اور میرے قریب ہی ایک شخص ہاتھ پیچھے باندھے ٹہل رہا تھا۔ اتنے نیچے سے وہ مجھے بہت لمبا لگا۔ اس کا سر جست کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس میں کچھ قصور میرے حواس کا بھی تھا جو پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے۔ میرے سر کی وہ جگہ پھوڑے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح درد کر رہی تھی جہاں جمیل نے ریوالور کا دستہ مارا تھا مگر درد سر کے اندر بھی جیسے گشت کر رہا تھا۔

میں نے کچھ دیر بے ہوشی کا ڈراما جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ سلجھنے والا شخص باریش تھا مگر اس کی داڑھی شرع کے تقاضے پورے نہیں کرتی تھی۔ داڑھی کے بال لان کی گھاس کی طرح ہموار تراشے گئے تھے اور آدھے انچ سے زیادہ بڑے نہیں تھے۔ اس کے بھاری بھرکم اور سرخ و سفید چہرے پر یہ داڑھی اچھی لگتی تھی۔

"غلطی میری تھی۔ تم دونوں کو ایک ساتھ بھیجنے کا مطلب ہے کام خراب۔ مجھے ایک کی چھٹی کرنی پڑے گی۔"

طاٹو کی شکل رونے والی ہو گئی۔ "وڈے ملک صاحب۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کچھ زیادہ بولتا ہوں مگر میری زبان سے کوئی غلط بات نکلی کبھی؟ کوئی نقصان ہوا میرے بولنے سے۔"

وڈے ملک نے رک کے جمیل کی طرف دیکھا "تجھے قابو نہیں ہے اپنے آپ پر۔ ادھر آ ذرا میرے پاس۔"

جمیل کی حالت غیر ہو گئی "وڈے ملک صاحب۔ غلطی ہو گئی۔ معافی دے دو اس بار۔"

"اوئے غلطی دے پتر۔ جو میں نے کہا وہ سنا کہ نہیں؟" وڈے ملک صاحب نے شیر کی طرح دہاڑ کے کہا۔

جمیل آہستہ آہستہ میکانکی انداز میں اٹھ کے آگے بڑھا۔

"اور آگے آ۔ ادھر کر منہ اپنا۔"

"قسم ہے جی اگر آج ہاتھ بھی لگایا ہو" جمیل نے ہکلا کے کہا۔

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک زبردست تھپڑ کی آواز آئی اور جمیل میرے اوپر گر گیا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میرے حلق سے بے اختیار ایسی آواز نکلی جیسے مجھے الٹی آ رہی ہو۔ میں تھوڑا سا اچھلے بغیر بھی نہ رہ سکا۔

شاید جمیل نے تھپڑ کو اپنے بڑے جرم کی بہت چھوٹی سزا کے طور پر قبول کر لیا تھا جیسے عدالت سے قید کے فیصلے کی توقع رکھنے والا جرمانے کی سزا سن کے خدا کا شکر ادا کرے کہ جج نے بڑی رحم دلی سے کام لیا "یہ تو مکر کیتے پڑا ہے جی۔۔۔" اس نے کہا اور مجھے ایک جھٹکے سے اٹھا کے صوفے پر بٹھا دیا۔

میں آنکھیں کھولنے کی کوشش میں پلکیں جھپکتا رہا اور تھوڑی دیر جھومتا بھی رہا پھر میں نے روایتی سوال کیا "میں۔۔۔ میں کہاں ہوں؟"

بڑے ملک صاحب نے حکم دیا "اسے ایک ڈبکی دو پھر پتا چل جائے گا اسے کہ یہ کہاں ہے؟"

حکم کی تعمیل کے لیے مجھے طاٹو اور جمیل گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گئے۔ میرے بار بار کہنے پر بھی کہ میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں انہوں نے مجھے فرش پر بٹھا کے پانی کی بالٹی میرے سر پر انڈیل دی۔ میرا خیال تھا کہ ڈبکی کا مطلب ڈبکی ہو گا اور مجھے پانی کے تالاب میں نہ سہی، سر پکڑ کے باتھ ٹب میں غوطے ضرور دیے جائیں گے۔ بالٹی بھر پانی پڑنے سے مجھے اپنی حالت میں کچھ افاقہ محسوس ہوا۔

میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے اور اس حالت میں مجھے بڑے ملک صاحب کے سامنے پیش کیا جاتا تو ان کے قیمتی قالین کا ستیاناس ہو جاتا چنانچہ مجھے لباسِ قدرت میں پیش کیا گیا جو پیدائش کے وقت میرے جسم پر تھا۔

بڑے ملک صاحب نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اس وقت وہ صوفے پر بیٹھے تھے اور حقے کی نلکی کا آخری حصہ ان کے منہ میں ہی تھا۔ الفاظ ان کے منہ سے دھوئیں کے ساتھ ہی نکلے "ہاں بھئی جوان۔ ہوش آ گیا یا دھونی بھی دیں۔"

میں نے کپکپاتے ہوئے عرض کی "بڑے ملک صاحب۔ آپ تو ماشاءاللہ سے سیانے بندے ہو۔ کسی کے سر پر ایسا ریچھ جیسا جانور حملہ کر دے اور ریوالور سے اس کا سر پھاڑنے کی کوشش کرے تو اس کو اتنی جلدی ہوش کیسے آ سکتا ہے۔ اندر تک سر میں مغزالت پلٹ ہو گیا تھا۔ شکر ہے فوت نہیں ہونا پڑا۔"

بڑا ملک ٹھنڈے دماغ کا پُرسکون لہجے میں بات کرنے والا آدمی تھا "تو کب سے جانتا ہے گفتار کو؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ میں کسی گفتار کو نہیں جانتا۔"

بڑے ملک نے سہلایا "وسیم ہے اس کا اصل نام۔"

"اللہ خوش رکھے جی آپ کو۔ یہی ہے اس کا اصل نام۔ آپ تو سب جانتے ہیں۔"

"وہ تھانے دار بشیر چوہدری کا بہنوئی ہے۔"

"ہاں جی مگر بہنوئی بڑا حرامی ہے۔ ایک تھانے دار کی بہن کو۔"

"اوئے کام کی بات کر" جمیل نے میری گدی پر ہاتھ مارا۔

"کتے کی طرح فالتو مت بھونک" طاٹو نے کہا۔

"دیکھ لو جی ملک صاحب، ایک کا ہاتھ غلط چلتا ہے اور ایک کی زبان۔ میں کہہ رہا تھا کہ تھانے دار کی بہن کو۔۔۔ ننگ کر رکھا ہے وسیم نے۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ تو اسے کیسے جانتا ہے اور کب سے؟"

بڑے ملک نے تحمل سے اپنا سوال دہرایا۔

میں نے کہا "جنابِ عالی۔ آپ کے سامنے جھوٹ تو میں بول نہیں سکتا۔ آپ میری لاش کو بھی سچ بولنے پر مجبور کر سکتے ہو۔ مجھے اس بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔ میں آپ کو ساری بات بتا دوں گا۔ آپ چاہو تو سب ٹیپ کر لو۔ آپ کہیں تو میں لکھ کے دے دوں۔"

بڑے ملک نے میری بات کا مطلب سمجھ لیا "اوئے اس کو کپڑے دو دوسرے۔"

پانچ منٹ بعد میں پھر بڑے ملک کے سامنے تھا لیکن مناسب

کپڑوں میں۔ وہ نہ جانے کس کا سوٹ تھا۔ اس کی شلوار ٹھیک تھی مگر قمیص ڈھیلی تھی۔ غالباً بڑے ملک کو میرے شریفانہ تعاون اور مہذب انداز گفتگو نے قائل کر لیا تھا کہ میرے ساتھ مجرموں جیسا سخت سلوک فی الحال غیر ضروری ہے۔

"میں وسیم کا ساتھی ہرگز نہیں ہوں بڑے ملک صاحب۔ میں نے کہا "دشمن ہوں۔"

"پھر تو نے اس کی مدد کیوں کی تھی؟"

میں نے کہا "یہ ایک لمبی کہانی ہے۔"

"ساری رات نہیں ہے میرے پاس۔ مختصر بتا" بڑا ملک بولا۔

میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں میرا جھوٹ اور میری اداکاری کام نہیں آئیں گے۔ جتنی آسانی سے بڑے ملک نے حکم دیا تھا کہ اسے ڈبکی دو اتنی ہی آسانی سے وہ حکم دے سکتا تھا کہ اس کی کھال کھینچ لو اور بڑے ملک کے حکم کے غلام بچ بچ مجھے بکرے کی طرح الٹا لٹکا کے میری کھال اتار لیتے اور ملک کی خدمت میں پیش کر کے کہتے کہ اور کوئی حکم؟

بڑا ملک کیا تھا؟ اس کا میں صرف اندازہ کر سکتا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا بدمعاش تھا یا اسمگلر، سیاست داں یا کسی گروہ کا سرغنہ۔ اس کے انداز و اطوار سے ہی یہ عیاں تھا کہ وہ معمولی آدمی نہیں ہے۔ اس میں اپنی بڑائی کی بے سبب نمائش کی عادت نہیں تھی۔ لاحاصل غرور نہیں تھا اور وہ اکڑفوں نہیں تھی جو چھوٹے بدمعاشوں کے چھچھورے پن کی عکاسی کرتی ہے۔ ایسے لوگ کسی کو اپنی طاقت سے مرعوب کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتے۔ چیختے دہاڑتے نہیں۔ دھمکیاں نہیں دیتے اور یہ اعلان نہیں کرتے پھرتے کہ "اوئے ہم بڑے خطرناک بندے ہیں" وہ بس ایک اشارہ کرتے ہیں یا خاموشی سے حکم دیتے ہیں اور بندہ حاضر ہو جاتا ہے یا بندہ غائب ہو جاتا ہے۔

ایسے شخص کے سامنے جھوٹ بولنے کا خطرہ مول لینا میری حماقت ہوتی جس کا مجھے سنگین خمیازہ بھگتنا پڑتا۔ بڑے ملک کو دھوکہ دینے کی کوشش، آدم خور شیر کے سامنے جا کے اس کی ناک میں انگلی ڈالنے والی بات تھی چنانچہ میں نے اسے اپنے اور وسیم کے بارے میں سب بتا دیا کہ اس کے ساتھ میری دشمنی کا سبب کیا تھا۔ اس کے لیے میں دل میں کس قسم کے جذبات رکھتا تھا اور کیا چاہتا تھا۔ میں نے اصل داستان کے بہت سے غیر ضروری حصے حذف بھی کر دیے۔ مثلاً میں نے شادو کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ یہ نہیں بتایا کہ یتیم خانے سے نکل کے میں کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ میں نے بڑے ملک کو اپنے دوست ناصر عظیم اور اس کی ماں کے وسیم کے ہاتھوں مارے جانے کے بارے میں بتایا۔ یہ بتایا کہ کس طرح وسیم نے ان کا سب مال ہڑپ کر لیا تھا لیکن یہ بات گول کر گیا کہ وسیم نے اپنی بھابی اور ناصر کی ماں کو قتل کرنے کے بعد ان

بیوی کی مدد سے اپنے ہی گھر کے صحن میں گاڑ دیا تھا اور یہ کہ اب میں نے وسیم کو اس کا مکان دوبارہ بیچ کے اس سے سزا کے طور پر ساڑھے پانچ لاکھ وصول کرنے ہیں کیونکہ اسے تھانے دار بشیر چوہدری کی وجہ سے میں پھانسی کے تختے تک ہی نہیں پہنچا سکتا تھا اور خود بھی اسے قتل نہیں کر سکتا تھا۔

بڑے ملک صاحب نے بڑی توجہ سے سب سنا اور درمیان میں حقے کے کش بھی لیتا رہا۔ وہ کبھی کبھی سر ہلاتا تھا اور "ہوں" کہہ کے خاموش ہو جاتا تھا۔

"چل مان لیا کہ تو اس کا ساتھی نہیں ہے پھر تو نے اس کو وہاں سے کیوں بھگایا تھا؟"

میں نے کہا "بڑے ملک صاحب۔ میں نے بشیر چوہدری سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی بہن کا شوہر اسے واپس لا دوں گا۔"

"وہ سوٹ کیس کون لے گیا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے بالکل معلوم نہیں۔"

"تو وہیں تھا۔ تو نے دیکھا ہو گا؟" بڑے ملک نے کہا۔

"دیکھا ضرور تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک سبزی فروش ہے۔ گلزار بیگ وسیم نے اسے ایک سوٹ کیس دے دیا جو وہ اپنی ریڑھی پر رکھ کے لے گیا۔"

اچانک ملک نے ہاتھ سے اشارہ کیا "یہ کھوتے کا کھر تو بھی بات بتا رہا ہے۔ تو بھی نہیں بتا رہا ہے۔"

"بتائے گا جی وڈے ملک صاحب" جمیل نے گردن دروج کے مجھے اٹھا لیا "ریکارڈ کی طرح بجے گا۔"

"میں پورا ریکارڈ سننا چاہتا ہوں" بڑے ملک نے مسکرا کے کہا۔

میں نے کہا "بڑے ملک صاحب۔ خدا کی قسم میں نے جھوٹ نہیں بولا۔ میں نے سب بتا دیا اور جو پوچھتا ہے پوچھ لیں۔"

طاٹو اور جمیل نے میرے شور مچانے کی پروا نہیں کی۔ خود بڑے ملک صاحب ایسی بے نیازی سے بیٹھے رہے جیسے ان کے کان کچھ بھی نہیں سن رہے ہیں یا پھر کمرے میں مکمل خاموشی ہے اور ان کے سوا کوئی بھی نہیں ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اب بڑے ملک صاحب کی نجی جیل میں میرے ساتھ وہی ہو گا جو تھانوں میں ہوتا ہے۔ وہ مجھ سے پورا سچ اگلوانے کے لیے میرے جسم کی قوتِ برداشت آزمائیں گے۔ خوف سے میرا جسم لرزنے لگا۔ میں نے بہت کہا کہ میں وہ سب ہی بتا رہا ہوں جو انہوں نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے نہیں بتایا تھا کہ بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ بڑے ملک صاحب نے کہا تھا کہ میرے پاس ساری رات نہیں ہے تو۔۔۔ میں اب بتا رہا ہوں۔ گارڈ مجھے دھکے دیتے ہوئے اندر لے گئے۔ کسی نے میری چیخ و پکار نہیں سنی۔ "اب تو تیرا باپ بھی بتائے گا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔" طاٹو نے میری کمر پر ایک لات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں آگے منہ کے بل گرا۔ "میں نے..... غیر متعلقہ باتیں بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا" میں بڑی مشکل سے اٹھا۔

"غیر متعلقہ دے پتر۔ یہ فیصلہ تو نے کرنا تھا کہ کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری۔ بڑے ملک صاحب سے بھی بڑا جج ہے تو....." طانو نے میرے دوسری لات ماری تو میں ایک دروازے سے ٹکرا گیا۔

دروازہ کھل گیا اور ایک دم میری نظروں کے سامنے وہ منظر آگیا جس نے لمحہ کو میری رگوں میں منجمد کردیا۔ میں چکرا گیا اور پھٹی پھٹی نظروں سے رئیس کو دیکھتا رہا جو چھت کے ایک کنڈے سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں ایک رسی سے جکڑے ہوئے تھے اور وہی رسی پنکھے کے بیچ سے گزاری گئی تھی۔ یہ نئی اور نائلون کی رسی تھی جس سے رئیس کے ہاتھ بھی کمر کے پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ اس کے باوجود کافی رسی فرش پر پڑی تھی۔

رئیس کے جسم پر کپڑوں کی جگہ لال نیلی لکیریں تھیں جو گردن سے اوپر کمر کے نچلے حصے تک نظر آرہی تھیں۔ اس کے منہ کو مضبوط ٹیپ لگا کے بند کردیا گیا تھا اور دو نوجوان لڑکے صرف شلوار پہنے اس پر بڑی محنت سے تشدد کررہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں چمڑے کی بیلٹ تھی جو وہ ہاتھ گھما کے مارتے تھے تو ہوا میں شڑاپ کی آواز پیدا ہوتی تھی پھر چمڑے کے کھال پر پڑنے سے ذرا مختلف آواز سنائی دیتی تھی اور اس کے ساتھ ہی رئیس تڑپ کے اچھلتا تھا۔ اس کا جسم کرب سے اینٹھتا تھا اور بل کھاتا تھا' جھٹکے لیتا تھا اور تھرتھراتا تھا مگر اس کے حلق سے کوئی چیخ نہیں نکلتی تھی۔ ایک بہت گھٹی ہوئی ہنکارے جیسی آواز آتی تھی۔

یہ منظر میری آنکھوں نے صرف ایک لمحے کے لیے دیکھا۔ صرف ایک بار میرے کانوں نے وہ نحوست زدہ بھیانک اور بے رحم آوازیں سنیں پھر ایک دم میرے جسم کا سارا خون کھنچ کے میرے سر میں پہنچ گیا۔ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا اور میری عقل نے مصلحت کے سارے تقاضے نظرانداز کردیے۔

میں نے چمڑے کی بیلٹ لہرانے والے ایک نوجوان کو چیخ کے گالی دی اور اسے ایک جست لگا کے نیچے گرادیا۔ دوسرے لمحے میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا۔ میرے ہاتھ اس کی گردن پر جم گئے۔ چند سیکنڈ پہلے بہادری کا مظاہرہ کرنے والے کا چہرہ دہشت سے لاش کی طرح سفید ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں موت کا خوف اترگیا مگر اس کی آواز میری گالیوں میں دب گئی۔

یہ پاگل پن مجھے بہت مہنگا پڑا۔ ایک دم باقی تین افراد مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میری وحشت اور دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ سب مل کے مجھے مار رہے تھے اور کھینچ رہے تھے مگر وہ میرے ہاتھوں کے شکنجے سے اس شخص کی گردن چھڑانے میں ناکام تھے جسے میں نے دبوچ رکھا تھا۔ جب انہوں نے مجھے گھسیٹا تو وہ نوجوان بھی ساتھ گھسیٹا گیا۔ معلوم نہیں کب وہ مرگیا۔ کسی نے میری کلائی پر ڈنڈے مارے تو شکنجہ کھل گیا اور وہ میرے ہاتھوں سے نکل کر فرش پر گر گیا اور پھر وہیں پڑا رہا۔ کچھ لوگ شور کی آواز سن کر اندر آگئے تھے۔ وہ اسے اٹھا کے لے گئے۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ رئیس بھی وہاں نہیں ہے جہاں اس کا جسم تشدد کی سولی پر چڑھا ہوا تھا۔ وہ جگہ میرے لیے خالی کردی گئی تھی۔

میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا مگر بڑے ملک صاحب کو یہ بات اچھی نہیں لگی تھی کہ میں نے آدھا سچ کیوں بولا اور غیر ضروری تفصیل کو اپنے بیان سے خارج کرنے کا فیصلہ خود کیوں کیا؟ مجھے بلوانے سے پہلے بڑے ملک صاحب نے اپنے ذرائع اور وسائل استعمال کرتے ہوئے میرے ماضی اور حال کے بارے میں تمام معلومات حاصل کرلی تھیں اور اب انہیں صرف یہ دیکھنا تھا کہ میرا بیان کس حد تک ان سے مطابقت رکھتا ہے اور میں کتنا جھوٹ بولتا ہوں۔

یہ محض کچھ حقائق کو ان کے معاملات سے الگ سمجھنے کا نتیجہ تھا کہ اس رات میرے ساتھ اخلاقی مجرموں جیسا سلوک کیا گیا۔ میں نے بڑے ملک صاحب کی بے عزتی نہیں کی تھی اور اپنا لہجہ اپنی اوقات کے مطابق رکھا تھا۔ اگر میں جھوٹ بولتا' بڑے ملک صاحب کی بڑائی کو تسلیم نہ کرتا اور لہجہ گستاخ رکھتا تو میرا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔

ملک صاحب کے ایک بندے پر قاتلانہ حملے کا جرم اپنی جگہ بہت سنگین تھا اور اسے مار کے ایک طرح سے میں نے خود کو سزائے موت کا مستحق ثابت کردیا تھا۔ طے صرف یہ ہونا تھا کہ موت سے پہلے مجھے کتنی اذیت سے گزرنا چاہیے۔ آسان موت تو گویا کوئی سزا ہی نہیں تھی۔

وہ رات میرے لیے قبر میں لیٹ کر یوم حشر کا انتظار کرنے والے مُردے کی رات سے بھی لمبی ہوگئی۔ بڑے ملک صاحب کے خدمت گزاروں نے ایک انتقامی جذبے کے ساتھ میری کھال میں بھس بھرا۔ میں بار بار بے ہوش ہوجاتا تھا تو وہ مجھے فرش پر ڈال دیتے تھے اور مجھ پر پانی چھڑکتے تھے۔ میں ہوش میں آتا تھا تو مجھے پانی پلاتے تھے اور پھر پوچھتے تھے کہ اب بتاؤ۔ وہ بندہ کون تھا جسے تم نے گزار کے ساتھ مل کے سامان سمیت بھگادیا؟ گزار کہاں ہے؟ خود کو سبزی فروش ظاہر کرنے والا اور ریڑھی کے ساتھ آنے والا کس کا آدمی تھا۔ وہ کیا سامان تھا جو تم نے اس کے حوالے کیا؟ اس کا خریدار کون تھا اور اس نے تمہیں یا گزار کو کیا ادائیگی کی؟

بہت کچھ جو میں نے پہلے نہیں بتایا تھا رات بھر میں بتادیا مگر جو مجھے معلوم نہیں تھا اور جس کی بنیاد محض شکوک اور مفروضات پر تھی وہ میں کیسے بتا سکتا تھا۔ میں چیختا چلاتا رہا۔ ہاتھ جوڑتا رہا۔ خدا رسول کے واسطے دیتا رہا اور ان سے رحم کی درخواست کرتا رہا مگر ان پر کیا اثر ہوتا۔ وہ مجھے بتاتے رہے کہ یہ تو ابتدا ہے اور گویا..... آگے تم کے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔

"صبح ہم اٹھالائیں گے تیری ماں بہن کو اور تیرے سامنے اس کی کھیر پکائیں گے....." انہوں نے انتہائی فحش الفاظ میں واضح کیا کہ کھیر کیسے پکائی جاتی ہے۔

"دیکھو تم مجھے جتنی سزا چاہو دو۔ میرے ٹکڑے کردو اور ملک صاحب کے کتوں کے آگے ڈال دو مگر وہ بوڑھی عورت ہے۔ بہت دکھی اور مظلوم ہے۔ خدا کے عذاب سے ڈرو" میں رونے لگا۔

وہ ہنسنے لگے "اور تیرا یار ڈاکٹر رانجھا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ وہ بھی دکھی اور مظلوم ہے؟"

میرے جسم پر لمبے لمبے زخموں کی لکیریں سی بن گئی تھیں۔ وہ ایک لوٹے میں نمک والا پانی لائے اور ٹونٹی کی دھار سے میرے جسم کو دھونے لگے۔ اذیت سے میرا جسم پھڑکنے لگا۔ میں فرش پر ایسے لوٹنے لگا جیسے مرغی پر چھری پھیر کے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ بہت جلد میں پھر بے ہوش ہوگیا۔

معلوم نہیں کب مجھے پھر ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا "تیرا یار تو بڑا بودا نکلا۔ فٹافٹ ہی مرگیا۔"

میں نے چیخ کے کہا "رئیس مرگیا۔ اسے مار دیا تم نے؟" میں دھاڑیں مار کے رونے لگا اور انہیں گالیاں بکنے لگا۔

وہ ہنستے رہے "اوئے تو نے بھی ایک بندہ پھڑکا دیا تھا ہمارا۔ ابھی اس کا بڑے ملک صاحب کو علم نہیں۔"

میں نے بڑے ملک صاحب کو بڑی بڑی گالیوں سے نوازا۔ موت کا یقین آجانے کے بعد میرے لیے موت کا خوف بے معنی ہوگیا تھا۔ تیسری یا چوتھی بار مجھے ہوش آیا تو میں کسی دوسرے کمرے میں تھا جہاں فرش پر مجھ سے کچھ دور رئیس پڑا ہوا تھا۔ میں نے خالی کمرے میں لگے ہوئے بلب کی زرد روشنی میں اسے دیکھا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مرگیا ہے۔

ہمت کرکے میں نے اپنے وجود کو ناقابل برداشت اذیت کے باوجود اوپر اٹھایا اور گھسٹ کر رئیس کے قریب گیا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور اسے آواز دے کر ہلایا "رئیس..... آنکھیں کھول کے دیکھ رئیس۔ میں حاضر ہوں" مگر پھر مجھے چکر سا آیا۔ کمرے میں لٹکا ہوا بلب اور اس کی دیواریں سب گھومنے لگے اور پھر میں اندھیرے میں ڈوب گیا۔

آخری بار میں نے آنکھیں کھولیں تو سارا منظر بدلا ہوا تھا۔ میں صاف ستھرے کپڑے پہنے بستر پر لیٹا ہوا تھا اور میری جسمانی اذیت بھی معدوم ہوچکی تھی۔ مجھ پر غنودگی کا اثر باقی تھا جس سے میرا سر بھاری ہورہا تھا اور آنکھیں خود بخود بند ہوجاتی تھیں۔ وہ بے ہوشی یا نیند کا کوئی وقفہ تھا جس میں میرا ذہن سوچتا رہا کہ یہ کہ ہے؟ خواب یا فریب آرزو۔ فریب خیال.....؟

میں دوسری بار جاگا تو سفید یونی فارم والی ایک نرس میرا بازو تھام کے مجھے انجکشن لگا رہی تھی۔ انجکشن کی سوئی کی چبھن مجھے بالکل محسوس نہیں ہوئی۔ شاید یہ درد کا احساس مٹانے والی دوا کا انجکشن ہوگا۔ میں نے سوچا اور اسی لیے مجھے اپنے جسم میں کہیں بھی درد محسوس نہیں ہورہا ہے۔

میں نے نرس سے پوچھا "سسٹر۔ یہ کون سا اسپتال ہے؟"

وہ آہستہ سے مسکرائی "یہ کوئی اسپتال نہیں۔"

"پھر میں کہاں ہوں؟"

"تم اپنے گھر میں ہو۔" اس نے قدرے حیرانی سے کہا "ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک ہوگی تو تمہیں سب یاد آجائے گا۔"

وہ جانے لگی تھی کہ میں نے اسے روک لیا۔ "ایک منٹ سسٹر۔ میں کب سے بیمار ہوں؟"

"مجھے..... نہیں معلوم" شاید اس سوال کا جواب دینا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے کہا "اچھا۔ تم مجھے کب سے دیکھ رہی ہو؟"

اس نے یوں دروازے کی طرف دیکھا جیسے اسے کسی کے آنے کا ڈر ہو "کل دوپہر سے..... اب تمہاری حالت بہت بہتر ہے۔ کس نے مارا تھا تمہیں؟"

میں نے سوچ کے کہا "مارا تھا؟"

"ہاں۔ کیا جرم کیا تھا تم نے جس پر پولیس نے اتنا ٹارچر کیا..... عجیب وحشی بن جاتے ہیں یہ لوگ۔" اس کے لہجے میں خوف' نفرت اور افسوس کے ملے جلے جذبات شامل تھے "کوئی جانور کے ساتھ بھی ایسا نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا "مجھے پولیس نے ٹارچر نہیں کیا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی۔"

"تم مجھ سے چھپا نہیں سکتے..... دس سال میں بہت کیس دیکھے ہیں میں نے۔ تمہارا جسم خود بتاتا ہے۔"

میں نے کہا "پھر تکلیف کا احساس کیوں نہیں ہے مجھے۔"

"PAIN KILLERS..... ویسے بہت جلد ٹھیک ہوجاؤ گے تم۔ بس آرام کرو" وہ ایک شفیق مسکراہٹ کے ساتھ مجھے تسلی دے کر دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے کہا "سسٹر۔ پلیز' ایک بات اور بتادو۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ڈاکٹر آنے والا ہے۔ ہمیں مریضوں کے ساتھ زیادہ بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

"یہاں کہیں رئیس نام کا بھی کوئی شخص ہے..... میری عمر کا..... اس کی حالت بھی....."

اس نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ وہ میری بات کا کوئی جواب دیتی' ایک شخص اندر آگیا۔ وہ ڈاکٹر کے سوا کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی عمر پچاس سال کے لگ بھگ تھی اور وہ سوٹ میں تھا۔ اسٹیتھ اسکوپ اس کے گلے میں ہار کی طرح لٹک رہا تھا۔ وہ مجھے ہوش میں دیکھ کے مسکرایا۔

"ہیلو ینگ مین۔ ہاؤ ڈو یو فیل ناؤ؟"

میں نے اسے انگریزی میں ہی جواب دیا "میرا خیال ہے کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں زندہ ہوں۔"

وہ انگریزی میں بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا "تم زندہ رہو گے ابھی بہت عرصہ۔ لمبی عمر ہوگی تمہاری۔"

میں نے کہا "یہ آپ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کہہ رہے ہیں یا کچھ علم نجوم بھی جانتے ہیں؟"

نرس جاتے جاتے لوٹ آئی تھی اور اب کمرے کے ایک کونے میں کھڑے ہوئے اسٹینڈ کو قریب لا کے میرا بلڈ پریشر دیکھ رہی تھی۔

دروازہ پھر کھلا اور میں نے بڑے ملک صاحب کو دیکھا۔ وہ اس وقت بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا۔ مجھے دیکھ کے وہ بڑے دوستانہ اور مہربان انداز میں مسکرایا۔ میں اس کی شخصیت کے دوغلے پن پر حیران رہ گیا۔

ڈاکٹر نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ اس کی RECOVERY حیرت انگیز ہے۔ مضبوط اور غیر معمولی قوتِ ارادی کا مالک ہے یہ نوجوان۔"

میں نے غور سے اسے دیکھا۔ ڈاکٹر نے اسے بڑے ملک صاحب نہیں چھوٹے ملک صاحب کہا تھا مگر میں دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔ میں نے منہ پھیر لیا پھر میری نظر دوسری طرف بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے پھولوں کے گلدستے پر گئی۔ اس پر لکھا ہوا نام بہت واضح تھا۔

چھوٹے ملک نے مسکرا کے کہا "بھئی کوئی آیا تھا کل تم سے ملنے۔ تم نے تو یار، نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا اسے حالانکہ نظر بھر کے دیکھنے والی چیز تھی۔"

میں نے گلدستہ اٹھا لیا "نیلم۔۔۔ نیلم آئی تھی یہاں؟"

"ابھی آئے تو پوچھ لینا؟" چھوٹے ملک نے ہنس کے گھڑی دیکھی "ہم پر تو اعتبار نہیں تمہیں۔"

ڈاکٹر کے ساتھ نرس بھی کمرے سے نکل گئی تو میں نے چھوٹے ملک صاحب کی طرف دیکھا "یہ کیا ڈراما ہے ملک صاحب۔ چھوٹے بڑے کا؟"

"بڑے ملک صاحب مجھ سے بڑے ہیں اس لیے بڑے ملک صاحب کہلاتے ہیں" وہ اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا "وہ۔۔۔ بھائی ہیں آپ کے؟ جڑواں؟"

"ویسٹ از رائٹ۔ میں دس منٹ چھوٹا ہوں" وہ ہنسا۔

"کیسی عجیب بات ہے۔ صرف دس منٹ سے اتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ آدمی کی نظرت میں" میں نے کہا۔

"نظرت کا پیدائش کے وقت سے کیا تعلق۔" وہ بولا "یا تم یقین رکھتے ہو HOROSCOPE پر؟"

میں نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ میرا ایک دوست تھا۔۔۔ اسے بھی یہاں میرے۔۔۔ اتنے۔۔۔ اگر اتنا، وہ کہاں ہے؟"

"آئی ایم سوری، اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں یا بتانا نہیں چاہتے آپ؟"

"معلوم ہوتا تو بتانے میں کیا تھا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "آپ معلوم کر سکتے ہیں۔ پلیز چھوٹے ملک صاحب، آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔"

"دیکھو بھئی۔ بڑے ملک صاحب ویسے تو صرف دس منٹ بڑے ہیں مجھ سے۔ برابر ہی ہوئے مگر مجھے ڈر لگتا ہے ان کے معاملات سے۔"

میں نے کہا "کیا یہ بڑے ملک صاحب کا گھر ہے؟"

"نہیں یار۔ انہوں نے تمہیں میرے حوالے کر دیا تھا۔"

"مردہ سمجھ کے؟ یا مار کے ٹھکانے لگانے کے لیے؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"ہیو آر اے لکی فیلو۔۔۔ ایسا ہی ہوتا اگر۔۔۔ خیر۔۔۔ بعد میں بات کریں گے۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ملازمہ ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آ گئی تھی۔

میں سمجھ گیا کہ چھوٹے ملک صاحب اس کے سامنے کوئی بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی کہ میں اب بڑے ملک صاحب کے عقوبت خانے میں نہیں ہوں۔ ایک جیسی ظاہری شخصیت رکھنے والے دونوں ملک برادران کی نظرت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

رئیس کے قصور نے میری نیند اور بھوک اڑا دی تھی۔ آخری بار میں نے اسے جس حال میں دیکھا تھا، وہ انتہائی دل خراش منظر تھا۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔

ملازمہ واپس جانے والی تھی کہ میں نے کہا "سنو۔ یہاں فون ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا مگر بہت سوچنے پر بھی مجھے نیلم کا فون نمبر یاد نہیں آیا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک ہی نمبر یاد تھا۔ یہ ڈاکٹر مشہود کے گھر کا نمبر تھا۔

گھر کے اندر سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ میرے جسم پر عام کپڑے تھے۔ ایک بار میں اسپتال کے کپڑوں میں فرار ہو گیا تھا پھر اب کیا مشکل ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچا۔ شاید باہر کوئی چوکیدار یا گن مین ہوگا۔ شاید کیا، یقیناً ہوگا۔

دروازے سے گزر کے میں نے خود کو ایک لاؤنج جیسی جگہ میں پایا۔ لاؤنج میں ہر طرف دروازے تھے۔ دو دائیں طرف، دو بائیں طرف۔ ایک دروازہ بالکل سامنے تھا۔ میں نے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔ میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ یہ کاریڈور میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ جھٹ پٹ ہی راہداری میں قالین بچھا ہوا تھا اور دن کے وقت

بھی فانوس روشن تھے۔ اس کے آخری سرے میں مجھے ایک دروازہ اور نظر آ رہا تھا جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ باہر جانے کا راستہ ہوگا۔

اچانک میرے جسم میں اتنی قوت آ گئی تھی کہ میں بھاگا۔ کوئی کسی وقت کہیں سے بھی نمودار ہو سکتا تھا۔

میں دروازے کے قریب پہنچ گیا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی "رک جاؤ۔"

رگوں میں میرا خون ہی نہیں۔۔۔ میں خود بھی منجمد ہو گیا۔ اس آواز کو میں پہچانتا تھا۔

یہ آواز نیلم کی تھی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی سماعت پر بھی اعتبار نہ آیا۔ کہیں حواس مجھے دھوکا تو نہیں دے رہے ہیں۔ صحرا کے سفر کی صعوبت جھیلنے والے پیاسے مسافر کو خواہش اور مایوسی کی نتاا ایسے ہی فریب دیتی ہے اور اسے سراب نظر آتے ہیں۔ ں لگتا ہے جیسے ٹھنڈے میٹھے پانی کی جھیل اس کے سامنے ہے جبکہ تاحدِ نگاہ صرف ریت ہوتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ں نے سوچا تھا کہ یہاں سے کسی کو فون کرنے کا موقع ملے تو یلم کو فون کر کے بتاؤں کہ میں کہاں ہوں اور کس مشکل میں گرفتار ہوں لیکن مجھے اس کا فون نمبر ہی یاد نہ تھا اور اب میں س کی آواز سن رہا تھا۔

اس کے قدموں کی چاپ نزدیک آنے لگی تو میں نے پلٹ کے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ وہ اپنے اندازِ محبوبی کی ساری خرسامانی کے ساتھ مسکراتے ہوئے میری طرف آ رہی تھی۔ اس نے سفید ریشم جیسے کپڑے کا تقریباً شفاف لباس شبِ خوابی پہن رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ کوئی پری ہے جو بادلوں اور چاندنی کے غبار سے نکل کر زمین پر اتر آئی ہے اور میں گھپ اندھیری رات والے جنگل میں اپنی سمت اور اپنی راہ گم کر دینے والا مسافر ہوں جسے وہ اپنے ساتھ اڑا کے لے جائے گی۔

جب وہ قریب آئی تو فضا میں ایک مدہوش کن طلسماتی خوشبو بھر گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بھاگ کے کہاں جا رہے تھے، چلو واپس۔"

میں مزاحمت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ کا نازک لمس کسی فولادی ہتھکڑی سے زیادہ مضبوط تھا۔ میں نیند میں چلنے والے کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔

"مجھے یقین نہیں آتا" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کس بات کا یقین نہیں آتا؟" اس نے کلائی جھٹک کے میرا بازو تھام لیا اور میرا سہارا لے کر چلنے لگی۔ مجھے اس کا وزن بالکل محسوس نہیں ہوا۔

وہ ننگے پاؤں تھی اور اس کے بال بھی کھلے اور بکھرے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اس پر سو کے اٹھنے کے باوجود نیند کا اثر باقی ہے مگر یہ گزشتہ شب کے آخری جام کا نشہ تھا۔ نشہ اب میرے حواس پر بھی طاری ہونے لگا تھا کیونکہ صرف خوشبو ہی نہیں، اس کے بدن کی لطافت اور نرمی بھی مجھ میں اتر رہی تھی۔ میرے درد سے سلگتے اور چٹختے بدن میں برفاب کی ٹھنڈک سے ملنے والا سکون پھیل رہا تھا۔

اس نے پھر کہا "بولو نا۔ یقین نہ آنے والی کون سی بات

اندھیر نگری — محی الدین نواب — چار حصے — قیمت فی حصہ 150 روپے

سنہری جونک — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے

مقدس عہد — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے

مقدس نشان — ایم اے راحت — قیمت 90 روپے

راکھشس — ایک پراسرار اور خوفناک ناول — ساحر جمیل سید — قیمت 125 روپے

راکھ — ایک خوفناک ناول — وجیہہ سحر — قیمت 100 روپے

ڈاک خرچ فی کتاب 30 روپے

تمام کتب منگوانے پر ڈاک خرچ بذمہ ادارہ

اپنے ہاکر یا اپنے شہر کے بڑے بک سٹال سے طلب فرمائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

میں نے اس کے لہجے میں خفیف سی لکنت اور چال میں معمولی سی لڑکھڑاہٹ دیکھی اور سمجھ گیا کہ یہ صرف خمارِ شب ہی نہیں اس پر نشے کا اثر باقی ہے۔ بے اختیاری میں مجھے سہارا دینے کے بجائے وہ خود گرے جا رہی تھی۔ مجبوراً مجھے ایک ہاتھ اس کی کمر میں ڈال کے اسے سنبھالنا پڑا۔ اب ہم دونوں ایک دوسرے کے سہارے پر چل سکتے تھے لیکن میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ لوٹ کر اپنے کمرے میں جاؤں تو کیا اسے بھی ساتھ لے جاؤں۔ میں نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ راہداری میں کھلنے والے بہت سے دروازوں میں سے وہ کس دروازے سے باہر آئی تھی۔

اس نے اپنا ہاتھ میری کمر کے گرد حمائل کر کے میرا رخ اسی کمرے کی طرف موڑ دیا جہاں سے میں فرار ہوا تھا "یہ ہے تمہارا کمرا۔"

میں نے دروازے کو دھکیلا "جی۔ آپ کا کمرا کہاں ہے؟"

میرے ساتھ دروازے سے گزرتے ہوئے وہ کچھ اور مجھ سے چپک گئی "کیا بات کرتے ہو یار۔ یہ سارے کمرے میرے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیا یہ آپ کا گھر ہے؟"

اس نے سر ہلایا "ہاں۔ اور تم۔ تم مہمان ہو میرے۔ اور بیمار ہو' پھر بھاگ کے کیوں جا رہے تھے؟"

میں نے کہا "میں اب ٹھیک ہوں۔"

"نہیں۔ تم ٹھیک نہیں ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو' وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جو اس حرامی کے بچے بڑے ملک نے تمہارے ساتھ کیا۔ وہ بھی ٹھیک نہیں تھا اور جو وہ چھوٹا ملک میرے ساتھ کرتا ہے' وہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ٹھیک کچھ نہیں ہے ناصر اس دنیا میں۔"

میں نے اسے اپنے بیڈ پر لٹا دیا "آپ کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔"

وہ ہنسی "ہمت نہیں ہے یہ کہنے کی کہ تم نشے میں ہو۔ پی رکھی ہے تم نے۔ دیکھو ناصر' میں کوئی اچھی عورت نہیں ہوں۔ کوئی شریف زادی نہیں ہوں۔ بس تم نے پہلے میرا بابر روپ دیکھا تھا جو سب دیکھتے ہیں۔ ابھی وہ چھوٹا ملک آیا نا۔ خواہ مخواہ اس کے ساتھ میں نے پی لی۔ اس نے پلائی۔ میں انکار کر سکتی تھی مگر میں نے نہیں کیا۔ تم کیوں کھڑے ہو لیٹ جاؤ تم بھی۔"

میں نے کہا "میں بیٹھ جاتا ہوں۔ یہاں صوفے پر۔"

"نہیں۔ بیمار تم ہو' تم کو لیٹنا چاہیے یہاں" وہ اٹھنے لگی۔

میں نے اسے روک دیا "میں نے کہا نا کہ اب میں ٹھیک ہوں۔"

"اچھا' پھر تم بھی آ جاؤ یہاں جگہ بہت ہے۔ جگہ دل میں ہونی چاہیے۔"

میں نے گھبرا کے کہا "آپ میری فکر نہ کریں۔ میں صوفے پر ٹھیک ہوں۔"

اس نے لیٹ کے ایک گہری سانس لی "ناصر۔ تم نے بتایا نہیں' کس بات کا یقین نہیں آیا تھا تمہیں۔ جب تم نے مجھے دیکھا تھا؟"

میں نے کہا "مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں آپ کے گھر میں ہوں۔ گل دستہ دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ میں آپ کو فون کروں مگر نمبر یاد نہیں تھا مجھے۔"

وہ ہنسنے لگی "مجھے۔ میرے ہی گھر میں تھے تم اور مجھے فون کرنا چاہتے تھے۔ پاگل ہو تم بھی۔ ویسے ہی کہہ سکتے تھے جو کہنا تھا مگر تمہیں پتا نہیں تھا۔ خیر' کیا کہنا چاہتے تھے تم مجھ سے؟ اب کہہ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "اب کوئی جلدی نہیں۔ آپ کے اس عالی شان محل میں نوکر چاکر بھی تو ہوں گے۔"

"ہاں۔ کیا چاہیے تمہیں' بولو" اس نے بیڈ سائڈ پر لگے ہوئے پینل کا ایک بٹن دبا دیا۔

میں نے کہا "مجھے۔۔۔ اور آپ کو بھی۔ کافی کی ضرورت ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ ابھی صغراں سے کہتی ہوں میں" اس نے پھر بٹن دبایا۔

چار خانے کی لنگی' سفید کرتے اور جالی دار ٹوپی میں ایک عمر رسیدہ شخص اندر آ گیا۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے اس کے بالکل سفید بالوں سے ساٹھ سال کیا۔ سر کے بال ابھی تک گھنے اور نفاست سے تراشی ہوئی سفید داڑھی کے ساتھ بہت اچھے لگتے تھے۔ اس کا اپنا رنگ سیاہی مائل گندمی تھا اور اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ وہ اپنے چھ فٹ قد کے ساتھ بالکل سیدھا چلتا تھا اور اس کی آنکھوں میں عجیب مقناطیسی کشش محسوس ہوتی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹی۔ تم کیوں لیٹی ہو یہاں؟" اس نے بڑے نرم اور پُرسکون لہجے میں سوال کیا "بیمار کون ہے؟"

نیلم کہنیوں کے بیٹھ گئی "بابا یہ ناصر ہے۔ ناصر عظیم!"

"ہاں۔ اس کے بارے میں جتنا تم جانتی ہو' اتنا ہی مجھے

معلوم ہے" اس نے مسکرا کے مجھے دیکھا "یہ بتاتی رہتی تھی ہر بات مجھے۔"

میں نے کہا "انہیں کچھ چکر آ رہے تھے' میں نے لٹا دیا یہاں۔"

نیلم نے مجھے پُرتشکر نظروں سے دیکھا "میں آئی تھی بیمار کی طبیعت کا حال پوچھنے بابا" وہ ہنسی "خود بیمار بن گئی۔"

بابا واپس جانے لگا "میں گیا تھا تمہارے کمرے میں تو دیکھا تم غائب۔ میں سمجھا چھوٹے ملک کے ساتھ چلی گئیں پھر خیال آیا کہ تم یہاں نہ ہو۔"

"بابا۔۔۔ ذرا صغراں سے کہہ دیں' کافی لا دے دو کپ۔"

بابا رک گیا "یہ کیا طریقہ ہے بیٹی۔ وہ ملک تو گھر سے چلا ہوگا ناشتا کر کے۔ تم نے خالی پیٹ اس کے ساتھ پی لی۔۔۔ اور اب نشہ اتارنے کے لیے پوگی خالی پیٹ بلیک کافی۔ زہر کا علاج زہر سے۔۔۔ ایسے تو صحت کا بیڑا غرق کر لوگی تم۔ اتنی چھوٹی بچی نہیں ہو کہ میں ہر وقت تمہارا خیال رکھوں۔"

نیلم نے نظر جھکا کے کہا "آئندہ احتیاط کروں گی بابا!"

بابا دروازہ کھول کے نکل گیا تو میں نے کہا "یہ تمہارے والد ہیں؟"

نیلم نے بے خیالی میں کہا "والد سے بھی زیادہ۔"

"مگر والد نہیں ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں والد نہیں ہیں۔ ہاں بھی نہیں ہے میری اور مجھے معلوم بھی نہیں کہ وہ کون تھی۔ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے" وہ غصے میں اٹھ بیٹھی۔

میں نے مسکرا کے کہا "نہیں۔ کم سے کم مجھے نہیں پڑتا کیونکہ مجھے بھی اپنے ماں باپ کا کچھ پتا نہیں۔ میں نے تو ہوش ہی یتیم خانے میں سنبھالا تھا۔ وہاں میرے والد کا نام محمد عظیم ضرور لکھا ہوا تھا مگر اس کے سوا کچھ نہیں۔"

وہ پُرسکون ہو گئی "پھر تمہیں اندازہ ہوگا کہ دنیا والوں کی زبان انہیں کیا کہتی ہے اور کیا نہیں کہتی جن کی ولدیت ثابت نہ ہو۔"

میں نے کہا "دنیا کی پروا کون کرتا ہے۔ آج چھوٹے بڑے ملک صاحب جیسے کہتے ہیں جو تمہارے اشارۂ ابرو کے غلام ہیں۔ یہ خاندانی عزت دار لوگ تم سے زیادہ عزت دار تو نہیں سمجھے جاتے۔"

وہ مسکرانے لگی "ابھی تجربہ نہیں ہوا تمہیں۔ شہرت الگ چیز ہے اور عزت الگ۔ میں مشہور زیادہ ہوں مگر عزت دار ایک ایکٹریس' ناممکن۔ عزت پر تو ایسے ہی لوگوں کی اجارہ داری ہے ناصر۔ جو چوری ڈکیتی' اسمگلنگ اور لوٹ مار سے دولت مند ہو گئے۔ بڑے بڑے خاندانی' پیرزادے اور نواب زادے۔ ان میں کتنے حرام زادے ہیں۔ یہ میدانِ حشر میں پتا چلے گا۔ یہاں تو وہ بڑے عجیب الطرفین ہیں۔ ان کی نظر میں ایک طوائف میں' ماڈل گرل اور ایکٹریس میں کوئی فرق ہی نہیں کیونکہ سب ان کے لیے برائے فروخت ہوتی ہیں۔"

کافی پینے کے بعد وہ کچھ نارمل ہو گئی۔ مجھے بھی بیٹھنے سے تکلیف محسوس ہونے لگی تھی۔ "آخر میں یہاں کیسے آ گیا؟" میں نے کہا۔

وہ بالوں کو اور اپنے لباس کو سیٹ کرا اٹھی "جب تم میرے بلانے سے نہیں آئے تو مجھے خود جا کے لانا پڑا تمہیں۔"

"پلیز مس نیلم!"

"یار' اتنی جلدی کیا ہے آخر۔ ابھی آرام سے لیٹے رہو اور خبردار جو پھر بھاگنے کی کوشش کی۔" اس نے بیڈ سے اتر کے کہا۔ "باہر گارڈ کھڑا ہوا ہے۔"

"کیا میں یہاں بھی قیدی ہوں؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"ہاں۔ میری ذاتی قید میں ہو تم" وہ بولی "ملک صاحب کی نجی جیل سے نکال کے میں نے تمہیں اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔"

میں نے کہا "بس ایک بات بتا دیں مجھے۔"

"چلو لیٹ جاؤ آرام سے" اس نے مجھے حکم دیا "میں آتی ہوں نہا کے پھر ہم ناشتا کریں گے ایک ساتھ۔"

میں نے کہا "میں کوئی بات نہیں مانوں گا آپ کی' جب تک آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گی کہ رئیس کہاں ہے؟ میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔"

"رئیس کون؟ یہاں تو پتا نہیں کتنے رئیس آتے ہیں۔"

میں نے کہا "میرا دوست رئیس۔۔۔ وہ بھی بڑے ملک صاحب کی قید میں تھا۔ جب میں نے آخری بار اسے دیکھا تو۔۔۔ وہ شاید بے ہوش تھا۔ میں سمجھا کہ مر گیا پھر میں خود بھی بے ہوش ہو گیا تھا۔ بڑے ملک کے حکم کے غلاموں نے اس پر بھی بڑا تشدد کیا تھا اور مجھ پر بھی۔ انہوں نے کہا کہ۔۔۔ وہ مر گیا۔"

وہ کچھ فکرمند نظر آنے لگی "ایسا کہا تھا انہوں نے؟"

"وہ ضرور جھوٹ بول رہے تھے مس نیلم!" میں نے محسوس کیا کہ رئیس کے ذکر سے میرا سینہ بوجھل ہونے لگا ہے "رئیس نہیں مر سکتا۔"

"میں معلوم کر لوں گی۔ تم کو فکر کرنے کی ضرورت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں۔"

آنسوؤں کا ایک ریلا میری آنکھوں میں اُمڈ آیا "کب معلوم کرلیں گی؟ ناشتے سے اور غسل سے فراغت کے بعد۔ کپڑے بدلنے اور میک اَپ کرنے کے بعد۔ ہر کام سے فارغ ہونے کے بعد۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ اس بات کی کتنی اہمیت ہے میرے لیے۔ دنیا میں اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں مجھے۔ میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا مس نیلم!"

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "اوکے اوکے۔ میں ابھی پوچھتی ہوں ملک صاحب سے۔ ایسے رونے کی ضرورت نہیں' مرد ذرا بھی اچھے نہیں لگتے آنسو بہاتے ہوئے۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہی ہوگا۔ ابھی تمہارے سامنے معلوم ہوجائے گا۔"

وہ چند منٹ کے بعد واپس آئی تو میں اپنے آنسوؤں پر قابو پاچکا تھا اور بہت بہتر محسوس کررہا تھا۔ رئیس کی طرف سے مجھے تشویش ضرور تھی مگر ناامیدی بالکل نہیں تھی۔ میں ایسا سوچتے ہوئے بھی ڈرتا تھا چنانچہ میں نے اپنے ذہن کے سارے دروازے اس خیال کے لیے بند کررکھے تھے کہ رئیس تشدد کی تاب نہ لاتے ہوئے ہلاک ہوچکا ہے' اسے مارنے والے اس کے جسدِ خاکی کو کسی بے نشاں نامعلوم مقام کی مٹی میں دبا کے بھول چکے ہیں اور بے خوف وندناتے پھر رہے ہیں۔ رئیس بہت سخت جان ہوگیا تھا کیونکہ اسے مار کھانے کا بہت تجربہ تھا۔ اس نے شاہ جی سے پولیس سے سنیما کے ٹکٹ بلیک کرنے والوں سے اور عمران خان کے حریفوں سے سب سے بہت مار کھائی تھی۔

نیلم کے ہاتھ میں کورڈلیس فون تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کے کوئی نمبر ملانے لگی اور مجھے دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں مسکراتی رہی "کیا مصیبت ہے۔ فون مستقل بزی ہے۔"

میں نے کہا "ان کے تو بہت سے فون نمبر ہوں گے۔"

"میرے پاس آفس کے دو نمبر ہیں۔"

"گھر کا کوئی نہیں؟"

نیلم نے سر ہلایا "مگر وہاں فون کرنے کا فائدہ؟ یہی جواب ملے گا کہ وہ آفس میں ہیں۔ اس کی بیوی سے بات نہیں کرنا چاہتی میں ویسے بھی' جانی دشمن ہے وہ میری۔ آواز پہچانتے ہی گالی دیتی ہے جاہل عورت۔ اسی لیے تو شوہر بھی بس نام کے شوہر ہوتے ہیں۔"

"ایسی عورت سے شادی کیوں کرلی اس نے؟"

"اس نے کہاں کی۔ اس کے باپ نے کی ہوگی زبردستی۔ کسی چاچے تائے کی لڑکی سے۔ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے یہ زمیندار جاگیردار قسم کے لوگ۔ وہ خاندانی بیوی گھر میں بیٹھی بچے جنتی رہتی ہے خالص نسل کے۔ قید جیسی زندگی گزارتی ہے محل میں مگر سمجھتی ہے وہ راج کررہی ہے۔ اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتی۔ ویسے مجازی خدا' سیکریٹری' ملازمہ' داشتہ جس سے چاہے دل بہلائے اور کتے کی طرح جہاں چاہے حرامی بچے پیدا کرتا پھرے۔"

وہ باتیں کرتے ہوئے مسلسل نمبر ملا رہی تھی۔ وہ بے شرمی کی حد تک بے باک تھی اور اس کی زندگی کی ساری تلخی اس کے لہجے میں محسوس ہوتی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا رخ تھا جو پبلک کی نظر سے اوجھل تھا اور میں دیکھ رہا تھا۔ اسکرین پر وہ ہنستی مسکراتی شوخ اور چنچل اداؤں سے بجلیاں گراتی ناچتی گاتی نظر آتی تھی اور اس کا ہر انداز دلربائی قسم کے اشتہاروں میں اور سنیما پر لگے ہوئے بڑے بڑے رنگین پوسٹرز میں بھی انتہائی پُرکشش تھا۔ اصل نیلم اس سے بالکل مختلف تھی۔

"جبھی میں کیا کروں۔ پتا نہیں کس سے اتنی لمبی بات ہورہی ہے" وہ جھنجلا کے اٹھ کھڑی ہوئی "لو تم کرو یہ کام۔ یہ ری ڈائل کا بٹن ہے۔ اسے دبا کے سنتے رہو۔ لائن مل جائے تو ملک سے کہنا کہ آدھے گھنٹے بعد مجھ سے بات ضرور کرے۔ بتادینا کہ میں آدھے گھنٹے تک کوشش کرتی رہی۔ میں ابھی آتی ہوں نہادھو کے۔"

میں نے کورڈلیس فون کا ریسیور لے لیا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ نیلم کے جاتے ہی نمبر مل گیا۔

چھوٹے ملک نے کہا "ہیلو!"

میں نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ میں ناصر عظیم ہوں' نیلم کے گھر سے بات کررہا ہوں۔"

"ہاں بولو۔ کیا بات ہے؟"

میں نے اسے نیلم کا پیغام دیا "چھوٹے ملک صاحب۔ آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں۔" میں نے ہمت کرکے کہہ دیا۔

"یار' تم وہ بات مت پوچھنا جس سے میں ناراض ہوجاؤں۔"

"سر۔ آپ کو رئیس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

"میں' میرا خاندان' میرے دوست سب رئیس ہیں۔"

"رئیس میرا دوست۔ جسے بڑے ملک صاحب نے میرے ساتھ ہی اٹھوالیا تھا۔ میں تو معلوم نہیں کیسے زندہ بچ

گیا۔"

وہ ہنسنے لگا "یار جانتے بوجھتے انجان بن رہے ہو۔ نیلم نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"ابھی۔ ان سے بات نہیں ہوئی اس موضوع پر۔"

"تمہارا یہ دوست' کیا نام ہے اس کا۔ ہاں۔ رئیس" ملک نے سوچ کے کہا "اس کے بارے میں بڑے ملک صاحب ہی بتاسکتے ہیں۔"

"آپ ان سے معلوم کرسکتے ہیں جناب!" میں نے لجاجت سے کہا۔

"اوہ یار' ایسے نہیں۔ بڑے ملک صاحب کا بھی موڈ دیکھنا پڑتا ہے۔ جیسے تم نے میرا نمبر گھمادیا' ایسے بڑے ملک صاحب کو فون کرتے تو جواب میں اب تک سن چکے ہوتے ایک درجن گالیاں۔ بہت خاص قسم کی۔ میں شام کو یا رات کو پوچھ کے نیلم کو بتادوں گا" اس نے فون بند کردیا۔

میری بے قراری نیلم سے اور پھر چھوٹے ملک سے بات کرکے کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ فون بند کرکے میں سیدھا لیٹا چھت کو گھورتا رہا اور اس وحشیانہ عذاب کے بارے میں سوچتا رہا جس کا نشانہ ہم بے سبب بنے تھے۔ اصل مجرم وسیم تھا جس نے بڑے ملک صاحب کا مال خورد برد کردیا تھا۔ شاید قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا ہوگا کہ مال کس کے حوالے کرنا ہے۔ جانتا تو جانتے بوجھتے ایسی خطرناک اور جان لیوا غلطی کیوں کرتا۔ اس کی جگہ ہوتا تو میں بھی یہی سمجھتا کہ جن کا مال تھا وہی اس کے بارے میں پوچھنے آسکتے ہیں۔ کسی اور کو اس کے متعلق کیا معلوم اور اگر معلوم ہوگیا تھا تو یہ وسیم کی غلطی نہیں تھی۔

کہیں نہ کہیں کسی مرحلے پر اس مال کے بارے میں انفارمیشن غیر متعلقہ افراد تک پہنچ گئی یا پہنچادی گئی۔ مال کی خریداری' ترسیل اور وصولی تک نہ جانے کتنے لوگ شریکِ راز ہوں گے۔ جو اچھے کام کرتے ہیں ان کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں' دوست کم۔ بڑے ملک صاحب جیسے شخص کے ساتھ مخلص اور وفادار کون ہوسکتا ہے جس نے کسی کے ساتھ نیکی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھا ہو۔ لوگ اس سے ڈرتے ضرور ہوں گے اور وہ سمجھتا ہوگا کہ میری عزت کرتے ہیں۔ خوف سے صرف نفرت پیدا ہوتی ہے۔ جسے موقع ملا اس نے ملک کو نقصان پہنچادیا۔ کچھ بات اس کے دشمنوں کو بتادی اور شاید اس اطلاع کا اچھا معاوضہ بھی وصول کرلیا۔ ملک کا مال اس کے دشمن لے گئے اور پھنس گئے ہم۔ ہمیں تو بس شامتِ اعمال ادھر لے گئی تھی ورنہ ہمارا وسیم سے کیا تعلق۔ ہم گئے تھے اپنے چکر میں کہ وسیم سے جو ملے وصول کرلیں اور پھر اسے حوالے کردیں اس کی جورو کے بھائی کے کہ لو سنبھالو اپنی بہن کے ساگ کو۔ ہمارا کام خشم لیکن بنا بنایا کام نادانستگی میں سرزد ہوجانے والی ایک غلطی سے بگڑ گیا۔

اگر وسیم کو پہلے سے بتادیا جاتا کہ مال لینے کون آئے گا اور وہ شناخت کے بعد مال اس کے حوالے کرتا۔ تو یہ سب خرابی کے اسباب پیدا ہی نہ ہوتے لیکن بڑے ملک صاحب کو اس سے کیا کہ غلطی کس نے کی اور دانستہ کی یا نادانستہ۔ ان کا ناقابلِ تلافی نقصان ہوگیا۔ نقصان سے زیادہ یہ احساس بڑے ملک کے لیے باعثِ آزار تھا کہ اس کی منصوبہ بندی ناکام ہوگئی۔ اس کے لیے یہ دشمنوں کی فتح تھی یا اپنوں کی غداری تھی۔ بہرصورت وہ اس کا انتقام لینا چاہتا تھا اور اپنی شکست کے ذمے داروں کو سزا دیے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

اس کی نظر میں قصوروار میرے اور رئیس کے بعد وسیم تھا۔ وسیم بے شک ایک تھانے دار کا بھنوئی تھا مگر بڑے ملک جیسے لوگوں کے ہاتھوں کی گرفت کے سامنے ایک پولیس انسپکٹر کی کیا اوقات۔ اب تک وسیم کو مجرم نمبرون کی حیثیت سے حاضر کردیا گیا ہوگا اور اعترافِ جرم کرانے کے بعد قرار واقعی سزا بھی سنادی گئی ہوگی۔ بڑے ملک کے نظامِ انصاف میں عبرتناک سزاؤں کے معیار انتہائی ظالمانہ اور لرزہ خیز تھے۔ دنیا بھر میں قانوناً سزائے موت پانے والوں کے ساتھ آخری رعایت کے طور پر انہیں کم سے کم اذیت کے ساتھ موت کو گلے لگانے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ پھانسی اور سولی جیسے طریقے بے رحمانہ قرار دیے گئے ہیں۔ الیکٹرک چیئر اور گیس چیمبر کے بعد اب ایک زہریلے انجکشن سے سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کو سب سے آسان اور رحم دلانہ تسلیم کیا گیا ہے۔ جس میں مرنے والے کو مارنے والوں کے ہاتھوں کم سے کم اذیت ملتی ہے۔

لیکن چوہدری صاحب کے اور ملک صاحب کے ہاتھوں سزائے موت پانا بھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ ایک طویل پُرعذاب اور وحشیانہ حد تک غیر انسانی طریقے سے آدمی کو سسکانے اور تڑپانے کے بھی مارسکتے ہیں اور اس کی جان کو ہفتوں یا مہینوں تک عالمِ نزع کے عذاب میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔

نیلم نے دروازے میں نمودار ہوکے کہا "کیا بات ہے؟ یہاں بیٹھے چھت کو گھور رہے ہو۔ وہاں میں ناشتے کی میز پر انتظار کررہی ہوں کب سے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے بڑبڑا کے کہا "مجھے۔۔۔ مجھے کیا معلوم۔"
"کیوں؟ صفراں کہہ کے گئی تھی تم سے۔"
میں نے کہا "اچھا! کب۔۔۔ خیر آئی ایم سوری!"
"کمال ہے۔ تم کیا مراقبے میں تھے یا بے ہوش تھے۔ تم نے سنا ہی نہیں" وہ سر کے گیلے بالوں پر تولیا باندھے کھڑی تھی۔
میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ "میں اپنے خیالوں میں گم تھا۔"
"باہر نکل آؤ خیالوں کی دنیا سے" وہ باتھ گاؤن میں مرے ساتھ چلنے لگی "ہر وقت خواب دیکھنے والا حقیقت کی دنیا سے دور ہو جاتا ہے۔ جیسے تم ہو گئے ہو۔"
میں نے کہا "میں تو بہت حقیقت پسند ہوں۔"
"خاک حقیقت پسند ہو۔ مجھے سب معلوم ہے کہ تم اس فقیر کی بیٹی شادو کے لیے۔ کتنے پاگل تھے۔ بنو سامنے" اس نے مجھے باقاعدہ ڈانٹنا شروع کیا۔
میں سامنے بیٹھ گیا "شادو کا معاملہ کچھ اور تھا۔"
"کیا معاملہ تھا وہ جناب! کون سی غیر معمولی بات تھی اس میں۔ کوہ قاف کی پری تھی وہ یا کوئی شہزادی تھی۔ بہت اونچے خاندان کی تھی یا بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انتہائی ذہین تھی جس سے تم متاثر ہو گئے۔"
"دل کے معاملات ایسے ناپ تول کے اور دیکھ بھال کے نہیں ہوتے۔ کیا یہ غلط ہے؟"
"بالکل غلط ہے۔ آدمی جوتا بھی خریدتا ہے تو کچھ دیکھ کر۔ پسند کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ کوئی سبب ہوتا ہے چاہت کا۔ وہ لڑکی کسی طرح بھی تمہارے لائق نہیں تھی۔ برباد کر دیا اس نے تمہیں۔"
"کیا برباد کر دیا مجھے۔۔۔؟" میں نے خفگی سے کہا۔
"مجھ سے مت سوال کرو۔ یہ تم خود جانتے ہو کہ اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ چالاک لڑکی تھی جس نے تم کو بیساکھی کے طور پر استعمال کیا اور جیسے ہی وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئی اس نے بیساکھی کو پھینک دیا۔ کوڑے کے ڈھیر پر۔ بے کار چیز سمجھ کے۔"
"آپ اسے کچھ مت کہیں" میں نے غصے میں کہا۔
"ورنہ تم کیا کرو گے؟ اٹھ جاؤ گے ناشتے کی میز پر سے۔ واک آؤٹ کر جاؤ گے میرے گھر سے۔ یہ بھول جاؤ گے کہ تمہاری جان میں نے بچائی ورنہ آج تمہاری لاش کہیں گل سڑ رہی ہوتی۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس کی مجھے کیا قیمت ادا کرنی پڑی؟ مجھے جانا پڑا بڑے ملک کے پاس۔ چھوٹے ملک نے کہا کہ بھائی صاحب سے خود بات کرو۔ بے غیرت انسان' اچھی طرح جانتا تھا کہ بھائی صاحب سے بات کرنے کا مطلب کیا ہے؟ مگر میں نے یہ بھی کیا۔ میں اس شخص کے پاس تمہاری جاں بخشی کی درخواست لے کر گئی۔ جس سے میں دل کی گہرائی سے نفرت کرتی ہوں کیونکہ وہ انسان نہیں کتا ہے کتا۔ سنو گے کہ اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟"
میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا "آئی ایم سوری۔ یہ سب مجھے معلوم نہیں تھا۔"
"یہی تو مصیبت ہے کہ تمہیں کچھ معلوم نہیں اور تم خود کو سمجھتے ہو عقل کل۔ تم سے زیادہ دنیا کی ٹھوکریں کھائی ہیں میں نے۔ تم سے کہیں زیادہ ذلت اٹھائی ہے۔ اس لیے کہ میں ایک عورت ہوں۔ مرد تو صرف جسم کا عذاب برداشت کرتا ہے۔ عورت کی روح کے عذاب کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں عمر میں بھی بڑی ہوں تم سے اور اسی لیے تم کو یہ سب سمجھا رہی ہوں کہ ابھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔"
میں نے کہا "شادو والی بات تو ختم ہو گئی۔ چلیں میں مان لیتا ہوں کہ وہ محبت نہیں تھی پاگل پن تھا میرا۔"
اس کی ملازمہ نے تنگ آ کے کہا "بی بی۔ گلا بعد میں کرنا۔ ناشتا تے مکاؤ پہلے۔"
"مس نیلم' آپ بہت ٹینشن میں ہیں" میں نے کہا۔
اس نے ایک گہری سانس لی اور تولیا ہٹا کے بال جھٹکے "اس کی وجہ بتا دی ہے میں نے۔ اس وقت جھوٹ بولا تھا میں نے تم سے کہ میں نے چھوٹے ملک کے ساتھ پی۔ میں نے رات کو بھی اسی جانور کے ساتھ پی تھی۔ اور صبح اس لیے پی کہ میں گزشتہ رات کو بھول جانا چاہتی تھی حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ سکون آور گولیاں ختم ہو گئی تھیں ورنہ شراب کے ساتھ نگل جاتی تو۔۔۔ خیر۔ تم ناشتا کرو۔"
میں نے اسے چائے بنا کے دی "مس نیلم۔"
"بھاڑ میں گئی مس نیلم۔ بس نیلم کافی ہے۔"
"آپ نے۔۔۔ یہ سب کیوں کیا۔ میرے لیے؟" میں نے کہا۔
وہ چائے کا ایک گھونٹ لے کر بولی "یہی ملک نے پوچھا تھا مجھ سے۔ چھوٹے نے بھی اور بڑے نے بھی اور میں نے کہا کہ وہ چھوٹا بھائی ہے میرا۔"
میرے ہاتھ سے چائے کا کپ گرتے گرتے بچا "چھوٹا بھائی۔"
"ہاں' اور کچھ بھی کہتی میں' ان پر اثر نہ ہوتا۔ وہ مجھے ٹال دیتے اور تمہیں مار دیتے۔ کسی کو بھی مار دینا ان کے لیے کوئی پرابلم نہیں۔"
میں نے کہا "لیکن آپ کو سب جانتے ہیں۔ کیا یہ معلوم

نہیں ہے لوگوں کو کہ آپ کا کوئی چھوٹا بھائی نہیں۔"
اس نے کہا "اس ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے مجھے دس جھوٹ اور بولنے پڑے۔ میں نے کہا کہ ہماری ماں ایک تھی۔ باپوں کا پتا نہیں۔ اس بھائی کا جب مجھے پتا چلا تو میں اسے اپنے پاس لے آئی۔ یہ پہلے یتیم خانے میں تھا پھر کہیں فقیروں کے ہتھے چڑھ گیا۔"
میں نے کہا "اور وہ اتنے بے وقوف ہیں کہ انہوں نے تمہاری بات کو کسی ثبوت کے بغیر تسلیم کر لیا۔"
"ثبوت انہیں نظر آ گیا۔ جب انہوں نے غور کیا۔"
میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا "میں سمجھا نہیں۔ ایسا کون سا ثبوت تھا جس سے وہ فوراً قائل ہو گئے۔"
نیلم نے کہا "میری صورت۔ اور تمہاری صورت میں۔ زیادہ تو نہیں مگر معمولی سی مشابہت ضرور ہے۔ میں نے کہا کہ ہم اپنی ماں پر گئے ہیں۔ بس میں عورت ہوں اور ناصر مرد ہے۔ اس لیے فرق محسوس ہوتا ہے۔"
میں بھونچکا رہ گیا "کمال ہے۔ مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا۔"
اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچتی ہوئی اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ وہاں اس نے مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے قدِ آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا اور خود میرے ساتھ کھڑی ہو گئی "جواب دیکھو۔ غور سے دیکھو۔"
میں دم بخود کھڑا رہا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ ایک نظر میں کسی کو صورت کے نقوش کی مشابہت کا احساس نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا رنگ انتہائی صاف تھا اور میرا کچھ گندمی۔ اس کا قد پانچ فٹ چار انچ ہو گا۔ میرا چھ فٹ کے قریب تھا۔ وہ نازک اندام تھی' میں سختی ایام اور جفاکشی کی زندگی سے تنومند اور پتھر جیسے مضبوط جسم کا مالک ہو گیا تھا۔ اس کے بالوں میں کچھ مصنوعی سنہرا پن تھا اور میرے بال کالے تھے لیکن اس کی پیشانی' اس کی آنکھیں۔ ناک اور ٹھوڑی تک چہرے کی ساخت وہی تھی جو میری' اگر کسی کو ہمیں ایک ساتھ اور غور سے دیکھنے کا موقع ملتا تو وہ مان لیتا کہ ہمارے درمیان بہن بھائی کا رشتہ ہے۔ جیسا کہ چھوٹے بڑے ملک نے مان لیا تھا۔
"بولو۔ اب کیا خیال ہے تمہارا؟"
میں نے اسے شانوں سے پکڑ کے اپنی طرف کیا "پلیز' مجھے معاف کر دو۔ تم نے میرے لیے وہ کیا جو شاید ہر بڑی بہن نہیں کر سکتی۔ تمہارا یہ چھوٹا بھائی بہت احمق اور پاگل ہے مگر احسان فراموش نہیں ہے۔"
وہ خوشی سے اور شفقت سے مسکرائی "آؤ پھر پہلے

ناہید سلطانہ اختر کا طویل ناول
زندان میں پھول
لمحہ بہ لمحہ
سطر بہ سطر
تحیر، تجسس اور
درد میں ڈوبی
ایک حقیقی داستان
قیمت 300 روپے
ہمارے سارے خوبصورت بچے جو گزر گئے
Scanned By:
Azam & Ali
aazzamm@yahoo.com
aleeraza@hotmail.com
علی میل پبلیکیشنز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ' اردو بازار لاہور 7247414 ©

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے ساتھ بیٹھ کے ناشتا کرو۔ خوب پیٹ بھر کے۔"

میں اس کے ساتھ میز پر لوٹ آیا "آج سے میں بھی تمہارا خیال رکھوں گا۔"

اس نے پھر بالوں کو جھٹکا "تم کیا خیال رکھو گے۔"

"ہر چیز کا۔ تمہاری خوراک کا اور صحت کا۔ تمہارے معمولات کا' تمہاری حفاظت کا۔"

وہ ہنس پڑی "اتنے بڑے نہیں ہو گئے تم۔ بڑی میں ہوں۔ یہ بتاؤ چھوٹے ملک سے بات ہوئی؟"

میں نے اسے بتادیا کہ چھوٹے ملک نے مجھ سے کیا کہا تھا۔

"وہ کہتا ہے رات کو بڑے بھائی صاحب کا موڈ دیکھ کے بات کرے گا۔"

"آخر اتنی جلدی کیا تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میں بات کروں گی۔"

جواب دینے سے پہلے میرے کانوں نے گھنٹی کی آواز سنی "شاید یہ چھوٹے ملک صاحب ہوں۔"

صفراں نے ناک بھوں چڑھائی "میں آکھ دیتی ہوں کہ بی بی غسل خانے میں ہے۔"

میں نے کہا "نہیں۔ نیلم بی بی بات کریں گی۔ اگر ملک ہو تو۔ بعد میں وہ بھول جائے گا یا معذوف ہو جائے گا کہیں۔"

صفراں بھی چالیس سال کی یا اس سے کچھ زیادہ عمر کی عورت تھی اور باباجی کی طرح اس کی حیثیت بھی ملازموں جیسی نہیں تھی۔ وہ نیلم کے لیے ماں کی طرح فکرمند رہتی تھی اور اس کی تمام ضروریات کا پورا خیال رکھتی تھی۔ گھر میں ان کے علاوہ بھی ملازم تھے تو ان کا نیلم سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ ان کی نگرانی صفراں کرتی تھی۔ تاہم اس کی عزت خاص ملازمہ یا ہاؤس کیپر سے کہیں زیادہ تھی۔ اندرون خانہ تمام معاملات میں سب ملازم اسی کے امکانات پر عمل کرنے کے پابند تھے۔ باباجی کو' جیسا کہ میں نے بعد میں دیکھا۔ واقعی والد کا مرتبہ اور احترام حاصل تھا اور وہ نیلم کے مالیاتی امور بھی اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے۔

صفراں نے ناگواری سے کورڈلیس فون کا ریسور لا کے نیلم کو تھمادیا "وہی ہے۔ چھوٹا ملک۔"

میں بے چینی میں مبتلا ہو گیا "اگر میں اس کی باتیں سننا چاہوں۔"

نیلم نے کہا "کوئی اچھی بات نہیں ہے کسی کی باتیں سننا۔ مگر خیر۔ اندر جا کے میرے بیڈ روم کے فون کا ریسور اٹھالو۔"

میں چند سیکنڈ بعد ریسور اٹھا چکا تھا۔

میں نے نیلم کی آواز سنی "ملک جی۔ حکم دے سکتا ہے کوئی آپ کو؟"

"آپ فرماؤ کیا حکم ہے؟"

"میرے بھائی نے کچھ کہا تھا آپ سے۔ آپ نے ٹال دیا۔"

"لو جی حد ہو گئی۔ ٹالا کس کافر نے تھا۔ بس یہ کہا تھا کہ شام تک انتظار کر لے۔"

نیلم نے کہا "آپ اندازہ نہیں کر سکتے ملک صاحب کہ وہ کس قدر پریشان ہے۔ اس قسم کی صورتِ حال سے خدانخواستہ آپ دوچار ہوتے' آپ کے واحد عزیز دوست کا معاملہ ہوتا۔"

"تم چاہتی ہو کہ میں ابھی اسی وقت پتا کر کے بتاؤں؟"

"ہاں۔ یہی چاہتی ہوں میں۔ اب اسے حکم سمجھو یا التجا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "نیلم میری جان۔ تم خود بھی بھائی جی سے بات کر سکتی ہو۔"

"کیوں' تم اتنا ڈرتے ہو ان سے؟ کیا کریں گے وہ؟ گولی ماردیں گے تمہیں اس گستاخی پر۔ عاق کردیں گے" نیلم کا موڈ خراب ہونے لگا۔

"اچھا۔ اچھا۔ اتنا غصہ ہم سے برداشت نہیں ہو گا جی۔ میں ابھی پوچھتا ہوں بھائی جی سے۔ بس وہ مل جائیں اور بات کرنے پر راضی ہوں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ابھی میں مصروف ہوں تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔"

نیلم نے کہا "تم کوشش کر کے دیکھو اور پھر بتاؤ مجھے۔ میں بیٹھی ہوں انتظار میں۔"

میں ریسیور رکھ کے واپس ناشتے کی میز پر آگیا "یہ بھی ایک احسان ہو گیا آپ کا مجھ پر۔"

"چھوٹی چھوٹی باتوں کو احسان شمار نہیں کرتے۔ پتا نہیں آگے چل کے ہمیں اس سے کہیں زیادہ کرنا پڑے ایک دوسرے کے لیے" وہ بولی۔

میں نے کہا "نیلم۔ آخر آپ نے کیا دیکھا مجھ میں۔ اتنا مہربان کیوں ہو گئیں آپ مجھ پر۔ دنیا آپ کی ایک نظر کے لیے ترستی ہے۔"

"اس دنیا کی بات مت کرو۔ ان کی نظر میں لالچ اور ہوس کے سوا کیا ہوتا ہے۔ نیلم ان کے لیے ایک حسین عورت ہے یا دولت مند عورت ہے۔ تمہارے کردار کا ایک مضبوط روپ دیکھا تھا میں نے جب ایک لاکھ روپے کا چیک تم نے پھاڑ کے پھینک دیا تھا حالانکہ تم خود۔ کوئی لکھ پتی نہیں تھے اور لکھ پتی کیا کروڑ پتی بھی ایک لاکھ کو ایسے انکار نہیں کرتا۔ تم مخلص اور دیانت دار تھے۔ تم میں منافقت نہیں تھی اور تم باہمت تھے۔ دوسرے نوجوانوں کی طرح تم نے نیلم کو دیکھا تو اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ نیلم کے التفات کو بھی نظرانداز کردیا۔ تمہاری یہ خودداری بھی مجھے اچھی لگی۔ اس کے علاوہ جب تم نے میری گاڑی کے آگے آکے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔"

"نیلم۔ یہ غلط ہے۔"

"بہرحال۔ اس وقت تو مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ میں نشے میں گاڑی چلا رہی تھی اور یہ سمجھی کہ میں نے غلطی سے تمہیں ٹکر ماردی۔ احساسِ جرم ایک عذاب بن گیا تھا میرے لیے لیکن تم نے الزام اپنے سر لے لیا اور کہا کہ غلطی تمہاری اپنی تھی۔ میں ایسے ہی ڈر رہی تھی کہ کہیں خواہ مخواہ بات نہ بڑھ جائے۔ دشمن بہت ہیں میرے۔ حاسد اور بدخواہ تمہیں EXPLOIT کرتے اور تم ان کے بہکانے میں آکے... مجھ پر لاکھوں کے ہرجانے کا کیس کر دیتے۔"

میں نے کہا "میرے جیسا غریب اور لاوارث آدمی تمہارا کیا بگاڑ سکتا تھا؟"

"مجھے بعد میں پتا چلا اصل بات کا۔ تم کو ایک عورت کی بے وفائی کے صدمے نے پاگل کردیا تھا۔ تم نے اس کی خاطر بہت دکھ جھیلے تھے۔ بہت مصائب برداشت کیے تھے اور بہت خطرات مول لیے تھے مگر وہ عورت صرف پیسے کی خاطر تمہیں چھوڑ کے کسی دولت مند کے ساتھ چلی گئی تھی۔"

میں نے کہا "اب اس کا کیا ذکر۔"

"نہیں۔ میں اس وقت کی بات کر رہی ہوں جب تم اسپتال میں لیٹے ہوئے تھے اور بے ہوشی میں بولتے تھے۔ روتے تھے اور اسے بہت کچھ کہتے تھے۔ مجھے سب وہاں کی ایک لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہوا اور تم سے ملنے کے بعد میں گھر گئی تو رات کو پھر مجھے احساسِ جرم کی خلش نے پریشان کیا۔ میں نے سوچا کہ کہیں اس حادثے کے بعد تم عورت کے نام سے ہی متنفر نہ ہو جاؤ۔ نیلم کے اندر کی عورت شاد نہیں تھی اور یہ احساس دلانے کے لیے کہ ہر عورت شاد نہیں ہوتی' میں لوٹ کے تمہارے پاس گئی۔ کسی غرض کے بغیر میں نے تمہیں پوری توجہ دی۔ تمہارے ساتھ ہمدردی اور محبت کا رویہ رکھا۔ تم نے دیکھ لیا کہ میرے پاس سب کچھ ہے۔ اخبار والے میرے پیچھے پھرتے ہیں۔ میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے اسپتال میں رش لگ جاتا تھا۔ بڑے بڑے سیٹھ جس کی ایک نگاہِ التفات کے لیے سوالی بنے کھڑے رہتے ہوں وہ عورت تم جیسے غریب اور لاوارث کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر شرمندہ اور پریشان تھی۔"

"یہ آپ کی انسانیت اور شرافت تھی۔"

"شرافت؟" وہ ہنسی "ہم جیسی عورتوں کا شرافت سے کیا تعلق مگر میں نے کوشش کی' تمہیں جذباتی مایوسی کے اندھیرے سے نکالنے کی۔ یہ سمجھایا کہ زندگی کی طرح انسانوں کی فطرت کے بھی دو روپ ہوتے ہیں۔ یہ غرور کی بات نہیں' میرے مقابلے میں کیا اوقات شادو کی۔ اس نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا اور اس کے برعکس میں نے۔ خیر چھوڑو۔ وہ بات بہت پرانی ہو گئی۔"

"میں نے کبھی شادو کا موازنہ آپ سے نہیں کیا۔"

"ایک بات اور بھی ہے ناصر۔ ہم تقریباً ایک جیسے حالات کی کشتی میں سوار ہو کے زندگی [illegible] میں طوفانوں سے لڑے۔ مجھے خوش قسمتی اور [illegible] ساحل مراد تک پہنچادیا۔ تو میں نے سو [illegible] ہاتھ بڑھا کے تمہیں بھی گرداب سے نکال لوں۔ [illegible] ن تو میرے نامۂ اعمال میں لکھی جائے۔"

میں نے کہا "دنیا آپ کے اس حسن پر مرتی ہے جو نظر آتا ہے۔ مجھے آپ کی فطرت کے باطنی حسن نے حیران کردیا ہے۔"

"میں بڑی گنہگار ہوں ناصر۔ میری بخشش نہیں ہو گی۔ اعمال ہی ایسے ہیں میرے۔ جو زندگی میں گزار رہی ہوں نا' اور صبح سے شام تک جو کچھ بھی کرتی ہوں' سب گناہ کے کام ہیں۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں مت کریں۔ نیتوں کا حال خدا جانتا ہے۔ وہ جو بڑے شریف' نیک اور متقی بنے پھرتے ہیں۔ کیا پتا ان کے مقابلے میں خدا کو آپ کی کون سی بات پسند آجائے۔"

فون کی گھنٹی پر وہ چونکی "تم سنو۔ کوئی مجھے پوچھے تو کہہ دینا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔"

میں نے ریسیور کو آن کیا "ہیلو۔"

کسی نے کہا "بھئی میڈم کہاں ہیں۔ یہاں انتظار ہو رہا ہے ان کا سیٹ پر۔"

"وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"گھر پر نہیں ہیں تو پھر کہاں ہیں؟ کب گئی ہیں گھر سے؟"

"کافی دیر ہو گئی؟" میں نے کہا۔

"کافی دیر ہو گئی" وہ غالباً کوئی پریشان ہدایت کار یا فلمساز تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے فون بند کردیا "آپ کے لیے تھا۔ آپ کو کہیں شوٹنگ پر پہنچنا تھا۔"

"اس نے اپنے سر پر ہاتھ مارا "یہ نمبر کہاں سے معلوم کرلیا انہوں نے۔ اب اسے بدلنا پڑے گا ورنہ ایک کو معلوم ہوا تو سمجھو سب کو پتا چل گیا۔ ضرور ملک نے کہیں پھلزاری ہوگی کہ میرے پاس نیلم کا پرائیویٹ نمبر ہے۔"

میں نے کہا "نمبر ایکسچینج والے بھی بتادیتے ہیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہاں۔ آپریٹر کرتے ہیں بدمعاشی۔ کوئی پیچھے لگ جائے تو اس سے دو چار سو وصول کرلیتے ہیں۔ وہ نمبر تو پرانے ہیں اور سب کو معلوم ہیں۔ فلم والے اور اخبار والے وہی استعمال کرتے ہیں۔ ایک میں اپنے لیے رکھتی ہوں۔ خاص خاص لوگوں کے لیے۔"

"آج کل ملک خاص لوگوں میں شامل ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔ اس کا خاص آدمی ہونا ہی تمہاری زندگی کی ضمانت بن گیا۔ قدرت کے کھیل ہیں سب" وہ بولی۔

پھر فون کی گھنٹی بولی تو میں نے ریسیور اٹھا کر کے کان سے لگالیا "یس۔"

"نیلم کہاں ہے؟" یہ ملک کی آواز تھی۔

میں نے ریسیور نیلم کو تھمادیا "آپ کا خاص آدمی۔ بڑی لمبی عمر ہے اس کی۔ ہم اس کی بات کررہے تھے۔"

نیلم نے کہا "جی میری سرکار۔ اچھا۔ چلو خدا کا شکر ہے۔ اب میں اور کیا کہوں۔ قدردانی ہے آپ کی۔ بندہ نوازی ہے۔ اچھا بات سنو۔ وہ ہے کہاں' پھر تم یوں کرو۔ اسے یہ نمبر بتادو۔ کسی سے کہہ دو یار کہ اس نمبر پر ناصر سے بات کرلے۔ پلیز' تھینک یو ملک۔ ہاں ہاں" وہ ہنسی "مجھے پتا ہے۔ تم بڑے کاروباری ہو۔ نیکی کے بدلے میں صرف شکریہ کافی نہیں تمہارے لیے۔ اس کی قیمت وصول کرو گے۔"

اس نے فون بند کرکے میری طرف دیکھا "تمہارا دوست بالکل ٹھیک ہے۔"

مجھے نیلم کی گفتگو اور صورت کے تاثرات سے اس کا اندازہ ہوچکا تھا "میرے سر پر بڑا بوجھ تھا۔ بہت عذاب سے بچالیا مجھے آپ نے۔"

"ایسا مت کہو۔ مارنے بچانے والا تو اوپر وہی میرا تمہارا اور چھوٹے بڑے ملک کا رب ہے۔ باقی سب تقدیر کے کھیل ہیں جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ابھی وہ خود تم سے بات کرے گا' تمہارا دوست۔"

"رئیس ہے کہاں؟"

"بڑے ملک صاحب کی کوٹھی میں۔ میں نے چھوٹے ملک سے کہا ہے کہ وہاں کسی کو فون کرکے یہ نمبر بتادے۔ وہ رئیس کو پیغام پہنچادے کہ ناصر سے بات کرلو۔"

میں نے کہا "کیا رئیس۔ قید میں ہے؟"

وہ مسکرائی "بھئی مجھے کیا معلوم۔ ایک خوش خبری تو مل گئی تمہیں کہ وہ زندہ ہے اور خیریت سے ہے۔ بات بھی ہوجائے گی۔ خود ہی پوچھ لینا اس سے جو بھی پوچھنا ہے۔"

نرس ٹرے اٹھائے ہوئے نمودار ہوئی "میں ان کے روم میں گئی تھی میڈم۔ دوا دینی ہے۔ یہ یہاں بیٹھے ہیں۔ ڈریسنگ بھی کرنی ہے۔"

میں نے کہا "دوا تو میں کھالوں گا۔ ڈریسنگ کی کوئی ضرورت نہیں۔"

نرس نے میڈم کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا "آپ سمجھائیں ان کو۔"

نیلم نے کہا "چلو جاؤ۔ اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "رئیس کا فون آیا تو۔"

"تو میں بتادوں گی تمہیں۔"

کچھ دیر بعد جب نرس ڈریسنگ کرکے فارغ ہوچکی تھی۔ نیلم فون کا ریسیور اٹھائے میرے کمرے میں آئی اور پاؤں صوفے پر رکھ کے بیٹھ گئی۔

"فضول باتیں بہت ہوگئیں اور ہوتی رہیں گی بعد میں۔ اب ذرا کام کی بات ہوجائے" وہ بولی۔

میں نے کہا "کیا کام کرنا ہے مجھے۔ بتایئے' ویسے تو آپ خود بھی کام پر نہیں گئیں آج۔"

"یہ بتاؤ کہ تم بڑے ملک صاحب کے گھر میں کیسے پہنچ گئے تھے؟"

میں نے کہا "کیا کام کرنا ہے مجھے' بتایئے' ویسے تو آپ خود بھی کام پر نہیں گئیں آج۔"

"یہ بتاؤ کہ تم بڑے ملک صاحب کے گھر میں کیسے پہنچ گئے تھے؟"

میں نے کہا "انہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں تمہاری زبان سے سب سننا چاہتی ہوں" اس نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

میں نے اسے سب بتادیا۔ وہ غور سے سنتی رہی اور اپنے ہاتھوں سے گھٹنے سمیٹے اور گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات اور تاثرات سے عاری رہا۔ میں یہ اندازہ نہ کرسکا کہ میری باتوں میں اس کے لیے کوئی حیران کن انکشاف تھا یا نہیں اور جو میں نے بتایا وہ اسے کسی حد

تک پہلے ہی معلوم تھا۔ بس وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ میں اس پر اعتماد کرتا ہوں تو اسے سب سچ بتاتا ہوں یا اس میں مصلحت آمیز جھوٹ بھی ملاتا ہوں۔

میں بیس منٹ تک بولتا رہا اور میری نظریں بار بار نیلم کے چہرے سے ہٹ کے گھڑی کی طرف جاتی رہی۔ مجھے رئیس کے فون کا انتظار تھا اور اندر سے میں ایک اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے زندہ سلامت ہونے کی خبر یقین کرکے میں خوش نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے فون پر بات ہونے تک یہ غیر مصدقہ خبر تھی۔ بڑے اور چھوٹے ملک جیسے لوگ کسی بے گناہ کو اپنی فرعونیت کا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے قتل کرتے ہوئے احساس جرم کی خلش محسوس نہیں کرتے تو جھوٹ بولتے ہوئے انہیں کیا شرم آئے گی۔ اگر فرشتہ غیب کی طرح پہنچ کے نیلم مجھے نہ بچاتی تو ان سے پوچھنے والا کون تھا کہ ناصر اور رئیس نام کے دو نوجوان کہاں ہیں۔ بس ان کا اظہار لاعلمی اور انکار کافی ہوتا۔ کون ناصر' کیسا ناصر اور کون رئیس خان؟ ہم تو اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں۔ ہمارے بدخواہ اور دشمن ہوں گے جو یہ کہتے ہیں کہ انہیں ہمارے آدمی اٹھا کے یہاں لائے تھے۔

اب درمیان میں نیلم کے آجانے سے وہ خوف زدہ نہیں ہوسکتے تھے مگر احتیاط پسندی سے کام لیتے ہوئے بڑے ملک صاحب کہہ سکتے تھے کہ رئیس خان آیا تھا یہاں اپنے کام سے۔ اسے ملازمت کی ضرورت تھی۔ وہ ہم نے دے دی مگر یہ ہم کیسے بتاسکتے ہیں کہ وہ کہاں ملے گا۔ جب مس نیلم نے فون کیا تھا تو وہ یہاں تھا' کچھ دیر بعد چلا گیا۔ اس کا پتا ٹھکانا ہم نے پوچھا نہیں۔ آئے گا نوکری پر تو معلوم ہوجائے گا۔

وہ کہیں نہ ملتا اور کبھی بڑے ملک صاحب کی عنایت خسروانہ سے عطا ہونے والی نوکری کے لیے نہ پہنچتا تو کس کی مجال کہ ملک صاحب سے جواب طلبی کرے۔ ایسے سیکڑوں ملازم اور ضرورت مند آتے جاتے رہتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا کدھر گیا وہ۔

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد نیلم نے کہا "ناصر۔ تم جانتے ہو یہ بڑے ملک صاحب کیا چیز ہیں۔"

میں نے لاعلمی کا اعتراف کرلیا "نام بڑا ہے ان کا۔ خود بھی بڑی چیز ہیں۔ مگر اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔"

"وہ جدی پشتی جاگیردار ہیں۔ شاید انہیں خود بھی معلوم نہ ہو کہ ان کی زمین اب کتنی ہے۔ ان زمینوں پر سیکڑوں مزارعے ان کے خانہ زاد غلاموں کی طرح چلتے ہیں۔ ان کی دو شوگر ملز ہیں۔ ایک سیمنٹ فیکٹری ہے۔ آئل اینڈ سوپ انڈسٹری ہے۔ فیصل آباد شیخوپورہ روڈ پر ٹیکسٹائل مل ہے اور پتا نہیں کیا کچھ ہے۔ بڑے ملک صاحب قومی اسمبلی میں تھے۔ اب سینیٹ میں جانے کی تیاری کررہے ہیں۔ چھوٹے ملک کو وہ صوبائی اسمبلی میں ہی رکھیں گے۔ اسے سیاست سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے مگر یہ ان کی موروثی سیٹ ہے جسے اپنے خاندان میں رکھنا ضروری ہے۔ چھوٹے ملک کا بزنس ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کا۔"

"یہ بڑا اچھا نام ہے ہر قسم کے جائز ناجائز بزنس کے لیے۔"

"ہاں۔ وہ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کا ممبر ہے۔ اس کی بہت سی کمپنیاں اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹرڈ ہیں جن کا وہ ڈائریکٹر ہے۔ دونوں بھائی کئی ارب روپے قرض لے چکے ہیں مختلف قومی اداروں سے مگر اس کا سود تک ادا نہیں کرتے۔"

میں نے کہا "جیسے سب نہیں کرتے۔"

وہ مسکرائی "ان کو غصہ اس بات پر تھا کہ عین وقت پر جب انتخابات قریب ہیں تمہاری وجہ سے ان کی شکست کے اسباب پیدا ہوگئے۔"

"میری وجہ سے؟"

"ہاں تمہاری وجہ سے۔ انہوں نے کچھ سامان منگوایا تھا بیرون ملک سے۔ بڑی مشکل سے ملتا ہے وہ سامان۔"

"آپ کو معلوم ہے وہ کیا سامان تھا؟ سب تخریب کاری میں استعمال ہونے والی چیزیں تھیں۔ ٹائم بم اور الیکٹرانک ڈیٹونیٹر وغیرہ۔"

"ہوں گے۔ تم نام جانتے ہو۔ مجھے تو کچھ پتا نہیں۔"

میں نے کہا "ایسی تباہ کن چیزوں کا انتخابات سے کیا تعلق؟"

"کیسے بے وقوف آدمی ہو تم۔ بھئی جب انتخابات ہوتے ہیں تو پہلے ایک تحریک چلتی ہے۔ جیسی آج کل چل رہی ہے۔ تحریک بحالی جمہوریت۔ ایم آر ڈی' تحریک جلاؤ گھیراؤ' توڑ پھوڑ' تخریب کاری اور دھماکے سب ہوتا ہے۔ ملک صاحب ویسے تو ہر حکومت کے آدمی ہیں مگر درپردہ ہر اپوزیشن کے ہمدرد بھی رہتے ہیں۔"

"تاکہ کل کو اگر اپوزیشن ہی برسراقتدار آجائے تو یہ پھر ان کی گڈ بکس میں شامل ہوں۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے یہاں اور ہوتا رہے گا۔ چت بھی میرا پٹ بھی میرا۔ ملک صاحب نے ایم آر ڈی کو صرف اخلاقی نہیں' مالی امداد بھی فراہم کی اور باہر سے اپنے مخصوص رابطے استعمال کرکے کچھ سامان منگوایا جو انہیں بحالی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جمہوریت کی تحریک چلانے والے کارکنوں کے حوالے کرنا تھا۔ وہ تمہاری حماقت سے نہ جانے کون لے گیا۔"

"میرا کیا قصور تھا اس میں؟"

"قصور یہ تھا تمہارا کہ تم نے اس سوٹ کیس کو کھولا' دیکھا۔ اس میں سے ستائیس ہزار ڈالر نکال لئے۔"

"وہ دوسرے سوٹ کیس میں تھے۔ وسیم کے سوٹ کیس میں۔"

"تو پھر وسیم نے نکالے ہوں گے۔ مگر وہ سب تم لے گئے۔ اور تم نے ہی بڑے ملک صاحب کا وہ سامان کسی غلط آدمی کے حوالے کردیا۔"

"میں تو اسے جانتا بھی نہیں تھا" میں نے کہا۔

"تم کیسے ثابت کرو گے؟" وہ مجھے دیکھتی رہی۔

"کیسے ثابت کروں گا؟"

"ہاں۔ ملک صاحب کو شک نہیں یقین تھا کہ تم ان کے سیاسی مخالف اور دشمنوں کے آدمی ہو۔"

"میں تو بہت حقیر سا آدمی ہوں۔ میرا کیا تعلق سیاست سے۔"

"حالات سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ تم وسیم کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور وہ ریڑھی والا بھی تمہارے ساتھ تھا جو سوٹ کیس لے کر غائب ہوگیا۔"

"اگر یہ سچ ہوتا تو اتنی مار کھا کے ہم دس بار قبول کر چکے ہوتے۔ ہر بات تو بتادی میں نے ملک صاحب کو۔"

"اچھا کیا تم نے کہ جھوٹ نہیں بولا۔ اب یہ تو مان لیا ہے انہوں نے کہ تمہارا وہاں پہنچنا اتفاق تھا۔"

"شامت لے گئی تھی ہمیں وہاں بہت غلط وقت پر۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "بڑے ملک صاحب کی پوزیشن بہت خراب ہوگئی تمہاری وجہ سے۔ وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکے اور ان کے اعتبار کو نقصان پہنچا۔ پھر یہ کہ تمہیں اس کا علم ہوگیا۔"

میں نے کہا "مجھے یہ علم نہیں تھا کہ وہ مال کس کا ہے۔ مجھ سے بڑے ملک کو کیا خطرہ ہوسکتا تھا۔"

"خطرہ پیدا ہوگیا ہے اس مال کے غائب ہوجانے سے۔ مجھے تو چھوٹے ملک صاحب نے بتایا ہے سب کچھ۔ وہ دوسروں کے لیے گڑھا کھود رہے تھے اور اب ممکن ہے وہ خود اس گڑھے میں گر جائیں۔ ان کا اسلحہ انہی کے خلاف استعمال ہو۔ اور یہ تمہاری غلطی سے ہوا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ کیا ہم وہاں نہ پہنچتے تو وہ ریڑھی والا نہ آتا؟ وہ نہ جانے کون لوگ تھے جن کو یہ بات معلوم ہوگئی تھی اور انہوں نے مال غائب کرنے کا پورا پلان پہلے سے تیار کرلیا تھا۔ ملک کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ان کے خفیہ مشن کا راز فاش کیسے ہوا۔ کس نے غداری کرتے ہوئے دشمنوں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ مال اڑا لے جائیں۔ ظاہر ہے کوئی گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہوا۔ اصل خطرہ تو وسیم نے مول لیا تھا۔ اپنی بے وقوفی سے یا لالچ میں۔ وہ لوگ اسے کہیں بھی مار کے اس سے سوٹ کیس چھین سکتے تھے۔"

"ٹھیک کہتے ہو تم۔ مگر کیا یہ غلط ہے کہ اس ریڑھی والے کو سوٹ کیس خود تم نے دیا تھا؟ ملک کو کیا معلوم کہ تم کون ہو اور وہاں کیا لینے گئے تھے" نیلم نے کہا۔

"چلو اس نے معلوم کرلیا۔ سچ اگلوالیا ہم سے۔ یقین آگیا اسے کہ ہم نہ اس کے دشمن ہیں نہ کسی دشمن کے آلۂ کار۔ ہم تو اپنے ہی چکر میں گئے تھے وہاں۔ میں تو وسیم کو بھی قصوروار نہیں سمجھتا۔ اسے کسی نے نہیں بتایا تھا کہ مال کس کے حوالے کرنا ہے۔ پھر وہ کیا کرتا۔ غلطی خود ملک صاحب کی ہے۔ وسیم کیا کرتا؟ اسے انکار کردیتا؟ یا اس سے شناخت کرانے کے لیے کہتا۔ یہ پوچھتا کہ مال تمہارا ہے تو ثابت کرو۔"

"چلو چھوڑو۔ یہ لوگ عقل کی اور منطق کی بات کہاں سنتے اور سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں انسانی جان کی۔ غلطی کسی نے جانتے بوجھتے کی یا انجانے میں۔ ان کے نزدیک تو وہ مجرم معافی کا مستحق ہی نہیں جس کی وجہ سے انہیں نقصان ہوا۔"

میں نے کہا "ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ بس زندگی تھی کہ خدا نے آپ کو دسیلہ بنا کے بھیج دیا۔ آپ کو پتا کیسے چلا اس بات کا؟"

"تم نے میرا نام خود بتایا تھا۔ یہ کہا تھا کہ ڈاکٹر مشہود سے پوچھ لیں میرے بارے میں۔ ایک ہیروئن ہے نیلم' وہ مجھے جانتی ہے۔ تم نے تو ڈی آئی جی صاحب کا حوالہ بھی دیا تھا کہ وہ مجھے دیکھنے اسپتال آئے تھے۔" وہ مسکرانے لگی۔

"اچھا؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ مجھے ہوش ہی نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں لیکن ظاہر ہے اپنی جان بچانے کے لیے میں نے سب سچ ہی کہا تھا۔ کیا انہوں نے پوچھا تھا آپ سے؟"

"ہاں۔ مجھ سے بھی اور ڈاکٹر مشہود سے بھی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا "ان کی رائے میرے بارے میں خراب ہوتی جارہی ہے۔ وہ شروع سے یہ سمجھتے ہیں کہ میں غلط قسم کے لوگوں کی صحبت اختیار کرچکا ہوں اور میرا انجام

تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔"

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "سچ بات تو یہ ہے ناصر کہ میری کوشش سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے چھوٹے ملک سے یہ ضرور کہا کہ تم ایسے آدمی نہیں ہو۔ مگر یہ بھی تسلیم کیا کہ میں تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ جتنا مجھے معلوم تھا وہ میں نے بتادیا تھا۔ یہ میں کیسے بتاسکتی تھی کہ تم کیا کرتے ہو۔ میرا مطلب ہے شاید سے عشق کرنے کے علاوہ۔"

میں نے خفت سے کہا "پھر میری جاں بخشی کیسے ہوئی؟"

"ایک تو ڈاکٹر مشہود کی کوشش سے۔"

مجھے سخت حیرانی ہوئی "انہوں نے بچایا مجھے؟"

"انہوں نے اپنے تعلقات کا پورا استعمال کیا۔ پتا نہیں کس کس سے فون کروایا بڑے ملک کو۔ اس کے بعد ملک کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ تمہیں لاوارث سمجھ کے جو چاہے کرے۔ اس کا بگاڑ کچھ نہیں سکتا تھا کوئی مگر بات اتنی پھیل گئی تو اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اخبار والوں تک پہنچ جائے گی اور اس کی سیاسی ساکھ کو نقصان ہوگا۔"

"ڈاکٹر مشہود کے اتنے احسانات ہیں مجھ پر۔ کہ مجھے ان کے سامنے جاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ اچھا سوچا میرے لیے۔ اور اچھا کیا۔ مگر اتفاق ایسا ہے کہ میں نے ہمیشہ انہیں مایوس کیا۔"

"میرا خیال ہے کہ ملک نے تمہیں نہ میری وجہ سے چھوڑا اور نہ ڈاکٹر مشہود کی سفارش سے مجبور ہوکے۔"

"پھر کیا خدا نے رحم ڈالا ان کے دل میں؟"

وہ ہنس پڑی "خدا سیپ میں موتی ڈال سکتا ہے مگر پتھر میں سے موتی برآمد نہیں ہوسکتا۔ ایسی خلاف فطرت بات معجزہ کہلائے گی اور یہ معجزوں کا دور نہیں ہے۔"

"پھر یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"تم سوچو۔ اندازہ لگاؤ کہ اور کون ہوسکتا ہے جس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔" وہ مجھے شوخ نظروں سے دیکھنے لگی۔

میں نے سوچ کے کہا "اور تو ایسا کوئی نہیں جو ملک جیسے بندے کو قائل کرسکے۔ ڈاکٹر رانجھا کی کیا اوقات ہے بے چارے کی۔۔۔ اور نہ ان پیر صاحب کی چل سکتی ہے۔"

"کون پیر صاحب؟"

"وہ بدمعاش' چاچا پتنگ باز۔ وہ تو خود جیل میں ہے۔ اس کے بھی اچھے خاصے مرید ہوگئے تھے۔"

"ایک ہستی اور ہے" وہ بولی "ذرا ذہن پر زور دو۔"

میں نے کہا "اب زیادہ سسپنس مت پیدا کریں' میں نے ہار مانی۔"

مگر اس سے پہلے کہ نیلم کچھ بتاتی فون کی گھنٹی چلانے لگی اور اس نے ریسیور کو آن کرکے کان سے لگالیا "ہیلو۔ ہاں' یار' کس سے بات کرنی ہے۔ ناصر کون۔؟"

میں نے ریسیور جھپٹ لیا "رئیس۔۔۔" میں نے چلا کے کہا۔

"ناصر!" وہ بھی چلا کے بولا "کیا حال ہے تیرا یار رے؟"

میں نے کہا "ابے میں ٹھیک ہوں' بالکل ٹھیک ہوں' تو بتا۔"

"بس یار رے۔ اپن بھی اب تو موج کررہے ہیں۔ ورنہ پڑے ہوتے ڈھانچا بن کے کسی قبر میں" وہ بولا "تا رابست ان ظالموں نے یار۔"

"چل یار۔ خدا کا شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ میں تیری طرف سے بہت پریشان تھا۔ مجھے تو ہوش نہیں تھا لیکن میں نے جب دیکھا تجھے۔۔۔ تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے تو مرگیا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے ہم جیسے ڈھیٹ لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے۔"

میں نے کہا "سچ بتا تو بالکل ٹھیک ہے نا؟"

"ابے ذرا ہڈیاں درد کررہی ہیں۔ اور اٹھتے بیٹھتے ہائے خود بخود نکل جاتی ہے۔ لیکن اندر باہر سے کوئی چیز ٹوٹی پھوٹی نہیں ہے۔ دو چار دن میں پھر خچر کی طرح دوڑنے لگیں گے۔ ابھی تو ملک صاحب کی مہربانی سے بڑی خاطریں ہورہی ہیں اپنی۔ قسم اللہ کی ٹلے کرنا مشکل ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "یار کیا ٹلے کرنا ہے تجھے؟"

"ابے یار۔ ایک تو ملک صاحب کی نوکرانی ہے۔ نیچے سے اوپر تک ڈبل روٹی ہے۔" اس نے ڈبل روٹی سے تشبیہ دینے کی وجہ زیادہ تفصیل سے بیان کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی دو سو پاؤنڈ وزن کی حسینہ ہے جس کا سارا حسن اس وزن میں ہے جو کمر سے اوپر اور کمر کے نیچے قیامت ڈھاتا ہے۔

میں نے کہا "سالے ہڈیوں کے ڈھانچے۔ ایسی چیز سے دور ہی رہ۔ گر گئی تیرے اوپر تو پاپڑ کی طرح بکھر جائے گا۔ چُرمُر ہوجائے گا۔"

وہ ہنسا "ہاں یار۔ ویسے بھی سالی ملک صاحب کے گن مین کی گھر والی ہے۔ اس لیے سارے نخرے دیکھ کے بس آہیں بھر سکتے ہیں ہم۔ وہ کیا شعر ہے۔ کیچڑ نظارہ دور دور سے۔ مگر یار نظارہ کرنا ہے تو اس نرس کا جلوہ بھی نرالا ہے جو دن میں کئی بار آتی ہے۔ کبھی گولی کھلانے' کبھی انجکشن لگانے۔ قسم اللہ کی جب بدن پر مرہم لگاتی ہے۔ کیا کہتے ہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انگریزی میں 'ڈریسنگ کرتی ہے تو پیارے اس کے ہاتھوں سے کرنٹ دوڑنے لگتا ہے پورے جسم میں۔ سالی کرسٹان ہے' اپنا ایمان خراب کرتی ہے۔"

میں نے کہا "بند کر یہ فضول بکواس۔"

"سنا ہے پیارے تو بھی عیش کر رہا ہے اپنی نیلم جان کی نازگاہ خواب میں۔"

میں نے کہا "جاہل کی اولاد۔ خواب گاہِ ناز کہتے ہیں اسے۔"

"ابے ہاں وہی۔ مگر وہ ہے کہاں' تیرے پاس ہی بیٹھی ہے نا' یا لیٹی ہے؟"

میں نے کہا "مجھے ایک بات بتاؤں' نیلم نے کہا کہ یہ میرا بھائی ہے اور ملک نے یقین کرلیا۔"

"ابے بھائی تو سب لڑکیاں ہی کہتی ہیں مگر کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ تو کہہ دے کہ اپن کسی کے بھائی وائی نہیں ہیں' ہاں۔"

میں نے کہا "یہ پوچھ رئیس خبیث کہ ملک جیسے شخص نے یہ بات کیوں مان لی؟"

"ابے نیلم جیسی قاتل حسینہ کی کون نہیں مانے گا؟ وہ درخت سے کہے کہ چل میرے ساتھ تو وہ چل پڑے ساتھ۔"

میں نے کہا "ایک عجیب بات ہوئی یار۔ آج اس نے مجھے آئینے میں اپنا چہرہ دکھایا۔ وہ خود میرے ساتھ کھڑی ہوگئی۔"

"کیسے۔۔۔ گلے میں بانہیں ڈال کے اور منہ سے منہ ملا کے۔"

"یار بکواس کیے جا رہا ہے اپنی۔ اس کی اور میری صورت ملتی ہے۔"

رئیس بالکل سیریس ہونے پر آمادہ نہ تھا "ہاں پیارے۔ سب ایسے ہی ہوتا ہے فلموں میں۔ پہلے نظر سے نظر ملتی ہے۔ پھر دل سے دل ملے۔ اب صورت سے صورت مل گئی۔ اور کیا چاہیے۔ پوری کی پوری نیلم تجھ سے مل جائے گی۔ جیسے ندی مل جاتی ہے ندی سے۔ موج کر پیارے' پڑا رہ بیمار بنا جب تک جی چاہے۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں کرے گا تو میں فون بند کردوں گا۔ میں ملنا چاہتا ہوں تجھ سے۔۔۔ دیکھنا چاہتا ہوں تجھے۔"

"ابھی تو مشکل ہے یار۔ نہ اپنا دل چاہتا ہے یہاں سے اٹھ کے کہیں جانے کو اور تجھے بھی جلدی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ شادو آئی تجھے دیکھنے؟"

میں اس غیر متوقع سوال پر اچھل پڑا "شادو؟ تیرا دماغ خراب ہے؟ وہ کیوں آئے گی مجھے دیکھنے؟"

"اسپتال کیوں آئی تھی وہ؟"

میں نے خفگی سے کہا "وہ مجھے دیکھنے نہیں آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے دیکھنے کے لیے نیچے جاؤں۔ وہ اپنی کار میں بیٹھی رہی تھی۔ اگر وہ آتی یہاں تو میں انکار کردیتا۔ صاف کہہ دیتا کہ میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

رئیس نے کہا "سالے ناشکرے۔ اس کو دعائیں دے۔"

میں نے غصے میں فون بند کردیا "الو کا پٹھا۔ اسے کیا ہوگیا ہے۔ کہتا ہے شادو کو دعائیں دے۔"

نیلم پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی "ٹھیک کہتا ہے وہ۔"

"کیا۔۔۔ کیا ٹھیک کہتا ہے؟" میں نے بگڑ کے کہا۔

"تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے شادو کا۔ اصل کامیابی اسی کی وجہ سے ہوئی۔ بڑے ملک کا دماغ عرش سے فرش پر آگیا۔"

میں اسے بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہا "وہ کیسے؟"

"اسی نے لیگل نوٹس بھجوا دیا بڑے ملک کے نام۔ وہ جو اس کے مرحوم شوہر ہاشمی صاحب کا معاون تھا۔ وہ اب اسی لیگل فرم کا سربراہ ہے۔ اس کے دستخط تھے نوٹس پر۔"

میرے حلق کا ذائقہ کڑوا ہوگیا "نوٹس میں کیا تھا؟"

"یہی کہ آپ نے میرے مؤکل کو غیر قانونی طور پر حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے اور اس بات کے یقینی شاہد موجود ہیں کہ آپ نے میرے مؤکل ناصر عظیم کو اس کے گھر سے اغوا کرا کے اپنی کوٹھی میں بلوایا جہاں اس کی جان خطرے میں ہے۔"

"مگر میں اس کا مؤکل کیسے ہوگیا؟"

"وکالت نامہ تم نے خود ہی دیا ہوگا۔ اس کی نقل ساتھ تھی۔"

میں نے کہا "وکالت نامہ تو۔۔۔ بہت پہلے دیا تھا۔ اپنے مکان کے معاملات کے سلسلے میں۔"

"وکالت نامہ تو صرف وکالت نامہ ہوتا ہے۔ جب تک تم اسے منسوخ نہیں کرتے وہ تمہاری وکالت کرسکتے ہیں۔"

میں حیران پریشان بیٹھا رہا "اور کیا لکھا تھا اس میں؟"

"وہی جو اس قسم کے نوٹس میں لکھا جاتا ہے۔ یہ کہ اس نوٹس کی وصولی کے بعد ایک گھنٹے میں آپ نے ناصر عظیم کو بحفاظت اور خیر و عافیت کے ساتھ اس کے گھر نہ پہنچایا تو آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے گی۔ اس نوٹس کی ایک

نقل ایس ایس پی کو بھیج دی گئی تھی اور ایک ایس ڈی ایم کو۔ بڑے ملک کے سیکریٹری نے نوٹس وصول کرلیا تھا۔ بڑا ملک اس پر بہت بگڑا کہ دستخط کیوں کیے رسید پر۔ اس نے تو ٹائم بھی ڈال دیا تھا کیونکہ نوٹس لانے والے کا اصرار تھا۔"

"کون لے کر آیا تھا نوٹس؟"

"وہ بھی ایک وکیل تھا۔ کوئی ماتحت ہوگا۔ بڑا ملک پریشان ہوگیا اور اس نے فوراً اپنے چھوٹے بھائی کو بلا کے کہا کہ بتاؤ اب کیا کریں۔ کہیں ہمارے خلاف اغوا اور حبسِ بے جا کی ایف آئی آر نہ کٹوا دے یہ وکیل۔ تھانے دار اس کو انکار بھی نہیں کرسکتا۔ کل یہ ہائی کورٹ میں پہنچ جائے گا۔ اس پر چھوٹے ملک نے کہا کہ بس بہت ہوگئی تفتیش۔ اب آپ اسے میرے حوالے کریں۔ میں گھر چھوڑ آتا ہوں اسے۔ اتفاق سے اسی وقت میں پہنچ گئی۔ مجھے چھوٹے ملک نے خود بلوایا تھا۔ اس کا بڑا بھائی خود مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں تمہیں کیسے جانتی ہوں۔ چھوٹے بھائی کی بات پر اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ جب میں پہنچی تو گویا انہیں موقع مل گیا۔ اپنی جان چھڑانے کا۔ انہوں نے تمہیں میرے حوالے کردیا۔ پھر بڑے ملک نے چھوٹے بھائی سے کہا کہ وہ نوٹس بھیجنے والے وکیل کے ساتھ مل کے معاملہ سنبھال لے۔ ہم نے ان کا بندہ چھوڑ دیا ہے۔ انہوں نے نوٹس واپس لے لیا۔ مجھ سے تصدیق کرنے کے بعد۔ اور معلوم ہے تصدیق کس نے کی؟ خود شادو نے۔ اس نے کہا ناصر کا خیال رکھنا۔"

میرا موڈ بہت خراب ہوگیا تھا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس مصیبت سے کیسے جان چھڑاؤں۔ آخر وہ کیوں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے؟ میرا اس کا اب کون سا رشتہ باقی ہے؟ میں اسے بھول گیا' اسے یاد رکھنا بھی نہیں چاہتا۔"

نیلم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "تمہارے اس ردِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم اب بھی اس سے محبت کرتے ہو۔"

میں بھڑک اٹھا "غلط ہے یہ بات۔ جھوٹ ہے' میں نفرت کرتا ہوں اس سے۔"

"نفرت بھی ایک روپ ہوتی ہے محبت کے جذبات کا۔"

"فلسفہ مت بگھارو میرے سامنے۔ اس نے ہاشمی صاحب سے شادی کرلی تو اس کا ناصر عظیم سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ وہ بڈھا مرگیا۔ اس کی قسمت' شادو کی لاٹری نکل آئی۔ کروڑپتی ہوگئی وہ۔ اس نے ناصر عظیم کی محبت کو خود دفن کردیا تھا۔ اب گڑے مُردے کیوں اکھاڑنا چاہتی ہے۔ اس نے مجھے لندن سے تار بھیجا۔ وہ مجھے اسپتال میں دیکھنے آئی۔ پھول بھجوائے اپنے ایک ملازم کے ہاتھوں۔ خود نیچے بیٹھی رہی اپنے شوہر کی گاڑی میں۔ اب مجھ پر احسان کردیا لیگل نوٹس بھیج کے۔"

"اس نے برا کیا۔ اس میں اتنا مشتعل ہونے والی کون سی بات ہے آخر؟" نیلم نے ناراضی سے کہا "کتنے ظرف کا مظاہرہ کیا اس نے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس سے نفرت کرتے ہو۔ اس کا نام سننے کے روادار نہیں' اس کو پتا چلا کہ تمہاری زندگی خطرے میں ہے تو وہ آرام سے نہ بیٹھ سکی۔ اس نے ملک جیسے شخص کو نوٹس بھیج دیا۔"

"آخر اسے کس نے بتایا تھا کہ میری جان خطرے میں ہے؟"

"میں نے" نیلم نے بے خوفی سے کہا "میں نے کہا کہ میں ہوں عینی شاہد اس کے اغوا کی۔ میں گواہی دوں گی عدالت میں۔ میں نے کہا اسے کہ ڈاکٹر مشہود کو بھی یہ بات معلوم ہے۔ میں ہیر رانجھا سے بھی ملی تھی۔ ان کا برا حال تھا رو رو کے۔ میں انہیں اپنے ساتھ لے کر گئی تھی ہاشمی صاحب کی کمپنی میں اور انہوں نے وہاں وکیل کو سب بتا دیا تھا کہ تمہیں کس طرح اغوا کیا گیا اور اغوا کرنے والے کون تھے؟ ہیر اوپر سے دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا نے تو گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کرلیا تھا۔"

"شادو بھی آفس میں تھی؟"

"ہم شادو کے آفس میں ہی بیٹھے تھے۔ اس نے سینئر وکیل کو بلایا اور اسے کہا کہ ایک گھنٹے میں نوٹس بھجوا دو بڑے ملک کو اور ایس ایس پی سے بات کرلو۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کا تو زمانہ دیوانہ ہے۔ آپ کسی سے کوئی کام کرا سکتی ہیں تو پلیز اس سے بات کریں۔"

خاموشی کے لمبے مختصر سے وقفے کے بعد میں نے کہا "نیلم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کیا سمجھوں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اتنے لوگ میرے لیے پریشان ہوئے۔ میں کس کس کا شکریہ ادا کروں۔ میرے جیسے لاوارث آدمی کے لیے سب ملک کے سامنے کھڑے ہوگئے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ ہمت صرف شادو نے کی۔ شکریہ ادا کرنا ہے تو اسی کا کرو" وہ بولی "باقی سب تو بس تمہاری صفائی پیش کررہے تھے اور درخواست کے انداز میں سفارش کررہے تھے بڑے ملک سے۔۔۔ تم میں ہمت ہے تو اٹھاؤ فون اور اس کا شکریہ ادا کرو۔"

"ہرگز نہیں۔ میں اب اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتا۔ میرے لیے وہ مرگئی اور اس کے لیے میں مرگیا۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے ناصر!"

"شرم اسے نہیں آئی تو مجھے کیوں آئے آخر؟ ہاشمی اینڈ کمپنی نے بڑے ملک کو نوٹس بھیجا۔ میں ہاشمی اینڈ کمپنی کو شکریے کا لیٹر ٹائپ کرا کے اور دستخط کر کے بھیج دوں گا۔ اور یہ بھی لکھ دوں گا کہ آئندہ کے لیے میرے وکالت نامے کو منسوخ سمجھا جائے۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس کام کی فیس لے لیں۔"

نیلم نے گھبرا کے کہا "مگر تم کہاں جا رہے ہو؟"

"میں جہاں چاہوں جاؤں، کیا بڑے ملک کی قید سے نکل کے میں تمہاری قید میں آگیا ہوں" میں نے برہمی سے کہا۔

"اچھا جاؤ۔ جہنم میں جاؤ میری طرف سے۔ خود غرض آدمی۔ مجھ سے غلطی ہوئی تمہیں سمجھنے میں۔" نیلم مشتعل ہوگئی "اور جا کے اپنے سب خیر خواہوں کو بتا دو کہ مجھے کسی کی دوستی اور ہمدردی نہیں چاہیے۔ کوئی نیکی نہ کرے میرے ساتھ۔ اور صرف شادو پر کیا منحصر، تم سب سے تعلق ختم کر لو تو مجھے کیا۔"

مجھے فوراً اپنی زیادتی کا احساس ہوگیا "آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب کو چھوڑو۔ سوری کہنا اور مطلب بدلنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ تم پتا نہیں کیا سمجھنے لگے ہو اپنے آپ کو۔ ذرا حالت دیکھو اپنی۔"

میں نے ندامت سے کہا "نیلم۔ میں ہاسپٹل کے پاس جا کے اسے تسلی دینا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر رانجھا کو اطمینان دلانا بہت ضروری ہے کہ۔۔۔ خدانخواستہ میں کسی غلط قسم کے کاروبار میں ملوث نہیں ہوں۔ جس دن مجھے بڑے ملک کے بندے اٹھا کے لے گئے تھے اسی دن میں نے گاڑی خرید کے دی تھی انہیں۔ وہ مکان اور کلینک اور وہاں جو کچھ ہے، سب میں نے ان کے لیے بنایا تھا۔ وہ سمجھے ہوں گے کہ میری کمائی ایسی ہی ہے۔ وہ بہت سیدھے سادے اور وضع دار لوگ ہیں۔ میری طرف سے ان کا دل صاف ہونا ضروری ہے۔"

"ان کا دل صاف ہے" نیلم رکھائی سے بولی "ویسے بھی وہ آنے ہی والے ہوں گے یہاں۔ کل بھی آئے تھے، میں نے سب بتا دیا تھا انہیں۔"

"کیا رئیس یہاں نہیں آسکتا؟" میں پھر بیٹھ گیا۔

"تم سے زیادہ خراب حالت ہے اس کی۔ تمہاری فکر کرنے والے بہت تھے۔ اس کا تو کسی کو بھی پتا نہیں تھا۔"

میں نے کہا "پھر اسے کس نے بچایا؟"

"دنیا میں نہیں جس کا کوئی اس کا خدا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ تمہاری وجہ سے وہ بھی بچ گیا۔ مارے جاتے تو تم دونوں ایک ساتھ مارے جاتے۔ اب اسے بڑے ملک صاحب نے ہی پناہ بھی دے دی ہے۔"

"پناہ کیسی؟"

"اسے رکھ لیا ہے اپنے پاس۔ اپنے ملازموں میں شامل کر لیا ہے۔ وہ ابھی ان کی کوٹھی میں ہی رہے گا" وہ بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "اور کام کیا کرے گا، اسے تو کچھ بھی نہیں آتا۔"

"سب سیکھ لیتا ہے آدمی۔ آخر تمہارا دوست ہے۔ اتنا بے وقوف بھی نہیں ہو سکتا اور پھر بڑے ملک صاحب کون سا اسے چیف اکاؤنٹنٹ یا ہیڈ خانساماں بنائیں گے۔ کچھ نہیں کر سکتا تو چل گاڑیاں صاف کر، چھت پر سے کوے اڑایا کر۔" نیلم کی وضاحت کے باوجود یہ بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ میں رئیس کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے زندگی بھر ڈھنگ کا کوئی کام کیا ہی نہیں تھا اور کسی جگہ بھی جم کے محنت لگن اور ذہانت سے کوئی ذمے داری نبھانے کی اس نے کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

شاید بڑے ملک کے دل میں بھی انسانی رحم دلی کی کوئی رمق باقی تھی یا اس نے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے ایک گناہ کا حساب ایک ثواب سے خود ہی برابر کرنا چاہا ہو کہ ایک بے گناہ پر ظلم ہوا۔ چلو اس کے ساتھ ایک وکیل کر دیتے ہیں۔ کام کوئی نہیں کر سکتا تو کوئی بات نہیں۔ فی الحال مفت کی روٹیاں توڑے۔ روٹی میں نمک تو ہوتا ہے۔ ہمارے نمک خواروں میں شامل ہو جائے گا تو کبھی کوئی کام بھی سونپ دیں گے اور اسے کرنا پڑے گا۔

میرا خیال تھا کہ رئیس دوبارہ فون کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں نے غصے میں فون بند کیا تھا۔ شاید اس نے مجھے منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اس سے خفا نہیں رہ سکتا۔ یا پھر اسے ایک ہی فون کرنے کی اجازت ملی تھی۔

مسلسل بیٹھے رہنے اور باتیں کرنے سے مجھ پر کچھ تھکن غالب آنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بخار ہوگیا۔ ڈاکٹر مجھے دوپہر کے بعد دیکھنے کے لیے آیا تو مجھ پر غنودگی طاری تھی۔ وہ ایک مہربان اور عمر رسیدہ شخص تھا۔

اس نے کہا کہ مجھے کم سے کم ایک ہفتہ بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ میں گھر کے اندر تھوڑا بہت چل پھر سکتا ہوں لیکن

جسمانی محنت و مشقت کا کوئی کام کرنے کی اجازت فی الحال نہیں دی جا سکتی۔

نیلم نے کہا "یہ تو ابھی جا رہے تھے جان کی بازی لگا کے دہیں۔"

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "ایسی جلدی کیا ہے؟"

"دراصل مہم جوئی ان کی فطرت میں شامل ہے۔ شرافت سے رہنا اور گزر بسر کرنا ان کے لیے اتنا ہی ناممکن ہے جتنا شیطان کے لیے۔"

ڈاکٹر ہنسنے لگا "بھئی ایک تو آدمی کو باندھ کے رکھنے کا وہی طریقہ ہے کہ زنجیر ڈال دی جائے پیروں میں مگر آپ تو ویسے ہی آدمی کو اسیر رکھ سکتی ہیں۔ ہماری تو خیر آرزو ہی رہی مگر وہ کیا ہے، چوڑے حسن کے اسیر ہوئے۔"

نیلم نے کہا "آپ آدمی کی بات کر رہے ہیں۔ یہ ناصر عظیم ہے۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "یہ مجھے آدمی کہاں سمجھتی ہیں ڈاکٹر صاحب، ورنہ یہ کھاس ڈالتی ہیں کسی کو؟"

اس کے جانے کے بعد نیلم بھی چلی گئی۔ اس نے مجھ سے تو یہی کہا کہ وہ کام سے جا رہی ہے۔ کام کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ آج اس کا ارادہ شوٹنگ پر جانے کا نہیں تھا اور اس کا وقت بھی گزر گیا تھا مگر ایک مصروف اداکارہ کی مصروفیات کا دائرہ لامحدود ہوتا ہے۔ میں کچھ دیر خالی الذہن لیٹا شادو کے بارے میں سوچتا رہا۔ معلوم نہیں تقدیر میرے ساتھ یہ کھیل کیوں جاری رکھنا چاہتی تھی۔ ہاشمی صاحب سے شادی کے بعد شادو میری زندگی سے نکل گئی تھی۔ اس کے اور میرے راستے اس حد تک جدا ہو گئے تھے کہ زندگی میں پھر کبھی ہمارا اتفاق سے سرِ راہ ملنا بھی دشوار نظر آتا تھا۔ اس کی اور میری دنیائیں ہی بدل گئی تھیں اور میں نے اس کے بارے میں سوچنا بھی چھوڑ دیا تھا مگر وہ سات سمندر پار جا کے بھی لوٹ آئی تھی اور زندگی کی راہوں پر وہ ایسے مل گئی تھی جیسے بھول بھلیوں میں گم ہو جانے والے اچانک سامنے آجاتے ہیں۔

یہ عجیب بے بسی تھی کہ جب مجھے اس سے محبت تھی تو میں اس کی محبت نہ پا سکا اور اب میں اس سے نفرت کرنا چاہتا تھا تو مجھے اس کی نفرت پر اختیار نہ تھا۔

میں کچھ دیر سویا پھر صغراں نے مجھے دوپہر کے کھانے کے لیے جگا دیا۔ کھانے کے بعد نرس آگئی۔ اس نے ڈاکٹر کی تبدیل کی ہوئی دوا دی۔ شاید مجھے پُرسکون اور بے عمل رکھنے کے لیے اس نے TRANQUILISER کی مقدار بڑھا دی تھی۔ جو مریض آرام نہ کرتا ہو یا تکلیف کے باعث ایسا نہ کر پائے اسے SEDATION میں رکھنا ہی اس کا علاج ہوتا ہے۔

میں نے نرس سے پوچھا "سسٹر، تم چوبیس گھنٹے یہیں موجود رہتی ہو؟"

"پہلے تھی۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی" وہ بولی۔

"پھر بروقت کیسے نازل ہو جاتی ہو؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرانے لگی "میڈم کی کوٹھی کے بالکل پیچھے میرے شوہر کا کلینک ہے۔"

"آئی سی۔ تم نے ایک ڈاکٹر سے شادی کی ہے؟"

"جو آپ کو لک آفٹر کر رہے ہیں وہی میرے شوہر ہیں" وہ بولی۔

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا کیونکہ نرس کی عمر میں اور ڈاکٹر کی عمر میں اتنا ہی فرق تھا جتنا ہاشمی صاحب اور شادو کی عمر میں تھا "ڈاکٹر صاحب نے بہت دیر سے شادی کی۔ برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

"اس سوال پر برا ماننا ہی چھوڑ دیا ہے میں نے۔" وہ بولی۔

میں نے حیرانی سے کہا "تم کو کیا معلوم کہ میں کیا سوال کروں گا؟"

"مجھے معلوم ہے" اس نے ایک آہ بھری "تم بھی پوچھو گے کہ میں نے آخر کیا دیکھا کہ دگنی عمر سے زیادہ کے مرد کی بیوی بننا قبول کر لیا؟"

"آئی ایم سوری مگر میرا سوال ہرگز یہ نہ ہوتا۔"

"پھر۔ پھر کیا پوچھنا تھا تم کو؟" وہ خفت زدہ نظر آنے لگی۔

"بس ایسے ہی۔۔۔ میں پوچھنا چاہتا تھا کہ اس شادی سے پہلے آپ نے کسی سے محبت کی تھی؟"

اس کے چہرے پر ایک تاریک سایہ سا پھیل گیا "کیوں؟ آخر یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟"

"اس لیے کہ آپ اتنی حسین ہیں۔"

"خیر کیا ہوا؟ کیا بیس سال کی لڑکی کسی پچاس سال کے مرد سے محبت نہیں کر سکتی؟" وہ تلخی کو پی کے بولی۔

میں نے کہا "کیوں نہیں کر سکتی مگر فلموں میں ایسا نہیں ہوتا۔"

"زندگی کوئی رومانٹک فلم نہیں ہے ناصر صاحب۔ کم سے کم میرے لیے" اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا اور اپنا سامان سمیٹ کر چلی گئی۔ میرے سوال نے اسے اپ سیٹ کیا تھا اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں ایسا ہی دوسرا کریدنے والا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوال کروں۔

ہر شخص کی زندگی کے کچھ گوشے اتنے ہی مجبور اور پُرآزار ہوتے ہیں اور وہ ان کی بدصورتی کو مصلحت یا ضرورت کا کفن پہنا کے ذہن کے تاریک نہاں خانوں میں دفن رکھتا ہے یا کم سے کم اس کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسی کسی کوشش میں کوئی بھی پوری طرح کامیاب کبھی نہیں ہوتا۔

مجھے بعد میں افسوس ہوا کہ میں نے اس لڑکی کے ماضی کے مدفن میں جھانکا اور شکستہ خوابوں کے شکستہ ڈھانچوں کی بے حرمتی کی۔ میری یہ حرکت بدن کے مندمل ہوجانے والے زخموں کو چھیلنے کے مترادف تھی اور اس کا عذاب بھی کم نہ تھا۔

میں پھر سونے لگا تھا کہ مجھے ڈاکٹر رانجھے کا اور ماسی ہیر کا خیال آیا۔ مجھ سے تو نیلم نے کہا تھا کہ وہ آنے والے ہوں گے۔ اس نے جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے۔ یہ ڈاکٹر رانجھے کے کلینک کا وقت تھا۔ وہ یا تو صبح آسکتا تھا یا پھر رات کو مگر ماسی ہیر کے لیے تو وقت کی کوئی قید نہ تھی۔ وہ کیسے مطمئن ہو کے گھر میں بیٹھی تھی۔ اسے تو میرے پاس ہونا چاہیے تھا' ہر وقت۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ نیلم نے انہیں کچھ بھی نہ بتایا ہو۔ وہ خاموشی سے مجھے اپنے ساتھ لے آئی ہو۔

بڑے ملک صاحب نے میرے بارے میں سب پوچھا تھا۔ ڈاکٹر مشہود سے بھی معلوم کیا تھا اور مسز ہاشمی مرحوم عرف شادو سے بھی معلوم کیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر سے معلومات حاصل نہ کی ہوں۔ وہ نہ ڈاکٹر مشہود کو اٹھوا سکتے تھے اور نہ ہاشمی اینڈ کمپنی لیگل ایڈوائزر جیسی نامور فرم کی مالکہ کو لیکن ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر تو غریب' مجبور اور بے بس لوگ تھے۔ میں انہی کے گھر سے پکڑا گیا تھا۔ وہ عینی گواہ تھے۔ ملک نے انہیں یقیناً تفتیش کے لیے طلب کرلیا ہوگا اور ان سے سچ اگلوانے کی کوشش بھی ضرور کی ہوگی۔

اس خیال کے آتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میری نیند وقتی طور پر غائب ہوگئی تھی۔ رئیس کی جاں بخشی بھی ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر بھی بالآخر بخش دیے گئے ہوں گے مگر انہیں اپنی ذلت اور اپنے ساتھ بڑے ملک کے سلوک کا سخت صدمہ ہوگا۔ ان کے ساتھ یہ سب میری وجہ سے ہوا تھا۔ انہیں بے عزت کیا گیا ہوگا۔ گالیاں دی گئی ہوں گی۔ مارا پیٹا گیا ہوگا۔ کیا پتا ملک کے آدمی ان کے گھر میں گھس گئے ہوں۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ غائب ہوجانے والا مال میں نے وہاں تو نہیں چھپا رکھا ہے۔ خانہ تلاشی کے لیے آنے والے قانون کے علمبردار بھی کم لاقانونیت کا مظاہرہ نہیں کرتے تو بڑے ملک کے غنڈوں نے کیا کمی کی ہوگی۔

دکھ کے احساس سے میرا دل بھاری ہوگیا۔ ابھی تک ماسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا کے نہ آنے کا سبب بہت واضح تھا۔ اتنی بے عزتی کے بعد وہ مجھ جیسے شخص سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا تعلق کسی قسم کے خطرناک لوگوں سے ہے اور میری دولت مندی کا راز کیا ہے۔ ان کی خوددار غیرت کے مقابلے میں میرا شاہانہ خرچ اور میرا رہن سہن یقیناً میری ناجائز اور غیر قانونی ذرائع سے ملنے والی دولت کا مظہر تھا۔

میری عمر کا نوجوان جو بظاہر کچھ بھی نہ کرتا ہو' جس کی پرورش یتیم خانے میں ہوئی ہو۔ جو فقیروں کے اڈے پر رہا ہو' جو صرف میٹرک پاس ہو اور جس کے نام نہ لاٹری نکلی ہو اور نہ کسی نے ترکے میں جائداد چھوڑی ہو۔ ایسی عیاشی کی زندگی کیسے گزار رہا تھا؟ باہر آنے جانے کے سوا میں کچھ کرتا نظر ہی نہیں آتا تھا مگر اب بالآخر یہ راز ان پر کھل گیا تھا۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ باہر میں کیا کرتا تھا۔

اب وہ مجھ سے تعلق رکھ کے اپنی دنیاوی عاقبت خراب کرنا نہیں چاہتا تھا اور یہ بعید از امکان تھا کہ وہ میری عطا کردہ ہر چیز پر تھوک کے اپنی پرانی پُرحسرت اور بے تعبیر خوابوں والی زندگی کی طرف لوٹ گئے ہوں۔

میں اٹھا اور پھر مجھے ایک چکر سا آیا۔ میرے بدن میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ اگر میں خود کو نہ سنبھالتا تو ضرور نیچے گر جاتا۔ میں نے بستر پر لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کرلیں پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے میں جھولے پر لیٹا ہوں۔ بیڈ گول دائرے میں حرکت کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں چند منٹ ہی آنکھیں بند کیے لیٹا رہا مگر میں نے پھر آنکھیں کھول کے دیکھا تو گھڑی میں پانچ بجے تھے۔ ایک مانوس خوشبو نے مجھے اپنی قربت کا احساس دلایا تو میں نے دوسری طرف دیکھا۔

نیلم نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔ میں ابھی آئی ہوں۔ دیکھا تو تم سو رہے تھے۔"

میں اٹھ کر بیٹھ گیا "نیلم مجھے کچھ پوچھنا ہے آپ سے۔"

وہ بولی "اوکے۔ میں آئی ہوں دو منٹ میں کپڑے بدل کے۔ چائے ہوگئے' پی لو۔ کسی نے بہت مزے کا کیک بھیجا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے.... ایسی چیزیں میں ذرا کم ہی کھاتی ہوں کہ موٹی نہ ہو جاؤں' تم کھاؤ۔"

اس کے لوٹ کر آنے سے پہلے عفراں نے چائے کی ٹرالی پنچایتی جس میں وہ کیک بھی موجود تھا "صاحب جی' میڈم کو زیادہ مت کھانے دینا۔" اس نے جاتے جاتے رازدارانہ التجا کی۔

نیلم دس منٹ کے بعد آئی "ارے تم بیٹھے ہو مہاتما بدھ بنے۔ اب تک تو کھا کے ختم کر دیتے یہ کیک۔"

میں نے کہا "نیلم۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کیوں نہیں آئے؟"

وہ چائے بنانے لگی "آ جائیں گے۔"

"تم نے جھوٹ کیوں بولا تھا مجھ سے۔۔۔ کہ وہ کل بھی آئے تھے اور آنے ہی والے ہیں۔۔۔" میں نے کہا۔

"پہلے چائے پی لو آرام سے۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا۔ تم بے وقوف کے بنا رہی ہو آخر؟" میں نے برہمی سے کہا "کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ وہ مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتے۔ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتے مجھ سے؟"

"یہ تم نے کیسے فرض کر لیا؟"

"ایسا نہ ہوتا تو ماسی ہیر یہاں موجود ہوتی۔ وہ میرے پاس سے ایک سیکنڈ کے لیے ہٹنا گوارا نہ کرتی۔ وہ تسلی بھاتی رہتی۔ دعائیں مانگتی رہتی اور منت مانتی رہتی' داتا صاحب کے دربار پر دیگ بھجوانے کی۔ میں کیا جانتا نہیں انہیں۔ ایسے آرام سے گھر کیسے بیٹھ سکتی تھی وہ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں پتا ہی نہ ہو۔"

نیلم نے چائے کا کپ میری طرف بڑھا دیا "دماغ خراب ہے تمہارا۔ میرے ساتھ ہاشمی اینڈ کمپنی گئے تھے' میں بتا چکی ہوں۔"

"پھر یہاں کیوں نہیں آئے وہ؟ کیا تم نے ان کو بتایا نہیں کہ میں یہاں ہوں۔"

"ہاں۔ میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا" وہ بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی "ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر میرے لیے کسی میں شامل نہیں ہیں۔ میرے ماں باپ ہیں وہ۔"

"مجھے معلوم ہے مگر راز تب تک راز رہتا ہے جب تک اپنی ذات تک محدود رہے۔ ابھی یہ ضروری تھا۔ چلو پکڑو چائے' زیادہ گرمی مت دکھاؤ مجھے۔"

میں نے چائے لے لی "کیا بڑے ملک نے انہیں بلایا تھا؟ ان کے گھر کی تلاشی کے لیے بندے بھیجے تھے؟"

"ہاں مگر ان کے ساتھ زیادتی کوئی نہیں ہوئی۔ بڑے ملک کے دو خاص بندے۔ جو تمہیں لے گئے تھے۔ ڈاکٹر رانجھا کے عقیدت مند مریض تھے۔ انہوں نے بڑے ملک کو بتا دیا کہ وہ بے ضرر لوگ ہیں۔ وہ تمہاری طرف سے متفکر تھے مگر میں نے انہیں تسلی دی اور مطمئن کر دیا کہ تم میرے ساتھ بالکل محفوظ ہو اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"میں نہیں مان سکتا کہ وہ مطمئن ہو گئے۔۔۔ تمہاری بات سے۔"

"وہ مجھے اتنی بری عورت نہیں سمجھتے" نیلم نے کہا "جتنی تم سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں' ماسی ہیر کی رائے بہت اچھی ہے تمہارے بارے میں۔ اتنا اچھا سمجھتی ہے وہ تمہیں کہ۔"

میں نے عین وقت پر ایک بے ضرر سے سچ کو سنسر کر دیا۔ ماسی ہیر تو چاہتی تھی کہ میری شادی نیلم سے ہو جائے۔ وہ نیلم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ سادہ لوح سادہ دل سادہ خیال عورت مگر یہ بات نیلم کو بتانے کا کیا فائدہ۔

"تم کچھ کہنا چاہتے تھے۔۔۔ کہتے کہتے رک گئے۔"

"وہ۔۔۔ ایسی ہی فضول سی بات تھی" میں نے کہا "تم سنو گی تو ہنسو گی۔"

"پھر تو میں ضرور سنوں گی۔ میں ہنسنا چاہتی ہوں۔"

میں نے اسے بتا دیا۔ وہ اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کم سے کم مجھ پر اس نے یہی ظاہر کیا کہ وہ دکھ کے آنسو نہیں تھے۔

میں نے کہا "یہ تم ہنس رہی ہو کہ رو رہی ہو؟"

اس نے آنسو پونچھ لیے "ہنسنے کی بات ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ میں کوئی عام سی گھریلو قسم کی شریف لڑکی ہوں۔ جن کے لیے شریف' برسرروزگار' خاندانی لڑکوں کی مائیں بڑے ارمانوں سے پیغام لے کر آتی ہیں۔ جب بڑی تلاش کے بعد کہیں انہیں مثالی قسم کی چاند سی بہو مل جاتی ہے پھر ایک لمبا سلسلہ چلتا ہے بات طے ہونے تک اور منگنی سے مایوں تک۔ مہندی اور شادی کے ہنگامے تک اور آنکھوں میں سپنے سجائے وہ لڑکی میکے سے سسرال پہنچتی ہے تو پھر خوابوں کا نیا سفر شروع ہوتا ہے جب وہ ماں بنتی ہے اور ماما کے تجربے کے بعد اپنے گھر کو خوش اور آباد رکھنے کی جدوجہد کا سلسلہ تمام عمر چلتا ہے۔ بچے بڑے ہوتے ہیں۔ اسکول جانے کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں پھر کالج جانے لگتے ہیں اور ڈاکٹر انجینئر بن

جاتے ہیں اور خود بہو بن کے کسی اجنبی گھر کی دہلیز پار کرنے والی لڑکی' اپنے بیٹوں کے گھر آباد کرنے کے سپنے دیکھنے لگتی ہے اور کسی مثالی قسم کی چاند سی بہو کی تلاش میں پھرنے لگتی ہے۔ اسی دنیا میں ہوتا ہے یہ سب ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا مگر میں اس دنیا سے نکل کے دوسری دنیا میں پہنچ گئی ہوں جہاں یہ سب صرف کیمرے کے سامنے ہو سکتا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔"

وہ ایسے بول رہی تھی جیسے لوگ سوتے میں بولتے ہیں یا اپنے آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ میں نے اس کے خاموش ہونے کا انتظار کیا۔ خاموش ہو جانے کے بعد وہ خلا میں دیکھتی رہی۔

میں نے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ ہماری یہ دنیا خلا سے کیسی لگتی ہے؟"

وہ چونکی "نہیں۔ میں خلا میں کبھی نہیں گئی۔"

میں نے کہا "جو جا چکے ہیں' ان کا کہنا ہے کہ یہ دنیا بھی ستاروں کی طرح روشن نظر آتی ہے' چمکتی ہوئی اور خوب صورت۔ جیسے ہمیں چاند نظر آتا ہے مگر کیا چاند کی سطح ایسی ہی ہے' چاندنی جیسی رومان پرور' نہیں۔۔۔ یہ سب فریب نظر ہے۔ خیالی باتیں ہیں۔ تصورات کا کھیل ہے۔ چاند پر مٹی' دھول' اجاڑ زمین ہے۔ گہرے اونچے نیچے ویران غار ہیں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "دور سے ہر دنیا خوب صورت لگتی ہے۔"

"ہاں مگر جو اس دنیا میں رہتے ہیں انہیں صرف سنگین ذہنی حقائق کی بدصورتی نظر آتی ہے۔ تم جس دنیا میں ہو وہ ننانوے فیصد عورتوں کے لیے سنہرے خوابوں کی دنیا ہے۔ ان کے نزدیک تمہاری زندگی قابل رشک ہے کہ تم نے چاند ستارے مانگے تو تمہیں مل گئے اور تم سمجھتی ہو کہ یہاں سب مصنوعی ہے۔ خوشی بھی کیمرا ٹرک ہے اور محبت ایک اسکرپٹ کے ڈائیلاگ سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"تم خوش کیوں نہیں رہ سکتی۔"

"خوش رہنا تو سیکھنا پڑتا ہے۔ اس کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ یہ سب ایک خود اختیاری فعل ہے۔ آپ رونا چاہیں تو زندگی کی ہر کامیابی میں ناکامی اور خوشی میں غم کا پہلو نکال کے رو سکتے ہیں ورنہ تم میں مسکرا سکتے ہیں۔ آزمائش سے تو ہنس کے گزر سکتے ہیں۔ معلوم ہے آج دن میں کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"میں نے نرس سے ایک سوال پوچھ لیا اور بالکل انجانے میں اس کے زخم دل کو جیسے نوک نشتر سے چھیڑ دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کی ظاہری مسکراہٹ کے حسن میں کتنی بدبختی کا نوحہ ہے۔"

نیلم نے پوچھا "سوال کیا تھا؟"

میں نے اسے بتا دیا۔

بعد میں نیلم نے مجھے بتایا کہ وہ ڈاکٹر کو کئی سال سے جانتی ہے۔ وہ بہت سینئر سرجن تھا اور اس کا اپنا اسپتال چار کنال کی عمارت تھی۔ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ خود ڈاکٹر تھی اور یہ بات جانتی تھی کہ اس میں قصور وار وہ خود ہے مگر اس کو بھی اپنے INFERTILE ہونے کا علم شادی کے دو سال بعد ہی ہوا۔ ظاہر ہے شادی سے پہلے اس ٹیسٹ کی ضرورت کا خیال کسی ڈاکٹر کو بھی نہیں آ سکتا۔ شوہر اس شک میں مبتلا ہو گیا کہ بیوی نے یہ بات جانتے بوجھتے چھپائی۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پڑھتی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ ایک باقاعدہ پلان کے مطابق انہوں نے ڈاکٹر بن جانے کے بعد شادی کی تھی۔ جب بچے نہیں ہوئے تو عام لوگوں کی طرح ڈاکٹر صاحب نے اسے خدا کی مرضی سمجھ کے قبول نہیں کیا پھر معلوم نہیں کس نے انہیں کہہ دیا کہ ان کی بیوی کو سب پتا تھا اپنے بارے میں مگر اس نے ایک ڈاکٹر کو شادی کے بندھن میں جکڑ لیا۔ ڈاکٹر صاحب کی عقل پر پتھر پڑ گئے۔ انہوں نے یہ بات مان لی۔ ان کا مؤقف یہ رہا کہ عام آدمی تو عام آدمی ہوتا ہے مگر ایک ڈاکٹر جو دوسروں کے اندر کا حال جانتا ہے' خود اپنے بارے میں اتنی بڑی خامی سے ناواقف رہے' یہ ناممکن ہے۔ حالانکہ خود انہوں نے دو سال اولاد نہ ہونے کے اسباب معلوم کرنے کے لیے INVESTIGATION کی تو اپنے FERTILE ہونے کے ٹیسٹ بھی کرائے۔ یہ خیال خود انہیں بھی شادی کرتے وقت نہیں آیا تھا اور نہ اس سے پہلے انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔ دراصل عام معاشرتی عوامل کے اثرات سے ڈاکٹر صاحب کا ذہن بھی محفوظ نہیں تھا۔ یہاں اولاد نہ ہونے کا الزام صرف عورت کے بانجھ پن پر آتا ہے۔ یہ کوئی سمجھتا ہی نہیں کہ مرد بھی بانجھ ہو سکتا ہے اور ڈاکٹر صاحب بہرحال مرد تھے۔ بعد میں جب واقعی بدقسمتی نے ناکامی کے اسباب کی ذمے داری بیوی کے کھاتے میں ڈال دی تو ڈاکٹر صاحب بددلی اور مایوسی کے ردعمل کا شکار ہو گئے اور پھر غلط فہمی کا۔ اس سے تلخی بڑھی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ محبت کے لیے محبت ہی کافی تھی۔ ان حالات میں اسے مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بیوی اس نرالی منطق کا کیا جواب دیتی اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی بے گناہی کا دفاع کیسے کرتی۔ اسے واقعی ڈاکٹر صاحب سے محبت تھی۔ ازدواجی زندگی کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے اس نے ڈاکٹر صاحب کو دوسری شادی کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ اس پر راضی کرلیا کہ وہ اولاد کے لیے جسے چاہیں شریک حیات بنالیں اور ڈاکٹر صاحب نے اس نرس کو پسند کرلیا۔ وہ ان کے اسپتال میں کام کرتی تھی اور ڈاکٹر صاحب اس کے گھریلو حالات سے بخوبی واقف تھے۔ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی علم ہو کہ نرس کہنے چاہتی ہے اور اگر اس کا کوئی محبوب ہے تو کون ہے۔ اتنی خوب صورت لڑکی پر کوئی نہ مرتا ہو اور اس سے شادی کرنے کا خواہش مند نہ ہو' یہ ناممکن تھا تاہم نرس کے گھریلو حالات مالی طور پر بہت خراب تھے اور اس نے اپنے سارے مسائل کا حل یہی سمجھا کہ اپنے ارمانوں کی قربانی دے۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے شادی کرلی اور ملازمہ کے بجائے اسپتال کی مالکن ہوگئی۔"

"کون تھا اس کا محبوب؟" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "میں اندازہ کرسکتا ہوں کہ اس پر کیا گزری ہوگی کیونکہ میں اور وہ ایک ہی ڈوب جانے والی کشتی کے مسافروں کی طرح ہیں۔ مجھے ڈبونے والی شادو تھی۔"

"تم غلط موازنہ کررہے ہو۔" نیلم نے کہا "اس نرس نے ایک مجبوری کے تحت اپنی محبت کی قربانی دی۔ اس نے اپنے آپ کو قربان کردیا لیکن اپنے خاندان کو مشکلات کی دلدل سے نکال لیا۔"

"دونوں نے پیسے کے لیے اپنے آپ کو بیچا۔"

"مگر ایک نے ضرورت کے تحت' دوسری نے لالچ میں۔" نیلم نے کہا "مگر ناصر' کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں تمہارے بہتر مستقبل کی خاطر قربانی نہ دی ہو شادو نے۔ وہ چاہتی تھی کہ تم آگے بڑھو۔ وہ تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ زندگی کی عملی جدوجہد میں کوئی کامیابی حاصل کرنے سے پہلے ہی تم پر ازدواجی ذمے داریوں کا بوجھ پڑجاتا تو شاید تم ایک شوہر یا چار چھ بچوں کے باپ بننے کے سوا کچھ بھی نہ بن پاتے۔ بہت کم عمر میں روٹی کپڑے مکان اور بچوں کی تعلیم اور پھر شادیوں کی فکر میں تمہارے پیروں کی زنجیر بن جاتیں تو صرف جسم پر ہی نہیں تمہاری ذہنی صلاحیتوں پر بھی وقت سے پہلے بڑھاپا طاری ہوجاتا۔"

"یہی بات اور لوگ بھی کہتے ہیں اور خود مجھے بھی سمجھ آتی ہے مگر کیا شادو مجھے بتا نہیں سکتی تھی؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"اگر وہ بتاتی تو کیا تم مان لیتے؟ نیت کا پتا عمل سے بھی چل جاتا ہے۔ اس کے پیش نظر جو مقصد تھا' وہ اس نے حاصل کرلیا۔ وہ تمہاری زندگی سے نکل گئی۔ تمہیں آزاد کردیا اس نے لیکن دیکھ لو' کم سے کم دوبار اس نے عمل سے ثابت کردیا کہ وہ تمہاری خیرخواہی کے خیال سے غافل نہیں رہی۔ اس نے ایک بار تمہیں لندن بلایا تھا۔ معلوم نہیں وہاں اس نے تمہارے لیے کیا سوچا تھا اور کیا بندوبست کیا تھا۔ تمہارے جیسے لاکھوں نوجوان دن رات لندن یا امریکا اور دبئی جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں۔ جائز اور ناجائز طریقوں سے باہر نکل جاتے ہیں اور کچھ کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔ باقی پکڑے جاتے ہیں لیکن تمہیں پکڑے جانے کا یا ناکام لوٹنے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔"

"میں اس کی مدد کی بیساکھی کے سہارے پر چلنے سے بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ معذور ہوجاؤں۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ بھی سوچو' شادو نے ایسا ہی سوچا تھا تمہارے لیے۔ اس کے بعد یہ دیکھو کہ تمہیں ایک ٹھکانا اسی نے فراہم کیا۔ وہ ہاشمی صاحب کا مکان تھا جو اس نے تمہارے نام کرادیا۔ اس نے ہاشمی صاحب سے کہا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"اور کیا وجہ ہوسکتی ہے آخر؟ کیا ہاشمی صاحب سے تمہارا کوئی ایسا رشتہ تھا یا ان پر تمہارا کوئی قرض تھا؟ کوئی نیکی کی تھی تم نے یا احسان کیا تھا ان پر؟"

میں نہ چاہنے کے باوجود اس سچ کی کڑواہٹ کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ "ممکن ہے۔۔ خود ہاشمی صاحب نے ایک زیادتی کی تلافی کی ہو۔"

"ہاشمی صاحب نیک آدمی تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شادو نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ وہ شادو کے جذبات کو سمجھتے تھے اور اس کے مقصد کو سمجھتے تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو نہ جانے کہاں کہاں سامنے آئے بغیر تمہارے لیے ترقی کے راستوں کی ہر رکاوٹیں دور کرتے جاتے۔ بالواسطہ طور پر تمہیں سہارا دے کر آگے بڑھاتے رہتے۔ صرف اس لیے کہ شادو ایسا چاہتی تھی۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "کیا تم نے شادو سے اس موضوع پر بات کی تھی؟"

"نہیں۔۔ مجھے کیا ضرورت ہے بات کرنے کی۔"

"تم اتنے یقین کے ساتھ یہ سب بتارہی ہو مجھے" میں نے کہا۔

"مجھے ماسی ہیر نے بتایا ہے۔ ڈاکٹر رانجھا سے معلوم ہوا

ہے۔ ہم شادو کے آفس ایک ساتھ گئے تھے۔ ان کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ شادو نے نہ تم سے بے وفائی کی تھی اور نہ تمہیں دھوکا دیا تھا۔ یہ پیسے کا لالچ نہیں تھا۔ ہاشمی صاحب نے اسے اور تمہیں پناہ فراہم کی تھی اور تمہیں شاہ جی کے جارحانہ عزائم سے محفوظ رکھا تھا۔ وہ خود کیا کرسکتی تھی تمہارے لیے۔ اس نے ہاشمی صاحب کی دولت اور اثر رسوخ کی طاقت کو تمہارے لیے استعمال کیا۔"

"میں نہیں مان سکتا یہ بات۔ اسے ہاشمی صاحب نے باقاعدہ ورغلایا۔ اپنی دولت مندی کی چکاچوند سے اور شاہانہ زندگی کے عیش و آرام سے پھانس لیا۔ اس بڈھے کا دل آگیا شادو پر۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ امانت تھی میری۔ اس نے کیوں شادی کے لیے کہا شادو سے؟ خود شادو نے تو نہیں کہا ہوگا کہ ہاشمی صاحب مجھ سے شادی کرلو کیونکہ میں ناصر کی مدد کرنا چاہتی ہوں اور یہ قربانی اس کے اچھے مستقبل کی خاطر دے رہی ہوں۔"

نیلم نے کہا "میں مانتی ہوں کہ اس خواہش کا اظہار ہاشمی صاحب کی طرف سے ہوا ہوگا مگر شادو انکار بھی کرسکتی تھی۔ یہ کوئی زبردستی کی شادی نہیں تھی اور ہاشمی صاحب بے وقوف نہیں تھے کہ بعد میں شادو کے اشاروں پر تمہاری مدد کرتے رہتے۔ وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ شادو نے اپنی قربانی بھی کے لیے دی تھی۔ اگر وہ عام بڈھوں کی طرح تمہیں اپنا رقیب سمجھتے۔ تم سے حسد کرتے اور شادو پر شک کرتے تو اس کی زندگی کو جہنم بنادیتے۔ یہ کہتے کہ تم کیا بے وقوف سمجھتی ہو مجھے۔ شادی مجھ سے کی اور محبت ناصر سے کرتی ہو؟ یہ ایک حقیقت تھی جسے انہوں نے قبول کرلیا۔ اگر شادو بعد میں بھی تم سے ملتی یا تم سے کوئی تعلق رکھتی تو وہ اپنے مقصد میں ناکام ہوجاتی مگر وہ پوری طرح ہاشمی صاحب کی وفادار بیوی بن کے رہی۔ انہوں نے یقیناً اس پر دن رات نظر رکھی ہوگی اور قائل ہوگئے ہوں گے کہ شادو کی قربانی میں کوئی دھوکا نہیں۔ کوئی بدنیتی نہیں۔ اس طرح ان کے دل میں شادو کی عزت بڑھ گئی ہوگی۔"

"آخر تم شادو کی طرف سے یہ صفائی کیوں پیش کررہی ہو؟"

"میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ تمہارے دل سے بدگمانی کا کانٹا نکل جائے۔ تمہیں یقین آجائے کہ شادو نے محبت کی انتہا میں ایک فیصلہ کیا تھا' لالچ میں نہیں۔"

"ایسا کرتے وقت اسے یہ خیال نہیں آیا کہ میرے لیے اس فیصلے کا عذاب کتنا سخت ہوگا" میں نے کہا۔

"تم سے زیادہ سخت عذاب تو خود اس نے اپنے لیے قبول کیا۔ دوہرا عذاب تھا اس کے لیے۔ روح کا الگ اور جسم کا الگ۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اس کے لیے ہاشمی صاحب کی بیوی بن کے رہنا ایک مسلسل آزمائش تھی جس میں اسے ثابت قدم رہنا تھا۔ وہ تمہیں بھول بھی نہیں سکتی تھی۔ دیکھ لو یہ تیسرا موقع ہے جب اس نے اپنے عمل سے اپنی محبت کا ثبوت فراہم کیا۔ اسے آج بھی محبت ہے تم سے اور شاید پہلے سے زیادہ ہے لیکن وہ اپنی محبت کو کبھی تمہاری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بننے دے گی۔"

میں نے لاجواب ہوکے کہا "اچھا لعنت بھیجو شادو پر۔"

اس کا موڈ خراب ہونے لگا "آدمی کو حقیقت سے آنکھیں چرا کے کچھ نہیں ملتا۔ سوائے پشیمانی اور پریشانی کے۔ جو بات ہے وہ تمہارے نہ ماننے سے ختم نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "بات ہورہی تھی ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کے نہ آنے کی۔"

"وہ یہاں نہیں آسکتے۔"

"کیوں نہیں آسکتے" میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے منع کردیا ہے۔ تمہاری حفاظت کے خیال سے۔"

"جھوٹ بولتی ہو تم۔ اب ان کی یا میری زندگی کو کسی سے خطرہ لاحق نہیں ہے" میں اٹھ کے کھڑا ہوگیا "اگر وہ نہیں آسکتے یہاں تو کوئی بات نہیں' میں تو جاسکتا ہوں ان سے ملنے کے لیے اور تم مجھے روکنے کی کوشش بھی مت کرنا۔"

اس نے بے بسی سے کہا "دیکھو' اب رات ہوگئی ہے۔"

"کیا رات کو باہر نکلنے پر حکومت کو اعتراض ہوگا یا خلاف شرع ہے؟ تم کو نہیں جانا تو مت جاؤ۔"

"اچھا ٹھہرو۔ ایک بات سنو' کل چلی جائیں گے ہم۔ میرا وعدہ ہے کہ میں خود تمہیں لے جاؤں گی۔" اس نے لجاجت سے یوں کہا کہ میری ساری مزاحمت ختم ہوگئی۔

میں پھر بیٹھ گیا "تم کچھ چھپانا چاہتی ہو مجھ سے؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ تم بچے تو نہیں ہو۔ کوئی بھی بات کب تک چھپی رہ سکتی ہے تم سے۔ بس آج میں چاہتی ہوں کہ تم آرام کرو۔ کل تک تمہاری طبیعت بھی ٹھیک ہوجائے گی۔ تمہیں بخار تھا۔"

میں نے کہا "کیا بات ہے' تم اتنی مصروف اداکارہ ہو۔ اتنے پرستار ہیں تمہارے۔ فلمی دنیا میں بھی تمہیں ہر جگہ بلایا جاتا ہوگا۔ لوگ تم سے ملنے کے بہانے تلاش کرتے ہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ تم شام کے وقت بھی گھر میں فارغ بیٹھی ہو۔ نہ کوئی فون نہ ملاقاتی۔"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ "اگر میں ایسا نہ کروں تو میرے لیے جینا مشکل کردیں لوگ۔ میں صرف شوٹنگ پر شیڈول کے مطابق جاتی ہوں۔ اس کے بعد گھر۔ فلم انڈسٹری میں مشکل سے چار پانچ لوگ ایسے ہیں جن سے میرے مراسم ہیں۔ وہ میرے گھر آجاتے ہیں اپنی فیملی کے ساتھ۔ کبھی میں چلی جاتی ہوں۔ اس کے سوا نہ میں کسی سے ملتی ہوں نہ کسی کا دعوت نامہ قبول کرتی ہوں۔ نہ کوئی بیان دیتی ہوں اور نہ انٹرویو۔ اخبار والوں نے مجھے مغرور اور بددماغ مشہور کر رکھا ہے مگر وہ میرے خلاف کوئی اسکینڈل نہیں کھڑا کرسکتے کہ میں فلاں ایکٹر کے ساتھ چکّیں بڑھا رہی ہوں۔ فلاں پروڈیوسر مجھ پر بہت مہربان ہے۔ فلاں ہدایت کار کے ساتھ میں لندن گئی تھی شاپنگ کے لیے۔ کسی سے مسکرا کے کچھ دیر بات کرنے پر انسان بن جاتے ہیں کہ افیئر چل رہا ہے۔ منگنی ہو رہی ہے۔ شادی ہونے والی ہے۔ گھر میں رہ کے میں ایسی افواہوں اور رسوائیوں کی اذیت سے محفوظ ہوں۔ یہ کاروباری معاملات باہاتی طے کرتے ہیں۔ فون پر بھی وہی بات کرتے ہیں اور باہر کے مسائل سے بھی نمٹتے ہیں۔"

معلوم نہیں کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے نیلم مجھے باتوں میں لگا کے میرا دھیان دوسری باتوں سے ہٹانا چاہتی ہے۔ میری طبیعت اس حد تک خراب نہیں تھی کہ میں بستر سے اٹھ بھی نہ سکوں۔ وہ اپنی گاڑی میں کہیں بھی لے جانا چاہتی تو لے جاسکتی تھی۔

حفاظت والا بہانہ بالکل فضول تھا۔ اگر بڑے ملک صاحب نے میری خطا معاف کردی تھی تو پھر مجھے کس سے خطرہ ہو سکتا تھا۔ میرا دنیا میں کوئی دشمن نہیں تھا۔ ایک خطرناک دشمن شاہ جی تھا' وہ مرچکا تھا۔ وسیم کے ساتھ میری دشمنی حالات نے ختم کردی تھی۔

وسیم کا خیال آیا تو مجھے یہ خیال بھی آیا کہ آخر بڑے ملک صاحب نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جو ان کے خیال میں اصل مجرم تھا۔ ان کی نظر میں تو ہم بھی خطاوار تھے مگر اس لیے بخشے گئے تھے کہ ہم نے وسیم کے ساتھ غلط وقت پر پنگا لیا اور بلاوجہ اس معاملے میں ملوث ہوئے مگر اصل ذمے داری وسیم پر عائد ہوتی تھی جس نے مال وصول کیا تھا اور پھر تصدیق کے بغیر کسی غیر متعلقہ شخص کے حوالے کردیا تھا۔

انصاف کی بات تو یہ تھی کہ وسیم نہ مال دینے والے کو جانتا تھا' نہ پہچانتا تھا۔ پھر وہ شناخت یا تصدیق کیسے کرتا مگر جیسے بلاارادہ قتل بھی قتل ہی ہوتا ہے ایسے ہی بڑے ملک صاحب کے نزدیک نقصان بہرحال نقصان تھا خواہ کسی سے نادانستہ طور پر ہوا یا کسی نے جانتے بوجھتے پہنچایا۔ زبردست کے سامنے وکیل کیسی۔ بڑے ملک کے سوال کا وسیم بھی کیا جواب دے سکتا تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ میں کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔ میرا مال کہاں ہے؟ اب وسیم ان بڑے ملک کو الزام دے کہ جناب' آپ کے اپنے بندے بھروسے کے قابل نہیں۔ آپ ہی کے کسی غدار نمک حرام نے دشمنوں کو مخبری کی۔ LEAKAGE آپ کے نظام میں ہے۔ قصوروار وہ ہیں جنہوں نے مال مجھے بتائے بغیر میرے سپرد کردیا مگر نہ مجھ پر نظر رکھی اور نہ مجھے یہ بتایا کہ مال کسے دینا ہے۔ وہ خود دیر سے پہنچے۔ دشمن زیادہ مستعد تھے کہ پہلے ہی مال اڑا لے گئے۔ قصور میرا کیسے ہوگیا۔

لیکن ملک کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس کا اعتبار خراب ہوا تھا اور دشمنوں کی کامیابی اس کی ناکامی بن گئی تھی۔ اسے کسی نہ کسی کو غلطی اور کوتاہی پر سزا دینی تھی۔ وسیم سے پہلے ہم پکڑے گئے۔ یا ہم سے پہلے وسیم پکڑا گیا' یہ بات بڑے ملک سے کون پوچھ سکتا تھا۔ ہم نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ ہماری جان بچ گئی۔ بعد میں یقیناً ملک نے اپنے بندوں کی خبر بھی لی ہوگی کہ اوئے آجاؤ سب سالے۔ ابھی پتا چل جائے گا کہ کون نمک حرام اور غدار ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ وسیم کے سالے تھانے دار سے بات کروں۔ وہ میرا احسان مند تھا۔ میں نے اس کی زندگی بچائی تھی اور اس کی بہن کا سہاگ اسے لوٹا دیا تھا۔ تھانے میں روایتی پولیس انسپکٹر کی شخصیت رکھنے والا بشیر چوہدری اپنے گھر میں اور خاندانی رشتوں کے معاملے میں عام آدمی کی سطح پر آجاتا تھا۔ تمام قانونی اور غیر قانونی اختیارات رکھنے کے باوجود وہ ایک بے بس اور مجبور شخص نظر آتا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں بشیر چوہدری کو فون کرتا' چھوٹے ملک صاحب کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔ میں نے اسے کھڑکی کے ہٹے ہوئے پردوں سے کار سے نکل کر اندر آتے دیکھا۔

"ملک ہے نا؟" نیلم نے سوالیہ نظریں اٹھا کے کہا۔

میں جانے کے لیے اٹھا "ہاں۔ میں جاتا ہوں اپنے کمرے میں۔"

"نہیں۔ بیٹھو تم یہاں ناصر" نیلم نے اندر کے ایک دروازے کا رخ کیا "ملک کو بتادینا کہ میری طبیعت ٹھیک

نہیں ہے اور میں سو رہی ہوں۔"

اس کے غائب ہوتے ہی ملک آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا مگر اس نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا "ہاں بھئی' کیسے ہیں حال اور حالات؟" اس نے میرے سلام کے جواب میں کہا "نیلم کدھر ہے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "جی وہ سو رہی ہیں۔"

"سو رہی ہے' اس وقت؟" اس نے گھڑی دیکھی "خیر تم جگا کے اسے بتادو کہ میں آیا ہوں۔"

میں نے کہا "چھوٹے ملک صاحب۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ گولی کھا کے سوئی ہیں۔"

وہ بیٹھ کے مجھے گھورنے لگا "چلو پھر ہم انتظار کرتے ہیں ان کے جاگنے کا۔ کب سوئی تھیں' کھانے کے لیے تو اٹھیں گی۔"

میں نے کہا "پتا نہیں جناب۔ ابھی سوئی ہیں۔ آپ کیا پئیں گے' چائے' کافی یا ٹھنڈا؟"

وہ میرے انداز تخاطب پر چونکا۔ اس کی نظر میں یہاں میری حیثیت ایک پناہ لینے والے جیسی تھی۔ جو کسی معزز مہمان سے بھی تم تھی مگر میں اس نے گھر کے کسی فرد کی طرح پیش آرہا تھا۔ میرے سوال نے اس کی حیثیت باہر کے آدمی جیسی کردی تھی۔

"جاؤ لے آؤ کچھ پینے کو مگر وہ سب نہیں' چائے کافی اور ٹھنڈا۔" وہ ہنسا "ہماری پسند معلوم ہے نیلم کو۔"

"مگر وہ تو سو رہی ہیں۔" میں نے پھر معصومیت سے کہا۔

اس نے مجھے نظریں جما کے دیکھا "تم واقعی نیلم کے بھائی ہو؟"

میں جھینپ گیا "آپ کو شک کیوں ہے ملک صاحب کہ نیلم نے جھوٹ بولا ہوگا آپ سے؟"

اس نے بات بدل دی "یہ رئیس خان کون ہے؟"

"میرا دوست۔ جو مجھے بھائی سے زیادہ عزیز ہے۔"

"ہوں.... تمہاری بات ہوئی اس سے؟" وہ بولا۔

"جی.... مگر میں اس سے ملنا چاہتا تھا۔ کیا آپ مجھے اپنے ساتھ...."

"نہیں...." اس نے میری بات کاٹ دی "اسے ملنا ہوگا تم سے تو خود ہی آجائے گا۔ میں بڑے ملک صاحب کے معاملات میں دخل نہیں دیتا۔ وہ تو بس نیلم کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں" میں نے انگریزی میں کہا "ایک گزارش تھی ملک صاحب۔"

اس کو کچھ حیرانی ہوئی "کیا گزارش ہے؟"

میں نے کہا "میں جاننا چاہتا ہوں کہ وسیم کا کیا بنا؟"

"وسیم کون؟"

میں نے کہا "بڑے ملک صاحب کی نظر میں اصل مجرم وہی تھا کیونکہ ان کا مال اسی کے حوالے کیا گیا تھا۔"

چھوٹے ملک نے غصے سے کہا "دیکھو اتنا کافی ہے کہ انہوں نے میرے کہنے پر تمہاری جان بخشی کردی۔ اب حد سے آگے مت بڑھو۔ اپنی اوقات میں رہو' سمجھے؟"

میں نے سر ہلایا "جی چھوٹے ملک صاحب!"

"جاؤ میرے لیے چائے لاؤ" اس نے مجھے حکم دیا "اور کچھ کھانے کو۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے بٹن دبایا۔ جب صغراں آئی تو میں نے کہا "صغراں' ملک صاحب چائے پینا چاہتے ہیں اور بھوکے بھی ہیں۔"

صغراں کے جاتے ہی اس [illegible] میں ما [illegible] یا بات ہے؟ تم اپنے آپ کو اس گھر کا [illegible] سمجھنے لگے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے نرمی سے کہا "بہن کا گھر بھائی کا بھی ہوتا ہے چھوٹے ملک صاحب۔ جب تک وہ شادی کے بعد اپنے گھر کی نہ ہو جائے۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر ایک دم اٹھا اور کچھ کہے بغیر باہر چلا گیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے اس کی گاڑی کے اسٹارٹ اور پھر روانہ ہونے کی آواز سنی۔

نیلم نے اندر آکے کہا "ویری گڈ۔ اچھا ٹالا تم نے اسے۔ آج میرا اس سے ملنے کا بالکل موڈ نہیں تھا۔"

میں نے کہا "تم کیا دروازے کے پیچھے سے سب سن رہی تھیں؟"

"ہاں۔ آج وہ بڑا موڈ بنا کے آیا ہوگا۔ اپنے احسان کی قیمت وصول کرنے۔ چلو اس خوشی میں کہیں باہر چل کے کھانا کھاتے ہیں۔ ہمت ہے؟" وہ بولی۔

"ہمت تو ہے مگر کپڑے نہیں ہیں اس قابل" میں نے کہا۔

"کپڑے بہت۔ آؤ میرے ساتھ۔"

اس کے گیسٹ بیڈ کی وارڈ روب میں چار مردانہ قمیص پتلون' دو سوٹ اور دو نائٹ سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ شلوار قمیص کے بھی دو سوٹ ڈرائی کلین ہوئے رکھے تھے۔ میں نے انہی کو ترجیح دی تاکہ پیمائش کا تھوڑا بہت فرق محسوس نہ ہو۔ قمیص پتلون یا سوٹ کے بالکل فٹ آنا ضروری تھا اور مجھے ان کو پہن کے دیکھنا پڑتا۔ نیلم کے ساتھ ڈنر کے لیے جانے کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشی اس لیے تھی کہ مجھے باہر نکلنے کا موقع مل رہا تھا اور میں نیلم کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کے گھر کی طرف چلے۔

نیلم نے تیاری میں زیادہ اہتمام نہیں کیا اور صرف دس منٹ میں لباس بدل کے نکل آئی۔ سفید پھولوں والے سیاہ شلوار قمیص کے ساتھ بالوں کی پونی ٹیل بنائے وہ فلمی دنیا کا کوئی سپر اسٹار نہیں ایک عام سی کالج کی لڑکی نظر آتی تھی۔ اس کا فطری انداز حسن بہرحال نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔

"میک اپ کے بغیر کیسی لگ رہی ہوں میں" وہ کندھے پر بیگ جھلاتے ہوئے مسکرائی۔

میں نے کہا "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔"

وہ یہی سننا چاہتی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور اس کے جذبات کا احترام مجھ پر لازم تھا۔ میں نے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر سے ملنے کی خواہش کا اظہار واپسی تک ملتوی کردیا۔

پورچ میں ڈرائیور چمکتی دمکتی گہرے نیلے رنگ کی ہنڈا اکارڈ کو محض عادتاً مزید چمکانے میں مصروف تھا۔ نیلم کو دیکھتے ہی اس نے آگے والا دروازہ کھولا۔

نیلم نے سر کو نفی میں ہلایا "وہ چھوٹی گاڑی لاؤ۔"

ڈرائیور کچھ مایوس ہوا مگر اس نے حکم کی تعمیل کی۔ وہ گاڑی کو ریورس گیئر میں واپس لے گیا اور چند منٹ میں ایک سفید رنگ کی سوزوکی الیف ایکس لے آیا۔

"جب میں چھپ کے کہیں جاتی ہوں تو یہ غریبانہ سی گاڑی استعمال کرتی ہوں۔ ہنڈا اکارڈ ابھی نئی آئی ہے۔ سب کی نگاہوں میں آتی ہے اور گاڑی کو دیکھنے والے جب مجھے دیکھتے ہیں تو مجمع لگ جاتا ہے" وہ بولی۔

ڈرائیور نے پھر اس کے لیے آگے والا دروازہ کھولا تھا مگر وہ پیچھے میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ شادمان سے نکل کے ڈرائیور نے پوچھا "کہاں چلوں میڈم!"

اس نے میری طرف دیکھا "جی تو چاہتا ہے لکشمی کی طرف چلیں مگر وہاں سب فلمی دنیا والے مل جائیں گے۔ فائیو اسٹار ہوٹلوں سے تو ویسے بھی بیزار ہوں میں۔ کیا خیال ہے مزنگ چنگی چلیں؟"

میں نے کہا "بشیر مچھلی والے کی طرف۔ ڈولا ماہی۔ رش بہت ہوگا۔"

"تو پھر گوالمنڈی چلتے ہیں۔ واپسی پر پرانی انارکلی سے فالودہ کھائیں گے" وہ بچوں کی طرح ہنسی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب ہم واپس آرہے تھے تو میں نے کہا "نیلم۔ کیا حرج ہے اگر ایک نظر ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو بھی دیکھ لیں؟"

اس کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "ابھی۔ اس وقت؟"

میں نے کہا "زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے ہیں۔"

اس نے کہا "وہ سو چکے ہوں گے۔"

"پھر کیا ہوا۔ جگالیں گے" میں نے کہا "کتنے خوش ہوں گے وہ تمہیں میرے ساتھ دیکھ کر۔"

"میں نے کہا تھا کہ کل چلیں گے۔"

"لیکن اب نکلے ہیں تو آج کا کام کل پر کیوں چھوڑیں۔" میں نے کہا اور نیلم کی رضامندی کے فیصلے کو نظرانداز کرتے ہوئے ڈرائیور کو "ہیر کلینک" کا پتا سمجھادیا۔

نیلم نے اعتراض یا احتجاج نہیں کیا مگر اس کا لطف وانبساط ختم ہوگیا۔ وہ خاموش اور متفکر نظر آنے لگی اور اس کا سبب بھی مجھے کچھ دیر بعد معلوم ہوگیا۔ آگے جا کے ڈرائیور کچھ کنفیوز ہونے لگا تو میں نے اس کی راہنمائی کی اور دس منٹ بعد گاڑی روکنے کو کہا۔

ہیر کلینک کی اوپر والی منزل تاریک پڑی تھی۔ وہ یقیناً سو گئے تھے۔ جو کار میں نے چند روز پہلے ڈاکٹر رانجھا کے ساتھ جا کے خریدی تھی وہ اوپر جانے والے زینے کے سامنے سڑک کے کنارے موجود تھی۔ آس پاس کا سارا علاقہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ یہاں اسٹریٹ لائٹس کے کھمبے تو موجود تھے مگر ان کے بلب فیوز ہو چکے تھے یا ٹوٹ گئے تھے اور انہیں بدلنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تھی۔

میں نے کئی بار کال بیل بجائی مگر اوپر کی منزل پر خاموشی کا تسلط برقرار رہا۔ کوئی آہٹ یا قدموں کی چاپ تک سنائی نہ دی جس سے پتا چلتا کہ کوئی دروازہ کھولنے اترا ہے۔ امید تو مجھے یہ تھی کہ ڈاکٹر رانجھا اوپر کنہرے کی دیوار پر سے جھانک کر پوچھیں گے کہ بھئی کون آگیا ہے خیر سے آدھی رات کو۔

پھر اچانک میں نے ایک اور بات نوٹ کی۔ سڑک پر تو نہ جانے کب سے روشنی نہیں تھی مگر "ہیر کلینک" کے سائن بورڈ پر ایک بلب رات بھر ضرور روشن رہتا تھا۔ اب یہ بلب ہی نہیں ہیر کلینک کا سائن بورڈ بھی غائب تھا۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اٹھارہ فٹ لمبا اور چار فٹ چوڑا وہ بورڈ یوں اس عمارت پر نمایاں نظر آتا تھا جیسے دلہن کے ماتھے پر ٹیکا۔ وہ بورڈ اب وہاں نہیں تھا۔ کلینک کے دونوں دروازے بند تھے اور ان میں پرانے قفل پڑے ہوئے تھے۔

میں نے پلٹ کے کار میں بیٹھی ہوئی نیلم کو دیکھا اور پھر

اپنا ہاتھ گھنٹی پر رکھ دیا۔ اس خاموشی میں گھنٹی کی آواز صاف سنائی نہ دینے کا مطلب یہ تھا کہ گھنٹی خراب ہے یا بند پڑی ہے۔ اس کا سوئچ آف ہے۔ شاید پوری عمارت کا مین سوئچ آف تھا۔

جب لوگ گھر سے جاتے ہیں تو مین سوئچ ایسے ہی آف کرجاتے ہیں۔ یہ احتیاط کا تقاضا ہے اور پھر جب بجلی استعمال کرنے والا ہی کوئی نہ ہو تو مین سوئچ کو آن رکھنے کا فائدہ؟

اس گھر کے مکین بھی کہیں چلے گئے تھے۔ شاید ہمیشہ کے لیے یہ جگہ چھوڑ گئے تھے۔

میں نے پریشانی کے عالم میں گاڑی کا رخ کیا "نیلم یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔"

اس نے مجھ سے نظر ملائے بغیر کہا "ہاں۔ ایسا ہی لگتا ہے۔"

میں نے اس پر نظریں جما کے کہا "تم میرے سامنے ایکٹنگ مت کرو۔ تمہیں معلوم تھا۔"

"نہیں۔ مجھے اس کا ڈر تھا۔" نیلم نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا۔

میں نے پلٹ کے اپنے اجڑے ہوئے چمن کو دیکھا۔ بہار آنے سے پہلے ہی اسے خزاں کی نظر لگ گئی تھی۔ "نیلم' میں نے کہا تھا نا کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔"

وہ خاموش رہی۔

"اسی لیے تم مجھے روک رہی تھیں۔ ہے نا یہی بات؟"

نیلم نے بڑی مشکل سے کہا "آئی ایم سوری ناصر مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تم زیادہ اپ سیٹ ہوجاتے۔"

میں اس شخص کی طرح شکست خوردہ' ہارا ہوا' مایوس اور دکھی تھا جو اپنی بے گناہی ثابت کرکے بالآخر جیل سے چھوٹے اور رشتوں کی پناہ کے لیے خوش خوش گھر کی طرف لپکے مگر گھر کی دہلیز پر اسے پتا چلے کہ اب اس کا کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ گھر نہ خاندان۔ نہ بیوی نہ بچے۔ وہ تہی دست و لاوارث ہوگیا ہے۔

نیلم نے کہا "بیٹھو ناصر۔ چلو گھر چلیں۔"

"نہیں جانا مجھے تمہارے ساتھ۔ میرا گھر یہ ہے" میں نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

"یہ تمہارا گھر تھا' خالی گھر بس ایک مکان ہوتا ہے" وہ نیچے اتر آئی "آؤ میرے ساتھ۔"

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "تم مجھے صرف اتنا بتادو کہ وہ کہاں گئے ہیں؟"

اس کی آنکھوں میں اداسی اتر آئی "یہ معلوم ہوتا تو میں خود تمہیں وہاں لے جاتی' یہاں کیوں لے کر آتی۔"

"میں معلوم کرلوں گا' تم جاؤ۔"

"کیسے معلوم کرلوگے اس وقت؟ کون ہے یہاں بتانے والا؟"

اس کی طرف دیکھے بغیر میں نے آس پاس کے بہت سے لوگوں سے پوچھا۔ ایک دکان کے سامنے تین افراد تخت پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھا تو وہ خاموش ہوکے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے کہا "آپ کو کچھ پتا ہے یہ ہیر کلینک کیوں بند ہے؟"

ان میں سے ایک نے کہا "کلینک بند ہونے کی وجہ تو ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے۔"

دوسرا بولا "نہیں چلا ہوگا کلینک۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔"

میں نے کہا "شاید یہ لوگ کہیں چلے گئے ہیں۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر۔"

ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی "اوہو' یہ کیا نام ہوئے۔ ہیر رانجھا کب سے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر ہوگئے؟"

میں نے غصے کو قابو میں رکھا "ان کے بھی نام ہیں جی۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ وہ ابھی آئے تھے' اوپر کی منزل پر رہتے تھے۔"

ایک نے کچھ یاد کرکے کہا "اوہو' تم اسے پوچھ رہے ہو۔ یار وہ ادھر ریڑھی نہیں لگاتا تھا' رانجھا شربت فروش۔ ڈاکٹری بھی کرتا تھا نہ۔"

میں نے کہا "بالکل وہی۔ تم جانتے ہو اسے؟"

سب نے سر ہلا کے اقرار کیا "دیکھا تو تھا اسے ایک دو بار۔ وڈا ڈاکٹر۔ ادھر شربت پیتا تھا تو سب سے ملتا تھا۔ اب نظر اٹھا کے نہیں دیکھتا تھا ہماری طرف۔"

دوسرے نے کہا "نہیں پتا کے نہیں گیا وہ۔ جہاں بھی گیا ہے۔"

میں نے سڑک کے کنارے چارپائی ڈال کے سونے والے دو افراد کو جگا کے پوچھا۔ وہ نیند سے جگائے جانے پر جزبز ہوئے اور میرے فضول سوال سے زیادہ جزبز ہوئے۔ "اوجا یار۔ سونے دے۔ ہمیں کیا معلوم ہیر کلینک کا۔"

پھر میں نے دو گھروں کی گھنٹی بجائی۔ باہر آنے والوں نے قسمتاً شرافت سے کام لیا اور غالباً میرے شائستہ لہجے اور پریشان چہرے کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ مشورہ دیا کہ اس علاقے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک اور ہومیوپیتھ ڈاکٹر بھی ہے۔ ایمرجنسی ہے تو میں اس کے پاس چلا جاؤں۔ ہیر کلینک کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے تھے۔

میں مایوس لوٹ رہا تھا کہ مجھے ایک بینک کے بند دروازے کی جھری سے روشنی جھانکتی نظر آئی۔ اندر سے ٹیپ یا ریڈیو پر گانے کی آواز بھی سنائی دی تو میں نے دروازے پر دستک دی۔ صرف کھے کی نیکر پہنے ایک نوجوان باہر آیا۔

میرے سوال پر اس نے کہا "لوجی وہ تو کیا کہتے ہیں..... دکان اپنی بڑھا گئے۔ تم اسی کو پوچھ رہے ہو نا' وہ جو گدھ کی شکل کا منجا' موٹے شیشوں والی عینک لگا کے اور ٹالی باندھ کے ادھر بیٹھتا تھا' ڈاکٹر رانجھا۔ لوگ کہتے ہیں پہلے ادھر ریڑھی پر ٹھنڈائی بیچتا تھا۔ لوجی رب نے خیر کی درنہ میں دوائی لینے گیا تھا اس سے۔ وہ تو پاگل تھا' اچھا ہوا دوائی نہیں کھائی میں نے۔"

میں نے کہا "وہ میرا چاچا تھا' اب بتاؤ۔"

نوجوان پر گھڑوں پانی پڑ گیا' اس کی بولتی بند ہو گئی "اچھا..... لوجی معاف کرنا۔ میں نے بڑی بکواس کی۔"

"کچھ معلوم ہے وہ کہاں گئے ہیں؟"

"لوجی سائیں جب ریڑھے پر لاد رہا تھا وہ تو میں نے پوچھا تھا کہ خیر ہے اب کس طرف کا رخ ہے؟ اللہ رحم کرے وہاں کے رہنے والوں پر۔ تو وہ بولا کہ..... پتا نہیں فارسی میں کچھ بولا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ دنیا بہت بڑی ہے خدا کی بنائی ہوئی۔ کہیں بھی آسرا کر لیں گے' چنگا جی۔"

وہ دروازہ بند کر کے اندر غائب ہو گیا تو میں آہستہ آہستہ واپس لوٹا۔ نیلم کار سے ٹیک لگائے میری دیوانگی کا تماشا دیکھ رہی تھی اور لوگ اسے دیکھ رہے تھے مگر اسے احساس نہ تھا۔

میں کوئی بات کیے بغیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کو واپس موڑ لیا۔ مایوسی سے اور دکھ سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نیلم نے میرا سر اپنے کندھے سے لگا لیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا "وہ چلے گئے۔ چھوڑ گئے مجھے۔ میں پھر یتیم ہو گیا۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھنے لگے تھے وہ۔ ماں باپ سے زیادہ پیار دیا تھا انہوں نے مجھے۔ میرا دکھ انہیں دکھی کر دیتا تھا اور میں ان کے لیے کچھ کرتا تھا تو وہ خوشی سے رونے لگتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں انہیں سارے زمانے کی خوشیاں دوں مگر اس سے پہلے ہی سب ختم ہو گیا۔ میں ان کے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ مجھ سے ناراض ہو کے چلے گئے۔ انہوں نے مجھے صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ جس بیٹے کو وہ فرشتے کی طرح معصوم سمجھتے تھے' وہ شیطان تھا۔ وہ میرے کالے کرتوتوں کی کمائی پر لعنت بھیج کے مجھے چھوڑ گئے۔"

میں سارا راستہ روتا رہا اور بولتا رہا اور نیلم میرے سر کو تھپکتی رہی اور مجھے تسلی دیتی رہی۔ حوصلے کی تلقین کرتی رہی۔ صبر سے کام لینے کو کہتی رہی "ہم انہیں تلاش کر لیں گے ناصر۔ ایسی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ مانا کہ لاہور بہت بڑا شہر ہے جہاں پچاس لاکھ انسان رہتے ہوں وہاں کسی کا پتا آسانی سے نہیں چلتا مگر وہ ڈاکٹر ہے۔ کہیں تو کلینک کھولے گا۔"

میں نے کہا "نیلم۔ وہ اس شہر کو چھوڑ کے بھی جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے کہ میں ان کو تلاش کر لوں گا۔ وہ میری صورت دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتے۔ میں بڑا گناہگار ہوں۔ مجرم ہوں ان کا۔ انہیں تھوڑے دن کا سکھ دیا اور ہمیشہ کے دکھ میں ڈال دیا۔ جب وہ سوچتے ہوں گے کہ وہ مجھ سے نہ ملے ہوتے تو اچھا ہوتا۔ محرومی کی زندگی جو ان کا مقدر تھی' اسی پر قناعت کرتے تو آج کسی چیز کے چھن جانے کی اذیت سے دوچار نہ ہوتے۔ جب خدا نے ہی اولاد نہیں دی تھی تو پھر کسی کو اپنا بیٹا سمجھنے کی غلطی کیوں کی؟"

گھر پہنچ کے بھی میرے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ نیلم کی ہمدردی اور تسلی لاحاصل تھی۔ مجھے شدت سے احساس تھا کہ میری وجہ سے ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کو یہ دن دیکھنا پڑا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے خوش قسمتی سے وہ سب کچھ پا لیا جس کے وہ صرف خواب دیکھ سکتے تھے۔ ایک جوان بیٹا مل گیا جس نے ان کے سکھ کے سپنے سچ کر دیے لیکن انہیں اپنے خواب کی تعبیر یقین آنے لگا تو اچانک سب ختم ہو گیا۔

اس انکشاف سے انہیں کتنا صدمہ ہوا ہو گا کہ ان کا بیٹا جرائم پیشہ لوگوں کا آلہ کار ہے۔ اس نے جو کچھ انہیں خرید کر دیا تھا' وہ سب حرام کی کمائی سے خریدا تھا۔ رئیس جیسے لوگوں کی صحبت انہیں پہلے بھی پسند نہ تھی۔ وہ مجھے اس کی چنڈال چوکڑی سے دور رکھنے کے لیے سمجھاتے رہتے تھے۔ انہوں نے میرے دماغ سے انتقام کا بھوت اتارنے کی کوشش بھی بہت کی تھی۔ وہ ڈرتے تھے کہ کہیں میں وسیم کو یا ہاشمی صاحب کو قتل نہ کر دوں۔ میں راتوں کو غائب رہتا تھا تو وہ سو نہیں پاتے تھے۔ اب انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ میرے کیا دھندے تھے۔ اتنا پیسہ میرے پاس کہاں سے آتا تھا کہ میں نے ان کے لیے پہلے ایک مکان کرائے پر حاصل کیا پھر وہی مکان خرید لیا۔ اس کے بعد تو جیسے مجھ پر دولت برسنے لگی۔

میں نے انہیں ہیر کلینک اور اس کے اوپر اپنا گھر فراہم کر دیا۔ اس گھر میں ٹی وی فریج' قالین اور پردے سب لا کے بھر دیے یہاں تک کہ انہیں ایک کار بھی لا دی۔ بظاہر میں کوئی اتنا بڑا بزنس نہیں کرتا تھا۔ کسی رشوت خور محکمے کا افسر نہیں تھا۔ میری آمدنی کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے لاکھوں خرچ کیے تو کیسے؟

کچھ دیر بعد جب میں پُرسکون ہو گیا تو میں نے نیلم سے پوچھا "کیا انہیں بھی بڑے ملک صاحب نے طلب کیا تھا؟"

"اگر کیا تھا تو مجھے نہیں معلوم مگر میرا خیال ہے کہ بلایا ہو گا۔"

"وہ بلواتے نہیں' اٹھواتے ہیں اور ان کی پوچھ گچھ کا انداز بھی شریفانہ نہیں ہوتا۔ ضرور انہوں نے تشدد سے کام لیا ہو گا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ناصر تمہارے ساتھ رہتا تھا۔ اس سے ملنے کون لوگ آتے تھے؟ کیا وہ کبھی کوئی چیز چھپانے کے لیے گھرایا تھا۔ ایک سوٹ کیس۔ وہ کیا کرتا تھا' اتنا پیسہ کہاں سے آتا تھا اس کے پاس؟ وہ یتیم خانے کا اوارث لوٹا۔ میٹرک پاس۔ جس کے نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ اس نے تمہارے لیے یہ سب کیسے کیا آخر؟"

نیلم کی خاموشی نے گویا میرے اندیشوں کی تائید کر دی۔

"وہ بے چارے کیسے بتا سکتے تھے۔ چپ چاپ مار کھاتے رہے ہوں گے۔ ملک کو یقین ہو گا کہ میں نے اس کے دشمنوں کے ساتھ سازباز کی اور اس کا مال غائب کرا دیا۔ دشمنوں سے ملنے والے پیسے سے میں نے گاڑی خریدی۔ ستائیس ہزار ڈالر تو میں نے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیے تھے۔"

"فارن ایکسچینج اکاؤنٹ بھی ہے تمہارا؟"

"ہاں۔ وہ ساری رقم اس میں محفوظ ہے۔ کچھ خرچ بھی ہو گئی تھی مگر میرے پاکستانی کرنسی کے اکاؤنٹ میں بھی پیسہ تھا۔ یہ میں ملک کو بتا چکا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تفتیش کرنے والوں کو۔ ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر بہت مظلوم اور بے سہارا لوگ تھے۔ وہ اس عمر میں صحت مند بھی نہیں تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے کتنا تشدد جھیلا' کتنی جسمانی اذیت اور ذلت برداشت کی۔ کیا تمہیں انہوں نے کچھ نہیں بتایا تھا؟"

"نہیں۔ وہ خاموش ضرور تھے۔ اور ماسی ہیر رونے بھی لگتی تھی۔ بار بار کہتی تھی کہ ہمیں ناصر سے یہ امید نہیں تھی۔ اس نے بہت برا کیا ہمارے ساتھ۔ ایسا بیٹا نہیں چاہیے ہمیں۔ ہم بے اولاد ہی بھلے۔ ہماری کچی کوٹھری ہی اس محل سے بھلی۔ انہیں شاہد نے بھی بہت سمجھایا کہ یہ غلط ہے۔ ناصر کوئی غلط کام نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی بے قراری سے پھٹ گیا ہے مگر وہ نہیں مانے۔ انہوں نے کہا کہ وہ بے وقوف نہیں۔ بہت سیانا ہے۔ وہ تو ہمیں بے وقوف بناتا رہا۔ میرا خیال ہے کہ بہت زیادہ جسمانی تشدد نہیں کیا گیا تھا ان پر۔ غالباً ان کے بڑھاپے کو دیکھتے ہوئے۔ ذلت بہت اٹھانی پڑی تھی انہیں۔ اس کے باوجود وہ ملک کے خلاف گواہی کے لیے تیار تھے۔ مجسٹریٹ کے سامنے بیان حلفی دینے کے لیے بھی تیار تھے کہ ناصر کو اغوا کیا گیا تھا۔ بڑے ملک کی بدسلوکی کے باوجود وہ اس سے ڈرے نہیں تھے۔ ڈاکٹر رانجھا نے کہا تھا کہ اب کچھ تو کرنا ہی ہے ناصر کے لیے۔ بڑا ملک کیا کرے گا اس سے زیادہ ہمارے ساتھ؟ ہمیں جان سے مار ڈالے گا؟ مار ڈالے..... زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سمجھ لیں گے کہ بس اتنا ہی جینا تھا ہمیں اور ایسے ہی مرنا تھا۔"

"میں نے بہت برا کیا۔ وہ اس سلوک کے مستحق نہیں تھے۔ میں ان کو عزت اور آرام کی زندگی دینا چاہتا تھا مگر قسمت انہیں ذلت اور خواری۔ جو تھا وہ سب چھن گیا۔ وہ دربدر ہو گئے میری وجہ سے۔"

"بار بار خود کو الزام کیوں دیتے ہو۔ کیا خود تم یہ سمجھتے ہو کہ تم نے کوئی بہت غلط کام کیا تھا؟ تم کسی جرم میں ملوث ہوئے تھے؟ کوئی گناہ سرزد ہوا تھا تم سے؟ یہ تو ملک کی بدمعاشی تھی کہ تم پکڑے گئے اور بلاوجہ اس کے عتاب کا نشانہ بنے۔ اس میں ہمت ہوتی تو ہاتھ ڈالتا ڈاکٹر مشہود پر یا مجھ پر۔ اور شاہد پر..... نزلہ بر عضو ضعیف۔ تم اور رئیس کمزور تھے' تم مجرم ہو گئے۔"

"لیکن یہ بھی ٹھیک ہے کہ صرف مجھ سے تعلق کی سزا ملی ڈاکٹر رانجھا کو اور ماسی ہیر کو۔ جیسے مجھے سزا ملی وسیم سے تعلق کی۔ تم نے بھی انہیں یہ بات سمجھائی ہو گی لیکن حاصل کیا ہوا۔ کیا انہوں نے یقین کیا تم پر؟"

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "سمجھایا تو شاہد نے بھی تھا کہ تم سے زیادہ میں جانتی ہوں ناصر کو مگر وہ ایک ہی بات کو روتے رہے کہ ٹھیک ہے' پہلے نہیں ہو گا ایسا مگر اب وہ ایسا ہی ہے۔ ہم تو دن رات دیکھ رہے تھے اس کے رنگ ڈھنگ۔ اس نے غلط صحبت اختیار کر لی تھی۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ اس کے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ رہا ہے۔ اس کا نمایاں خود بھی بھٹکتا اور ہمیں بھی اس عمر میں خوار کیا۔ ایک عزت ہی تھی اپنے پاس۔ بڑے ملک نے جو ہمارے ساتھ کیا' اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے نظریں ملاتے ہوئے شرماتے ہیں۔ کون ہے اس کا ذمے دار۔ ہم تو بہت خوش تھے مگر بڑا منحوس تھا وہ دن جب ناصر ہمارے گھر آیا تھا اور پھر ہمیں اپنے ساتھ لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیا تھا۔"

"ان کا ڈیپریشن میں مبتلا ہونا جائز تھا۔ وہ یہاں رہتے تو آئندہ بھی خطرہ تھا کہ ملک انہیں پھر اٹھوالے۔ ان کی دوسری خطا یہ بن جائے کہ انہوں نے چشم دید گواہ کی حیثیت سے اپنا نام قانونی نوٹس میں دیا۔ وہ بڑے ملک کے خلاف عدالت میں گواہی دینا چاہتے تھے۔"

"ہوسکتا ہے ان کے روپوش ہوجانے کا ایک سبب یہ بھی ہو۔ جب تمہیں رہائی مل گئی تو ان کے کرنے کو کچھ نہ رہا۔ انہوں نے تم کو میرے سپرد کیا اور اپنی جان بچا کے کہیں چلے گئے مگر تم فکر مت کرو۔ ان کے لیے جذباتی طور پر تم سے قطع تعلق اتنا آسان نہیں ہوگا۔ وہ تمہیں بھول نہیں پائیں گے خواہ اس کے لیے کتنی بھی کوشش کریں۔"

میں نے کہا "نہیں نیلم۔ وہ اب لوٹ کے نہیں آئیں گے۔"

"لوٹ کے نہ آئیں مگر تمہاری خبر ضرور رکھیں گے۔ کسی دن فون آئے گا ان کا۔ آج کل میں تم دیکھ لینا۔ وہ تمہارا حال پوچھیں گے۔"

میری امید کچھ بندھی "شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ تم ایسا کرو' جب ان کا فون آئے تو ان سے کہو کہ ناصر کی حالت خراب ہے۔ وہ روتا رہتا ہے اور تمہیں ہر وقت یاد کرتا ہے۔ وہ بہت شدید ڈیپریشن کا شکار ہوگیا ہے۔"

نیلم نے سراہا یا "رائٹ۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ اس کا ذمے داری جتنا بڑا ملک ہے' اتنے ہی آپ لوگ بھی ہیں۔ بڑے ملک کے ہاتھوں مارے جانے سے تو وہ بچ گیا مگر اس ذہنی کیفیت میں وہ اپنے ہاتھوں اپنی جان لے سکتا ہے۔ پھر دیکھنا وہ کیسے نہیں آتے تم کو دیکھنے۔"

میں نے خود کو پُرسکون محسوس کیا۔ واقعی یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ جتنا دکھ مجھے ہے ان سے بچھڑنے کا۔ اس سے کہیں زیادہ دکھی وہ خود ہوں گے۔ شدتِ جذبات میں انہوں نے ایک فیصلہ تو کرلیا مگر ایسے فیصلوں پر قائم کون رہ سکتا ہے۔ والدین بھی اولاد کو عاق کردیتے ہیں' گھر سے نکال دیتے ہیں اور چند دن بھی نہیں گزرتے کہ پچھتاوے کے عذاب میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ عجلت میں کیے ہوئے فیصلے کی پشیمانی ایک روگ بن جاتی ہے اور بالآخر انہیں اپنی عزت اور انا۔ خودداری اور اصول پرستی سب کچھ بھول کے خود ہی اولاد کو منانا پڑتا ہے۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی جلدی وہ کہاں گئے ہوں گے۔ رہنے کی جگہ تو خیر مل ہی جاتی ہے مگر ڈاکٹر رانجھا نے اپنا کلینک چھوڑ دیا۔ جہاں اس کی پریکٹس چلتی تھی۔ اس کا جمایا اڈا تھا۔ کسی نئی جگہ جاکے وہ بڑی مشکل میں پڑجائے گا۔ کون آتا ہے ایک نئے ڈاکٹر کے پاس جو پورا ڈاکٹر بھی نہ ہو۔ کئی برس تو کوئی فائنڈ ڈاکٹروں کو فارغ بیٹھے کھیاں مارتے گزر جاتے ہیں۔"

نیلم میرے موڈ کی تبدیلی سے خوش تھی "میری بات لکھ لو۔ آج نہیں تو کل وہ ضرور مجھ سے معلوم کریں گے کہ ناصر کیسا ہے اب؟"

میں نے کہا "نیلم۔ تمہارے لیے تو ٹیلی فون کے مخملے والے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ تم اپنا فون نمبر بدلواتی رہتی ہو۔ ایک کام کرو۔"

"کیسا کام؟"

"صبح اپنے فون پر آبزرویشن لگوالو۔ یہ کہو کہ مجھے دھمکیاں مل رہی ہیں۔ ٹیلی فون کرنے والے فحش کلامی کرتے ہیں' گالیاں دیتے ہیں۔"

اس نے چٹکی بجائی "بالکل ٹھیک۔ اس سے میرے نام آنے والی ہر فون کال ریکارڈ ہوجائے گی۔ یہ پتا چل جائے گا کہ فون کہاں سے کیا گیا تھا۔ وہ سیدھے سادے لوگ ہیں۔ انہیں شک ہی نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "اور اگر تم انہیں باتوں میں لگا سکو تو یہ ہوسکتا ہے کہ دس پندرہ منٹ میں کوئی وہاں پہنچ جائے جہاں سے وہ فون کررہے ہوں۔"

"کون پہنچ جائے گا پولیس؟"

میں نے کہا "وہ تو قتل کی وارداتوں میں بھی اتنی مستعدی نہیں دکھاتے۔ پہنچتے ہیں اطمینان سے گھنٹا بھر بعد اور پولیس کے ذریعے انہیں پکڑ کے لانا اچھا بھی نہیں لگتا۔ خیر اتنا پتا چل جائے کہ فون کس کا استعمال ہوا تھا۔"

"وہ پبلک کال آفس سے ہی فون کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے بھی یہ معلوم ہوجائے گا کہ علاقہ کون سا ہے پھر میں اس علاقے کو چھان ماروں گا۔"

نیلم نے کلائی کی گھڑی دیکھی "چلو اب سوجاؤ۔ بہت رو دھولیے۔ اب مطمئن رہو۔ ہم انہیں ڈھونڈ نکالیں گے ورنہ وہ خود آئیں گے اس سے پہلے ہی یہاں۔"

نیلم کی بات اس وقت مجھے سوفیصد درست لگی۔ رشتے کی زنجیر کو توڑنا جتنا مشکل میرے لیے تھا' اس سے زیادہ ناممکن ان کے لیے تھا۔ جب نیلم مجھے شب بخیر کہہ کے چلی گئی تو میں نے بھی سونے کی کوشش کی مگر میرا ذہن جاگتا رہا۔ جیسے آگ بجھ جانے کے بعد بھی جلتی بہت دیر خود اپنی تپش دیتی ہے۔ ایسے ہی میرے پریشان کن خیالات کا تلاطم ختم

ہوگیا تھا مگر تموج باقی تھا۔

میں سوچتا رہا اور تصور کرنے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ اس وقت ڈاکٹر رانجھا اور ماسی ہیر کہاں ہوں گے۔ نہ جانے کس چھت کے نیچے بے سروسامانی کے عالم میں خاموش لیٹے اپنی یادوں کا عذاب جھیل رہے ہوں گے۔ سوچ رہے ہوں گے کہ گردشِ حالات نے انہیں کہاں سے کہاں پہنچادیا۔

میں یہ بھی سوچتا رہا کہ بڑے ملک نے ان کے ساتھ کس حد تک غیر انسانی سلوک کیا ہوگا۔ اگر وہ کہتے ہیں کہ ہم ایک دوسرے سے نظر ملاتے ہوئے شرماتے ہیں تو اس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے۔ ملک نے ان کے ساتھ وہی کیا جو پولیس مجرموں کے ساتھ تھانے میں کرتی ہے؟ شاید اس سے بھی زیادہ شرمناک اور وحشیانہ انداز میں تشدد کا نشانہ بنایا۔ ننگا کرکے الٹا لٹکانا اور مار مار کے کھال ادھیڑ دینا تو معمولی بات ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ اس کے شوہر کے سامنے کوئی حیا سوز حرکت کی جائے۔

میں نے محسوس کیا کہ ایسی باتیں سوچنے سے میرا دماغ تپ رہا ہے۔ میرا خون جل رہا ہے اور میری اضطرابی کیفیت ہیجانی ہورہی ہے۔

رات کے دو بجے میں ضد کرکے نیلم سے سکون آور گولیاں مانگنے اس کی خواب گاہ میں گیا۔ اس نے سوتے سے اٹھ کے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھ کے حیران رہ گئی "کیا بات ہے؟" اس نے مسکرا کے ایک انگڑائی لی۔

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ تمہارے پاس خواب آور یا سکون کی گولیاں ہیں تو مجھے دے دو۔" میں نے اس کے لباس کی بے ترتیبی سے نظر چرا کے کہا۔

"گولی تو نہیں ہے۔ ہوتی تب بھی نہ دیتی میں" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اندر کھینچ لیا "مگر سکون کی تمنا میں یہاں آئے ہو' اور پھر مہمان بھی ہو میرے۔ تمہارے آرام کا خیال رکھنا فرض ہے میرا۔"

میرے لیے اس کے خیال سے اتفاق نہ کرنا ممکن ہی نہیں رہا تھا چنانچہ میں نے مزاحمت کی کوشش بھی نہیں کی۔

وہ ایک طویل پُرسکون اور مدہوشی کی نیند تھی جس میں کوئی خواب تک خلل نہ ہوا۔ ایک خواب کے سوا جس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے دیکھا کہ نیلم کے ساتھ میں کسی گھنے جنگل سے گزر رہا ہوں اور ہمارے اردگرد اونچے درختوں کے بارش سے بھیگے تنے ہیں۔ بہت اوپر آپس میں الجھی ہوئی گھنی شاخوں کی چھت سے آسمان نظر نہیں آتا مگر پتوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ہم بھیگتے جارہے ہیں اور میں نیلم کا ہاتھ پکڑے اسے اپنے ساتھ کھینچ رہا ہوں۔ "ادھر آجاؤ۔ یہ جگہ محفوظ لگتی ہے" اور نیلم ہنستی جارہی ہے اور بھاگ رہی ہے۔ اس کا جسم سردی سے کانپنے لگا ہے۔ فضا میں عجیب سی مدہوش کرنے والی مہک ہے۔ بھیگے پتوں کی اور بھیگی ہوئی خودرو گھاس کی اور بھیگے کپڑوں سے پھوٹتی نیلم کے بدن کی۔

میری آنکھ کھلی تو میں نے نیلم کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ اس کے بھیگے بالوں سے ٹپکنے والے قطرے میرے چہرے کو بھگو رہے تھے اور میں اس کے وجود کی خوشبو کے حصار میں تھا۔ میں اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

وہ ہنسی اور اس نے اپنے بال پیچھے جھٹک کے تولیے میں لپیٹ لیے۔ وہ ابھی ابھی غسل کرکے نکلی تھی اور میک اپ کے بغیر اس کا حسن شبنم سے دھلے گلاب کی طرح لگ رہا تھا جس پر بہار کی صبح کے سورج کی پہلی کرن اتری ہو۔

"جی نہیں چاہتا اٹھنے کو؟"

"نہیں" میں نے کہا اور اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میرے اوپر گر گئی۔

"مجھے شوٹنگ پر جانا ہے" اس نے آہستہ سے خود کو چھڑالیا "دیکھو وقت کیا ہورہا ہے؟"

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا "دس بج گئے۔ تم نہ جگاتیں تو میں بے ہوش پڑا رہتا۔"

"میرے ساتھ چلو گے شوٹنگ پر۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کے ہیئر ڈرائر سے بال سکھانے لگی۔

میں نے ایک انگڑائی لے کر خمارِ شب سے ٹوٹتے بدن کی کسک دور کی اور کہا "کوئی چانس ہے ہیرو بننے کا؟"

"چانس تو مل سکتا ہے۔ اگر میں چاہوں۔ مگر میں چاہوں گی نہیں۔"

"کیوں نہیں چاہو گی؟ اس لیے کہ اگر میں سچ مچ ہیرو بن گیا تو ہر ہیروئن کے ساتھ مجھے دیکھ کے تمہیں حسد محسوس ہوگا۔"

"نہیں۔ یہ تمہاری منزل نہیں ہونی چاہیے ناصر۔ تم کو بہت آگے جانا ہے' وہ کیا شعر ہے علامہ اقبال کا۔ قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر۔ ترے سامنے آسمان اور بھی ہیں۔"

میں نے باہر جاتے جاتے کہا "ابھی سے آسمان پر کیوں بھیجنا چاہتی ہو مجھے؟ ویسے فلمی دنیا کو عالم رنگ و بو خوب کہا تم نے۔"

ابھی ہم ناشتے کی میز پر ہی تھے کہ چھوٹے ملک صاحب کا فون آگیا۔ صغراں نے ریسیور مجھے تھمادیا "آپ سے بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کریں گے وہ۔"

میں نے کہا "السلام علیکم ملک صاحب! کیسے یاد فرمایا صبح صبح۔"

"صبح صبح؟ گیارہ بجے ہیں۔ آس پاس کوئی گھڑی ہے تو دیکھ لو۔ میں نے تو پہلے بھی فون کیا تھا" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

"اچھا؟ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"

"کیسے بتاتا' تم بھی سو رہے تھے' نیلم بھی سو رہی تھی۔ صغراں نے صاف کہا کہ بیڈ روم میں جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

اس کے لہجے میں رقابت کا حسد محسوس کرتے ہوئے میں نے بات بدل دی "کیا حکم ہے میرے لیے جناب!"

"او یار حکم کیا۔ تم نے کہا تھا کل مجھ سے کہ اپنے یار رئیس خان سے ملنا چاہتے ہو۔"

میں نے پُراشتیاق لہجے میں کہا "جی۔ ملنا تو چاہتا ہوں۔"

"اچھا میں گاڑی بھیج رہا ہوں اپنی۔۔۔ نیلم کہاں ہے؟"

"میرے ساتھ ناشتا کر رہی ہیں۔" میں نے کہا اور ریسیور نیلم کی طرف بڑھا دیا "آپ کو پوچھ رہے ہیں۔"

نیلم نے برا سا منہ بنایا مگر ریسیور لے لیا۔ اس نے دو بار ہیلو کہا اور پھر ریسیور آف کر کے رکھ دیا "اس نے تو بات کیے بغیر لائن کاٹ دی۔ کیا کہہ رہا تھا؟"

میں نے کہا "وہ اپنی گاڑی بھیج رہا ہے۔ مجھے رئیس سے ملوانے کے لیے بلایا ہے۔"

نیلم سوچ میں پڑ گئی "تمہیں رئیس سے ملوانے کے لیے؟ خود چھوٹے ملک صاحب نے گاڑی بھیجی ہے۔"

"ہاں۔ کل میں نے اس سے کہا تھا کہ مجھے ساتھ لے چلیں تو صاف انکار کر دیا تھا۔"

"مجھے یہ بات کچھ عجیب لگ رہی ہے۔ یہ ان لوگوں کے مزاج کے خلاف ہے کہ تم جیسے کسی شخص کو وہ اتنی عزت دیں کہ ڈرائیور گاڑی لے کر تمہیں لینے کے لیے آئے اور وہ بھی رئیس خان سے ملوانے کے لیے" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "شاید تمہاری وجہ سے مجھے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔"

"مجھ سے تو بات تک نہیں کی اس نے۔ یہ معاملہ گڑبڑ لگ رہا ہے مجھے ناصر۔ کبھی مجھے لے جانے کے لیے گاڑی نہیں بھیجی اس نے۔ تم انکار کر دو۔"

مجھے ملک کے لہجے میں شکایت اور خفگی بھرا حسد یاد آیا تو میں بھی سوچ میں پڑ گیا "میرا خیال ہے کہ۔۔۔ اب ایسی کوئی بات نہیں' ڈرنے کی۔"

نیلم نے کہا "تم اکیلے نہیں جاؤ گے۔ میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔"

میں نے کہا "مگر تمہاری شوٹنگ۔ تم نے کل بھی مس کر دی تھی۔"

"وہ مجھے چھوڑنی پڑے گی اور اتنا خیال ہے تمہیں میرا تو ملک سے کہہ دو کہ میں جا رہا ہوں نیلم کے ساتھ۔ آپ رئیس خان کو اسٹوڈیو بھیج دیں۔ یا کہہ دو کہ ہم اسے پک کر لیتے ہیں۔"

میں تذبذب میں پڑ گیا "نیلم۔ اگر چھوٹے ملک کا موڈ میرے انکار سے خراب ہو گیا تو پھر۔۔۔ ایسا نہ ہو کہ رئیس سے میری ملاقات بھی نہ ہو۔"

"ہاں۔ یہ رسک تو ہے۔ اللہ مالک بھابا جی کہہ دیں گے کہ میں کل بیمار تھی' آج بھی بیمار ہوں۔"

"اور بیماری کا نام ہے ناصر عظیم" میں نے کہا۔

باہر سے کار نے ہارن دیا تو نیلم اٹھی "لو بھئی۔ تمہارے لیے شاہی سواری آ گئی۔ اب جانا ہی پڑے گا۔"

میں رئیس سے ملنے کے لیے بہت بے قرار تھا اور اس بے قراری کو سمجھنا نیلم کے لیے دشوار تھا۔ "نیلم۔ میرا خیال ہے کہ تم شوٹنگ مت چھوڑو۔ مجھے وہاں جانے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ ویسے بھی تمہیں معلوم ہے۔"

وہ رک گئی "تم ایک بات مانو گے میری؟"

"پہلے بات بتاؤ" میں نے کہا۔

"نہیں' پہلے وعدہ کرو۔ میں تمہیں جانے سے نہیں روکوں گی۔ نہ آسمان سے تارے توڑ کر لانے کی فرمائش کروں گی۔"

میں نے کہا "اوکے' وعدہ۔ بولو کیا بات ہے؟"

اس نے کورڈلیس فون کا ریسیور میری طرف بڑھایا "نمبر ملاؤ اور شاداب سے بات کرو۔"

میں نے ہاتھ بڑھا کے کھینچ لیا "یہ۔۔۔ یہ ناممکن ہے۔"

"تم وعدہ کر چکے ہو۔ بس شکریہ ادا کرو اس کا اور یہ بتا دو اسے کہ تم پھر بڑے ملک کی کوٹھی پر رئیس سے ملنے جا رہے ہو۔"

میں اسی طرح بت بنا بیٹھا رہا۔ مجھ پر عجیب سی کمزوری غالب آ گئی تھی۔ میرے لیے وہ برزخ کے عذاب کا لمحہ تھا۔ نیلم سے کیے ہوئے وعدے کو توڑنا اور شاداب سے فون پر کہنا کہ میں ناصر بول رہا ہوں' ایک جیسے مشکل کام تھے۔

اچانک نیلم نے فون کو آن کر کے نمبر دبائے اور ریسیور

میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ "لو۔ نمبر میں نے ملا دیا ہے۔ یہ اس کا ذاتی نمبر ہے۔ جو اور کسی کو معلوم نہیں۔"

میں نے کانپتے ہاتھوں سے فون لیا تو مجھے اپنی کم ہمتی پر شرم آئی لیکن اعصاب پر میرا اختیار نہ تھا۔ میرا دل ایسے دھڑک رہا تھا جیسے دیوانہ کسی زنداں کی دیواروں سے سر ٹکرائے۔ میری سانسوں کی رفتار بے ترتیب ہو گئی تھی اور مجھے پسینہ آنے لگا تھا۔

دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی اور میرا حلق خشک ہونے لگا تھا۔ مجھے یقین نہ تھا کہ جب میرے کانوں میں شاداد کی آواز آئے گی تو میں جواب میں اسے ہیلو بھی کہہ سکوں گا۔

چند سیکنڈ بعد میں نے کہا "گھنٹی تو بج رہی ہے۔"

نیلم نے ریسیور مجھ سے لے کر کان سے لگا لیا "کیا مسئلہ ہے آخر۔ شاداد کیوں ریسیور نہیں اٹھا رہی ہے؟"

میں نے کہا "وہ کورٹ میں ہو گی یا آفس میں؟"

"وہ وکیل نہیں ہے۔ کورٹ کیوں جائے گی اور آفس بھی وہ شام کے وقت جاتی ہے۔" نیلم نے کہا "خیر میں پوچھتی ہوں کسی سے۔"

اس نے ہاشمی صاحب کے گھر کا دوسرا نمبر ملایا۔ کسی ملازم نے ریسیور اٹھایا اور اسے مطلع کیا کہ بیگم صاحبہ گھر میں نہیں ہیں۔ شاداد ایک گھنٹا پہلے کہیں گئی تھی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کر کے سکون کا سانس لیا۔ نیلم نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا "تم بتاؤ نا اسے بعد میں۔۔۔ اگر ضروری سمجھو۔"

"میں تمہاری حفاظت کے خیال سے ایسا چاہتی تھی۔"

"میری حفاظت کرنے والا خدا ہے" میں نے کہا "تمہارا میرے ساتھ جانا ویسے بھی کوئی مناسب بات نہیں۔ تمہاری شان کے خلاف ہے۔"

"شان!" اس نے تلخی سے کہا۔

"ہاں۔ چھوٹے بڑے ملک کے لیے خود کو اتنا CHEAP کیوں کرتی ہو اپنے آپ کو۔ کہہ بن بلائے وہاں پہنچ جاؤ" میں نے کہا۔

"اچھا۔۔۔ پھر تم جاؤ لیکن دیکھو' وہیں مت بیٹھ جانا اور یہ لو میرا نمبر۔ اسٹوڈیو کا نمبر ہے" اس نے ایک کاغذ کے پرزے پر نمبر لکھا اور مجھے تھما دیا "ویسے وہ بلاتے نہیں مگر میں ڈیوٹی لگا دوں گی کسی کی۔ تمہارا نام بتا دوں گی پھر وہ سیٹ پر تم سے بات کرا دیں گے۔"

باہر چھوٹے ملک کی وہ گاڑی نہیں تھی جو میں نے گزشتہ شام دیکھی تھی لیکن ڈرائیور وہی تھا "یہ تو بڑے ملک کی گاڑی ہے" نیلم نے برآمدے میں آ کے کہا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی میری جانی پہچانی سڑکوں سے گزر کے ماڈل ٹاؤن کی ایک عالی شان کوٹھی میں پہنچی۔ اس کی دیواریں قلعے کی فصیل ایسی تھیں اور کوٹھی سڑک سے شاید ایک فرلانگ اندر تھی۔ کار پورچ میں رکی تو اندر سے چھوٹے ملک صاحب نمودار ہوئے۔ اس نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے اندر لے گیا۔

رئیسانہ شان و شوکت والے راہداری کے راستوں سے گزر کے میں ایک کمرے میں پہنچا۔ اندر قدم رکھتے ہی جیسے مجھ پر بجلی گری۔

میرے سامنے چھت کے ایک کنڈے سے لٹکی ہوئی وسیم کی لاش جھول رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر دیوار کے قریب ایک کرسی پر بڑے ملک صاحب پورے جاہ و جلال اور کروفر کے ساتھ فروکش تھے اور ان کے قدموں میں ایک عورت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے بدن پر لباس نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہنے دی گئی تھی۔

یہ عورت شاداد تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں مفلوج ہو گیا۔

○☆○

صرف ایک لمحے کے لیے میں مفلوج ہو گیا۔ ان حالات میں خود کو قانون کے حوالے کر دینے کے سوا چارہ نہ تھا مگر میں یہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ شاہ عالم گرفتار ہو گیا تو اس کا انجام کیا ہو گا۔

پھر میں نے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور انسپکٹر کو موقع دیا کہ وہ قریب آئے۔ آگے وہی تھا اور اسے ریوالور کی طاقت پر بھروسا تھا۔ اب میرا ذہن کام کرنے لگا تھا اور میں یہ طے کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔

میرے کھاتے میں پولیس نے پہلے ہی قتل جیسے سنگین مقدمات ڈال رکھے تھے۔ اگر اس میں گرفتاری سے بچنے کے لیے مار پیٹ اور قانون کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے جیسے جرائم کا اضافہ ہو جاتا تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں مفرور مجرم اور داغی روپوشی کا فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔

اس تنگ جگہ میں جو گلی کی طرح تھی انسپکٹر ایک طرف کھڑا ہو کے اور اپنے ریوالور کا رخ میری طرف رکھتے ہوئے کسی ماتحت کو یہ حکم نہیں دے سکتا تھا کہ آگے بڑھو اور ملزم کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب میں نے ہاتھ اوپر کردیے تو وہ زیادہ مطمئن ہوگیا اور اس نے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آکے مجھے حکم دیا "اپنا منہ دوسری طرف کرلیں۔"

میں نے عاجزی سے کہا "سرجی۔ میرے پاس کوئی توپ شوپ نہیں ہے۔"

"ہم تلاشی لے کر دیکھ لیں گے" وہ بولا۔

"جیسی آپ کی مرضی تھانے دار صاحب!" میں آہستہ آہستہ گھوم گیا۔

اب میں نے رئیس کو دیکھا۔ وہ مجھ سے چند قدم آگے تھا اور اس طرح ہینڈز اپ کی پوزیشن میں کھڑا غور سے انسپکٹر کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری تو اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلا کے مجھے منع کیا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ میں تلاشی لینے والے انسپکٹر سے ریوالور چھین لوں اور اس کے اسلحے کے بل پر اسی کو ڈھال بنا کے پولیس کی باقی نفری کو الٹے قدم واپس چلنے پر مجبور کردوں۔ یہ کام میرے لیے کسی بچے کے ہاتھ سے کھلونا چھیننے سے بھی زیادہ آسان تھا۔ پانچ سیکنڈ میں تھانے دار ہاتھ اوپر کیے نظر آتا اور اسے میرے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح چلنا پڑتا۔

ظاہر ہے اس کے بعد مجھے رئیس کے ساتھ یہاں سے فرار ہوکے کہیں اور جانا پڑتا۔ فی الحال رئیس خانے کا ٹھکانا ہی سب سے محفوظ جگہ تھی۔ ہم واپس وہیں جاتے اور زیرِ زمین بنے ہوئے گھر میں پناہ لیتے۔ وہاں آرام اور آسائش کی ہر چیز تھی۔ رئیس خانے کا سامنے والا گیٹ جو آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا' غیر معینہ مدت تک مقفل رہتا اور ہم پیچھے والی گلی کے خفیہ راستے سے آتے جاتے رہتے۔

غالباً رئیس نے اصل خطرے کو بھانپ لیا۔ ابھی تک اس نے گیراج کے بند دروازے کو نہیں کھولا تھا ورنہ نیچے جانے والے زینے کی نشاندہی ہوجاتی اور جیرے بلیڈ کا جمایا کاروبار چوپٹ ہوجاتا۔ پولیس والوں کے تو وارے نیارے ہوجاتے۔ شاہ عالم کی گرفتاری اپنی جگہ ایک بڑا کارنامہ تھی۔ خفیہ طور پر چلنے والے سٹے کے اڈے پر کامیاب چھاپا اس کامیابی کا بونس بن جاتا۔

ابھی تک پولیس انسپکٹر کی نظر نے وہ دروازہ نہیں دیکھا تھا کیونکہ سامنے جیرے کی ہائی جیسی سیاہ رنگ کی جیپ کھڑی تھی۔ اگر میں اس وقت مار دھاڑ کرکے گرفتاری سے بچ جاتا اور فرار ہونے میں کامیاب ہوجاتا تو میری حماقت کا خمیازہ جیرے بلیڈ کو بھگتنا پڑتا۔ پولیس اس جگہ کا محاصرہ کرلیتی اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادیتی۔

تلاشی کے دوران میں انسپکٹر نے میرا ریوالور اپنے قبضے میں لے لیا اور پھر پیچھے ہٹا۔ "آپ باہر نکل آئیں شاہ صاحب" اس نے تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے کہا۔ "چل بھئی تو بھی آجا۔"

رئیس نے رویے کے اس فرق کا برا نہیں مانا۔ ایک سیاسی لیڈر اور ایک عام آدمی کے ساتھ صرف پولیس کا نہیں ہر شخص کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ ہم یوں گیراج سے باہر آئے کہ میرے ساتھے تھانے دار تھا۔ اس کے ریوالور کا رخ بھی میری طرف تھا اور وہ خود ریورس گیئر میں چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دونوں ماتحت بھی الٹے چل رہے تھے۔

باہر پولیس کی ایک جیپ کھڑی ہوئی تھی مگر اس میں ڈرائیور کوئی نہیں تھا۔ انسپکٹر نے کہا "شاہ جی۔ آپ عزت دار بندے ہو۔ اس لیے میں آپ کو ہتھکڑی نہیں ڈالوں گا لیکن آپ بھی میری نوکری کا خیال کرنا۔"

میں نے پُراعتماد دوستانہ انداز میں مسکرا کے کہا "نوکری کی ہے تمہاری۔ حکومت کوئی بھی آئے جائے۔ تمہیں کیا لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے میرا سراغ کیسے لگایا؟"

اس نے مجھے جیپ میں بیٹھنے کا اشارہ کیا "بس جی۔ آپ اتفاق ہی کہہ سکتے ہو۔ میں نے آپ کو گزرتے ہوئے دیکھ لیا۔ ایسے ہی نظر پڑ گئی اور میں نے پہچان لیا آپ کو۔ آپ کی فوٹو ہر تھانے میں لگ گئی ہے۔"

میرے لیے یہ انکشاف بڑا پریشان کن تھا "یہ تو بہت بُرا ہوا؟"

"کوئی بات نہیں یار۔ اپنے تھانے دار کے سوا کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ابھی تک اور یہ مجھے بڑے بھلے مانس لگتے ہیں۔" رئیس نے اب اپنی حکمتِ عملی آزمائی۔

تھانے دار نے آگے بیٹھتے ہوئے اسے گھور کے دیکھا "کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا۔"

"جی۔ ہم نے آپ کو اچھا کہا تو کیا یہ فضول بات ہوگئی؟ باقی رہی مطلب کی بات تو وہ کرلیتے ہیں اطمینان سے کہیں بیٹھ کے۔" رئیس بولا۔

میں نے اس کی تائید کی "ہماری کون سی ذاتی دشمنی ہے اور اس گرفتاری پر تمہیں کون سا انعام ملے گا۔"

اپنے مطلب کی بات تو دیوانہ بھی سمجھ لیتا ہے۔ تھانے دار سیانا ہوتا ہے۔ وہ صورتِ حال کے مطابق اپنے اختیارات کو دراز یا مختصر کرنے کا کرتب کسی ماہر مداری کی

طرح دکھا سکتا ہے۔ ہر زیرِ حراست ملزم اس کے لیے ایک سادہ چیک کی طرح ہے جس پر رقم بھرنے سے پہلے وہ اپنے تجربے کو پوری طرح بروئے کار لاتا ہے۔ یہ دیکھتا ہے کہ جرم کیا ہے اور جرم کرنے والا کون ہے۔ ان کی مالی حیثیت کا تعین کرنے کے بعد وہ اپنی مہارت سے جتنا وصول کرسکے کرلیتا ہے۔

اس تھانے دار نے بھی پہلے سختی سے فرض شناسی کے مؤقف پر قائم رہنے کا تاثر دیا پھر نوکری اور بیوی بچوں والا معاملہ آیا اور سختی حالات کا رونا۔ کم تنخواہوں کا گلہ اور جان کے ہر وقت خطرے میں رہنے کا مسئلہ۔

ظاہر ہے اس وقت تک معاملات ہمارے ڈھب پر آگئے تھے اور اب اگلا مرحلہ سودے کا تھا۔ ماتحت زیرِلب مسکرا رہے تھے کہ ان کا ذہین افسرِ اعلیٰ ان کے فائدے کی بات بڑی ہوشیاری سے کررہا ہے اور آج کا دن مالی طور پر بہت نفع بخش ثابت ہونے کے آثار ہیں۔ بڑی پارٹی ہے تو منافع بھی بڑا ہوگا اور بے شک افسرِ اعلیٰ انگریزی محاورے کے مطابق شیر کا حصہ رکھے گا مگر جو کچھ انہیں ملے گا وہ بھی اللہ کا شکر ادا کرنے کے لیے بہت کافی ہوگا۔ ہذا من فضل ربی۔

میں نے کہا "انسپکٹر۔ ہم کب تک یہاں جیپ میں بیٹھے رہیں گے۔ کسی ڈھنگ کی جگہ بیٹھ کے اطمینان سے بھی تو بات ہوسکتی ہے۔"

انسپکٹر نے پریشان نظر آنے کی کوشش کی "شاہ صاحب۔ آپ تو بڑے لوگ ہو۔ کل کو حکومت آپ کی ہوگی تو آپ جھنڈا لگا کے پھرو گے مگر ہمارے لیے تو وہی ڈنڈا رہے گا۔ آپ کہو گے مخالفوں کو مارو اور مخالف اخبار میں اور عدالت میں دہائی دیں گے تو وہی ڈنڈا۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "میں سمجھتا ہوں تمہاری مجبوری کو۔ ہر حکومت پولیس کو بہت MISUSE کرتی ہے۔ اس معمولی سی تنخواہ کی خاطر چوروں ڈاکوؤں' غنڈوں' بدمعاشوں اور سیاسی دادا گیروں سے مقابلہ کرنا واقعی بہت مشکل کام ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری "بندہ کیا شے ہے شاہ صاحب۔ ایک گولی میں پھونک نکل جاتی ہے اور بیوی بچے خوار ہوجاتے ہیں۔ اعلیٰ افسران ایک تعریفی سند پکڑا دیتے ہیں۔ حکومت اگر حاتم طائی کی..... پر لات مارے تو تھوڑا بہت نقد انعام دے دیتی ہے خیرات کے طور پر۔ دس بیس ہزار میں کیا ہوتا ہے آج کل۔ مہینے کا خرچ نہیں چلتا..... میرا مطلب ہے..... زندگی تو نہیں گزرتی۔"

میں نے ہمدردی سے کہا "فرید عباسی کو جانتے ہو تم؟"

"ہاں جی۔ بڑا وہ بندا تھا۔ ایمان دار اور فرض شناس۔ چھٹی ہوگئی اس کی اسی چکر میں۔"

میں نے کہا "آؤ اس کے گھر چلتے ہیں۔ وہ میرا دوست ہے۔"

وہ کچھ گھبرایا "کیوں جی۔ وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا "ہم کسی ہوٹل ریستوران میں بیٹھ کے بات نہیں کرسکتے۔ مجھے بہت لوگ پہچانتے ہیں۔ کسی نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو کام خراب ہوجائے گا۔"

"آپ ادھر ہی بات کرو جی۔"

میں نے کہا "کیا تم صرف بات سے مطمئن ہوجاؤ گے۔ میری جیب میں ریوالور کے علاوہ ایک پرس تھا۔ اس میں مشکل سے دو ہزار ہوں گے۔ تم چیک بھی نہیں لوگے اور کل کے وعدے پر بھی اعتبار نہیں کرو گے۔ کیا پتا میں نشان لگے نوٹ دے کر تمہیں اندر کروادوں۔"

اس نے رئیس کی طرف دیکھا "یہ کوٹھی اس کی ہے؟"

"یہ کوٹھی؟" میں نے ہنس کے کہا "یہاں تو میری ایک جاننے والی رہتی ہیں۔ ان کے شوہر مشہور وکیل ہیں۔ فیصل ہاشمی' یہ میرا ڈرائیور ہے۔"

"اس سے کہو کہ..... کوئی بندوبست کرے" انسپکٹر بولا۔

میں نے کہا "اس بے چارے کی کیا اوقات۔"

"آپ رقعہ لکھ دو۔ یہ لے آئے گا کہیں سے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا "بہت مشکل ہے۔ یہ نیا ہے۔ ابھی زیادہ تر لوگ نہیں جانتے اسے۔"

"شاہ صاحب۔ کسی نے جیپ میں ہمارے ساتھ آپ کو دیکھ لیا تو پھر ہم مجبور ہوجائیں گے گرفتاری دکھانے پر" وہ بولا۔

میں نے کہا "جیپ کو اسی جگہ چھوڑ دو یا آگے جہاں تم مناسب سمجھو۔ میری گاڑی ہے تو چھوٹی مگر محفوظ ہے۔ کالے شیشوں میں کچھ نظر نہیں آتا۔ فرید عباسی اپنا یار ہے۔ اس وقت وہ گھر پر نہیں ہوگا۔ اس کی بیوی ہوگی اور بوڑھی ماں۔ وہاں بیٹھ کے ایک کپ چائے پئیں گے۔"

مسئلے کا یہ حل انسپکٹر کی سمجھ میں آگیا "دیکھو شاہ صاحب۔ چالاکی مت کرنا۔ کہیں ادھر پہنچ کے....."

میں نے کہا "لاحول ولا قوۃ۔ اب کیا ہم اتنے ناقابلِ اعتبار ہیں اور اب کیا قسم کھاؤں یا حلف اٹھاؤں؟ وہ بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رشوت کے معاملے میں؟"

"ٹھیک جی۔ آپ کو یقین ہے کہ وہاں گھر میں تین لاکھ کی نقد رقم موجود ہوگی؟" انسپکٹر نے کہا۔

"کیسے تین لاکھ؟"

اس نے کہا "دیکھو جی۔ دو لاکھ میرے۔ پچاس پچاس ہزار ان دونوں کا منہ بند رکھنے کے۔ آپ کے لیے یہ کوئی بڑی رقم نہیں۔"

میں نے کہا "پچاس تمہارے۔ دس دس ہزار ان کے۔ منظور ہیں تو بولو۔"

"نہیں جناب!" انسپکٹر نے رکھائی سے کہا اور ڈرائیور سے کہا کہ گاڑی چلائے۔

میں نے کہا "ایک منٹ۔ ذرا میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے علیحدگی میں بات کرنی ہے۔ ڈرو نہیں۔ میرا ریوالور تمہارے قبضے میں ہے۔ میں نہ بھاگ سکتا ہوں اور نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہوں۔"

وہ سرپلا کے نیچے اُتر آیا۔ واپس اندر پہنچتے ہی میں نے تھانے دار کو ہاتھوں کے کمال کا ایک معمولی سا کرتب دکھایا اور اپنے ریوالور کے ساتھ اس کا ریوالور بھی چھین لیا۔ اس کے حلق سے آواز تک نہ نکل سکی۔

میں نے کہا "اگر میں چاہوں تو ایک جھٹکے میں تمہاری گردن توڑ کے تمہیں دوسرے جہان میں پہنچا دوں۔ یہ کام میں پہلے بھی کر سکتا تھا مگر میں بلاوجہ کشت و خون پسند نہیں کرتا۔ میں ایک لاکھ تمہیں دوں گا۔ پچیس پچیس ہزار ان دونوں کو۔ اب شرافت سے چلو اور یہ مت بھولنا کہ جن کی کمائی پر تھانے چلتے ہیں، وہ میرے اشاروں کے غلام ہیں۔ مجھے بھنا دیتے ہیں۔"

میں نے اسے چھوڑا تو اس کی حالت غیر ہو رہی تھی "سر۔ سر جی، آپ تو ایویں غصے میں آ گئے۔ آپس کی بات تھی۔"

میں نے کہا "تم یہ بھی خیال رکھنا کہ آج کی بات کل تمہیں یاد رہنی چاہیے نہ مجھے۔ دماغ سے بھی نکل جانی چاہیے اور دل سے بھی۔ بات اگر دل میں رہ جائے تو آدمی بدلہ لینے کی سوچتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ وہ بعد میں توپ چلائے گا۔ تھانے دار ہو تم صرف تھانے میں لیکن تمہارا ایک گھر بھی ہے۔"

وہ ہکلانے لگا "جناب، جناب عالی! میں نے کچھ بولا ہے؟ کوئی ایسی بات کی ہے۔ میری توبہ، میرے باپ کی توبہ جو پھر کبھی یہ خیال بھی دل میں لاؤں کہ آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"چلو اب تم بیٹھو میرے ساتھ۔ اپنے ماتحتوں سے کہو کہ جیپ میں ذرا فاصلے سے پیچھے چلیں اور باہر انتظار کریں" میں نے کہا۔

یہ انتظام بہت معقول تھا۔ تھانے دار کے ماتحتوں کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔ ڈرائیونگ رئیس نے سنبھالی اور میں نے تھانے دار کو عزت دیتے ہوئے آگے بیٹھنے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے پیچھے بیٹھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ یہ ایک مشکل صورت حال تھی اور تھانے دار زیادہ اڑیل نہ کرتا تو بڑی خوش اسلوبی اور خوش اخلاقی سے مسئلہ حل ہو سکتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اتفاق میں دونوں کا بھلا ہوا۔ اتفاق میں برکت ہے، بزرگ صحیح فرماتے تھے۔

رخشی مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "اللہ خیر کرے پھر نازل ہو گئے تم؟"

میں نے کہا "تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی پوریاں اتنی پسند آئیں کہ میں نے سوچا آج لنچ میں بھی ناشتا دہرایا جائے۔ ایک سرکاری مہمان بھی ساتھ آیا ہے۔"

"اب کس منٹ خورے کو پکڑ لائے" وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھی۔

میں نے اسے روک لیا "ادھر کہاں جا رہی ہو۔ پولیس بیٹھی ہے۔"

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں "پولیس کیوں آئی ہے؟"

"تھانے دار کے گھر تھانے دار آیا ہے۔ اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے۔ نیک لوگوں کے گھر نیک بندے جاتے ہیں میرے جیسے۔"

"میں اماں کو بلاتی ہوں۔"

"ارے ایسا غضب مت کرنا۔ یہ بتاؤ، ڈیڑھ لاکھ روپے نقد ہوں گے تمہارے پاس؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ کس لیے، رشوت دینی ہے؟"

میں نے کہا "ہیں یا نہیں؟"

"مشکل ہے، میں دیکھتی ہوں۔ اماں سے پوچھوں؟"

میں نے کہا "پوچھ لو مگر اس سے زیادہ کچھ مت کہنا کہ مجھے چاہئیں اور نہ ہوں تو فیصل کو فون کر کے کہنا کہ آدھے گھنٹے میں کہیں سے لے آئے۔"

رخشی نے دس منٹ بعد مجھے مطلوبہ رقم فراہم کر دی۔ ایک لاکھ کے قریب اس کے پاس تھے۔ پچاس ہزار عباسی کی

والدہ نے کوئی سوال پوچھے بغیر دے دیے۔

میں نے رقم تھانے دار کے سامنے رکھی "گن لو۔"

وہ نوٹ گنے بغیر اٹھانے لگا "پورے ہی ہوں گے جناب، اعتبار ہے ہمیں۔"

"نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گن لو، یہ حکم ہے میرا۔"

اس نے بادل ناخواستہ نوٹ شمار کیے اور بولا "ایک روپیہ بھی کم نہیں ہے سرجی۔ پورے ڈیڑھ لاکھ ہیں۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "اصل مقصد کچھ اور تھا اس کا۔ جب تم نوٹ گن رہے تھے تو فرید عباسی کی بیوی نے میرے کہنے سے مووی کیمرے پر فلم بنالی اور تمہیں پتا نہیں چلا۔"

اس کی حالت خراب ہو گئی "یہ۔ یہ اچھا نہیں کیا آپ نے جناب!"

"ہاں۔ تم نے اور میں نے کوئی بھی اچھا کام نہیں کیا۔ تم نے مجھے چھوڑ کے جرم کیا۔ میں نے تمہیں رشوت دے کر جرم کیا۔ اس کیس میں مجھے جیل ہو سکتی ہے تو تمہاری نوکری بھی جا سکتی ہے اور تمہیں جیل بھی ہو سکتی ہے لیکن ڈرو نہیں، میرا ارادہ ہرگز تمہیں بلیک میل کرنے کا نہیں ہے۔ تم جیسے معمولی انسپکٹر کے ساتھ ہم ایسا گھٹیا گیم نہیں کھیلتے۔ یہ تو بس تمہارا منہ بند رکھنے اور تمہیں قابو میں رکھنے کے لیے ہے" میں نے ہاتھ بڑھا کے اس سے مصافحہ کیا اور اس کا ریوالور اسے واپس کر دیا۔ اخلاقاً میں نے رخشی کا شکریہ ادا کیا اور ہم باہر نکل آئے۔

پولیس کی جیپ عباسی کے گھر سے سو گز کے فاصلے پر موجود تھی۔ میں نے اور رئیس نے تھانے دار کو وہاں تک پیدل جاتے دیکھا۔ اس کی حالت تھانے سے نکلنے والے کسی بدمعاش جیسی ہو رہی تھی جس کی ساری اکڑفوں رات بھر کی تفتیش میں نکل گئی ہو۔ میں نے اپنی گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم مخالف سمت میں روانہ ہو گئے۔

رئیس نے ایک قہقہہ لگایا پھر ایک دم سیریس ہو گیا "یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی پیارے۔ اپنے یار جیرے بلیڈ کا اڑا خواہ مخواہ اس کی نظر میں آ گیا۔"

میں نے کہا "یہ کچھ نہیں کرے گا یار۔"

"ابے یہ نہیں کرے گا، کسی اور کو بتا دے گا کہ شاہ عالم وہاں نظر آیا تھا۔ میں جیرے کو پہلے سے بتا دوں کہ فی الحال اپنا بوریا بستر گول کر لے وہاں سے۔ میں اب شاہ عالم نہیں ایک مفرور مجرم ہوں۔ ہر تھانے میں فوٹو ہے میری۔"

"مجھے تو کچھ اور ہی شک ہو رہا ہے قسم اللہ کی۔ کہیں تیری فوٹو اخبار میں تو نہیں چھپواری ہے دشمنوں نے۔ دشمنی میں ملک خدا بخش کے لواحقین سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ تھانہ کچہری سے زیادہ اپنی دولت، سیاسی اثر رسوخ اور طاقت پر بھروسا کرنے والے لوگ ہیں۔"

"اگر میں ایک بار ان سے مل سکتا تو۔"

"تو کیا؟ وہ تیری سننے سے پہلے تجھے گولی مینٹ گون کر دیں گے۔ ان کے لیے شک کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ وہ تجھے قاتل سمجھتے ہیں اور دلیل سے قائل نہیں ہو سکتے۔ تو یہ خیال چھوڑ دے پیارے اور کم سے کم تین مہینے کے لیے غائب ہو جا ورنہ مارا جائے گا۔"

میں نے کہا "یہ تو بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے یار۔ مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ شاہ عالم کی دولت جائداد رخشی کے حوالے کرنی ہے۔ یہ کام وکیل کے آفس میں ہی ہوگا۔ ایک مسئلہ شبنم کا بھی ہے۔"

"ابھی صرف اپنی فکر کر سالے اور کچھ نہیں تو اپنا تھوبڑا ہی بدل لے" رئیس نے کہا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا "ابے واہ۔ یہ ہوئی نا کام کی بات۔ میں حیران ہوں کہ یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا۔ میک اپ سے چہرہ بدل کے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔ بس اب تو مجھے چھوڑ کے جا اور پکڑا کسی بھروسے کے آدمی کو۔ میک اپ کے ایک سے بڑھ کر ایک ماہر موجود ہیں یہاں۔ اسٹیج پر فلموں میں اور ٹی وی اسٹیشن پر لیکن یہ معاملہ رازداری کا ہے۔"

رئیس نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "یار، تو سب مجھ پر چھوڑ دے۔ ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں کالے نہیں کیے ہیں۔"

"تو کیوں محاوروں کی ایسی تیسی کرتا ہے ابوجہل کی اولاد۔ بال دھوپ میں سفید کرنا صحیح محاورہ ہے۔"

"ابے رہنے دے۔ یہ محاورہ بھی غلط ہے۔ دھوپ میں آدمی کا رنگ کالا ہوتا ہے یا سفید" رئیس نے کہا "ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے یہ بال نزلے میں سفید نہیں کیے۔"

ایک بار پھر ہم رئیس خان کے عجیب و غریب نقشے والے گھر کی پچھلی گلی میں پہنچے۔ سامنے والے گیٹ پر اس کے چوکیدار تیس مار خان نے بھاری قفل ڈال دیا تھا اور ادھر سے دیکھنے والے کو "رئیس خانہ" ویران اور غیر آباد نظر آتا ہوگا۔ پچھلی گلی کا خفیہ راستے کی طرف کسی کا شک بھی نہیں جا سکتا تھا مگر حالات کے پیش نظر احتیاط لازمی تھی۔

رئیس نے پہلے گاڑی سے اتر کے دائیں بائیں دیکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور پھر دکان کے شٹر کو اوپر اٹھادیا۔ میں نے گاڑی کو اندر پارک کرنے تک اس کے تاریک شیشے نہیں اتارے۔ رئیس نے فوراً شٹر نیچے کردیا۔

گیراج کے پچھلے والے دروازے سے گزر کے ہم نیچے جانے والے زینے سے رئیس خانے کے زیرِ زمین اسٹور میں پہنچے۔ رئیس نے مجھے سمجھایا کہ سلائیڈنگ ڈور کیسے کھلتا ہے۔ "اب ہر وقت تو اپن تیرے ساتھ نہیں ہوں گے پیارے۔ اچھی طرح دیکھ لے ان راستوں کو۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "یہ بہت ضروری ہے۔"

تہ خانے کے دونوں بیڈ روم پوری طرح آراستہ تھے۔ کچن میں فریج بھی تھا اور کھانے پکانے کی ہر چیز وہاں موجود تھی۔ ایک کمرے میں فون اور ٹی وی کے ساتھ ڈش اور وی سی آر کے کنکشن نظر آرہے تھے لیکن زیرِ زمین ہونے کی وجہ سے کمروں میں شدید حبس تھا۔ اس کا علاج رئیس نے اے سی چلا کے کیا۔ دو ٹن کا اسپلٹ یونٹ پورے بیس منٹ کے لیے بہت کافی تھا۔ بس بجلی کا بریک ڈاؤن ہونے کی صورت میں یہ جگہ ناقابلِ رہائش تھی۔ یہاں جنریٹر نہیں لگایا جاسکتا تھا کیونکہ اس کا شور اوپر صاف سنائی دیتا۔

"اب میں جاتا ہوں یار۔ تو آرام سے بیٹھ یہاں۔"

میں نے کہا "رئیس۔ وہ لیپ ٹاپ کمپیوٹر کہاں ہیں جو تو نے خالد اور خادم سے چھینے تھے؟"

"وہ بھی رکھے ہیں" رئیس نے کہا۔

"اور ان کے ساتھ جو فلاپی ڈسکٹ تھی؟"

"وہ بینک کے لاکر میں ہیں۔ ان کے سارے کاغذات کے ساتھ۔"

"وہ سب یہاں لے آ" میں نے کہا۔

رئیس نے گھڑی دیکھی "ٹائم تو نہیں ہے مگر میں کوشش کرتا ہوں۔ آج نہیں تو کل ضرور لے آؤں گا۔"

میں نے کہا "اپنا موبائل فون دے جا مجھے۔ یہاں مجھے اور بھی کچھ چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔ پرنٹر چاہیے ایک۔ میں لسٹ بنادوں گا تجھے۔"

رئیس چلا گیا تو میں کچھ دیر بیڈ پر آرام سے لیٹ کر اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کسی عدالت سے مفرور اور مطلوب قرار دیے جانے تک کسی مجرم کی تصویر تھانوں میں نہیں لگائی جاسکتی تھی اور یہ ایک طویل عدالتی طریقہ کار تھا مگر جہاں قانون کو پوچھنے والا کوئی نہ ہو وہاں سب کچھ ہوسکتا ہے۔ رئیس کا یہ خیال بھی غلط نہیں تھا کہ خدا بخش مندرانی کے وارث میرے سب سے خطرناک دشمن ہوسکتے ہیں۔ ان کے لیے اپنے باپ کے قاتل کو خود مار دینا بھی آسان تھا اور اسے مروا دینا بھی۔ عملاً میں غالب کے اس شعر کی تفسیر بن گیا تھا۔ یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے۔ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں۔

لیکن میں واقعی حرفِ مکرر بن گیا تھا۔ میں نے دوسرے شاہ عالم کی زندگی اختیار کرکے سارے زمانے کی دشمنی مول لے لی تھی۔ میں ہر طرف سے جان کے طلبگار دشمنوں میں محصور ہوگیا تھا۔ ایک طرف پارٹی کے سازشی عناصر تھے۔ بے شک میں نے جمس اور قریشی کے حق میں پارٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے دستبرداری قبول کرلی تھی اور پارٹی ان کے حوالے کردی تھی مگر میرا وجود ان کے لیے سر پر لٹکنے والی تلوار کی طرح تھا۔ وہ پارٹی کے نائب صدر تیمور کو مارنے کے بعد چیئرمین کو ختم کیے بغیر مطمئن نہیں ہوسکتے تھے۔

دوسری طرف خادم عثمان اینڈ کمپنی کی صورت میں ایک مافیا میرے خلاف ہوچکی تھی۔ ملک سے نوادرات بیرونِ ملک اسمگل کرنے والے اس گروہ کی سرگرمیاں مجھ سے پوشیدہ نہ تھیں مگر ان کی طاقت کا مجھے اندازہ نہ تھا۔ ان کے سارے کاروباری راز میری تحویل میں آجانے سے مافیا کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا اور کوئی مافیا کسی ایک فرد کے ہاتھوں نہ بلیک میل ہوتی ہے اور نہ ختم ہوتی ہے۔ ان کے مقاصد سے انحراف کرنے والا یوں غائب ہوجاتا ہے جیسے وہ تھا ہی نہیں۔

تیسری طرف میرے دشمنوں کی زر خرید پولیس تھی جو مجھے کسی بھی بہانے گرفتار کرسکتی تھی اور کسی دشواری کے بغیر تفتیش کے دوران میں مجھے ہلاک کرسکتی تھی۔ ایسا نہ جانے کب سے ہو رہا ہے۔ کسی تفتیشی افسر پر آج تک کوئی الزام نہیں آیا۔ نام نہاد انکوائری میں بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مرنے والے نے خودکشی کی تھی یا اسے دل کا دورہ پڑا تھا کیونکہ وہ پہلے سے بیمار تھا۔

صرف چوتھی سمت میں میرے لیے پناہ تھی اور یہ واپسی کا راستہ تھا۔ مقابلہ اور وہ بھی بیک وقت تین طاقتور، خوں آشام اور سفاک دشمنوں سے۔ میرے بس کی بات ہی نہ تھی۔ میں نہ ہیرمین تھا اور نہ جیکی چن جیسا فلمی ہیرو کہ مار دھاڑ سے کشتوں کے پشتے لگادوں اور مجھے خراش تک نہ آئے۔ مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ اب شاہ عالم کے لیے زندگی کے امکانات معدوم ہوچکے ہیں۔ میں صرف ناصر عظیم بن کے زندہ رہ سکتا تھا بشرطیکہ میں اپنے اصل چہرے پر کوئی مصنوعی چہرہ سجالوں۔ ورنہ ناصر عظیم کو شاہ عالم سمجھ کے کوئی بھی قتل کرسکتا تھا۔ جب تک شاہ عالم اور ناصر عظیم کی

شخصیت اور شناسائی کے دائرے الگ تھے، ان کو ایک دوسرے سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ اپنی اپنی زندگی جی رہے تھے اور ان کی اپنی اپنی مصروفیات تھیں۔ کسی موقع پر بھی ایسا اتفاق نہیں ہوا تھا کہ کسی نے ان کی صورت کی مشابہت پر غور کیا ہو یا غلط فہمی میں ایک کو دوسرے کی جگہ سمجھا ہو لیکن اب شاہ عالم کی زندگی اور موت کے معاملات کو اتنی پبلسٹی مل چکی تھی کہ ناصر عظیم بھی گمنام اور روپوش نہیں رہ سکتا تھا۔

تاہم ناصر عظیم کے لیے اب اپنی پرانی شناخت رکھنے والی اصل زندگی کی طرف واپسی بھی آسان نہیں تھی۔ اس کا ثبوت مجھے قمر کی شادی میں شریک ہوکے مل گیا تھا۔ وہاں کوئی مجھے ناصر عظیم سمجھ کے پرانی اپنائیت دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ خان اعظم کی زندگی میری سمجھ میں آتی تھی۔ وہ بڑے تھے اور غصے میں مجھے تھپڑ بھی مار دیتے تو میں انہیں کچھ نہ کہتا۔ استاد اور باپ کا ایک سا درجہ ہے۔ وہ سو بار جائز بات پر ناراض ہوں گے تو ایک بار ناجائز بھی ہوں گے۔

افسوس مجھے چندا کے رویے پر تھا جس نے مجھے دیکھا اور ایسے نظرانداز کردیا جیسے میں کوئی اجنبی ہوں۔ بلاشبہ نام کی حد تک میں اجنبی تھا۔ میں شاہ عالم بن کے گیا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ میں ناصر عظیم کے رشتے اور حوالے سے آیا ہوں۔ وہ سب کے سامنے نہ سہی علیحدگی میں مجھ سے بات کرسکتی تھی اور قربت ملوا سکتی تھی۔

سوال اب یہ تھا کہ وہ پھر ناصر عظیم کو اپنی زندگی میں وہی مقام اور حیثیت دینے کے لیے رضامند ہوں گے جو ات پہلے حاصل تھا؟ وہ اخباروں میں سب پڑھ رہے ہوں گے کہ مجھے شاہ عالم بننے کی کیسی عبرت ناک سزا مل رہی ہے۔ میرا سب کچھ چھن گیا ہے۔ میرے نام کی عزت، میرا چیئرمین پی جے ایف کا منصب۔ میری دولت اور شان و شوکت، میرے حامی اور ساتھی۔ یہاں تک کہ میری نام کی بیوی بھی مجھے چھوڑ گئی تھی۔

اور یہ سب کچھ گنوانے کے بعد میں واپس آرہا تھا تو کیا اپنی خوشی سے آرہا تھا؟ نہیں۔ میں دھوبی کا کتا بن کے آرہا تھا۔ میں مجبور ہوگیا تھا کہ اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ جب میں نے شاہ عالم کی زندگی اختیار کی تھی تو اسے مجبوری کا نام دیا تھا۔ آج میں اس زندگی سے دستبردار ہو رہا تھا تو یہ بھی مجبوری تھی۔

میں جانتا تھا کہ میرے لیے روٹھوں کو منانا مشکل ہوگا ناممکن نہیں۔ بگڑے ہوئے بچے گھر سے بھاگ جاتے ہیں یا ناراض ہوکے چلے جاتے ہیں تو ان پر گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے کوئی بند نہیں کرسکتا۔ ماں باپ بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں اور بہن بھائی بھی۔

ابھی سہ پہر کے ڈھائی بجے تھے۔ مجھ پر یہ احساس مسلط ہونے لگا تھا کہ میرے لیے ایک قیدِ تنہائی کا عذاب شروع ہوگیا ہے۔ زمین کے نیچے دس فٹ کی گہرائی پر اس تہ خانے میں مدفون رہ کے میں یقیناً محفوظ تھا مگر اوپر کی دنیا میں میرے لیے کوئی چیلنج نہ تھی۔ ہر طرف موت کے فرشتے منڈلا رہے تھے اور قاتل گھوم رہے تھے۔ انہیں شاہ عالم کی تلاش تھی۔ وہ ایک بار مر کے زندہ ہوگیا؟ ہم اسے پھر مار دیتے ہیں۔

امید کا ایک سہارا رئیس نے فراہم کیا تھا۔ اگر وہ کسی فنکار میک اپ مین کو لے آیا تو شاید میں ایک بدلے ہوئے چہرے کے ساتھ تیسری شخصیت کے روپ میں.... انسانوں کی دنیا میں بے خوفی سے پھر سکوں۔ یہ تیسری شخصیت نہ شاہ عالم کی ہوگی اور نہ ناصر عظیم کی۔ اس کا نام بھی کچھ اور ہوگا اور زندگی کے سارے حوالے بھی جھوٹے ہوں گے۔

جھوٹ کا یہ سہارا۔ مصنوعی شخصیت کا یہ خول اور یہ دھوکا دینے والا بہروپ کب تک چلے گا۔ یہ روپوشی کب ختم ہوگی؟ واپس ناصر عظیم بننے کا مشکل مرحلہ کب تمام ہوگا؟ فی الحال ایسے کسی سوال کا کوئی جواب خود میرے پاس بھی نہیں تھا۔

مجھے کچھ بھوک محسوس ہونے لگی تو میں نے فریج کھول کے دیکھا۔ اس میں ملک پیک، کولڈ ڈرنک، کھانوں کے ٹن پیک اور بیئر سے شراب تک سب کچھ تھا اور یہ ایک آدمی کے لیے کم سے کم ایک ہفتے کا راشن تھا۔ روٹی یا ڈبل روٹی جیسی کوئی چیز فریج میں نہیں تھی۔ میں نے کچن کا جائزہ لیا تو وہاں آٹا تھا مگر اسے گوندھ کے روٹی پکانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چولھا جلا کے میں نے پانی ابلنے کے لیے رکھا اور اس میں ٹن پیک بریانی کا ڈبا اوپر سے کھول کے رکھ دیا۔ جب بریانی گرم ہوگئی تو میں نے پلیٹ میں نکالنے کا تکلف کیے بغیر ڈبے میں چمچہ ڈال کے کھائی اور ایک بوتل کوک کے ساتھ اپنا لنچ مکمل کیا۔

تین بجے میں نے شبنم کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ڈاکٹر عائشہ کو فون کیا۔ حسبِ عادت وہ بڑے دوستانہ انداز میں مجھ پر انگریزی میں خفا ہوئیں اور اس میں اردو بھی ملاتی رہیں۔

"ویری بیڈ شاہ جی۔ آپ کہاں ہیں اور واٹ از دا ٹل دس؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

"ڈیئنگ مین' بات معافی کی نہیں EXPLAIN- نیوز پیپرز میں کیا نان سنس PRINT ہو رہا ہے تمہارے بارے میں۔"

میں نے کہا "اخبار والے خبریں دیتے ہیں تو یہ ان کا کام ہے۔"

"لیکن میرے لیے پرابلم بن گیا شبنم سے چھپانا۔"

"پھر کیسے چھپایا آپ نے؟ جھوٹ بول کے؟"

"I MAD TO LIE میں نے کہا کہ آج اخبار والا ہی نہیں آیا مگر مجھے شرمندگی ہوئی' کسی نے اسے بتادیا کہ اخبار سب آئے تھے۔ وہ بہت UPSET ہے۔ تم اس کو CONSOLL کرو۔ بلکہ آجاؤ IMMEDIATELY-"

میں نے کہا "سوری ڈاکٹر۔ میں ایسی جگہ ہوں کہ ابھی آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ تم میری بات کرادو اس سے۔ میں اسے سمجھادوں گا۔ ویسے وہ کیسی ہے؟"

"SHE IS FINE- اگر کوئی اسے PROPERLY گھر میں ATTEND کرے تو سب سے بہتر۔ یہاں اسپتال کا ATMOSPHERE ہے۔ کسی HEALTHY اور نارمل شخص پر بھی PSYCHOLOGICAL اثر رہتا ہے"

میں نے کہا "اس کے لیے سب سے مناسب جگہ آزاد صاحب کا گھر ہے۔ شبنم ان کے لیے بیٹی کی طرح ہے۔"

چند منٹ کے بعد شبنم نے کہا "ہیلو۔"

مجھے اس کی آواز میں وحشت سے زیادہ خوف محسوس ہوا "ہیلو ڈیئر۔ کیا حال ہے مزاج یار کا؟"

"عالی۔ تم کہاں ہو آخر۔ یہ کیسی خبریں مل رہی ہیں مجھے؟"

میں نے کہا "دیکھو' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بالکل خیریت سے ہوں۔ مجھ پر یقین کرو۔"

"یقین تب کروں گی جب تم آؤ گے۔ خود آکے بتاؤ گے مجھے کہ آخر یہ چکر کیا ہے۔ کیا واقعی تم نے۔"

"شبنم۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے خلاف کیا چکر چلا رکھا ہے میرے دشمنوں نے" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"خدا بخش مندرال کے قتل کا الزام کیسے آگیا تم پر؟"

"یہ سب میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ یہ الزام بے بنیاد ہے لیکن میرے لیے اپنی بے گناہی ثابت کرنا بہت مشکل ہے اور اسی لیے میں تم سے ملنے نہیں آسکتا۔"

"تم گرفتاری سے ڈرتے ہو؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے۔ بڑی مشکل سے خادم اور عثمان کے دہرے قتل کا الزام ختم ہوا تھا۔"

"کسی وکیل سے بات کرو۔ ضمانت قبل از گرفتاری کراؤ۔"

میں نے کہا "ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے جج کے سامنے خود پیش ہونا پڑتا ہے۔ اور اس کیس میں ضمانت کا بھی کوئی امکان نہیں۔"

"لیکن ایسے تم کب تک روپوش رہ سکتے ہو۔ اگر تم بے گناہ ہو تو کہیں یہ بات عدالت میں ثابت کرنی پڑے گی۔ تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت ہے عالی۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور میرے ساتھ آزاد صاحب ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ پورا پریس میری بیک پر ہوگا۔ وکیل بھی بہت ہیں لیکن میں گرفتاری نہیں دے سکتا۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے۔ حراست میں قتل کردیں گے۔ یہی ہوتا ہے یہاں۔"

"تم باہر چلے جاؤ۔"

"اب وہ بھی مشکل ہے۔ میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل ہوگا۔ میری تصویر ہر پولیس اسٹیشن کو دے دی گئی ہے غیر قانونی طور پر۔"

"اخباروں میں فرنٹ پیج پر اشتہار کی قیمت دے کر خبر کے ساتھ تمہاری تصویر لگوائی ہے۔ مندرال کی فیملی نے۔"

"پھر تم ہی سوچو کہ میں اور کیا کرسکتا ہوں۔ میں نے اپنی بے گناہی کے ثبوت حاصل ہونے تک روپوشی کا فیصلہ کیا ہے' مکمل روپوشی۔"

"تم فکر مت کرو۔ ثبوت میں حاصل کروں گی" اس نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"مجھے پورا بھروسا ہے تم پر۔"

"مجھ سے کب ملو گے عالی؟" اس نے کہا۔

"اگر تم ٹھیک ہو تو آزاد صاحب کے ساتھ چلی جاؤ۔ انہی کے گھر میں رہو۔ میں موقع ملتے ہی وہاں آؤں گا۔ اور ایک کام کرو۔"

"کیا کام ہے' بتاؤ؟"

میں نے کہا "وطن فروشوں کا ایک گروہ بہت عرصے سے چپکے چپکے اس ملک کے عجائب خانوں سے تاریخی حیثیت کے نوادرات باہر بھیج رہا ہے۔"

"ایسی کچھ خبریں دیکھی ہیں میں نے بھی۔"

"تم ایسی سب خبریں جمع کرو۔ مختلف اخباروں سے۔ ان خبروں پر کچھ قانونی کارروائی بھی شروع ہوئی تھی مگر ظاہر

ہے بعد میں معاملہ دبادیا گیا۔ وہ کیا فرماتے ہیں گویا بزبان فارسی کہ۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ گاؤ را قصاب برد قصاب ہم مرد۔ مطلب اس کا کچھ یوں ہوا عزیزہ کہ فائل کو کھا گئی گائے' گائے کو لے گیا قصاب اور قصاب بھی اللہ کو پیارا ہوگیا۔ تحت باخیر گزرا۔"

آزاد صاحب کی نقل پر وہ ہنسی پھر اس نے کہا "کیا بات ہے؟"

لیکن صاف ظاہر تھا کہ یہ سوال اس نے مجھ سے نہیں کیا تھا۔ اس کے لہجے میں خوف تھا اور تشویش تھی پھر میں نے اس کی اونچی آواز سنی "کون ہو تم لوگ؟ کیا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "شبنم کیا ہوا۔ ہیلو!"

مگر مجھے ریسیور میں اس کی ایک چیخ سنائی دی "چھوڑو مجھے۔" وہ دوبارہ چلائی "عالی۔ عالی!" پھر اس کی آواز دور ہوتی گئی۔

میں نے چلا کے کہا "شبنم۔ شبنم!"

ریسیور میں خاموشی اور سرسراہٹ سنائی دیتی رہی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کریڈل پر نہیں رکھا گیا ہے۔ لائن ابھی تک ملی ہوئی تھی۔

شبنم کی چیخ و پکار سے میرے تصور میں ایک ہی تصویر ابھرتی تھی کہ وہ مجھ سے فون پر باتیں کرنے میں منہمک تھی اور اسے کسی کے قریب آنے کا پتا بھی نہیں چلا یا اسے یہ شک نہیں ہوا کہ وہ اسے پکڑ کے زبردستی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ شک ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ فون ڈاکٹر عائشہ کے آفس میں ہوگا اور وہ اخلاقاً شبنم کو اکیلا چھوڑ گئی ہوگی تاکہ وہ اطمینان کے ساتھ مجھ سے کچھ کہنا سننا چاہے تو اسے کسی اور کی موجودگی کے احساس سے جھجک اور بے سکونی محسوس نہ ہو مگر آفس میں کسی کے آنے جانے پر پابندی نہیں تھی۔

میں نے پریشانی میں کئی بار وہی نمبر ڈائل کیا مگر جواب میں مجھے بزی کی ٹون کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ ریسیور الگ پڑا تھا یا شاید تار سے لٹکا ہوا جھول رہا تھا اور کسی کو بھی وہاں پیش آنے والے واقعات کا پتا ہی نہیں تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کروں۔ میرے پاس کلینک کا دوسرا فون نمبر بھی نہیں تھا۔ میں نے انکوائری سے پوچھا تو وہاں سے بھی یہی نمبر دیا گیا۔

میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی کوئی فون ہے؟"

آپریٹر نے کہا "نو سر!" اور لائن کٹ گئی۔

جو سوال بار بار میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا وہ بڑا اذیت ناک تھا۔ کیا شبنم کو کلینک سے اغوا کرلیا گیا تھا؟ اگر ایسا تھا تو اسی سے منسلک دوسرا سوال یہ تھا کہ کس نے اغوا کیا ہے اور کیوں؟

وہ ایک خاموش اور پرسکون سی کوٹھی میں واقع پرائیویٹ کلینک تھا جہاں مخصوص لوگ آتے تھے۔ وہاں سرکاری اسپتالوں والی بھیڑ نہیں ہوتی تھی جس میں مریضوں یا تیمارداروں اور اسپتال کے عملے سے زیادہ غیر متعلقہ افراد شامل ہوں۔ فقیروں سے لے کر اخبار اور پھلوں کی چاٹ بیچنے والوں تک اور بوٹ پالش سے تیل مالش کرنے والوں تک۔

ڈاکٹر عائشہ کے کلینک میں وہی جاتے تھے جن کا کوئی عزیز' رشتے دار یا دوست کسی نفسیاتی عارضے کے باعث وہاں داخل ہو اور وہاں مریضوں کی تعداد ہی بہت محدود تھی۔ شبنم کے بارے میں بھی معدودے چند افراد ہی جانتے تھے کہ وہ وہاں زیر علاج ہے۔ میرے علاوہ یہ بات آزاد صاحب کے علم میں تھی۔ رئیس جانتا یا شاید رخشی کو اور کسی کو معلوم ہوگی۔

شبنم جیسی سرپھری صحافی نے اپنی پیشہ ورانہ حق گوئی' بے باکی سے نہ جانے کتنے پردہ نشینوں کو بے نقاب کرکے ان کا اصل چہرہ دنیا کو دکھایا ہوگا۔ رازہائے درون مے خانہ فاش کرکے نہ جانے کتنے زاہد اور پارسائی کے دعوے داروں کو رندی و بلانوشی کی خبر عام کی ہوگی۔

صرف صحافی پر منحصر نہیں' ہر طبقے اور پیشے میں انسان دہرے معیاروں کے دہرے تضادات والے مسلک کی پیروی کرتے ہیں۔ ایک وہ جو مصلحت کے تحت کسی بھی معاملے میں مصالحت کرسکتے ہیں اور دوسرے وہ جو اصولوں پر سودا کرنے سے جان دینا بہتر سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس دوسرے مسلک پر ایمان رکھنے والے ہمیشہ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں اور جیسے جیسے مادیت کی قدریں فروغ پاتی ہیں ایسے لوگ کمیاب ہوتے جارہے ہیں۔

شبنم کا شمار انہی لوگوں میں کیا جاسکتا تھا جن کے نزدیک سچائی کی اہمیت اپنی زندگی سے زیادہ تھی۔ چنانچہ اس نے دشمن زیادہ بنائے تھے۔ اس کی جرأت اور سرفروشی کی داد دینے والے کم نہ تھے مگر وہ اسے کوئی تحفظ نہیں فراہم کرسکتے تھے۔ ایسے صحافی دنیا بھر میں اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں۔ وہ اغوا بھی کیے جاتے ہیں۔ قید و بند کی صعوبت بھی جھیلتے ہیں اور قتل بھی ہوتے ہیں۔

یہ ناممکن نہیں تھا مگر اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ کہیں اسے شاہ عالم کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے اغوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہ کیا گیا ہو۔ اس کی شاہ عالم کے ساتھ دیوانگی کی حد تک جذباتی وابستگی سب پر عیاں تھی۔ یہ ایک ایسا جرم تھا جس کا اعتراف وہ احباب واغیار سب کے سامنے کسی احساس ندامت کے بغیر کرتی تھی۔ اس کے نزدیک یہ کوئی جرم یا گناہ کی اور معیوب بات ہی نہیں تھی' محبت کا کیا ہے' کسی سے بھی ہوسکتی ہے اور محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس میں کسی کی عمر یا رنگ اور نسل سے کیا فرق پڑتا ہے اور اس کا شادی سے بھی کیا تعلق۔

رئیس کا موبائل فون میرے پاس تھا۔ میں اس سے رابطہ نہیں کرسکتا تھا۔ میں پولیس کو بھی مفروضے کی بنا پر اطلاع نہیں دے سکتا تھا کہ دوڑو' فلاں جگہ سے فلاں کو اغوا کرلیا گیا ہے۔ اول تو وہ ہر کس وناکس کے فون پر دوڑتے نہیں۔ وہ پہلے پوچھتے ہیں کہ آپ کون ہو اور آپ کو یہ الہام جیسے ہوا' بالفرض محال اور بحالت مجبوری انہیں ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے جائے واردات تک جانا ہی پڑے تو وہ اس وقت پہنچتے ہیں جب سانپ نکل جاتا ہے اور پیٹنے کے لیے لکیر کا سراغ بھی نہیں رہتا۔

اگر شبنم کو واقعی کسی نے میرا پتا پوچھنے کے لیے اغوا کرلیا ہے تو پھر پولیس آکے کیا کرے گی۔ ایسی صورت میں تو کسی کے بھی کرنے کے لیے کچھ نہیں رہتا۔ اس کا سراغ لگانے کے لیے خود شرلاک ہومز زندہ ہوکے پہنچ جائے تو اسے بھی وقت بہرحال درکار ہوگا اور وقت بہت گزر چکا تھا۔ اب کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ ایک مرد کے پاس ہارنے کے لیے زندگی ہوتی ہے مگر عورت کے پاس جان کے ساتھ آبرو بھی ہوتی ہے۔

یہ ہوسکتا ہے کہ ایک گمنام کال کے ذریعے آزاد صاحب تک یہ مطالبہ پہنچادیا جائے کہ شاہ عالم خود کو ہمارے حوالے کردے تو شبنم کو چھوڑ دیا جائے گا۔ آزاد صاحب یہ مطالبہ ایک اطلاع عام کی صورت میں صفحہ اول پر شائع کردیں اور ہونے کو یہ بھی عین ممکن ہے کہ اب تک اس بے جان جسم کہیں پھینک دیا گیا ہو یا چند دن بعد کسی ہوس کی اجتماعی قربان گاہ سے روندا ہوا بے آبرو اور داغ داغ جسم واپس کردیا جائے۔ کہ۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

رفتہ رفتہ میری وحشت اس انتہا کو پہنچ گئی کہ میں نے سارے خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے خود ڈاکٹر عائشہ کے کلینک جانے کا فیصلہ کیا۔ میں بڑی تیزی سے چور دروازوں اور خفیہ راستوں سے گزر کے اس گیراج تک پہنچا جہاں گاڑی کھڑی رہتی تھی اور شٹر اٹھانے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ باہر سے مقفل ہے۔

رئیس نے مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے عملاً مجھے قید کردیا تھا۔ اس کی نیک نیتی اور خلوص کا یہ مظاہرہ اس وقت مجھے دشمنی سے زیادہ گراں گزرا میں اسے گالیاں دیتا ہوا واپس آیا اور سوچنے لگا کہ اب کس سے کہوں کہ وہ جاکے شبنم کا حال دریافت کرے۔

مجھے رخشی کے گھر کا نمبر یاد نہیں تھا۔ اس آفس کا فون نمبر معلوم نہیں تھا جہاں سابق انسپکٹر فرید عباسی اپنے کزن فیصل کے ساتھ پریکٹس کے لیے بیٹھنے لگا تھا۔ مجھے آزاد صاحب کا خیال آیا تو یہ احساس بھی ہوا کہ پریشانی سے میں بدحواس بھی ہوں ورنہ سب سے پہلے تو مجھے آزاد صاحب کو ہی یہ بات بتانی چاہیے۔

میں نے ان کے اخبار کے دفتر فون کیا۔ غالباً کاتب جواہر رقم لال دین نیرنگ نے ریسیور اٹھایا۔ جواہر رقم کا لقب انہوں نے خود اپنی خوش نویسی سے متاثر ہوکے اختیار کیا تھا۔ لال دین اصل نام تھا اور وہ نیرنگ تخلص فرماتے تھے چنانچہ آزاد صاحب ان کو جواہر لال نہرو کہتے تھے مگر صرف غصے میں۔ عام طور پر تو انہیں میاں تو رنگ کے نام سے بلاتے تھے۔

میرے سوال پر کاتب نے کہا "آزاد۔۔۔ کون آزاد۔۔۔ ہم سب آزاد ہیں۔ پاکستان ایک آزاد ملک ہے اور ہم اس کے آزاد شہری۔ بول کہ لب آزاد ہیں تیرے۔"

میں نے جھنا کے کہا "تم نے بھنگ پی رکھی ہے۔ جواہر لال نہرو کی اولاد۔ میں ابوبکر صاحب کو پوچھ رہا ہوں۔ تمہارے چیف ایڈیٹر۔"

"وہ۔۔۔ اچھا۔۔۔ وہ ہوں گے اپنے مدفن میں" وہ بولا "اور دیکھو یہ بھنگ پیتے ہیں ملنگ اور مجذوب" اس نے ترنگ میں کہا۔

"ان کے گھر کا فون نمبر بتادو ورنہ وہاں آکے سارا نشہ ہرن کردوں گا" میں نے غصے میں کہا۔

اس نے نمبر بتا کے کہا "یہ ہرن کا ذکر کہاں سے آگیا۔ کیا ہم شکار کی بات کررہے تھے؟"

میں نے فون بند کرکے آزاد صاحب کے گھر کا نمبر ملایا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی۔ وہ غالباً گدھے گھوڑے سب بیچ کے سو رہے تھے۔ رات بھر جاگنے والی اخبار نویس مخلوق کے لیے وقت کا سارا نظام الٹا ہوتا ہے۔ ان کے لیے دن ہوتا ہے

رات اور رات ہوتی ہے دن۔

میں نے کچھ دیر بعد ریسیور رکھ دیا اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پیا تو مجھے عقل کی ایک اور بات سوجھی۔ میں نے انکوائری سے ڈاکٹر عائشہ کا نمبر پوچھا۔ ظاہر ہے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں اس نام کی درجنوں خواتین ہوں گی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ان کے گھر کا فون ان کے شوہر کے نام پر ہو۔ آپریٹر نے مجھ سے پتا پوچھا تو میں نے کلینک کا پتا بتادیا۔

مسئلہ فوراً حل ہوگیا۔ مجھے ڈاکٹر عائشہ کے گھر کا نمبر مل گیا۔ میں نے فون کیا تو کسی نوکر نے اٹھایا۔ اس نے کہا کہ وہ آفس میں ہیں۔

میں نے کہا "آفس کا فون خراب ہے شاید۔ تم لپک کے جاؤ اور انہیں بتاؤ۔ یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"اچھا جی۔ کس کی زندگی اور موت کا؟"

میں نے دہاڑ کے کہا "تمہاری۔ جاؤ ورنہ میں منتر پڑھ کے پھونک دوں گا فون میں۔ بھسم ہوجاؤ گے' شاہ عالم ہے میرا نام۔"

وہ غالباً کالے علم پر یقین رکھتا تھا کہ ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے حساب لگایا کہ اسے پیغام پہنچانے میں دو منٹ سے زیادہ نہیں لگ سکتے کیونکہ ڈاکٹر عائشہ کی رہائش بھی کلینک کے ایک حصے میں تھی۔

پانچ منٹ بعد ان کا ریسیور صحیح رکھا جاچکا تھا۔ گھنٹی بجتے ہی ڈاکٹر عائشہ نے ریسیور اٹھالیا۔ "تھینکس گاڈ۔ یہ تم ہو' سرونٹ نے مجھے کہا کہ کوئی جناتی بابا شاہ عالم ہے۔ تم آجاؤ فوراً۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ۔ شبنم کہاں ہے؟"

انہوں نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا "تم آؤ گے تو میں بتاؤں گی پوری بات۔"

"کیا ہوا ہے شبنم کو؟" میں نے چلا کے کہا۔

"SOMETHING VERY SERIOUS HAS HAPPEND"

میں نے کہا "مجھے کچھ اندازہ ہے۔۔۔ وہ مجھ سے بات کررہی تھی جب کسی نے اسے اغوا کرلیا۔"

"اغوا۔۔۔ یعنی KIDNAP۔ یہ کس نے بتایا تمہیں؟"

"کیا یہ غلط ہے؟"

"ون ہنڈرڈ پرسنٹ۔ وہ یہاں ہے۔"

"جھوٹ مت بولیں ڈاکٹر عائشہ!"

"واٹ نان سنس۔ ینگ مین! تم INSULT کررہے ہو میری۔ میں جھوٹ کو کسی حالت میں جائز نہیں سمجھتی"

انہوں نے خفگی سے کہا "یہاں آکے دیکھ کیوں نہیں لیتے اسے۔ وہ سو رہی ہے ورنہ میں اسے بلا کے کہتی کہ تم سے بات کرے۔"

میں نے کہا "سوری ڈاکٹر عائشہ! میں ذرا اپ سیٹ تھا۔ مجھے فون پر شبنم سے بات کرتے ہوئے ایسا لگا۔ اس کی چیخ پکار سے۔ جیسے کوئی اسے زبردستی اغوا کرکے لے گیا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ یہ ہوا۔ یہاں ایک شخص اس پر عاشق ہوگیا تھا۔ کل اس نے کمرے میں جاکے اظہار محبت کیا اور شبنم سے کہنے لگا کہ مجھ سے شادی کرلو۔" ڈاکٹر صاحبہ نے انگریزی میں بتایا "ظاہر ہے شبنم نے اسے بے عزت کرکے کمرے سے نکال دیا۔ آج وہ آفس میں فون پر تم سے بات کررہی تھی کہ وہ پہنچ گیا اور اس نے زبردستی کی۔ شبنم کے شور پر اسٹاف آگیا۔۔۔ میں پہنچ گئی۔"

"کون تھا وہ الو کا پٹھا!" میں نے کہا۔

"ایسا مت کہو۔ وہ ذہنی طور پر نارمل ہوتا تو ایسی حرکت کرتا؟ تمہیں یاد ہوگا ایک دن کمرے میں دو افراد کھلونا پستول لے کر آگئے تھے؟"

"مجھے یاد ہے ایک شرلاک ہومز بنا ہوا تھا دوسرا ڈاکٹر واٹسن۔"

"رائٹ۔ تو محبت ہوئی تھی شرلاک ہومز کو۔ اس کی مدد کے لیے ڈاکٹر واٹسن ساتھ گیا۔ بعد میں انہوں نے کہا کہ ہم شبنم سے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔ وہ غالباً کسی اور کو چاہتی ہے۔ میں نے بتایا کہ اس کی تو شادی ہوچکی ہے اور اس کا شوہر شاہ عالم ہی اسے یہاں لایا تھا۔ روز اس سے ملنے آتا ہے۔"

"او مائی گاڈ۔ یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔"

"بھئی ضروری تھا۔ وہ بہت ڈرے ہوئے ہیں اور اپنے کمرے سے باہر آنے پر تیار نہیں۔ شبنم کو میں نے سمجھا کے دوا دی اور سلادیا۔ اب تم فوراً آجاؤ۔"

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحبہ! میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ ہی سمجھ سکتی ہیں میری بات کو۔ میرے حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ میں روپوشی پر مجبور ہوں۔ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو یہ بات یقینی ہے کہ مجھے قتل کردیا جائے گا۔"

"DONT SAY THAT" انہوں نے بے یقینی سے کہا۔

میں نے مختصراً انہیں ساری بات سمجھائی "اب آپ ایک کام کریں۔ آپ شبنم کو بتائیں کہ میں آیا تھا اور میں نے یہ سب بتا کے کہا کہ شبنم سے رابطہ رکھنا فی الحال ممکن نہیں۔ میں آزاد صاحب سے رابطہ رکھوں گا اور کسی سے نہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی جان بچانے کے لیے ایک طویل روپوشی بہت ضروری ہے۔ جب تک میرے خلاف مقدمات کا طوفان ختم نہیں ہوتا اور میرے دشمن مجھے بھول نہیں جاتے' میں غائب رہوں گا۔"

"لیکن تم رہو گے کہاں؟ میرا مطلب ہے شبنم سے تمہیں خود کو چھپانے کی کیا ضرورت ہے' وہ مدد کرے گی تمہاری۔"

میں نے کہا "میرے ساتھ رہنے میں اس کی جان بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ مجھ سے ملتی رہے گی تو کسی دن اس کے پیچھے لگ جائے گا کوئی۔ لوگ اس کے اور میرے تعلق کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ وہ بھی مجھ سے بے تعلق رہے۔ رہی میری مدد کی بات تو وہ فیلڈ میں رہ کے زیادہ مدد کر سکتی ہے میری۔ میں اس سے ملوں گا نہیں۔ اس سے رابطہ رکھوں گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ایسے کب تک چلے گا لیکن بالآخر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ اسے تسلی دیں کہ بالکل پریشان نہ ہو۔"

انہوں نے کہا "اوکے ینگ مین۔ AS YOU SAY"

شبنم کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے سکون کے ساتھ اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ وہ اپنی اصل زندگی کی جانب واپسی کے سفر کا آغاز تھا اور میرے لیے اس خیال میں ایک بڑی جاں فزا طمانیت تھی کہ کسی بڑی خرابی میں ناقابلِ تلافی نقصان کے بغیر میں حالات کے اس جان لیوا دلدل سے نکل آیا جس میں کچھ مجبوری اور کچھ اپنی کوتاہ اندیشی کے باعث میں نے اپنی زندگی کا تقریباً ایک سال گنوا دیا تھا۔

ناصر عظیم سے شاہ عالم بننا کوئی اختیاری فعل نہیں تھا۔ خود میں ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا مگر تیمور نے میرے خلاف سازش کا جو تانا بانا بُنا تھا وہ بہت مضبوط تھا اور میں اس جال میں گرفتار ہونے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ خود تیمور کے لیے اصل شاہ عالم کی جگہ مجھے لانا بقا کی جنگ کا ایک حصہ تھا۔ اس کے پیشِ نظر ذاتی مفادات بھی تھے اور اپنے سیاسی مستقبل کا تحفظ بھی۔ اس نے ایک جوا کھیلا تھا جس میں پانسہ اس کی مرضی سے اس کے حق میں نہیں پلٹا اور وہ خود بھی اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوتا چلا گیا۔ اس کے مخالف کتنے طاقتور ثابت ہوں گے' تیمور کو اندازہ نہ تھا اور بالآخر یہ اندازوں کی غلطی ہی اسے مہنگی پڑی۔ وہ زندگی کی بازی بھی ہار گیا۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم۔

میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا رہا۔ میری توقعات میرے اپنے اندازوں کے غلط ہو جانے سے پوری نہ ہو سکیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اپنی ہمت اور ذہانت سے میں شاہ عالم کی زندگی جی کے بھی دکھاؤں گا۔ یہ کیا مشکل کام ہے۔ ایک ایکٹر کی طرح مجھے صرف سچویشن کے مطابق اداکاری ہی کرنی ہے۔ جو مجھے بلیک میل کرنے کا سوچ رہے ہیں اور نقلی شاہ عالم کو کسی کٹھ پتلی کی طرح اشاروں پر چلا کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں' انہیں بالآخر اپنے عزائم میں ناکامی اور شکست کا سامنا ہوگا اور انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک شاہ عالم ان کے لیے عذاب تو دو سرا اس سے کہیں بڑی بلا ہے۔ بوتل سے باہر آ جانے کے بعد جن ان کے قابو میں نہیں رہا اور اب الٹا ان پر سوار ہے۔ اس جن کو اتارنا کسی عامل کے بس کی بات نہیں۔

مجھے پورا یقین تھا کہ میں شاہ عالم بن سکتا ہوں اور ایسے کہ دیکھنے والوں کو پتا ہی نہیں چلے گا کہ پتا بدل گیا ہے۔ جیسے مداری سب کے سامنے کھیل دکھاتا ہے اور بھلی آنکھوں سے دیکھنے والوں کو دل کے بادشاہ کی جگہ چڑیا کا غلام نظر آنے لگتا ہے اور ٹبلے پہ دہلا۔ انکار کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے ذلت و رسوائی اور جان کے خوف سے شاہ عالم بننے کا چیلنج قبول کر لیا۔ اس عزم کے ساتھ کہ میں مداری کا کھیل دکھا سکتا ہوں۔ شاہ عالم کا نام اور اس کی زندگی کا کردار قبول کرنے کے باوجود میں رہوں گا وہی ناصر عظیم۔ بالکل اسی طرح جیسے دلیپ کمار کوئی بھی کردار کرے رہتا یوسف خان ہی ہے۔

یہ میری غلط سوچ تھی۔ میری سوچ میں دور اندیشی کا فقدان تھا یا بے وقوفی کی حد تک بڑھی ہوئی خود اعتمادی سے پیدا ہونے والی خوش فہمی جس نے مجھے ۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق۔ والی بات پر اکسایا اور میں نے جو بنیادی حقیقت نظر انداز کر دی.... یہ تخلیق نہیں ظلل ہے دماغ کا۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے کہ ۔ آج بھی ہو براہیم کا ایماں پیدا۔ آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا۔

تو آتشِ نمرود میں کودنے سے پہلے مجھے اتنا تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یہ براہیم کا ایماں نہیں خود فریبی کا طلسم ہے۔ میرے لیے آگ کبھی پھول نہیں بن سکتی مگر اس وقت جوشِ جنوں میں مجھے کچھ نہ سوجھا اور میں وہ کام کرنے پر تل گیا جو میرے بس کا نہ تھا۔ عملاً کسی کے لیے بھی ممکن نہیں کہ وہ کسی اور کی زندگی گزار سکے۔ میں نے اس خوش فہمی کے غرور کا خمیازہ بھگتا کہ..... کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ آدمی سب کچھ نہیں کر سکتا۔ نعوذ باللہ وہ خدا تو کیا فرشتہ بھی نہیں بن سکتا۔ چاند کو زمین پر نہیں لا سکتا اور آسمان کو نہیں چھو سکتا۔ وہ تو اتنا کمزور بے اختیار ہے کہ ہوا کو مٹھی میں نہیں روک سکتا۔

جو ہوا سو ہوا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تقدیر میں بھی تھا اور زندگی ایسے ہی عملی سبق سکھاتی ہے۔ اب میں اسے اپنی خوش قسمتی شمار کر سکتا تھا کہ میں اپنی اصل زندگی پھر اپنانے کے لیے حالات کی ساری زنجیریں توڑنے میں کامیاب ہوا۔ ناصر عظیم اپنی شخصیت پر مسلط ہو جانے والے شاہ عالم کے مصنوعی خول کو اتار پھینکنے میں کامیاب ہوا اور نہ یہ بھی ممکن تھا کہ جیسے وہ شاہ عالم ہونے کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہوا تھا ایسے ہی اسے شاہ عالم بن کے مرنا پڑتا۔

ابھی میں کامیابی کے دعوے پر خوش ہونے کا حق بھی نہیں رکھتا تھا۔ ابھی میں نے بعد از خرابی بسیار یہ سمجھ لیا تھا کہ میں ناصر عظیم کبھی شاہ عالم نہیں بن سکتا تھا۔ میرے لیے سلامتی اور عافیت اسی میں ہے کہ میں شاہ عالم کے چہرے کا ماسک بھی اتار کے پھینک دوں اور ناصر عظیم ہی رہوں مگر میرا یہ طے کر لینا ہی کامیابی نہیں تھا' تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ۔ یہ واپسی بھی شاید اتنی آسان نہ ہو۔ قلابازی کھانے کے بعد الٹی قلابازی کھانا کہیں زیادہ مشکل ہوتا ہے۔

اس کے باوجود اس تہ خانے میں جہاں میں خود کو ناصر عظیم سمجھنے کے لیے ذہنی طور پر پوری طرح تیار تھا' میرے لیے سکون تھا۔ میرے لیے اس احساس میں سکون تھا کہ میں ایک مصنوعی اور جعلی زندگی کے پُرعذاب جہنم سے نکل آیا اور تقدیر نے یاوری کی تو میں جس پُرخطر راہ پر چل پڑا تھا اس پر واپسی کے خطرات پر بھی قابو پا لوں گا۔ شاہ عالم بننا ناممکن کام تھا پھر ناصر عظیم بننا ناممکن نہیں۔ صرف مشکل کام ہے۔ جیسے کسی پرانے چھوڑے ہوئے گھر کو پھر آباد کرنے کے لیے قابلِ رہائش بنانا۔ جسے جلاوطنی کی زندگی گزار کے واپس آنے والا اس حال میں پائے کہ اس کے بام و در پر خستہ حالی اور ویرانی کا آسیب مسلط ہو۔ گرد و غبار اور خس و خاشاک کا ڈھیر ہو۔ دیواروں کا پلستر جھڑ رہا ہو اور رنگ و روغن غائب ہو چکا ہو۔ دہلیزوں کو دیمک لگی ہو اور بند کمروں میں پرندوں سے زیادہ بھوتوں کا بسیرا نظر آتا ہو۔ اسے پھر اپنی اصل حالت میں لانے کے لیے صرف خواہش کی طلسمی چھڑی گھمانا یا جادو کے بول کافی نہیں ہو سکتے۔ اس کے لیے وقت چاہیے اور وقت سے زیادہ لگن کا جذبہ چاہیے پھر وہ گھر ماضی کے تصور جیسا بھی ہو سکتا ہے۔

اپنے طور پر ایک فیصلہ کر لینے کے بعد یہ آسان نہ تھا کہ میں خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور کہوں کہ جنابِ السلام علیکم۔ میں ہوں آپ کا پرانا ناصر عظیم۔ جنگ مار کے بدھو واپس گھر لوٹ آیا ہے اور چندا کے سامنے سر جھکا کے عرض کروں کہ میں تمہارا وہی پرستار ہوں اور میری استدعا ہے کہ رشتۂ وفا کو پھر وہیں سے استوار کر دو جہاں سے ٹوٹا تھا۔ بقول فلمی شاعر۔ جانیں سکتا کبھی شیشے میں بال آیا ہوا۔ ان کے لیے بھی مجھے معاف کرنا اتنا آسان نہ ہوگا اور ایک سال کے زخموں کے مندمل ہو جانے میں نہ جانے کتنے سال لگیں گے۔ نشان تو پھر بھی رہیں گے۔ یادوں کے نقش مٹانے سے کہاں مٹتے ہیں۔

یہ سوچتے سوچتے کہ مجھے پہلے کیا کرنا ہے پھر کیا کرنا ہوگا اور اس کے بعد کیا ہوگا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی اور مجھے اس نیند سے شام ڈھلنے کے بعد رئیس نے جگایا۔ اس نے میری ناک پر دھاگے کی بتی گھمائی۔

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا "تو آ گیا؟ مجھے یہاں تالے میں بند کر گیا تھا؟"

"ہاں اور آئندہ بھی ایسے ہی ہوگا پیارے" وہ بولا اور صوفے پر گر گیا "آج تو بڑی تھکن ہو گئی۔ یہ دن ہی منحوس

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پراسرار اور خوفناک ناول

ساحر جمیل سیّد

راکھشس

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔
وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔
سرکٹا جسم کس کا تھا؟ ٹکڑے انگاروں سے جسم لینا اس کا مقدر تھا۔
ایک ایسے کیریکٹر کی سنسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

قیمت 125.00 روپے

اپنے بک سیلر یا اپنے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز ۴۰ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور ٹ 7247414

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔"

"کیوں؟ کام نہیں ہوا کوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "رکھے نا یار۔ وہ سالا تھانے دار پہلے تو ڈیڑھ لاکھ لے گیا خواہ مخواہ۔"

میں نے کہا "یار' اس نے گرفتار نہیں کیا مجھے اور ایک مفید اطلاع بھی دی کہ میری تصویر تھانوں کو دے دی گئی ہے۔"

رئیس نے کہا "اس کے بعد میں نے بات کی ایک میک اپ آرٹسٹ سے۔ بندہ اپنے کام کا ماہر ہے اور بھروسے کا بھی ہے مگر میں نے کہا کہ میں آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو مکر گیا کہ تمہیں اعتبار نہیں ہم پر تو ہم کیوں اعتبار کریں۔ وہ پانچ مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ دس دیں گے ہم مگر شرط یہی ہے' منظور ہو تو رات تک فون کر دینا۔ اپنا نمبر دے دیا تھا اسے۔"

"ابھی تک اس کا فون نہیں آیا۔"

"آئے گا تین چار گھنٹے میں۔ دس ہزار نقد کو ٹھکرانا آسان نہیں پیارے۔ وہ بھی جانتا ہے کہ کام کرنے والے بہت ہیں۔ کوئی اور مان جائے گا۔ اپن بھی ذرا شرافت کے موڈ میں ہیں ورنہ اٹھا لائیں گے سالے کو۔"

میں نے کہا "یہ بتا کمپیوٹر کے کام کا کیا ہوا؟"

"وہ بھی نہیں ہوا۔ ایک نیا منیجر آیا بیٹھا تھا بینک میں۔ کہنے لگا کہ بینک کا ٹائم ختم ہو گیا۔ کل آئیں۔ میں نے کہا کہ پیارے' ہمیں پہچان لو اچھی طرح۔ آج تو ہم چلے جاتے ہیں مگر پھر ایسی بات مت کرنا ہم سے قسم اللہ کی۔ ہم رئیس خان ہیں اور ٹائم تمہارا ختم ہو سکتا ہے' ہمارا نہیں۔"

"یار' غلط کام کرانے کے لیے منت سماجت چلتی ہے۔ دھمکی نہیں۔"

"ابے ہماری بدمعاشی چلتی ہے" اس نے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔

"پھر اس تھانے دار کے سامنے کیوں بھیگی بلی بن گیا تھا؟"

"وہ بھی تیری وجہ سے یار' تو پکڑا جاتا تو ہم پر بھی الزام آتا کہ اپن خدا بخش مندرال کے قاتل کے ساتھ تھے۔ اس کی فیملی خواہ مخواہ میری دشمن ہو جاتی کہ شاید میں نے نمک حرامی کی۔" رئیس نے ایک آہ بھری "اپنے لیے اچھا تھا وہ یار' بہت بھروسا کرتا تھا مجھ پر قسم اللہ کی۔ پیسے کے معاملے میں اپنا ہاتھ کھلا رکھتا تھا اور دل کا بھی کھلا تھا۔"

"میں نے بھی کسی سے اس کی برائی نہیں سنی۔ اس کے اور میرے سیاسی اتحاد سے معلوم نہیں کس کو خطرہ محسوس ہوا؟"

"ابے سب سے پہلے تو وہی۔۔۔ تجھے پارٹی سے دودھ میں مکھی کی طرح باہر کرنے والے۔ ہم نے تو اچھا ہی کیا تھا تم دونوں کو بلوا کے مگر اپنی نیکی بھی سالی خرابی بن گئی مقدر کی۔۔۔ اس کے جنازے میں جانے کی تو ہمت نہیں پڑی مگر میں گھر گیا تھا اس کے۔"

میں نے کہا "تو اس کے گھر گیا تھا؟"

"ہاں یار' اس گھر میں نہیں جہاں اس سے تیری ملاقات ہوئی تھی۔ یہاں اس کی شہری بیوی رہتی ہے۔" رئیس بولا "وہ تو بڑی بلا ہے۔ اب دیکھنا وہ اس کو بھی پر قبضہ جمالے گی۔ ہر چیز لے لے گی۔ اسی لیے شادی کی تھی اس نے مندرال سے۔ یہی مقصد تھا اس کا۔ اپنا راخلہ بھی بند ہو جائے گا وہاں اور جتنے پرانے نمک خوار ہیں' نکال دیے جائیں گے۔ خاندان والے اسے پوچھتے نہیں۔ نہ یہاں کوئی آتا تھا اور نہ اسے خاندان میں کہیں بلاتے تھے۔"

میں نے کہا "کون ہے وہ۔۔۔ میرا مطلب ہے پہلے کیا تھی؟"

"پہلے تھی ایک ماڈل۔ دو چار اشتہاروں میں نظر آئی تو ایک فلم میں کام مل گیا۔ خدا بخش مندرال کا دل تو اشتہار دیکھ کے ہی آ گیا تھا۔ اس نے بھی ایک فلم بنانے کا اعلان کر دیا اور اسے سائن کر لیا' ہیروئن کے رول کے لیے۔ فلم شروع بھی نہیں ہوئی کہ ملک خدا بخش کی اس سے پہلے ہی شادی ہو گئی۔ سنا ہے بہت کچھ وصول کر چکی تھی۔ آج محل اپنے نام کرایا تھا۔ گاڑی اور زیور لیے تھے۔ بینک بیلنس کا مجھے پتا نہیں مگر کم نہیں ہو گا۔ اسے تو آزادی مل گئی۔ اب واپس چلی جائے گی فلمیں اور ماڈلنگ کرنے۔"

"ابے اب کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں یار۔ ضرورت تو نہیں اگر شرافت سے گھر بیٹھ کے گزارا کرنا چاہے مگر پیارے' یہ فلمی دنیا کی چکا چوند آدمی کو چھوڑتی نہیں۔"

میں نے کہا "تو کون سے گھر گیا تھا؟"

"گاؤں میں۔ جہاں سے خدا بخش مندرال کی میت اٹھائی گئی تھی۔ اس کی پہلی خاندانی بیوی وہیں رہتی ہے۔ جوان بیٹے ہیں اس کے۔ وہ عدت میں کسی غیر مرد سے نہیں مل سکتی۔ اس کا بڑا بیٹا پڑھا لکھا ہے۔ کہیں افسر ہے ٹیلی فون کے محکمے کا۔ مجھے جانتا ہے' مجھ سے پوچھنے لگا کہ تمہارے

خیال میں یہ کام کس کا ہو سکتا ہے؟ ویسے تو سب نام لے رہے ہیں شاہ عالم کا مگر بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اپن کا سیاسی اتحاد ہوا تھا۔ وہ کیوں قتل کرائے گا اپا کو؟ اور قتل کرانے والا کیا اپنے نام سے بم کا تحفہ بھجوائے گا؟"

میں نے کہا "اچھا؟ یہ بات تو بڑی معقولیت کی ہے۔"

"ہاں۔ اس کا خیال ہے کہ کسی نے شاہ عالم کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی ہے مگر بہت بے وقوفی سے۔"

"پھر تو نے کیا کہا؟"

"میں نے کہا کہ سچ فرمایا جناب آپ نے۔ مجھے تو خود اپنی فکر پڑ گئی ہے۔ شاہ عالم کے ساتھ اپنا بھی یارانہ ہے۔ ٹھنا بیٹھنا ہے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کیس ہمیں بھی نہ پکڑوا دیں۔ تفتیش کے لیے پولیس ان کا بیان بھی لے گی۔ وہ مجھے پسند نہیں کرتیں کیونکہ ملک صاحب مجھ پر بھروسا کرتے تھے اور ہم ان کو صحیح رائے دیتے تھے۔ چھوٹی بیگم صاحبہ کی نظر میں تو ملک صاحب کے سارے خیر خواہ دشمن ہیں۔"

"آخر کوئی وجہ بھی ہو گی اس کی؟"

"ابے وجہ صاف ظاہر ہے۔ جو اس کی اصلیت کو سمجھتے ہیں اور اندر کی باتیں جانتے ہیں وہ اس کی آنکھ میں کھٹکتے ہیں۔"

میں نے کہا "تو جانتا ہے اندر کی ایسی کوئی بات؟"

وہ ہنسنے لگا "پیارے' ہم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ ابے سات سال سے اپنا اور ملک خدا بخش مندرال کا ساتھ تھا۔ ایک دن میں اپنا اعتبار قائم نہیں ہو گیا تھا۔ وہ تو خدا بخش نے دیکھا کہ بندہ کام کا ہے اور کھرا ہے تو وہ اپنے کام ہمارے سپرد کرنے لگا جو رازداری کے ہوتے تھے۔ اس کی حویلی میں بھی جاتے تھے ہم اور بڑی بیگم صاحبہ کی ہم پر وہ بھی کیا کہتے ہیں اسے۔۔۔ نظرِ عنایت۔ کبھی کبھی مجھ سے پوچھتی تھیں کہ ملک صاحب کی مصروفیات کیا ہیں۔ کون آتا ہے ان سے ملنے جب وہ شہر میں ہوتے ہیں۔ اب یار' اتنا تو وہ خود بھی جانتی تھیں کہ ملک صاحب گاؤں میں زراعت کرتے ہیں تو شہر میں سیاست۔ ان کا ملنا تو سب سے ہو گا مگر ہم سمجھتے تھے بیگم صاحبہ کیا جاننا چاہتی ہیں۔ ان کا مطلب ہوتا تھا کہ ملنے والیاں کون آتی ہیں۔ قسم اللہ کی ایسی شاندار عورت ہے۔ بالکل خاندانی طور طریقے ہیں اس کے۔ عمر کافی ہے مگر بڑی رعب والی شخصیت ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے حویلی میں مگر نوکر چاکر بھی اسے ماں جی کہتے ہیں۔ ملکانی نہیں۔ گاؤں کے سارے عورتیں اپنے جھگڑے اور شوہروں کی شکایتیں لے کر آتی ہیں۔ سب کے فیصلے انصاف سے کرتی ہے۔ ضرورت مند کی مدد بھی کرتی رہتی تھی۔ جوان اولاد ہے اس کی اور سب باپ سے ڈرتے ہیں۔ ماں سے محبت کرتے ہیں۔ دیکھ یار' ایک خدا کے سوا دنیا میں آدمی جس سے خوف کھاتا ہو اس سے محبت نہیں کر سکتا۔"

میں نے اس کی تائید کی "یہ بڑا فلسفیانہ نقطہ بیان کیا تو نے مگر یہ بتا کہ کیا تو سچ بتا رہا تھا کہ ملک صاحب کے روز و شب کیسے گزرتے ہیں؟"

"ابے مرنا تھا مجھے سچ بول کے۔ نمک کھاتا تھا میں ملک کا۔ اس کی بیوی کو بتا دیتا کہ شہر میں کیا ہوتا ہے تو پھنڈا گاؤں میں ہوتا اور مجھے جوتے مار کے نکال دیتا خدا بخش۔ ویسے بھی پیارے' ان ملکوں' چوہدریوں کی بیویاں سب جانتی ہیں کہ باہر کیا کرتے ہیں ان کے خاوند۔ وہ ان کا خاندانی چلن تو بدل نہیں سکتیں۔ صبر شکر کر لیتی ہیں کہ حویلی میں اور گاؤں میں ان کی چلتی ہے۔ وہی خاندانی بیوی ہیں اور عزت دار ہیں۔ باقی رئیسوں کے شوق کی اور استعمال کی چیزیں ہیں جو بدلتی رہتی ہیں۔ میرے بتانے سے اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہ ہوتا۔ دراصل ان خاندانی بیویوں کو بھی اندر سے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ خاوند ان پر سوکن نہ لے آئے۔ ویسے دل لگی کے لیے جس سے چاہے دل بہلائے مگر کسی کو نکاح کر کے ان کے برابر کا درجہ نہ دے۔"

"پھر جب ملک خدا بخش نے یہ دوسری شادی کی تو کیا تو نے بتایا تھا ملکانی کو؟"

"نہیں یار۔ میں کیسے بتا سکتا تھا۔ میں ملک خدا بخش کا ملازم تھا اور اس کے راز کو راز رکھنا میرا کام تھا۔ کرنے کو اسے بلیک میل کر سکتا تھا میں مگر اس کے بعد میرا انجام کیا ہوتا۔ یہ اچھی طرح جانتا تھا میں۔ جب ملک خدا بخش کا اس چھوٹی بیگم کہلانے والی سے چکر شروع ہوا تو مجھے سب معلوم تھا۔ خوب صورت اور جوان تو وہ تھی' ہوشیار بھی بہت تھی۔ آہستہ آہستہ اس نے ملک کو پوری طرح اپنے قابو میں کر لیا۔ اپن سب دیکھ رہے تھے مگر خاموش تھے پھر ایک دن ملک نے مجھے بلایا اور کہا کہ رئیس' ہم نکاح کر رہے ہیں کشوری سے۔ اس کا نام تو تھا کشور سلطانہ مگر وہ کشوری مشہور تھی۔ ماڈل تھی تب بھی اور فلموں میں کام کرتی تھی تب بھی۔ میں نے کہا کہ "میرے لیے کیا حکم ہے؟" ملک خدا بخش کی پیشانی ہم بہت دن سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تیرا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا کہ "جنابِ عالی' میری کیا اوقات کہ میں رائے دوں مگر آپ نے پوچھا ہے تو وہی کہوں گا جو میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دل کی بات ہے۔ میں کشوری کو آپ کی حیثیت کے لائق نہیں سمجھتا" میرا خیال تھا کہ ملک خفا ہوگا مگر وہ بولا کہ "تو نے ٹھیک کہا رئیس لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ کسی طرح نہیں مانتی۔ ہم یہ کوٹھی اس کے نام کرنے پر راضی ہیں۔ اس کے علاوہ گاڑی ہم تحفے میں دے چکے ہیں۔ چار پانچ لاکھ کے زیورات دیے ہیں۔ نقد بھی دس لاکھ دینے کو تیار ہیں۔ اتنا سن کے اپنا تو دماغ گھوم گیا ہے یار' کشوری جیسی عورت کی اتنی قیمت۔ میں نے کہہ دیا کہ "ملک صاحب اور کیا چاہیے اسے؟" ملک خاموش ہوگیا اور پھر بولا کہ رئیس' تو نکاح کا انتظام کر۔ ہم مجبور ہیں مگر دیکھو' مولوی اپنا ہو اور نکاح نامہ لا کے مجھے دینا"

اس کی بات کا مطلب اپنی سمجھ میں آگیا۔ اپن بڑی دور سے ایک مولوی کو پکڑ لائے جس کی اتنی عمر ہوگئی تھی کہ نہ اسے ٹھیک سے بھائی دیتا تھا نہ سنائی دیتا تھا۔ بس اس کے بعد سب کچھ عین شرع کے مطابق ہوا۔ ملک نے کچھ اپنے اعتبار کے لوگ بلائے تھے۔ کشوری نے اپنے خاندان کے علاوہ فلمی دنیا کے چند لوگوں کو بلایا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی نہیں آیا۔ دس لاکھ حق مہر رکھا گیا اور کشوری ہوگئی ملک خدا بخش مندرانی کی دوسری بیوی' کشوری نے ماں باپ کے سامنے نکاح نامے پر دستخط کیے تھے۔ وکیل اور گواہ اس کے اپنے تھے۔ ایک پاگل ماموں تھا اور دو سرا کوئی رشتے کا چاچا۔"

"فلمی دوست' کیوں نہیں آئے اس شادی میں۔"

رئیس نے قہقہہ مارا "میں نے انہیں فون پر کہہ دیا تھا کہ نکاح کی تقریب آواری میں ہوگی۔ نکاح ہوا ہالیڈے ان میں۔ کشوری کو حیرانی بھی ہوئی اور صدمہ بھی اسے بہت تھا کہ اس کے معزز مہمان نہیں پہنچے۔ معزز مہمان اور فلمی صحافی بیٹھے رہے آواری میں۔ وہاں بھی ایک ہال بک تھا اور مہمانوں کی اچھی خاطر تواضع ہوئی لیکن دولھا دلہن نہیں پہنچے تو وہ انتظار کر کے چلے گئے۔ وہ سمجھے کہ شادی میں کوئی پھڈا پڑ گیا۔"

"یہ حرکت تو نے کی تھی؟"

"ظاہر ہے۔ اپن کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ملک کیا چاہتا ہے۔ اس کی مجبوری بھی ہماری سمجھ میں آگئی تھی۔ جب ملک کو میرے اس کا پتا چلا۔ وہ کیا کہتے ہیں' حسن انتظام کا۔ تو وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے ہنس کے کہا کہ رئیس' تو بڑا خبیث ہے۔ یہ اس نے گالی نہیں دی تھی۔ تعریف کی تھی میری۔"

"دوسرے ہوٹل کا بل کس نے ادا کیا تھا؟"

"اس وقت میں نے ہی کیا سب کچھ۔ بعد میں فائدہ یہ ہوا کہ بل تھا پچیس ہزار کا۔ میں نے وصول کر لیے پچاس ہزار۔ پچاس ہزار مجھے ملک نے انعام کے دیے۔ ایک لاکھ اس کے لیے کچھ بھی نہیں تھے مگر جو میں نے کیا وہ بہت تھا۔ کشوری نے بعد میں اپنے دوستوں سے شکایت کی تو انہوں نے کہا کہ ہم تو آواری میں بیٹھے رہے۔ کشوری نے کہا کہ تمہیں ہالیڈے ان بلایا گیا تھا۔ سب نے غلطی پر معذرت کرلی مگر کشوری یہ ماننے پر تیار نہ تھی کہ سب سے ایک ہی غلطی کیسے ہوئی۔ وہ سب مصروف لوگ تھے اور انہیں اتنے دعوت نامے ملتے تھے کہ کسی کا کنفیوز ہو کے غلط جگہ پہنچ جانا ناممکن نہیں تھا۔ کوئی وقت یاد نہیں بھول سکتا مگر سب آواری پہنچ گئے' یہ کیسے ہوا؟ کشوری نے فون پر معلوم کیا تو اسے سب پتا چل گیا۔ اس نے ملک خدا بخش سے جھگڑا کیا کہ آخر اس سازش کا مقصد کیا تھا؟ ملک نے قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم اور میں نے کچھ نہیں کیا۔ کشوری کیا کرتی' ملک کو جھوٹا اور دھوکے باز تو کہہ نہیں سکتی تھی سب کے سامنے۔"

"اگر وہ معلوم کرتی تو بیٹے تو پکڑا جاتا۔"

رئیس ہنسا "ابے کیسے پکڑا جاتا۔ وہ چالاک عورت تھی۔ ہمیں پتا تھا کہ کوئی نہ کوئی اسے بتادے گا کہ پروگرام میں تبدیلی کی اطلاع کسی نے فون پر دی تھی پھر وہ پوچھے گی ہوٹل والوں سے کہ انتظامات کا ذمے دار کون تھا؟ جہاں نکاح ہوا وہاں تو ہم نے سارا کام کیا تھا اور ویٹر سے منیجر تک سب ہمیں پہچانتے تھے۔ اس کو پتا چل گیا ہوگا کہ رئیس نام کے شخص نے نگرانی کی تھی اور اس کا یہ حلیہ ہے۔ دوسری جگہ ہم نے اپنے یار محمد نذیر کے ذریعے بکنگ کرائی تھی اور ادائیگی کرنے بھی وہ خود گیا تھا۔ ہماری کسی نے شکل نہیں دیکھی تھی وہاں۔ کچھ بعید نہیں کہ اس نے میری یا ملک صاحب کی تصویر دے کے کسی کو بھیجا ہو لیکن ہوٹل والوں نے بھی وہی کہا ہوگا جو حقیقت تھی۔ نکاح خواں کو بھی جیرا بلیڈ ہی کہیں سے پکڑ کے لایا تھا۔ نکاح کے بعد وہ واپس جا رہا تھا تو جیرا بلیڈ اسے پھر مل گیا مگر انسپکٹر پولیس کی وردی میں۔ مولوی کو موٹے شیشوں والی عینک سے بھی بالکل صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ کیسے پہچان سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے۔ اسے تو شک بھی نہیں ہوا۔ انسپکٹر نذیر نے اسے خواہ مخواہ ڈرایا دھمکایا کہ تم جعلی نکاح خواں ہو۔ جعلی نکاح پڑھاتے ہو اور تمہارے پاس جعلی نکاح نامے اور رجسٹر ہیں۔ بے چارے مولوی نے بہت قسمیں کھائیں اور ادھر ادھر کے بہت سے حوالے دیے کہ ایسا نہیں ہے لیکن جیرا اسے تھانے لے گیا۔"

"تھانے لے گیا؟ اس کا کون سا تھانہ ہے؟"

رئیس نے کہا "ابے ہر تھانے دار کسی بھی تھانے جا کے کسی کو بھی بند کرا سکتا ہے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کا اتنا خیال رکھتے ہیں جتنا شریف ہمسائے نہیں رکھتے۔ ایک دوسرے کے کام آئے بغیر کام کہاں چلتا ہے۔ پوری مافیا ہوتی ہے ان کی بھی۔ اپنا جیرا بلیڈ سب خبر رکھتا ہے کہ کس تھانے میں کون انچارج ہے' کون ماتحت ہے۔ کون معطل یا لائن حاضر ہوا ہے اور کون کتنا حرامی ہے۔ دیکھ نا یار' آدمی خطرناک جنگل میں جائے تو اسے پتا ہوتا ہے کہ یہاں خطرے کی کیا بات ہے۔ جنگل میں سانپ بچھو ہیں۔ جن بھوت ہیں یا چور ڈاکو۔ تو اپنے یار جیرے نے تھانے کے باہر ہی مولوی کو حوالے کیا کسی پولیس کانسٹیبل کے کہ اسے ذرا پکڑ کے رکھو' میں آتا ہوں تھوڑی دیر میں۔ کانسٹیبل نے سیلوٹ مارا اور کہا جی سر جی' اور مولوی کو ڈال دیا حوالات میں سب کے ساتھ۔ بعد میں انچارج نے پوچھا ہوگا کہ یہ بندہ کس کا ہے تو کانسٹیبل نے کیا کہا ہوگا؟ یہی کہ نام تو پوچھا نہیں جی میں نے لیکن وہ انسپکٹر آپ کو جانتا تھا۔ آپ کو پوچھ رہا تھا اور کہہ گیا تھا کہ ابھی آتا ہوں۔ مولوی نے بھی رو پیٹ کے دہائی دی ہوگی کہ مجھے خواہ مخواہ پکڑ کے چوروں' جیب کتروں کے ساتھ بند کر دیا ہے۔ میں تو مولوی ہوں فلاں مسجد کا اور نکاح خواں ہوں۔ معلوم کرنے پر اس کے سچ کا پتا چل گیا ہوگا تو اسے چھوڑ دیا گیا ہوگا مگر جیرا بلیڈ اس کے رجسٹر وغیرہ ساتھ لے گیا تھا۔ وہ اس نے میرے حوالے کر دیے اور میں نے نکاح ناموں کی دونوں نقلیں ملک خدا بخش مندرانی کی خدمت میں پیش کر دیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ میرے سامنے ہی اس نے لائٹر سے انہیں جلا دیا پھر مجھے دس ہزار انعام کے دیے اور پوچھا کہ کشوری کو معلوم تو نہیں ہوگا؟ میں نے کہا جناب عالی' معلوم تو ہو جائے گا مگر قیامت والے دن۔"

"اس نکاح خواں نے رپورٹ نہیں لکھوائی؟"

اس نے کہا "نہیں' ایک تو جیرا اسے بہت گھما پھرا کے ملک خدا بخش کی تقریب نکاح میں لے گیا تھا۔ وہ محلے کا نکاح پڑھانے والا کسی اتنے بڑے ہوٹل میں کبھی نہیں گیا تھا۔ جیرے نے اسے بتایا تھا کہ آواری ہوٹل جانا ہے۔ وہ ہالیڈے ان کو آواری ہوٹل سمجھتا رہا پھر میں نے ملک خدا بخش کے نکاح نامے کی چاروں کاپیاں نکال کے باقی رجسٹر واپس مولوی کو پہنچا دیا۔ مولوی نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ جان چھوٹی۔ اول تو اسے یاد نہیں ہوگا کہ نکاح کس کا کس سے ہوا تھا اور اگر یاد آیا ہوگا تو وہ گیا ہوگا آواری ہوٹل۔ وہاں اسے کون گھاس ڈالتا۔ یہی کہا گیا ہوگا کہ شادیاں تو بہت ہوتی ہیں یہاں اور وہ سب ملک یا چوہدری وغیرہ ہی ہوتے ہیں۔ پتا ہم کیا بتائیں لیکن میرا خیال ہے کہ مولوی میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ پولیس کو رپورٹ کرتا یا خود تفتیش کرتا پھرتا۔ اس نے سمجھ لیا ہوگا کہ یہ کوئی چکر تھا اور ایسا نہ ہو کہ وہ نئے چکر میں پھنس جائے۔ اسے پانچ ہزار نقد جو مل گئے تھے۔ وہ انہی کو کافی سمجھ کے چپ بیٹھ گیا ہوگا۔"

"مطلب یہ کہ اس کا پھر کہیں سراغ نہیں ملا۔"

"نہیں' چھوٹی بیگم نے جب نکاح نامے کا مطالبہ شروع کیا تو ملک نے کہا کہ مولوی کو میں نہیں لایا تھا۔ چھوٹی بیگم نے مجھ سے پوچھا۔ میں بالکل انجان معصوم بن گیا کہ مجھے تو نہیں معلوم۔ باقی سب کام میں نے کیے تھے۔ یہ انتظام میں نے اس لیے نہیں کیا کہ نکاح خواں ہوتا ہے لڑکی والوں کا۔ کیا وہ آپ کے گھر والوں کے ساتھ نہیں آیا تھا؟ اس نے ماں باپ سے اور چاچے ماموں سے پوچھا۔ ظاہر ہے انہوں قطعی لاعلمی کا اظہار کیا۔ کشوری نے بہت شور مچایا۔ ملک نے اسے پہلے نرمی سے سمجھایا کہ پتا چل جائے گا۔ میں نے اپنے بندے لگا دیے ہیں اس کام پر۔ بعد میں ایک دن اسے گرمی دکھائی کہ نکاح ہوگیا سب کے سامنے۔ تم نے خود نکاح نامے پر دستخط کیے۔ اب نکاح خواں نہیں مل رہا ہے تو میں کیا کروں؟ دوسرا نکاح پڑھواؤں تم سے؟ اور تمہیں زندگی میرے ساتھ گزارنی ہے یا اس کاغذ کے پرزے کے ساتھ؟ ممکن ہے اور بھی کچھ کہا ہو کہ یہاں تم جیسی آتی جاتی رہتی ہیں لیکن تم بیوی ہو میری۔ اس گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے سوچ لینا کہ ملک خدا بخش عزت پر جان بھی قربان کر دیتا ہے مگر اپنی نہیں' اس کی عزت کو داغ دار کرنے والوں کے سارے خاندان کی۔ وہ سمجھتی تو خود بھی ہوگی کہ اس مسئلے پر ہنگامہ یا قانونی چارہ جوئی سے نقصان اسی کو ہوگا۔ دراصل اس کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ وہ شرعی عورت تھی اور اپنے قانونی حقوق کو سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ ایک بیٹا ہو جائے ملک خدا بخش سے تو وہ دوسرے بیٹوں کی طرح وراثت کا حق دار بن جائے گا۔ اس کا حق ملک کے خاندان والے اپنی روایات کے مطابق چاہے نہ مانیں مگر قانون تسلیم کرے گا مگر ملک خدا بخش جیسے لوگ ایسے خطرات کو پہلے سے بھانپ لیتے ہیں اور ان سے نمٹنا بھی جانتے ہیں۔ اس نے مجھے بلا کے پھر کہا کہ "رئیس۔ نکاح ناموں کی دو کاپیاں مجھے دی ہیں تو نے مگر دو کاپیاں اس مولوی کے پاس ہوں گی۔ وہ بھی نہیں رہنی چاہئیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عورت اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاندان والوں کو اس کام پر لگادے کہ جیسے بھی ہو اس نکاح خواں کا سراغ لگاؤ۔ شہر میں بندے کا پتا چلانا مشکل ہوتا ہے مگر ناممکن نہیں" میں نے کہا کہ "آپ فکر ہی مت کریں جی۔ میں نکاح خواں کا رجسٹر غائب کرسکتا ہوں تو آپ نکاح خواں کو ہی غائب کرسکتے ہو۔"

میں نے رئیس کو پُرملامت نظروں سے دیکھا "خود تو نے مشورہ دیا کہ غائب کردو اس بے گناہ پیش امام اور نکاح خواں کو؟"

"ہاں یار۔ بس یہ غلطی ہوگئی مجھ سے" وہ بولا۔

"غلطی کہتا ہے تو اسے؟ یہ گناہ بھی تھا اور جرم بھی۔"

"یار، میں پھنس گیا تھا اس کام میں۔ انکار بھی نہیں کرسکتا میں۔ ملک نے کچھ دن بعد مجھ سے کہا کہ "رئیس" میں نے ٹھیک سوچا تھا۔ اس عورت نے پتا چلالیا ہے کہ وہ کون مولوی تھا؟ میں نے کہا کہ "کیسے پتا چلالیا جی۔ ہم تو بڑی دور سے پکڑ کے لائے تھے اسے" اس نے کہا کہ "اب جیسے بھی پتا چلا مگر چل گیا" میں نے کہا کہ "ملک صاحب' پتا چل گیا تو کیا ہوا؟ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں نکاح نامے کا وہ رجسٹر اٹھالایا تھا جس میں آپ کے نکاح نامے کی باقی کاپیاں تھیں۔ اسے میں نے جلادیا تھا۔ ملک کہنے لگا "یہ بڑا اچھا کیا تو نے مگر اس مولوی کی گواہی تو ہے" میں نے کہا کہ "گواہی تو عدالت میں ہوتی ہے۔ آپ کے خلاف کون جارہا ہے عدالت میں؟" وہ قائل ہوگیا' کہنے لگا کہ "ہاں۔ اس عورت کی مدد صرف عدالت ہی کرسکتی ہے مگر تو ایسا کر۔ مجھے اس مولوی سے ملوادے۔ میں اسے سمجھاؤں کہ وہ کسی گواہی کے چکر میں نہ پڑے۔" میں نے کہا "ملک صاحب۔ اسے نہ کانوں سے ٹھیک سنائی دیتا ہے نہ آنکھوں سے صاف نظر آتا ہے۔ وہ آپ کے خلاف کیا گواہی دے گا؟ میرا تو خیال ہے کہ کوئی بھی نکاح پڑھانے والا کسی دولہا کو بعد میں نہیں پہچان سکتا۔ میں خود اس سے بات کرلوں گا۔"

"پھر تو نے اس سے بات کی؟"

"نہیں یار۔ مجھے اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے سوچا کہ ملک خواہ مخواہ پریشان ہورہا ہے۔ ایسی نوبت کبھی نہیں آسکتی کہ کشوری ایک نکاح نامے کی خاطر ملک کے خلاف قانون کا سہارا لے اور خود کو اس کی بیوی ثابت کرنے کے لیے ثبوت کی خاطر کسی اور کی مدد حاصل کرے۔ اب بعد میں پتا نہیں کیا ہوا۔ میں نے دوبارہ مولوی سے مل کے اسے یہ سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ کبھی ملک خدا بخش مندرال کا نکاح پڑھانے کا اعتراف نہ کرے۔ دو مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ میں سمجھا کہ ملک بھی بھول گیا اس بات کو لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس کی بیوی کشوری نے اندر ہی اندر خاموشی سے کوئی چکر چلا رکھا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس کے مستقبل کو کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے اور ان خطرات سے اس کو ایک نکاح نامہ ہی محفوظ رکھ سکتا تھا۔ کل کو ملک اسے نکال باہر کرے تو وہ کیسے دعویٰ کرے گی کہ ملک اس کا شوہر تھا؟ اور ملک جیسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں کہ بدظن ہوجائیں یا کوئی دل سے اتر جائے تو ایک منٹ میں گھر سے بے گھر کردیں۔ خیر بات کچھ بھی ہو' ملک نے ایک دن صبح مجھے بلایا اور دس ہزار دے کے بولا کہ "رئیس' یہ اس مولوی کی بیوہ کو دے آ' میری طرف سے۔" میں تو بھونچکا رہ گیا۔ میں نے کہا "کون سے مولوی کی بیوہ جی!" وہ بولا "بے وقوفی کی باتیں مت کر۔ وہی مولوی جس نے میرا نکاح پڑھایا تھا کشوری سے" میں نے کہا "کیا وہ فوت ہوگیا ہے ملک صاحب!" وہ بگڑ گیا کہ "پاگل دے پُتر۔ وہ فوت نہ ہوتا تو اس کی بیوی کو میں کیسے بیوہ کہتا؟" اس کے بعد کچھ پوچھنے کی میری ہمت نہیں پڑی۔ میں دس ہزار لے کر گیا تو وہاں لوگ دریاں بچھائے بیٹھے تھے۔ یعنی اس وقت تک جنازہ بھی نہیں اٹھا تھا۔ میں نے معلوم کیا تو لوگوں نے بتایا کہ گزشتہ رات مولوی صاحب چنگے بھلے سوئے تھے۔ صبح نہیں اٹھے۔ بوڑھے آدمی تھے۔ ڈاکٹر نے یہی کہا کہ سوتے میں ہارٹ فیل ہوگیا۔ ویسے بڑھاپا سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے۔ بہانہ قضا نے چاہے بنالے۔"

"ملک نے مروادیا اسے؟"

"ظاہر ہے' مگر یہ بات اپنی زبان سے کسی نے بھی نہیں کی۔ کسی کا ادھر دھیان تک نہیں گیا مگر تو خود سوچ' رات کو کسی وقت مولوی صاحب فوت ہوئے۔ صبح صبح ملک کو کس نے اطلاع دی؟ وہ نہ مولوی صاحب کا رشتے دار تھا اور نہ کوئی اسے فون کرکے بتاسکتا تھا۔ اسے تو رات کو ہی پتا چل گیا ہوگا کہ کرنے والے اپنا کام کرآئے۔ جو کام میں نہیں کرسکتا تھا وہ ملک نے کسی اور سے کرالیا۔ میں نے جنازے میں شرکت کی اور اللہ سے دل ہی دل میں بڑی معافی مانگی۔ کسی حد تک اس کی موت کا ذمے دار میں خود کو بھی سمجھتا تھا۔ قبرستان سے واپسی پر میں نے دس ہزار وہ بھی مولوی صاحب کی بیوہ کو دے دیے جو ملک نے مجھے انعام دیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کس نے بھجوائے ہیں تو میں نے کہا کہ میں نام نہیں بتاسکتا۔ ایک شاگرد تھے مولوی صاحب کے۔ اس نے شکریہ ادا کرکے خاموشی سے رکھ لیے اور بہت سی دعائیں دیں۔ مجھے اتنی شرمندگی ہوئی یار کہ میں بتا نہیں سکتا۔ اس

کے بعد نہ کبھی ملک نے مجھ سے کوئی بات کی نہ کشوری نے۔ اسے بہت بعد میں پتا چلا کہ مولوی صاحب تو گزر گئے۔ ظاہر ہے وہ شک کرنے کے سوا کیا کرسکتی تھی۔ ان کی مرنے کی عمر تھی سب نے اسے طبعی موت سمجھا۔"

میں نے کہا "اور اب کشوری کیا کرے گی؟"

"کچھ نہیں۔ بس اس کوٹھی میں رہے گی۔ گاڑی اس کی' جتنا نقد ہے وہ سب اس کا۔ جو ملک نے اپنی مرضی سے دیا سب کی وہ مالک ہے قانونی طور پر مگر جو وہ اپنی مرضی سے لینا چاہتی تھی یعنی ملک کے نام کا وارث وہ اسے نہیں مل سکا۔ ملک نے اولاد پیدا کرنے کا خطرہ ہی مول نہیں لیا۔ کوئی طریقہ اختیار کیا ہوگا ایسا کہ کشوری ماں نہ بن سکے۔ بیٹا ہوتا یا بیٹی' وہ ان کے لیے وراثت کی دعوے دار بن جاتی مگر اسے اپنے ارادوں میں ناکامی ہوئی۔ اب وہ چار مہینے دس دن عدت کی قید میں گزارتی ہے یا نہیں' یہ اس کی مرضی۔ شادی کو سال ہی ہوا تھا۔ وہ لوٹ جائے گی اپنی ماڈلنگ اور اداکاری کی طرف۔"

"اور خاندان والے اعتراض نہیں کریں گے؟"

"خاندان والے اس سے کسی تعلق کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ آج میں ملک خدا بخش مندرال کے بڑے بیٹے سے ملا تو میں نے ایک کام اور کیا' میں نے اسے نکاح نامے کی دو کاپیوں کے بارے میں بتادیا کہ انہیں خود ملک صاحب نے جلادیا تھا۔ باقی دو میرے پاس محفوظ تھیں۔ ایک رہتی ہے رجسٹر میں اور دوسری جاتی ہے سرکاری دفتر میں۔ وہ میں نے ملک کے بڑے لڑکے کو پیش کردیں اور بتادیا کہ اب اس شادی کے دعوے محض زبانی رہ گئے ہیں۔ چھوٹا ملک بہت خوش ہوا اور اس نے مجھے شاباش دی۔ یہ بھی کہا کہ آج سے تم ہمارے ساتھ رہوگے۔ کشوری تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے کہا کہ جناب عالی' ساتھ رہنے سے تو معاف کریں۔ میں شہری آدمی ہوں' گاؤں میں میرا کیا کام۔ ویسے آپ کا خادم ہوں۔ آپ بس اتنی مہربانی کریں کہ مجھے تفتیش کے چکر سے بچالیں۔ آپ بڑے افسروں اور آپ کے تعلقات بھی ہوں گے بڑے افسروں سے" اس نے کہا کہ رئیس تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ جاؤ اب' کوئی کام ہو تو آجانا۔"

میں نے کہا "یہ بڑی دور اندیشی سے کام لیا تو نے۔"

"ہاں یار۔ ایک طرف سے تو مجھے بے فکری ہوئی۔ امید ہے وہ مجھ پر بھی شک ظاہر نہیں کرے گا۔"

میں نے کہا "کیا یہ کام کشوری کرا سکتی ہے؟"

"اب کون عورت بیوہ ہونا چاہتی ہے" رئیس نے کہا۔

"جو یہ سمجھتی ہو کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا۔ جسے صدمہ ہوا اپنی ناکامی کا۔ جسے احساس ہو کہ وہ بیوی نہیں داشتہ ہے اور ملک کی قید میں ہے۔ جو آزادی حاصل کرنا چاہتی ہو اس قید سے۔ ملک کے ہوتے یہ ناممکن تھا۔ وہ جتنا ملک سے لے سکتی تھی' لے چکی تھی۔ اس سے زیادہ کی امید ختم ہوگئی تھی۔ نہ اسے جائیداد سے حصہ ملنے کی توقع رہی تھی اور نہ ملک کی بیوی اور نہ اس کے بچے کی ماں بننے کی۔ وہ صرف بے عزت ہورہی تھی۔ اب وہ شرفا والی خاندانی عزت نہ سہی اپنی پر ستاروں والی عزت تو پھر حاصل کرسکتی ہے۔"

رئیس منہ کھولے بیٹھا رہا "تیری بات دل کو لگتی ہے یار۔ ایک ذہین عورت حالات سے فائدہ اٹھاسکتی ہے۔"

"کیا پتا کسی نے اسے یہ پٹی پڑھائی ہو کہ اس وقت شاہ عالم کو مجرم بنانا آسان ہے اور جس نے پٹی پڑھائی وہ یقیناً اس کا کوئی راز دار تھا۔ خود کشوری نے اس سے کہا ہوگا میری جان اس عذاب سے چھڑاؤ۔"

رئیس نے اقرار میں سر ہلایا "کشوری کے پرانے یار بہت ہیں اور ان میں شریف لوگ کم ہوں گے۔ ایک ماڈل اور فلم اسٹار کے تعلقات ہر قسم کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ کسی نے اس کا دل جیتنے کے لیے اس کی مدد کی۔"

"یا پھر میرے دشمنوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک طرف کشوری پر احسان کیا' دوسری طرف مجھے پھنسادیا۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا "یہ تو پتا چل سکتا ہے۔"

"کیسے پتا چل سکتا ہے؟"

"خود کشوری بتاسکتی ہے۔ ہم بھی جانتے ہیں یار' سچ اگلوانا اور یہ بات میں ملک کے بڑے بیٹے کو بھی سمجھا سکتا ہوں۔"

"اگر وہ بے وقوف نہیں ہے تو اب تک خود سمجھ چکا ہوگا مگر کشوری سے اعترافِ جرم کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ خواہ مخواہ بڑے ملک کی نجی زندگی کے معاملات پبلک میں آئیں گے۔ ان کی بدنامی ہوگی کیونکہ پھر کشوری بھی بہت کچھ بول سکتی ہے۔ سب سے اچھی بات ہے کہ اس بات کو یہیں ختم کردیا جائے۔ ہاں ملک کا بڑا بیٹا یہ کہہ دے کہ اسے شاہ عالم پر بالکل شک نہیں۔ شک یہ ہے کہ کسی نے اپنا جرم شاہ عالم کے سر ڈال کے قانون کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے اور اصل قاتل بہرحال پکڑے جائیں گے۔ بس ایسا ہی کچھ بیان پولیس کا بھی ہو۔"

"پولیس ایسا نہیں کہے گی۔" رئیس نے مایوسی سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سہلایا۔

"اگر ملک کا بڑا بیٹا اپنے اثر رسوخ اور تعلقات کو استعمال کرے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر اس کا کیا تعلق شاہ عالم سے۔"

میں نے کہا "یار' تو اسے کہہ سکتا ہے کہ میں نے آپ کا ایک کام کیا' آپ کے خاندان کو رسوائی سے بچایا ورنہ وہ ماڈل آپ کے خاندان کی بہو ہونے کا دعویٰ کرتی۔ آپ کی جاگیر بچائی میں نے۔ اب آپ میرے دوست کو بچائیں پریشانی سے۔"

رئیس نے کافی غور و خوض فرمانے کے بعد کہا "ایسا ہو سکتا ہے۔ میں کوشش ضرور کروں گا' ابھی تو جانا ہے ہمیں۔"

"کہاں جانا ہے اس وقت؟"

"یار وہ میک اپ کرنے والا یہاں نہیں آسکتا تو پھر یہی ایک صورت رہ جاتی ہے کہ ہم اپنی صورت کے ساتھ اس کے پاس چلے جائیں۔ اور وہ ہماری صورت بدل دے رات بھر میں۔"

رئیس نے اس سے فون پر بات کی اور اپنی تجویز اس کے سامنے رکھی تو اس نے رات بارہ بجے کا وقت دیا۔ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کے گیارہ بجے کے بعد ہی گھر پہنچتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے گھر پر ملنے کے دو ہی ٹائم ہیں' رات کے بارہ بجے یا پھر دوپہر کے بارہ بجے کیونکہ اس سے پہلے وہ سوتا رہتا تھا۔

ابھی صرف نو بجے تھے۔ رئیس نے تجویز پیش کی "چل تو یہاں آرام کر۔ میں واپسی میں کھانا بھی لیتا آؤں گا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "واپسی کا کیا مطلب؟ اور کہاں جانا ہے تجھے' تو نہیں بیٹھ سکتا آرام سے؟"

اس نے چٹکی بجائی "قسم اللہ کی۔ میں یوں گیا اور یوں آیا۔ تو ٹی وی دیکھ ورنہ پیارے' ایسی ایسی جلوے دار فلمیں پڑی ہیں' دل بہلانے کے لیے۔"

میں نے کہا "میں چلوں گا تیرے ساتھ۔"

"ابے بات کو سمجھا کر۔ بچے ہر جگہ ساتھ نہیں جاتے بڑوں کے" وہ اپنی تیسی دکھانے لگا "یہ ایک پرائیویٹ معاملہ ہے اپنا۔"

"پرائیویٹ کے بچے۔ صاف کہہ نا کہ جا رہا ہے ریڑی کھانے۔ اس ڈھائی من کی پوری بیت ملنے۔"

وہ جھینپ کر ہنسا "دیکھ نا یار۔ آخر یہ شوق ہے۔ اس کی ناراضی بھی ادا ہے۔ اپنے یاروں کی خاطر ہم نے ایک جھانپڑ مار دیا تھا۔ ایک اور جھانپڑ مار کے منا لیں گے سالی کو۔"

میں نے کہا "اچھا۔ پھر تو مجھے چھوڑ دے فرید عباسی کے گھر۔ میں اس سے اپنے پرائیویٹ معاملات ڈسکس کر لوں۔"

"تجھے اس صحافن کی بالکل فکر نہیں سالے جو صرف تجھ پر مرتی ہے اور مر رہی ہے وہاں پاگل خانے میں" وہ خفا ہو کے بولا۔

میں نے رئیس کو بتایا کہ میری شبنم سے بات ہو چکی ہے۔ وہ ٹھیک ہے اور ممکن ہے آج چلی جائے آزاد صاحب کے پاس۔

"یار' اپنا تو دماغ خراب ہونے لگتا ہے یہ سوچ کر کہ اس لڑکی کا آخر کیا انجام ہوگا۔ شاہ عالم ملا' پھر بچھڑ گیا۔ اب پھر ملا ہے بڑی مشکل سے اور پھر بچھڑ جائے گا۔ ابھی صرف پاگل ہوئی ہے وہ' اگلی بار ضرور مر جائے گی۔"

میں نے کہا "نہیں' وہ زندہ رہے گی۔ تو دیکھ لینا۔ جب کسی کی موت کا یقین آجائے تو صبر بھی آجاتا ہے۔"

"مگر تو نے اسے صرف روپوشی کا کہا ہے۔"

"روپوشی تو مہلت ہے۔ اس عرصے میں حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں' یہ کوئی نہیں جانتا۔ ضرورت پڑی تو شاہ عالم کو سچ مچ مار دیں گے۔ جیسے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ مرا نہیں تھا' ایسے ہی یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اب وہ مر گیا۔ ناصر عظیم کی زندگی کے لیے شاہ عالم کی موت ناگزیر ہو گئی۔"

وہ بدستور نفی میں سر ہلاتا رہا "تو اپنی زندگی سے نہیں' دوسروں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے الو کے پٹھے۔ کبھی مرنا کبھی جینا۔"

میں نے کہا "زندگی اسی کا نام ہے رئیس۔ بقول شاعر۔ زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا۔"

"دیکھ لے ایک تیری جان کو کتنے لوگ رو رہے ہیں۔ ناصر عظیم کو اپنا سمجھنے والے بھی رو رہے ہیں اور شاہ عالم کو چاہنے والے بھی۔"

"تجھے رونے والے کیا کم ہیں؟ ہمارے علاوہ کم سے کم ایک درجن سابقہ منگیتریں ہیں۔ کتنا خوش قسمت ہے تو۔ اگر پہلی سے ہی شادی کر لیتا تو تیری آج سات اولادیں ہوتیں۔ ڈیڑھ فٹ سے ڈیڑھ گز کے درمیان۔ یہ جو بعد میں تجھے ملیں' جلیبی اور برفی۔ رس ملائی اور بالوشاہی۔ ان سب کے مزے کیسے چکھتا تو اور کیا پتا آج ریڑی ملی ہے تو کل رس گلی مل جائے۔"

وہ ہنس پڑا "ایسا مت کہہ یار۔ یہ بالکل آخری ہے۔

بس میں نے ہی غصے میں زیادتی کی ورنہ پوری امید تھی۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے بھی امید سے نظر آتی تھی وہ۔ اب چل۔"

ہم اسی پیچ خفیہ راستے سے باہر نکلے۔ میں نے گاڑی کو ریورس کر کے باہر نکالا۔ رئیس شٹر گرا کے تالا لگا ہی رہا تھا کہ ایک طرف سے کالے برقع والی کوئی عورت تیزی سے میری طرف آئی۔ معلوم نہیں وہ کب سے وہاں کھڑی تھی۔ وہ دبلی پتلی اور چھوٹی سی عورت تھی جس کے چہرے کی جھلک تک نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے نقاب کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

رئیس سے پہلے اسے میں نے دیکھا۔ اس کا ارادہ گاڑی کا دروازہ کھول کے میرے ساتھ بیٹھنے کا تھا۔ کسی نامعلوم خطرے کو محسوس کرتے ہی میں نے ریوالور نکال لیا۔

"اے..... کون ہو تم۔ رک جاؤ۔" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے رئیس نے کہا "یار' کون ہے یہ بلا؟"

مجھ پر حیرت سے بجلی سی گری۔ جب کھڑکی میں منہ ڈال کے عورت نے نقاب اٹھایا اور مجھے اس کے چہرے پر دونوں طرف پھیلی ہوئی ایک فٹ کی مونچھیں نظر آئیں۔

"صاب جی۔ یہ ہم ہوتی۔" برقع میں سے خاتون نے سرگوشی کی "آپ گولی مت مارتی۔"

رئیس نے کہا "ابے تو؟ اس حلیے میں' سالے یہ کیا ڈراما ہے؟"

تیس مار خان پیچھے بیٹھ گیا "ڈراما نہیں ہم مجبور ہوتی صاب۔ بہت پریشان ہوتی۔ ادھر آپ کا انتظار کرتی۔"

رئیس میرے ساتھ بیٹھ گیا "میں نے کہا تھا کہ ادھر کا رخ بھی نہ کرنا۔"

تیس مار خان نے اپنا برقع اتار کے سیٹ پر رکھ دیا "ہم پیچھے کا رخ کرتی صاحب جی۔ آپ سامنے کا رخ بولتی۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا "یہ تو بہت برا ہوا کہ تم مرد سے عورت بن گئے۔ پہلے تمہیں چارفٹ کی دلہن نہیں ملتی تھی تو اب ساڑھے چار فٹ کا دولھا کہاں سے ملے گا۔"

اس نے میری بات کا سخت برا مانا "آپ کیسی بولتی۔ ہم مرد ہوتی صاب' اصلی۔ ہم تیس مار خان ہوتی' آپ ہمارا مونچھ دیکھتی؟"

"ابے تو پھر کیا مجبوری تھی؟ کیا پریشانی تھی تجھے؟" رئیس نے بھنا کے کہا۔

اس نے جواب میں ایک جذباتی تقریر کی "صاب! ہم آپ کو چھوڑ کے جاتی۔ ہم کو زارو قطار شرم آتی۔ ہم آپ کا نمک کھاتی۔"

رئیس نے اس کی مونچھیں ہلائیں "ابے صرف نمک کی بات کرتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں کھایا؟ کتنی گالیاں کھائیں اور ہمارا کتنا دماغ کھایا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "یہ ہمارا فرض ہوتی صاب۔ آپ کے واسطے اپنی جان قربان کرتی۔ ہمارا ضمیر بہت لعنت کرتی' ہم کو بزدل بولتی۔ نمک حرام بولتی اس لیے ہم واپس آتی' ابھی اپنا ڈیوٹی کرتی۔"

رئیس نے کہا "ابے پھر سوچ لے۔ اپن تو خیر جائیں گے پیارے کنوارے ہی۔ تیرے ارمانوں کا جنازہ بھی اٹھ جائے گا۔ بڑا شوق تھا تجھے قد میں عالم چنا کی برابری کا۔ اس کی ٹانگ کے برابر تو خیر ہو گیا تھا' اور یہ مونچھیں۔ ایک دن یہ پھیل کر تیرے بازوؤں سے لمبی ہو جاتیں۔ تیری ساری محنت خاک میں مل جائے گی۔"

لیکن ان باتوں سے تیس مار خان کی حوصلہ شکنی نہیں ہوئی اور اس کی جاں نثاری کے جذبے میں کمی نہیں آئی "ہم آپ کے ساتھ جاتی ہر جگہ۔ ہاتھ میں بندوق اٹھاتی' سر سے کفن باندھتی۔"

رئیس ہنسنے لگا "ہر جگہ کیسے جا سکتا ہے تو۔ ابے میں جاؤں گا باتھ روم یا گھر والی کے پاس۔ کیا وہاں بھی بندوق لیے اور سر سے کفن باندھے موجود رہے گا؟"

میں نے کہا "یہ برقع پہننے کا خیال کیسے آیا تمہیں؟ کس کا برقع ہے؟"

"ہم چرا کے لاتی صاب۔ اپنا ایک دوست کا گھر جاتی۔ اس کا دو بی بی ہوتی۔ چھوٹا بی بی لمبا ہوتی ہے بڑا بی بی کا برقع لاتی۔ اپنا شکل چھپاتی اور کھا شکوف چھپا کے آتی۔" اس نے بڑی سادگی سے بتایا۔

مجھے اور رئیس کو بہت ہنسی آئی مگر تیس مار خان نے برا نہیں مانا۔ فرید عباسی کے گھر پہنچ کے میں اتر گیا اور میری جگہ ڈرائیونگ کے فرائض تیس مار خان نے سنبھال لیے۔ سیٹ کو اس نے اپنے ساڑھے چار فٹ قد کے مطابق آگے کر لیا۔

میں نے کہا "دیری گڈ۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم صرف گن مین ہو۔"

رئیس نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا "قسم اللہ کی یار۔ بڑے گن ہیں اسی ایک بندے کی ذات میں۔ ہم نے ایسے ہی نہیں رکھ لیا تھا اسے۔ یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یہ پورا خانساماں بھی ہے۔ سب کچھ پکا سکتا ہے۔"

تیس مار خان نے دانت نکال کے عاجزی سے کہا "اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جناب' ہم ڈانسر ہوتی' سنگر ہوتی۔"

رئیس دو گھنٹے میں واپسی کا کہہ کے چلا گیا تو میں نے کال بیل بجائی۔ فرید عباسی نے گیٹ کھولا اور مجھے دیکھ کے خوش ہوا "بڑا اچھا کیا تم آ گئے۔ رخشی بھی یاد کر رہی تھی تمہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ صبح تم آئے تھے مجھ سے ملنے"

میں نے کہا "غلط' ہم ناشتا کرنے آئے تھے اور اس وقت بھی میں کھانا کھانے آیا ہوں۔"

وہ مجھے اندر لے گیا۔ اس کی ماں بیڈ پر نیم دراز ٹی وی پر کوئی ڈراما دیکھ رہی تھی۔ رخشی ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے کیرم بورڈ تھا اور دوسری کرسی خالی تھی۔ میرے آنے سے پہلے ان کا گیم جاری تھا۔ میں نے فرید کی ماں کو سلام کیا اور انہوں نے عادت کے مطابق کہا "جیتے رہو۔"

پھر فرید اور رخشی کا جھگڑا شروع ہو گیا "یہ کیا' دو گوٹیں غائب کر دیں تم نے اتنی سی دیر میں۔"

رخشی نے مصنوعی غصے سے کہا "میں بے ایمانی نہیں کرتی۔"

"تمہاری سات گوٹیں تھیں۔"

"پانچ تھیں" رخشی اڑ گئی۔

فرید نے بگڑ کے کہا "اور یہ کیا' میری ایک بڑھ گئی؟"

فرید کی ماں نے کہا "اتنی دیر سے کھیل کم اور لڑائی زیادہ ہو رہی ہے۔ چلو ختم کرو' رخشی دیکھو' کیا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا لگاؤ۔"

"جی ماں جی!" رخشی نے کسی سعادت مند بیٹی کی طرح کہا اور کیرم کی گوٹیں بکھیر کے کھڑی ہو گئی۔

"اتنی بے ایمانی کے باوجود تم ہار جاتیں پھر۔ خدا کا شکر ادا کرو ایک بھوکا آ گیا دروازے پر۔"

"بھوکوں نے تو گھر دیکھ لیا ہے" رخشی ہنسی اور اندر غائب ہو گئی۔ مجھے پھر اس گھر کے ماحول پر رشک بھی آیا اور حیرانی بھی ہوئی۔ یہاں رخشی کا رویہ بالکل گھر کی بہو جیسا تھا اور صرف فرید کی بات نہیں تھی' اس کی ماں بھی ذہنی طور پر اسے یہ حیثیت دینے کا فیصلہ کر چکی تھی — وہ سب ایک دوسرے کو پوری طرح قبول کر چکے تھے اور اب خیال کو حقیقت کا روپ دینے کے لیے انتظار صرف مناسب وقت اور حالات کی موافقت کا تھا۔

کھانے کی میز پر میں نے فرید کو دن بھر کی پیش رفت سے آگاہ کیا تو وہ متفکر نظر آنے لگا "یار' تم ایسے بھیس بدل کے کب تک چھپتے پھرو گے؟"

"اگر میں نے ایسا نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ کوئی نہ کوئی مجھے قتل کر دے گا۔ قتل کرنا آج کل بہت آسان اور سستا ہو گیا ہے اور قاتل کا پتا چلانا اتنا ہی مشکل۔"

"دشمن بھی خیر سے اتنے بنائے ہیں جناب نے۔"

میں نے کہا "بھائی۔ ہم جیسے اور تم جیسے لوگوں کو دشمن بنانے کے لیے کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا۔ بس ہم منافقت نہیں کرتے۔ ضمیر کی آواز پر فیصلہ کرتے ہیں اور عملاً ثابت کرتے ہیں کہ ہم خدا کے سوا کسی سے ڈرنے والے نہیں۔ اب ہم کیا غلط کرتے ہیں مگر اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ آپ نکالے جاتے ہیں ملازمت سے اور ہم نکالے جاتے ہیں سیاست سے۔ ہم ناپسندیدہ اور ناقابلِ قبول ہو جاتے ہیں۔ سب کے لیے اور جس راہ پر یہ معاشرہ جا رہا ہے' اس میں غلبہ انہی کو حاصل ہے جو منافق ہیں۔ بے ضمیر ہیں اور دل میں خوفِ خدا نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ خود بخود ہمارے دشمن بن جاتے ہیں۔"

"خیر یہ تو بجا فرمایا آپ نے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آپ کیا کریں گے؟"

"مجھے ویسے تو بہت کچھ کرنا تھا اس دنیا میں" میں نے آہ بھری۔

"مثلاً وزیرِ اعظم بننا تھا" رخشی نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ یہ بھی ایک کام تھا لیکن حاسد اور بدخواہوں نے موقع ہی نہ دیا اور اب بقول فلمی شاعر۔ دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے اور محترم عباسی صاحب۔ اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں سیاست سے توبہ کر کے کس پیشے میں قدم رنجہ فرماؤں گا تو عرض ہے کہ فی الحال مجھے کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت نہیں جس کو خواتین کہتی ہیں' ڈھنگ کا کام۔"

"ابھی کر سکتے ہو تم ڈھنگ کا ہر کام۔ بعد میں۔ میرا مطلب ہے شادی کے بعد تم چاہے ملک کے وزیرِ اعظم بن جاؤ۔ کوہ ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر جا کے سر کے بل کھڑے ہو جاؤ یا ورلڈ کپ جیت لاؤ۔ بیوی بھی کہے گی کہ ڈھنگ کا کوئی کام نہیں کیا ساری عمر۔" عباسی بولا۔

"اس کا جواب ہے میرے پاس۔ میں کہوں گا کہ تم سے شادی کی۔ تمہارے بچوں کا باپ بنا۔ کیا یہ ڈھنگ کا کام نہیں تھا؟"

رخشی مسکرائی "اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ قائل ہو جائے گی۔"

عباسی نے کہا "ہرگز نہیں۔ وہ کہے گی کہ خاک ڈھول۔ وہ تو خدا کا شکر ادا کرو کہ میں نے ہاں کہہ دی ورنہ پھر رہے

ہوتے آج بھی خوار۔"

"یہ بھی سچ کہا تم نے یار اور جب بیوی ہی نہ ہوتی تو بچے کہاں سے آتے۔ خیر' کام سے میری مراد تھی روزی کمانے کا کام تو فی الحال مجھے اس کی کوئی خاص فکر نہیں۔ میرا اچھا خاصا سرمایہ منافع بخش اداروں کے شیئرز میں لگا ہوا ہے۔ اخراجات کے مقابلے میں آمدنی زیادہ ہے جو بینک میں ہے وہ بڑھتا جا رہا ہے۔"

"وہ سب مجھے معلوم ہے کہ آپ کیا کرتے رہے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں۔ میرا مطلب یہ تھا کہ آخر اس دنیا میں کیسے رہیں گے آپ؟ زمانے کے ساتھ گزارا کیسے ہو گا؟" عباسی نے کہا۔

میں نے کہا "فارسی سمجھ میں آتی ہے آپ کے؟"

"ہاں۔ اتنی ہی جتنی کلاسیکی موسیقی" عباسی بولا۔

"علیم الامت فرما گئے ہیں یہ مطلب اس کا کچھ یہ ہوا کہ زمانہ تمہارے ساتھ نہیں چلتا تو زمانے سے لڑو۔"

"بھئی زمانے سے بعد میں لڑ لینا۔ کوئی اور بات کرو ورنہ کھانا کھاؤ چپ کر کے" رخشی نے ہم دونوں کو ڈانٹا۔

رخشی کو فوراً اماں کی حمایت حاصل ہو گئی "ٹھیک تو کہہ رہی ہے رخشی۔"

"آپ کو تو اس کی ہر بات ٹھیک لگتی ہے" عباسی نے احتجاج کیا۔

"تو اس میں غلط کیا ہے؟ سارے زمانے سے لڑنا کوئی اچھی بات ہے۔"

میں نے کہا "ماں جی۔ لڑیں نہ تو کیا کریں۔ شرافت سے کوئی جینے نہ دے دنیا میں تو کیا دنیا چھوڑ دیں؟ دوسری دنیا کو سدھار جائیں؟"

ماں جی نے خفگی سے کہا "لڑکے۔ کیا فضول بولے جا رہا ہے۔ سامنے رزق ہو تو منہ سے اچھی بات نکلنی چاہیے۔ خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔"

کھانے کے بعد ماں جی نے کہا "تو بھئی' اب تم کرو باتیں۔ میں تو جا رہی ہوں سونے کے لیے۔"

میں نے ان کے جانے کے بعد پوچھا "ماں جی کھانا کھاتے ہی سو جاتی ہیں؟"

عباسی نے کہا "نہیں۔ آج کچھ دیر سے کھانا کھایا ہم نے۔ یہ جلدی سونے کی عادی ہیں۔ دس بجے سو جاتی ہیں مگر ابھی یہ اپنے کمرے میں جا کے ایک گھنٹا تلاوت کریں گی پھر آدھا گھنٹا مصلّے پر بیٹھ کے دعائیں مانگتی رہیں گی۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہر روز کیا دعا کرتی ہیں؟"

میں نے کہا "ایک ماں کی ساری دعائیں آخر کس کے لیے ہوتی ہیں؟ اپنی اولاد کی زندگی۔ ان کی صحت اور سلامتی' خوشی اور خوشحالی کے لیے۔"

رخشی نے کہا "ماں جی صبح اٹھ جاتی ہیں فجر سے بھی ایک گھنٹا پہلے۔ تلاوت کے بعد نماز پڑھتی ہیں اور اس کے بعد چلی جاتی ہیں باہر باغ میں۔"

"اکیلی بیٹھی رہتی ہیں؟"

"نہیں۔ کبھی تم آ کے دیکھو۔ ان کے آس پاس پرندے جمع ہوتے ہیں۔ وہ انہیں دانہ ڈالتی ہیں۔ پرندے اتنے مانوس ہیں ان سے کہ کرسی کے بازو پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کے گھٹنوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور وہ باتیں کرتی رہتی ہیں ان سے۔ ان کا حال پوچھتی رہتی ہیں۔ سب کو پہچانتی ہیں۔ کل کہہ رہی تھیں کہ ایک مینا کئی دن سے نہیں آ رہی ہے۔ اللہ خیر کرے۔"

"اور تم پڑی رہتی ہو وہیں دوپہر تک؟"

عباسی ہنسا "تمہیں حیرت ہوئی یہ جان کر کہ اب یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہے۔ ماں جی کے ساتھ یہ خاتون بھی ہوتی ہیں۔"

"یہ میں کیا سن رہا ہوں رخشی! تم فجر سے پہلے اٹھ جاتی ہو نماز کے لیے؟"

اس نے جھینپ کے کہا "ساری بات ہوتی ہے ماحول کی۔ ماں جی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ خود میں نے کہا کہ مجھے بھی نماز کے وقت اٹھا دیں۔ پہلے دن انہوں نے جگایا تو میں نے آنکھیں کھول کے انہیں سلام کیا اور ان کے جاتے ہی پھر سو گئی۔ بعد میں بڑی شرم آئی مجھے۔ اگلے دن انہوں نے مجھے نہیں جگایا۔ یہ سوچا ہو گا کہ برسوں کی عادت ایک دن میں کہاں چھٹتی ہے۔ زبردستی کرنے سے کیا فائدہ۔ گھر میں نے الارم لگایا اور خود اٹھ گئی۔ وہ بہت خوش ہوئیں۔ اب تمہیں کیا بتاؤں' اس روز عجیب سکون ملا مجھے جس سے میں نا آشنا تھی اور اتنا مزہ آیا۔"

عباسی نے اس کی بات کاٹ دی "کہ شامت آئی میری۔ اب ان کا معمول بھی یہی ہے۔ صبح چڑیوں کے ساتھ یہ بھی چہک رہی ہوتی ہیں۔ لگتا ہے دانہ بھی چگنا شروع کر دیں گی۔"

اگر دانہ پانی ہے یہاں تو پھر یہ اور کہاں جا سکتی ہیں" میں نے کہا۔

میری ذو معنی بات پر رخشی بوکھلا گئی "میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔ آپ لوگ چل کے ڈرائنگ روم میں تشریف رکھیں۔"

میں اور فرید ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ رئیس کی عطا کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئی صلت سے نصف کھانے میں اور باتوں باتوں میں ختم ہوگئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ شاید رئیس کے لیے بھی وقت پر لوٹ کے آنا مشکل ہوگا۔ ربڑی کھاتے ہوئے اسے یہ خیال کہاں رہے گا کہ وقت گزر رہا ہے۔

خود میں یہاں آکے بہت پُرسکون ہوگیا تھا۔ تہ خانے کی تنہائی میں ایک گھنٹا گزارے نہیں گزرتا تھا۔

"ماں جی بہت پسند کرنے لگی ہیں رخشی کو" فرید نے سر کھجا کے کہا۔

"ماں جی!" میں نے اسے غور سے دیکھا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں نے اسے پسند کرلیا ہے اور ماں جی نے ہر ماں کی طرح میری پسند کو پسند کرلیا ہے۔"

وہ کچھ جھینپا "ایک ہی بات ہے۔"

"ایک ہی بات ہے تو گھما پھرا کے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں کھلی آنکھوں سے سب دیکھ رہا ہوں بیٹے اور بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔"

"پھر کیا خیال ہے تیرا؟" فرید بھی بے تکلفی میں تم سے تو پر آگیا "فی الحال تم دونوں اچھی ایکٹنگ کررہے ہو۔ مجھے امپریس کررہی ہے کہ جس بہو کی انہیں تلاش تھی وہ خود چل کے ان کے گھر پہنچ گئی ہے۔ اس سے پہلے وہ اس تلاش میں کہاں کہاں بھٹکی ہوں گی مگر اس کے باوجود ان کا انتخاب غلط ثابت ہوا اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کا صدمہ تمہیں اٹھانا پڑا۔"

"بہو تلاش کرنے کا روایتی طریقہ تو ایک جوا ہوتا ہے۔ شادی سے پہلے لڑکی کچھ اور نظر آتی ہے۔ سب دکھاوے کے طور طریقے ہوتے ہیں اور باقی اس کے گھر والوں کی پبلسٹی کہ ہماری بیٹی تو ایسی سگھڑ ہے۔ ایسی سعادت مند ہے اور اتنی نیک ہے۔ بالکل اللہ میاں کی گائے مگر بعد میں اس گائے کو کھونٹے سے باندھ کے رکھنا آدم خور شیر کو پالنے سے زیادہ مشکل ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہے اس مرتبہ وہ بہت قریب سے صبح شام سب کچھ خود دیکھ رہی ہیں اور براہ راست مشاہدہ کررہی ہیں۔"

"میں پھر وہی سوال کرتا ہوں۔ تیرا اپنا کیا خیال ہے رخشی کے بارے میں؟"

"دیکھ یار۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ اس پسند کو بھی میں نے واضح طور پر نوٹ کرلیا تھا۔ اب جو کچھ وہ یہاں کررہی ہے صرف تیرے لیے کررہی ہے۔ تیرے دل تک اسے رسائی حاصل ہوچکی ہے مگر گھر میں شریکِ حیات کی حیثیت سے رسائی کے لیے اس نے بہت صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ ماں کو اپنی خدمت گزاری' امور خانہ داری' سلیقہ شعاری اور ایسی ہی باتوں سے شیشے میں اتار رہی ہے۔"

وہ کچھ مایوس ہوا "کیا مطلب؟ بعد میں رخشی یہ سب چھوڑ دے گی۔ وہ دھوکا دے رہی ہے ماں کو؟"

"نہیں۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل اس کی زندگی شاہ عالم کے ساتھ بالکل مختلف انداز میں گزری تھی۔ جیسا وہ بننا چاہتی تھی۔ ایک عام قسم کی وفادار بیوی اور گھریلو عورت۔ اس کا شاہ عالم نے رخشی کو موقع ہی نہیں دیا اور نہ اس کے اندر کی عورت کی قدر ہوئی۔ کئی برس بے التفاتی اور بے حسی کی گرد پڑنے سے اس کے جذبات کے سارے روشن رنگ دب گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وفاداری کی مجبوری ختم ہوئی تو اس حادثے نے لاشعوری طور پر اسے آزادی کا احساس عطا کیا اور آہستہ آہستہ اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ اب وہ جینا چاہتی ہے۔ ان تمام خوشیوں کے ساتھ جن کے خواب ادھورے رہ گئے تھے اور اس گھر میں اسے تیرے ساتھ زندگی گزارنا انہی خوابوں کی تعبیر جیسا لگتا ہے۔ وہ صرف حسین ہی نہیں' ایک ذہین اور پختہ شعور رکھنے والی عورت ہے۔ وہ ماں جی کو یہ تاثر دینا نہیں چاہتی کہ خدانخواستہ اس نے ان کے بھولے بھالے معصوم بیٹے کو پھانس لیا ہے یا پٹا اس کے حسن و شباب اور مال و زر کے جال میں خود گرفتار ہوگیا ہے۔ تبدیلی زندگی کے ہر دور میں اور عمر کے ہر حصے میں آتی ہے۔ شاہ عالم سے شادی سے قبل کی رخشی کچھ اور تھی۔ شاہ عالم کی شریکِ حیات بن کے وہ ایک مصنوعی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ آج وہ کچھ اور ہے۔ کل اگر وہ اس گھر میں مالکن بن کے آئی تو اس کا رویہ تھوڑا بہت ضرور بدلے گا۔ یہ ایک فطری بات ہے۔ اس سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ تبدیلی بھی مثبت ہوگی۔"

فرید نے ایک گہری سانس لی "تھینک یو یار۔ تو نے میری مشکل آسان کردی۔ میں ایک احساسِ ندامت کا شکار تھا کہ کہیں میں خود غرضانہ نیک نیتی کا مظاہرہ تو نہیں کررہا ہوں۔ ایک پناہ لینے والی عورت کا جذباتی استحصال تو نہیں کررہا ہوں۔"

"اگر تیرے جذبات کی بنیاد خلوص پر استوار ہے اور تو پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ وہ ایک اچھی رفیقِ شب نہیں بلکہ رفیقِ حیات ثابت ہوگی تو پھر ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں اور اگر اس کے یا تیرے دل میں تذبذب ہے تو کچھ دن اور گزر جانے دو۔ ایک وقت آئے گا جب تم محسوس کرلو گے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ شک کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ تم ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہو۔"

"یو آر رائٹ۔ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں عجلت پسندی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔"

یہ آخری جملہ رخشی نے بھی اندر چائے لاتے ہوئے سنا۔

"سبحان اللہ' اتنے دن بعد بھی آپ یہاں بیٹھے یہ طے کرنے میں مصروف ہیں کہ ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔"

ہم دونوں بے ساختہ ہنس پڑے "دراصل فرید مجھے لگتا ہے جیومیٹری کے مسئلہ فیثاغورث کی طرح۔ جو مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ جب میں میٹرک میں پڑھتا تھا۔"

"اور نا صر مجھے الجبرے کی BINOMMIAL تھیورم کی طرح لگتا ہے۔ جو انٹر میں عذاب جاں بن گئی تھی میرے لیے" فرید نے سر ہلا کے کہا۔

ہماری فضول تاویل سے زیادہ ہماری ہنسی نے واضح کردیا کہ اصل بات کچھ اور تھی اور ہم نے رخشی کو ٹال دیا ہے لیکن یہ اندازہ اسے نہ ہو سکا کہ موضوعِ سخن خود اس کی ذات تھی۔

"آدمی خواہ مخواہ جان کا عذاب سمجھ لے تو بات اور ہے۔" وہ بولی۔

"خواہ مخواہ کیا۔ ابھی جو کچھ میں نے ماں جی کی وجہ سے اخلاقاً زہر مار کیا' وہ عذابِ جاں نہیں تو اور کیا تھا۔"

وہ خفا ہو کے بولی "اتنا برا پکایا تھا میں نے؟"

"اوہ۔ تم نے پکایا تھا؟ سوری۔ خیر' اب سچ نکل گیا ہے منہ سے تو اس پر جھوٹ کا پردہ ڈالنے سے کیا فائدہ۔ میں فرید تو ہوں نہیں کہ خود پر جبر کرکے جھوٹ بولوں اور تعریف کروں اس کھانے کی۔ اس سے اچھا تو مل جاتا ہے کسی جھونپڑی سا ہوٹل میں۔"

"تو کھا لیتے وہیں جا کے۔"

میں نے کہا "رخشی' اس میں ناراضی کی بھلا کون سی بات ہے۔ تم کہہ سکتی ہو کہ میں بالکل آؤٹ آف پریکٹس ہوں۔ کھانا پکانا بھول گئی ہوں' کبھی پکایا نہیں تھا۔"

فرید نے کہا "یار' نسخہ تو ٹھیک تھا۔ بالکل کتاب کے مطابق۔ کون سی کتاب میں دیکھ رہی تھیں تم رخشی" فرید نے کہا۔

رخشی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا منہ سوج گیا تھا۔

میں نے کہا "مقدار میں کچھ گڑبڑ ہو گئی شاید۔ اس میں لکھا ہوگا کہ ایک ٹی اسپون نمک۔ رخشی کے ہاتھ میں آگیا ٹیبل اسپون۔ مرچوں کے بھی دو چمچے ڈال دیے بڑے والے۔ بندہ بشر خطا کا پتلا ہے' کوئی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں یار۔ پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی ہے" فرید بولا۔

میں نے معصومیت سے کہا "پیٹ میں؟ ابھی تو کہہ رہا تھا کہ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی۔ کیا ہے پورا شعر۔"

فرید بولا "یار' مجھے شرم آتی ہے رخشی کے سامنے۔ بعد میں سناؤں گا۔"

رخشی کا چہرہ پہلے غصے سے لال ہو رہا تھا' اب اچانک اسے احساس ہوا کہ بات کا رخ بدل گیا ہے۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے انجان بن جانا بہتر سمجھا۔

وہ ہنس پڑی "آئندہ میں کتاب سامنے رکھ دوں گی۔ نمک مرچ اور سب مسالے سب کتاب میں دیکھ کے ایسے ہی پھانک لینا اور اوپر سے پانی پی لینا۔"

"میں مذاق کر رہا تھا رخشی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے کیا کمال کا کھانا بنایا تھا۔ تم جیسی دوسری مل جاتی تو میں ہی کر لیتا شادی" میں نے کہا۔

فرید نے مجھے تسلی دی "نہ ملے تو اسی خانساماں سے پوچھ لینا جس کی شاگردی رخشی نے کی تھی۔ کون تھے وہ رخشی' تمہارے ماموں؟"

"تم دونوں مل کے مجھے تنگ کرنا چاہتے ہو' میں جا رہی ہوں۔"

میں نے اسے روکا "اچھا اب فضول بات کروں تو جو فرید کی سزا وہ میری۔ میں تم سے ایک کام کی بات کرنے آیا تھا۔"

"نہیں کرنی مجھے کام کی بات بھی۔"

فرید نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھالیا "اس وقت پھر مجھے ایک شعر یاد آرہا ہے' غصے والا مگر تم کو سن کے اور غصہ آئے گا۔"

رخشی بھی سمجھ گئی ہوگی کہ شعر کون سا ہو سکتا ہے۔ ایسے ہر موقع کے لیے وہ شعر ضرب المثل بن گیا ہے۔ ان کو آتا ہے پیار پر غصہ۔ ہم کو غصے پہ پیار آتا ہے۔

مگر رخشی نے انجان بن کے کہا "کون سا شعر؟"

میں نے کہا "رخشی۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ شاہ عالم کا تھا وہ سب بلا تاخیر تمہارے حوالے کردوں۔"

فرید نے کہا "کردو۔ ابھی کردو۔"

رخشی نے اسے گھورا "آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ نہ تم کہیں بھاگے جا رہے ہو نہ میں۔"

میں نے کہا "میرا کچھ بھروسا نہیں۔ کیا پتا مجھے سچ مچ

بھاگنا پڑے۔ کوشش تو دشمنوں کی یہ ہے کہ مجھے ذرا بھی مہلت دیے بغیر گوو جٹ گون کردیں۔"

رخشی مسکرانے لگی "ان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" فرید بولا۔

"میں اپنے سر سے قرض کا یہ بار اتارنا چاہتا ہوں۔ جو تمہارا ہے اسے تم خود سنبھالو۔ یہ قانونی کام ہے۔ میرے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی کو جنرل پاور آف اٹارنی دے دوں۔ آگے تمہاری مرضی' تم پراپرٹی رکھنا چاہو تو تمہارے نام ہو جائے گی۔"

رخشی نے نفی میں سر ہلایا "میں پراپرٹی کے معاملات نہیں سنبھال سکتی۔"

"تو پھر سب فروخت کردو اور کسی غیر ملکی بینک میں فارن کرنسی اکاؤنٹ رکھو۔ ڈالر کی قیمت بڑھے گی تو تمہارا سرمایہ خود بخود بڑھے گا۔ جہاں اس نے انویسٹ منٹ کر رکھی تھی اسے رہنے دو۔ شیئر سرٹیفکیٹ اپنے نام ٹرانسفر کراؤ۔ ہر چیز تمہارے ہاتھ میں اور تمہارے کنٹرول میں رہنی چاہیے۔"

رخشی نے آہستہ سے کہا "جیسے تمہارا جی چاہے کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میں نے کہا "فرید۔ تو نے اپنے کزن سے بات کی۔ فیصل سے؟"

"اب بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود اس کا پارٹنر ہوں۔ وکیل تو میں ہی ہوں" وہ بولا۔

"مگر میں بہتر یہ سمجھتا ہوں کہ مختار نامہ فیصل کے نام پر ہو۔ وہی سب کچھ کرے۔ رخشی تمہارے گھر میں تمہارے ساتھ ہے۔ کوئی اس کا غلط مطلب نہ نکالے۔ میں مانتا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ رخشی کو تم پر بھی اعتبار ہے۔"

فرید نے سوچ کے کہا "تیری بات ٹھیک ہے یار لیکن وہاں بھی تو میرے نام اور فیصل نام کا ایک ہی مطلب ہے۔ یہ کام کوئی اور وکیل بھی کر سکتا ہے فیس لے کر۔ شاہ عالم کا قانونی مشیر کون تھا؟"

"بیرسٹر سلطان محمود!"

"پھر کیا مسئلہ ہے۔ ان کے لیے آسانی ہوگی۔"

میں نے کہا "شاید مجھے معلوم نہیں۔ میری وجہ سے ان کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ قانونی مقدمات میں میری وکالت نہ کریں۔ وہ اصول پرست آدمی ہیں۔ انہوں نے دھمکی دینے والوں کی بات ماننے سے انکار کردیا تھا مگر اصول پرستی کی سزا ایک شخص کو نہیں ملتی۔ اب تو یہ چلن بن گیا ہے کہ نشانہ فیملی کو بناؤ۔ ساری اصول پرستی کی اکڑفوں نکل جاتی ہے۔ میں نے اس سے پہلے ہی مناسب سمجھا کہ انہیں اس ذمے داری سے سبکدوش کردیا جائے۔ تو نے فیصل سے اور کوئی بات کی تھی میرے بارے میں؟"

"ہاں۔ پوچھا تھا کہ آخر وہ شاہ عالم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک بار شاہ عالم نے اسے بہت ذلیل کیا تھا۔ دفتر میں آکے گالیاں دی تھیں سب کے سامنے اور بعد میں غنڈوں سے پٹوایا تھا۔"

"آخر اختلاف کا سبب کیا تھا؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "وہی جو بیرسٹر سلطان محمود کے لیے تھا۔ اصول پرستی۔ فیصل کا مؤکل ایک غریب آدمی تھا۔ شاہ عالم کا ملازم رہا تھا۔ اس کی بہن پارٹی کے خواتین ونگ کی کارکن بن گئی تھی۔ جذباتی قسم کی' بڑے جوش و خروش سے جلسے جلوسوں میں شریک ہوتی تھی اور شاہ عالم زندہ باد۔ شاہ عالم آوے ہی آوے قسم کے نعرے بھی لگاتی تھی' خوب صورت لڑکی تھی۔ شاہ عالم نے اسے پارٹی میں عہدہ دے دیا اور پھر اپنا پولیٹیکل سیکریٹری بنالیا۔ وہ ہر جگہ شاہ عالم کے ساتھ رہتی تھی۔ پارٹی کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوتی تھی۔ اس کا انجام آخر کیا ہو سکتا تھا؟ شاہ عالم اس کا آئیڈیل پہلے سے تھا۔ ایک مرد کی حیثیت سے بھی ذہین اور پرکشش تھا۔ اس کی قربت نصیب ہوئی تو لڑکی نے اسے اپنی خوش قسمتی اور اپنا اعزاز سمجھ لیا۔ شاہ عالم نے اس سے شادی کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔"

"اسی جال میں تو پھنس جاتی ہیں خواب پرست عورتیں" رخشی نے تلخی سے کہا "نہ جانے کس سے وعدہ کیا ہوگا اس نے۔ کم سے کم دو کا تجھے بھی علم ہے۔ ان میں ایک یہ لڑکی تھی' تمہیں بتایا تھا میں نے۔"

"اچھا۔ مجھے یاد نہیں" میں نے کہا۔

"جب اس نے کہا کہ میں ماں بننے والی ہوں اور تم نے اب بھی شادی نہ کی مجھ سے تو میں سب کو بتادوں گی۔ ویسے بھی سب جانتے بھی تھے" رخشی نے کہا۔

"اس کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی وہ بے وقوف لڑکی۔ عقل ہوتی اس میں تو اس آئیڈیلزم کے چکر میں بھی کیوں پڑتی" میں نے افسوس سے کہا۔

"جب بلیک میلنگ کی دھمکی دی اس نے تو شاہ عالم نے وہی کیا جو اس جیسے لوگ کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ اسے یقیناً پہلے سے اندازہ ہوگا اور اس نے طے کر رکھا ہوگا کہ اس مصیبت سے جان چھڑانے کے لیے وہ موجہ تین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکاتی ایجنڈے پر عمل کرے گا۔ نمبر ایک' انکار کرے گا کہ وہ اس بچے کا باپ نہیں ہے اور وہ کسی اور کی مصیبت اس کے گلے ڈال رہی ہے۔ نمبر دو' لڑکی کو قائل کرے گا کہ وہ معقول رقم لے کر ماں بننے کے ارادے کو چھوڑ دے اور نمبر تین یہ کہ لڑکی نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا اور اپنی ضد پر اڑی رہی تو پھر نہ رہے بانس نہ بجے بانسری والے فارمولے پر عمل کیا جائے گا اور اس نے یہی کیا۔ لڑکی کے بھائی نے فحاء عالم کے خلاف قانونی کارروائی کا مطالبہ کیا کیونکہ پولیس اس کی رپورٹ لکھنے پر تیار نہ تھی پھر کسی نے اسے فیصل کے پاس بھیج دیا۔ فیصل نے ہائی کورٹ میں کیس کردیا کہ ایف آئی آر درج کی جائے ملزم کے خلاف اور لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ شاہ عالم نے فیصل کو سمجھایا' لالچ دیا' دھمکایا اور پھر ایک دن فاتح عالم فورس کے جوان اس کے دفتر میں گھس گئے۔ انہوں نے بڑی توڑ پھوڑ کی اور فیصل کو بھی مارا پیٹا۔ اس وقت وہ اکیلا تھا۔ حملہ آور جاتے جاتے دھمکی دے گئے کہ وہ راہِ راست پر نہ آیا تو اگلی بار اس کے گھر اور دفتر کو آگ لگادی جائے گی۔"

میں نے کہا "اس کیس میں کچھ ہوا؟"

"کچھ نہیں۔ ہائی کورٹ کی ہدایت پر پولیس نے ایف آئی آر درج کرلی مگر وہ غیرت مند بھائی مشکل میں پڑ گیا۔ اس کے خلاف چوری' ڈکیتی اور منشیات فروشی کے مقدمات درج ہوگئے۔ پولیس اور سی آئی اے والوں نے اس کا مسلسل ریمانڈ لیا اور اسے شاہ عالم کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے کی ایسی سخت سزا دی کہ بالآخر ایک دن اس نے خودکشی کرلی۔"

"اسی روایتی طریقے سے؟ جو پولیس کے ترجمان بتاتے ہیں۔"

"ہاں۔ اپنی شلوار کے ازار بند سے پھانسی۔"

"یار' میری بڑی خواہش ہے کہ کبھی کوئی عدالت کسی تھانے دار سے کہے کہ ذرا آپ ایسا کرکے دکھایئے۔ کسی بھی تھانے میں آپ کو ازار بند والی ایک شلوار فراہم کردی جائے گی۔ فرض کرلیتے ہیں کہ حوالات میں کوئی اور بند نہیں تھا اور باہر سنتری بھی موجود نہیں تھا جو روکے۔ کوئی خود کو پھانسی کیسے دے سکتا ہے ازار بند سے۔ عدالت خود دیکھے گی اور فکر کی کوئی بات نہیں تھانے دار صاحب' آپ کو مرنے نہیں دیا جائے گا۔"

"چھوڑ یار' ایسا سوچنا بھی لاحاصل ہے۔ فیصل اس بات کو کیسے بھول سکتا ہے۔ اس کے دل میں شاہ عالم کے خلاف نفرت کے جذبات انتہائی شدید ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا اندازہ ہے۔"

"میں نے بات شروع ہی کی تھی کہ وہ بگڑ گیا۔ کہنے لگا کہ اس کا نام مت لے میرے سامنے اور اس سے کہہ دینا کہ پھر مجھے اپنی شکل نہ دکھائے کبھی۔ اگر اس نے یہاں آنے کی غلطی کی تو میں خود گولی ماروں گا اسے اور پھر پولیس کو اطلاع دے دوں گا کہ آکے لاش لے جائے۔ وہ ایک مفرور اور مطلوب اشتہاری مجرم ہے جس کے خلاف قتل کے مقدمات ہیں۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ شاہ عالم اب وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہے مگر اس نے کہا کہ وہ خود بھی یہاں آیا تھا تو یہی کہہ رہا تھا مگر خصلت بدل سکتی ہے بھلا کسی کی؟ شد کی مکھی کبھی کہ اب میں بے ضرر اور خوشنما تتلی بن گئی ہوں تو کوئی مانے گا اور دیکھ لو اس نے خدا بخش مندرانی کے ساتھ کیا کیا؟ اس کی طرف ایک ہاتھ دوستی کا بڑھایا اور دوسرے ہاتھ سے اسے بم تھمادیا۔"

میں نے کہا "تو نے یہ راز تو فاش نہیں کیا کہ میں اصل شاہ عالم نہیں ہوں۔"

"نہیں۔ شاید وہ یقین نہ کرتا۔ مجھے اس کو اول تا آخر ساری بات سمجھانی پڑی۔ وہ ویسے بھی کچھ سننے پر راضی نہیں تھا۔ الٹا مجھ پر بگڑ رہا تھا کہ آخر تو اتنی شدومد سے شاہ عالم کی وکالت کیوں کر رہا ہے۔ اور بالفرض محال وہ میری سن لیتا اور یہ مان بھی لیتا کہ تو ناصر عظیم ہے جس نے خود کو قانونی طور پر شاہ عالم تسلیم کرالیا ہے۔ تو معلوم نہیں اس پر فیصل کا ردِعمل کیا ہوتا۔ وہ بہرحال ایک وکیل ہے۔ وہ کہتا کہ میری نظر میں یہ بہت بڑا فراڈ ہے جو قانون کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

"تو بھی ایک وکیل ہے' پہلے تھانے دار تھا۔"

فرید نے کہا "یار میری بات اور ہے۔ میں شروع سے اس معاملے میں ملوث رہا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ جب آدمی کو ہر طرف سے دھکیل کر کنوئیں میں گرادیا جائے تو یہ کہنا غلط ہوگا کہ خدا نے اسے عقل دی تھی' وہ کنوئیں میں نہ کودتا۔ تھانے والے کسی بے گناہ کی خودکشی کرادیں اور اس پر کوئی سرکاری کارندہ گیر ملا فتویٰ صادر کردے کہ یہ حرام موت تھی۔ تو اسے کیا کہا جائے گا؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "چل یار۔ خدا نے مجھے عقل دی۔ بہت دی اور موقع دیا کہ میں اس کنوئیں سے نکل آؤں جس میں مجھے گرادیا گیا تھا۔ اب میں شاہ عالم کو اس دنیا سے ایسے غائب کردینا چاہتا ہوں جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ یہ بعد میں دیکھا جائے گا کہ کیا اسے سچ مچ مردہ قرار دے کر دفن کرنا ممکن ہے۔ فی الحال تو میں روپوشی میں ہی سلامتی دیکھتا ہوں۔"

"یہ کام بھی آسان نہیں ہوگا۔"

"اپنی مشکلات کی دلدل سے نکلنا یقیناً بہت مشکل کام ہے۔ اس کا اندازہ کرسکتا ہوں میں۔ شاہ عالم کے مالی معاملات کا مسئلہ طے ہوجائے تو پھر شاہ عالم کی ضرورت بھی ختم ہوجائے گی۔ کچھ عرصے میں بھیس بدل کے پھروں گا اور دیکھوں گا کہ شاہ عالم کے غائب ہوجانے کا کیا ردِعمل سامنے آتا ہے۔"

"اس کے لیے بھی ایک مہم چلانی پڑے گی اخبارات میں۔ ایک باقاعدہ کیمپین..... چلانی پڑے گی۔"

"سب کریں گے یار۔ مل کے کریں گے۔ رئیس کے علاوہ مجھے تیری حمایت حاصل ہے۔ رخشی میرا نہ سہی تیرا ساتھ دے گی۔"

"مجھے تو معاف ہی رکھو ان چکربازیوں سے۔" وہ بولی "میں کسی کے ساتھ نہیں ہوں۔"

"آج نہیں تو کل ہوجاؤ گی۔ آخر اب تک سب سے زیادہ سپورٹ مجھے تم سے ہی ملی تھی۔ تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو شاہ عالم کون تسلیم کرتا مجھے۔"

"تم شبنم کو کیسے بھول رہے ہو؟" رخشی نے شرارت آمیز سنجیدگی سے کہا "عدالت سے بڑی سند اس کی قبولیت ہے۔"

"ہاں اور ابھی تک میں یہ نہیں طے کرپایا کہ اس سے کیسے پیچھا چھڑاؤں۔"

"یہ کتنی سنگدلی کی بات ہوگی۔ کیا تم واقعی ایسا کرنا چاہتے ہو؟" رخشی نے کہا۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوگا۔ میں کمبل کو چھوڑنا چاہوں مگر کمبل مجھے نہیں چھوڑے گا۔ گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل والا مسئلہ ہے۔ اسے شریکِ راز کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ وہ پاگل لڑکی نہ جانے کیا کر بیٹھے۔" میں نے کہا۔

"یار' ایک بات بتا مجھے۔ وہ شاہ عالم کو چاہتی ہے نا اس کے نام پر مرتی ہے۔ شاہ عالم اگر کسی مجبوری کے باعث اپنا نام بدل لیتا ہے۔ روپوشی اختیار کرتا ہے۔ لاہور سے کراچی یا لندن چلا جاتا ہے۔ سیاست چھوڑ کے تجارت یا زراعت کا پیشہ اختیار کرلیتا ہے۔ تو کیا شبنم کو فرق پڑے گا؟"

"میرا خیال ہے نہیں۔"

"تو پھر ڈر کیسا۔ اسے بتادے کہ اب میں شاہ عالم کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ میرے دشمن اس زندگی کے درپے ہیں۔ میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا اس لیے اپنا نام ناصر عظیم کرلیا ہے۔ یہ بھیس بدلا ہے اور اب باقی زندگی کبھی کوچۂ سیاست میں قدم نہیں رکھوں گا۔ تم اسے بتاسکتے ہو کہ اسی لیے میں نے اپنی بیوی کو چھوڑا۔ سارا کاروبار اور جائداد اسے دے دی۔ اب میں ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہوں۔"

"پھر وہ دنیا کے آخری کنارے تک اور زندگی کی آخری سانس تک تمہارا ساتھ نبھائے گی" رخشی نے کہا۔

"یہی تو مشکل ہے" میں نے کہا "مگر ابھی اس طرح کچھ دن گزارے جاسکتے ہیں۔"

"اور کچھ دن بعد؟" فرید بولا۔

"یار' ناصر عظیم کیا لوٹ کے اپنے گھر نہیں جائے گا؟ اور جائے گا تو شبنم کو کس طرح ساتھ لے جائے گا؟" میں نے کہا۔

باہر سے رئیس خان کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ میں اٹھا تو فرید نے مجھے روک لیا "اتنی جلدی کیا ہے۔ پوری بات کیے بغیر بھاگنے کی؟"

میں نے کہا "باتیں ہوتی رہیں گی۔ یار زندہ صحبت باقی۔ یہ کون سی آخری ملاقات ہے ہماری۔"

رخشی بولی "ہاں۔ ناشتا کرکے اور کھانا کھا کے بک بک کرنے کے لیے آتے رہنا۔"

"کیوں نہیں۔ ہم تو تمہاری شادی کے بعد بھی آتے رہیں گے اسی طرح اپنا گھر سمجھ کے" میں نے کہا۔

اس نے سٹپٹا کے کہا "میری شادی؟ پاگل ہوگئے ہو بالکل۔"

میں نے معصوم بن کے کہا "کیوں؟ بھئی اب تم آزاد ہو۔ شاہ عالم سے تو کوئی تعلق نہیں رہا۔ عدت کا زمانہ بھی ختم ہوگیا۔ ایک نہ ایک دن شادی تو کروگی۔ آخر یہ پہاڑ سی زندگی کیسے کٹے گی۔ محاورے کے مطابق۔"

"چلو نکلو یہاں سے۔ پہلے اپنی زندگی کے بارے میں سوچو' پھر رہے ہو دنیا میں لاوارث اونٹ کی طرح اِدھر اُدھر جھانکتے' منہ مارتے۔"

رئیس نے پھر ہارن دیا تو میں نے چلتے چلتے کہا "کچھ اس بے چارے کے بارے میں بھی سوچو جو تجھ سے زیادہ معصوم ہے۔ ایک بیوی کی غلامی کرتا تھا' وہ نہیں رہی۔ سرکار کی غلامی کی۔ وہاں سے بھی نکالا گیا۔ اسے بڑی ضرورت ہے کسی کے سایۂ عاطفت کی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرید نے جز بز ہو کے کہا "ایسا لگتا ہے کہ تم بے عزت ہو کے ہی نکلو گے ہمارے گھر سے۔"

میں دروازے میں رک گیا "یہ آپ نے جمع کا صیغہ استعمال کیا ہے؟ ہمارے گھر نہیں آپ کو میرے گھر کہنا چاہیے۔"

مصنوعی غصے کے ساتھ خفت آمیز ہنسی کے پیچھے رخشی کے دلی جذبات کی پُرمسرت کھنک صاف سنائی دیتی تھی۔ اس نے شرما کے فرید کو دیکھا "شاہ جی کو آج اچانک کیا ہو گیا ہے؟"

فرید نے اس کی مسکراہٹ کا بھرپور استقبال کیا "کچھ نہیں۔ بس وہ پرانا ناصر عظیم ہو گیا ہے۔ شاید وہ ایسا ہی تھا۔"

میں نے باہر آ کے دیکھا تو گاڑی میں اکیلا تیس مار خان بیٹھا ہوا تھا۔ رئیس ہوتا تو بلا تکلف اندر آ جاتا۔ "وہ خود کہاں رہ گیا؟ تمہارا آقا؟" میں نے کہا۔

وہ بولا "وہ آپ کا انتظار کرتا صاب۔ ہم کو بولتی تم اس کا بچے کو لاتی۔"

"کس کے بچے کو لانا ہے؟" میں نے حیرانی سے کہا۔

اس نے دکھ سے نفی میں سر ہلایا "نہیں صاب۔ ہم اس کا نام نہیں لیتی۔ وہ حرام جانور ہوتی' زبان ناپاک ہوتی۔"

فرید ہنسنے لگا۔ رخشی پھر مسکرانے لگی۔ میں ان سے رخصت ہو کے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں تیس مار خان نے اپنی اردو میں مجھے مطلع کیا کہ رئیس کے ساتھ اس کی محبوبۂ دلنواز مسماۃ ریڑی کی ملاقات برائے تجدید تعلقات کا ایک افسوسناک انجام ہوا اور اگر تیس مار خان نہ ہوتا تو آج خود رئیس کا افسوس ناک انجام یقینی تھا۔ خون کے پیاسے جان کے دشمنوں کا ایک لشکر اس کے پیچھے تھا مگر ریڑی بہادری سے ان سب کے عزائم کو شکست دیتے ہوئے آقا اور غلام جائے واردات سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دل پر بے وفائی کے زخم بڑے گہرے ہوں گے مگر جسم کی ساری ہڈیاں صحیح سالم اور اپنی جگہ پر تھیں۔ اب رئیس خان کو میرے جیسے دوست اور غم خوار کی اشد ضرورت تھی ورنہ معلوم نہیں وہ کیا کر بیٹھے۔

تیس مار خان فکر و غم اور مایوسی کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایسے صدمۂ جانکاہ کے بعد رئیس کا ذہنی توازن بگڑ جائے گا۔

میں نے اسے تسلی دی "وہ پہلے ہی بگڑا ہوا ہے۔ اس کے کردار سے زیادہ۔"

تیس مار خان نے نفی میں سر ہلایا "آپ نہیں سمجھتی صاب۔ وہ پاگل نہیں ہوئی تو ام الخبائث میں غرق ہوتی۔"

میں اس کی زبان سے یہ لفظ سن کے حیران رہ گیا۔ "شراب کا اتنا مشکل نام تمہیں کس نے سکھا دیا؟"

"مولبی صاب بولتی۔ ناپاک چیز کا نام نہیں لیتی۔"

میں نے کہا "محبت میں ناکامی پر شراب کا سہارا لینے والا فارمولا فلمی ہے۔ زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ خصوصاً رئیس کی زندگی میں۔"

تیس مار خان قائل نہیں ہوا "صاب وہ مینا پر پاکستان پر چڑھ جاتی اور کود جاتی۔ پُل سے راوی میں چھلانگ مارتی۔"

میں نے کہا "یار' یہ سب نہیں ہو گا۔ تم دیکھ لینا دو چار دن میں اسے پھر کوئی مل جائے گی' بالوشاہی یا فلاقند۔"

"وہ ہم سے ایسا بولتی صاب۔ کہ ایک دم مر جائے گی۔ بالکل فوت ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "تم کب سے ہو اس کے ساتھ' ایک سال سے؟ میں دس سال سے دیکھ رہا ہوں یہ سب۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ ہر سال ایسا ہی ہوتا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

تیس مار خان کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس وفادار جاں نثار کو یہ تشویش لاحق رہی کہ میں نے کچھ نہ کیا تو اس کا مالک یقیناً صدمۂ عشق کی تاب نہ لا کے اس جہاں سے ناکام و نامراد رخصت ہو جائے گا۔

رئیس خان زیرِ زمین اپنے عشق کے ظلمت کدے میں یوں گردش فرما رہے تھے جیسے طول شب فراق کو اپنے قدموں سے ناپ رہے ہوں۔ اس عاشقِ صادق کی ہذیانی کیفیت کے مقابلے میں ظاہری حالت قابلِ رحم حد تک مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔ ظالم سماج نے اس کے ساتھ عبرت ناک سلوک کیا تھا۔ اس کی ہڈیاں ضرور سلامت تھیں مگر چہرے کا جغرافیہ بہت بدل گیا تھا۔

میں نے کہا "یار' تو اکیلا ہی چلا گیا میک اَپ کرانے۔"

رئیس نے مجھے مجروح نظروں سے دیکھا "یار' تجھ سے امید نہیں تھی کہ تو بھی زخموں پر نمک پوشی کرے گا غم گزاری کی جگہ۔"

میں نے کہا "نمک پاشی اور غم گساری کہتے ہیں سالے۔"

وہ جھلا کے بولا "اب اپنی جان پر بنی ہے تجھے اردو کی زیادہ فکر ہے۔ قسم اللہ کی بس تیرا ہی انتظار تھا۔"

میں نے کہا "چل میں آ گیا۔ اب بتا دے تیری وفات حسرت آیات کے بعد مجھے کیا کرنا ہے؟ وصیت کرنی ہے کوئی

خودکشی سے پہلے؟"

وہ دھم سے صوفے پر گر گیا "ابے یہی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پہلے سوچا ناس کر لوں۔ پھر خیال آیا تیرا کہ اپنا یار اتنا قابل اور عقلمند ہے۔ تو بتا مجھے کیا کرنا چاہیے یار؟"

میں نے کہا "تجھے ابھی تو سو جانا چاہیے آرام سے۔"

"یہ مذاق کی بات نہیں یار۔ مجھے بتا میں کس کا خاتمہ کروں۔ اپنی زندگی کا یا اس بدروحوں کے کنبے کا؟ جنہوں نے یہ حال کیا میرا۔" وہ سخت غصے میں تھا۔

"جو آسان ہو وہ کام کر" میں نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"اپنے لیے کچھ مشکل نہیں یار۔ یہ دیکھ' بالکل نئی رسی پڑی ہے یہاں۔ پھانسی لٹک جاؤں گا میں تیرے سامنے اور یہ میں نے کھٹمل مار تیل میں چوہے مار گولیاں حل کر کے رکھی ہیں' اس گلاس میں۔"

میں نے بے نیازی سے دیکھا "مجھے تو کوک لگتی ہے گلاس میں۔ خیر' یہ پی کے پھانسی پر لٹکے گا تو اچھا رہے گا۔ کیمرا ہے تو مجھے دے دینا۔ میں تیری ایسی تصویریں بناؤں گا اسے دکھانے کے لیے کہ اس کا کلیجا پھٹ جائے پھر وہ خود پھٹ جائے۔"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ "سؤر کے بچے۔ لعنت تیری دوستی پر۔ اس سے اچھا تھا کہ میں ناس کر لیتا کہ یہ خودپیوں یا اسے پلاؤں؟ تو مشورہ دینے کے بجائے مذاق اڑا رہا ہے میرے جذبات کا۔"

میں نے کہا "مشورہ بعد میں دوں گا۔ پہلے بتا آخر ہوا کیا تیرے ساتھ؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سامنے رکھا ہوا گلاس اٹھا کے بولا "تو نے غلط سمجھا تھا۔ یہ کوک نہیں ہے یارے۔"

"پھر کیا ہے۔ پیپسی؟"

اس نے ایک گھونٹ لے کر کہا "ہاں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں سیریس نہیں ہوں۔ میں کتنے ارمانوں کے ساتھ گیا تھا اسے منانے۔ قسم اللہ کی وہ کہتی تو میں لکھ دیتا بکے کاغذ پر کہ شادی کے بعد سب کچھ چھوڑ دوں گا۔"

"سب کو یعنی اسے بھی' ریڑی کو بھی؟"

اس نے پھر ایک آہ اور ایک چسکی لی "اپن روز کی طرح پچھلی طرف سے گئے اور اس کی کھڑکی بجائی تو سالی نے اندر سے ہی کہا کہ چلے جاؤ۔ میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔ میں نے کہا کہ اچھا میری بات سن لو۔ بڑی مشکل سے مانی۔ کھڑکی کھولی ہی تھی کہ اپن چڑھ گئے۔ یہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ وہ خود ادھر سے ہی نکل کے آتی تھی اور ہمیں بھی بلا لیتی تھی مگر الو کی پٹھی کا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ ایسا دھکا دیا کہ میں پلٹ کے گرا گلی میں۔ جیسے چھپکلی گرتی ہے چھت سے۔ سر نکال کے بولی کہ جاؤ اپنے یاروں کے پاس۔ مرغے لڑاؤ اور بدمعاشیاں کرو۔ بس یار' اپنا دماغ گھوم گیا۔ اس کے ساتھ ہم نے کون سی بدمعاشی کی۔ اتنی شرافت سے محبت کی اور شادی بھی تو کر رہے تھے۔ میں نے کہا تیری تو۔۔۔ اور چھلانگ لگائی ایک دم تو سؤر کی بچی نے کھڑکی بند کر دی۔ ہم توپ سے نکلے گولے کی طرح کھڑکی سے ٹکرائے اور پھر گرے گلی میں۔ دوسری بار تو پیارے اپن کو ہوش ہی نہیں تھا۔ ایک دھکے میں کھڑکی کھل گئی اور ہم اندر۔ بس سالی چیخنے لگی اور بلانے لگی ابا کو۔"

میں نے کہا "اچھا؟ کوئی ابا بھی ہے اس کا؟ مارتا اسے بھی ایک ہاتھ۔"

"وہ بڑا خوفناک ابا ہے یار۔ ہے قصاب مگر لگتا ہے پہلوان۔ وہ ایک دم آ گیا بنگلا اٹھا کے اندر۔ اس کے پیچھے بھائی آ گئے۔ سب سالے مشٹنڈے۔ ابا تو بگڑ اٹھانے لگا کہ ابھی تیرے سری پائے الگ کرتا ہوں بدمعاش۔ میں تو یار پلٹ کے بھاگا اور کھڑکی تک پہنچ ہی گیا تھا کہ ابا نے بچ بچ بچ اٹھا دیا۔"

میں نے کہا "بگڑ' غالباً وہ کنگ سائز اور ہیوی ویٹ چھرا ہوتا ہے جس سے قیمہ کرتے ہیں اور سری پائے بناتے ہیں؟"

"ہاں پیارے۔ میں نے غوطہ مار کے اسے دیا ایک دھکا اور وہ پیچھے گرا اپنی ہی اولاد پر۔ بس مجھے موقع مل گیا باہر نکلنے کا۔ وہ سالے میرے پیچھے ایک کے بعد ایک کودے اور آج تو قسمت ہی خراب تھی یار' ایک نے پیچھے سے مارا پتھر۔ وہ لگا گولی کی طرح ٹخنے پر۔ میں لنگڑاتا بھاگا مگر انہوں نے آ لیا۔ دیکھ کیا حشر کیا سالوں نے۔"

"اب تو سالا مت کہہ۔ تیری شادی کہاں ہو رہی ہے ان کی بہن سے۔ واقعی تیری ناک بھی خوفناک ہو گئی ہے اور آنکھ بال بال بچ گئی ورنہ تو آئندہ ہر عورت کو ایک آنکھ سے دیکھتا۔ ماں بہن سمجھتا سب کو۔ ذرا دانت دکھا۔ دو ہیں کہ چار۔ بتیسی حلق سے تو نہیں اتار دی۔"

وہ ایک دم جوش میں آ گیا "ابے کیسی باتیں کرتا ہے۔ اپن موت میں مار کھا رہے تھے۔ مگر حد ہوتی ہے شرافت کی بھی۔ جب میں نے نکالا ریوالور تو بھاگے شور مچاتے۔ ادھر سے ابا صاحب بھی دہاڑتے آ رہے تھے کہ پکڑ کے رکھو حرامی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو جیسے سچ مچ میرے پائے الگ کردے گا۔ قسم اللہ کی دونوں گھٹنوں میں سوراخ کردیتا اگر اپنی ریڑی کا خیال نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "بہت اچھا کیا تو نے کہ خود پر قابو رکھا۔"

وہ سخت افسردہ ہوگیا "مگر یار۔ میں ریڑی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے سچی محبت ہے اس سے۔"

میں نے کہا "اب بند کر یہ بکواس۔ بہت سن لی میں نے۔ اس سے پہلے کتنی بار سچی محبت کرچکا ہے تو۔ تیرہ بار۔؟"

"یار' میں سچ کہہ رہا ہوں" وہ بے بسی اور شرمندگی سے بولا۔

"میں بھی سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ چودھویں تھی۔ کل تجھے مل جائے گی پندرھویں اور پھر سولہویں۔ یہ تو ٹی وی کا سیریل ہے۔ سو محبت ایک افسانہ۔ وہ تیس مار خان سچ مچ پریشان تھا تیرے لیے" میں نے کہا۔

رئیس ہنسنے لگا "یار' میں ذرا لطف لے رہا تھا۔ اس ہنگامے کی وجہ سے اپن کہیں بھی نہیں گئے۔ وہ تیرا یار فرید ہنستا ہے ہماری صورت دیکھ کے۔ وہاں ہم کیا بتاتے کسی کو۔ قسم اللہ کی مار پہلی بار کھائی ہے رئیس خان نے کسی کے لیے۔"

میں نے کہا "ایک عظیم فلسفی کا قول ہے کہ مس ہوجائے تو لڑکی اور بس کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہیے جان کی بازی لگا کے۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے؟"

"دوسری کا انتظار کرنا چاہیے۔ کوئی بس آخری بس اور کوئی لڑکی آخری لڑکی نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

وہ بھڑک گیا "ابے واہ۔ یہ کس عظیم فلسفی کا قول ہے؟"

میں نے عاجزی سے کہا "وہ تیرے سامنے موجود ہے۔"

رات کے ایک بجے بالآخر رئیس ٹھنڈی آہیں بھرتا سونے کے لیے لیٹ گیا تو میں نے آزاد صاحب کو فون کیا۔ حسب معمول ان کی چیخ پکار جاری تھی مگر ان کے عتاب کا نشانہ اسٹاف نہیں تھا۔ وہ شبنم پر خفا ہو رہے تھے۔ پس منظر میں شبنم کی آواز کچھ دبی دبی سنائی دے رہی تھی۔ "سر۔ آپ سنیں تو سہی۔"

"اجی کس کا سر گویا اور کہاں کا سر۔" انہوں نے کہا "اس سر کو تو بالکل خراب کردیا ہے تم نے۔ کوئی کباڑی بھی نہ لے۔ ہیلو۔۔۔ بھئی دوبارہ ہیلو۔"

میں نے خاموشی میں عافیت جانی اور شبنم کی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے لیے یہ اطمینان کی بات تھی کہ وہ آزاد صاحب کے پاس پہنچ گئی ہے۔

"کس کا فون ہے؟" شبنم کی آواز آئی۔

"کسی نے عالم ارواح سے کیا ہوگا یا پھر عزرائیل صاحب نے گویا" انہوں نے خفگی سے کہا "عجب نامعقولیت ہے اس آلۂ گفت وشنید میں بھی۔ اب ہم کیا بتائیں کہ بزبانِ خاموشی کون ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔ میاں عزرائیل' جان قبض کرنے کا نوٹس ہے تو بندا احسان ہوگا ہم پر۔ فوراً حاضر ہوجاؤ۔ ہم بھی کیا ہے وہ۔ بقول شاعر۔ کفن باندھے ہوئے چلے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں۔ سخت عاجز آچکے ہیں گویا۔"

شبنم نے کہا "آپ کیوں اتنے پریشان ہیں آخر؟"

مجھے اندازہ ہوا کہ انہوں نے فون کا ریسیور غلط رکھا ہے چنانچہ لائن ملی ہوئی تھی اور میں ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔

"عزیزہ! ہمارے لیے تمہارا وجود ہی مجسم پریشانی ہے گویا۔ آج سے نہیں' جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم نے۔ تم کو ایسے ہی دیکھ رہے ہیں کسی خبط میں سرگرداں۔ گزشتہ ششماہی میں اس حاضر شاہ غائب شاہ کے چکر میں سب کو بھلا دیا تھا تم نے۔ خود کو بھی۔"

"مگر اب تو میں آگئی ہوں۔"

"اجی خاک آگئی ہو تم۔ اب یہ نیا روگ ساتھ لائی ہو گویا کہ سراغ لگانا ہے ملک خدا بخش کے قاتلوں کا۔۔۔ نورِ چشم کچھ توجہ دو اپنے آپ کو۔ آئینے میں ملاحظہ فرماؤ خود کو۔ اچھا بھلا بیضوی چہرہ مثلث بن گیا ہے گویا۔ بخدا ہماری چلتی کی ہم عمر نظر آتی ہو۔ خود اپنا ایکس رے لگتی ہو۔"

شبنم ہنسی "میں ٹھیک ہوں۔"

"یعنی ہم احمق ہیں گویا۔ یا پھر اتنے ضعیف کہ نظر بھی ضعیف ہے' عقل بھی اور تم تو ماشاء اللہ صحت مندی کا ایسا چلتا پھرتا اشتہار ہو کہ دیکھی گھی کے ڈبے پر تمہاری تصویر ہونی چاہیے گویا۔" وہ خفگی سے بولے "ہماری طرف سے نوٹس سمجھ لو اسے۔ ایک کام کرو' صحافت۔۔۔ یا یہ حماقت جسے محبت کہتے ہیں۔"

"یعنی آپ چاہتے ہیں کہ میں شاہ عالم کو چھوڑ دوں؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ بھئی یہ کب فرمایا ہے ہم نے۔ لیکن صحافت کے ساتھ محبت میں بھی گویا اعتدال۔۔۔ اور کچھ معقولیت چاہیے۔ ہم کو یہ دیوانگی قطعی ناپسند ہے۔ تم یہاں ڈیسک پر بیٹھو۔ یا میگزین لے لو۔ رپورٹنگ چھوڑ دو۔"

"یہ ناممکن ہے۔"

"بھئی دیکھو' ہم تمہیں وہ بتا دیتے ہیں گویا' نیوز ایڈیٹر سٹی پیج کی ادارت کرو۔" آزاد صاحب نے سمجھانے کی

کوشش کی۔

"جی نہیں۔ میں دفتر میں نہیں بیٹھ سکتی۔ آپ نے مجبور کیا مجھے تو میں استعفیٰ دے دوں گی۔"

"اچھا' بات تو سنو۔۔۔ اف' یہ لڑکی تو ازلی وابدی پاگل ہے گویا مگر ہمیں بھی پاگل کرکے چھوڑے گی۔"

شبنم احتجاجاً واک آؤٹ کرگئی تھی اور اب میں آزاد صاحب کی اپنے آپ سے گفتگو سن رہا تھا پھر انہوں نے کہیں فون کرنے کے لیے ریسیور اٹھایا تو میں نے اپنی طرف سے فوراً ریسیور رکھ دیا ورنہ انہیں لائن HELD UP ملتی۔

رئیس کو اپنے پاس دیکھ کے میں چونکا۔ وہ نہ جانے کب سے دیکھ رہا تھا کہ میں کان سے ریسیور لگائے خاموش بیٹھا ہوں۔

"کیا ہوگیا ہے تجھے آخر؟ کیا سن رہا تھا اتنی دیر سے؟"

میں نے کہا "پتا نہیں کہاں لائن مل گئی تھی" مگر رئیس اس وقت تک مطمئن نہیں ہوا جب تک میں نے اسے ساری بات نہیں بتا دی۔

نیند ہم دونوں کی آنکھوں سے دور تھی۔ ہم گزرے ہوئے وقت کی باتیں کرتے رہے اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے رہے۔ آہستہ آہستہ بگڑے ہوئے معاملات کے سدھرنے کی امید پیدا ہو رہی تھی۔ میں شاہ عالم کی زندگی کے پُرآسیب حصار سے نکل آیا تھا۔ اب میری زندگی اپنی پرانی ڈگر اختیار کرسکتی تھی۔ میں پھر ناسر عظیم تھا اور یہ تبدیلی میرے علاوہ رخشی نے' فرید عباسی نے اس کی ماں اور رئیس نے تسلیم کرلی تھی کیونکہ یہ بھی ناگزیر تھی اور میری مجبوری تھی لیکن آگے اس سے زیادہ مشکل مرحلے تھے۔ اپنی پرانی زندگی کے سارے منقطع ہوجانے والے رشتوں کو پھر سے استوار کرنا اس وقت تک ایک سعی لاحاصل تھا جب تک خان اعظم مجھے پھر گلے لگا کے نہ کہیں کہ ہاں تو ناصر ہے۔ میں کیا جانتا نہیں' مجھے تو لوٹ کے آنا ہی تھا ایک دن۔ اس دن کے انتظار میں ہی جی رہا تھا میں۔

اور چندا' چندا پہلے کی طرح مجھے ناک آؤٹ کرکے کہے۔ لوٹ آئے گھر کا بھولا۔ دماغ ٹھکانے آگیا؟ آگئی سمجھ میں یہ بات کہ مجھ سے بھاگ کے تم کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ اپنی محبت کا ایک حصار قائم کردیا ہے میں نے تمہارے گرد۔ اس حصار کے آخری کنارے تک تم محفوظ ہو۔ بالکل جیسے زمین کی کشش کی حد کا حصار ہے۔ نظر نہ آنے اور محسوس نہ ہونے والا مگر آسمانوں میں اڑنے والے پرندے اور جہاز اور بندوق کی گولی' سب کے لیے ناقابلِ تسخیر۔ زمین سب کو واپس کھینچ لیتی ہے کیونکہ اس کے بعد تو خلا ہے۔

اور جب میں نے چندا کے بارے میں سوچا تو مجھے گزر جانے والے وقت کا ہر لمحہ پھر جیتا جاگتا اور اپنا لگا۔ میں نے بہت سی باتوں اور یادوں کو اپنے ساتھ خواب کی صورت دیکھا اور سوچا کہ کیا ہوا گر اس وقت میں اسے فون کرکے کہوں۔ میں آگیا ہوں چندا' تمہارے پاس۔ تمہارے دل کے اسی خالی مکان میں جہاں ازل سے میں تھا اور مجھے معلوم ہے کہ میں ہی ہوں۔ آج بھی ہوں۔ تم مجھے محسوس کرسکتی ہو اور دیکھ سکتی ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے اس وقت میں تمہیں دیکھ اور محسوس کرسکتا ہوں۔

ایک بے اختیاری کے ساتھ میں نے فون اٹھا لیا اور چندا کی خواب گاہ ناز میں فون پکارنے لگا۔ اٹھو کہ برف پگھلنے کی صبح آپہنچی۔ خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ۔

میں نے تاریکی میں اسے دیکھا۔ اس کے تکیے پر پھیلے ہوئے بالوں کے سیاہ ریشمی ڈھیر کو دیکھا۔ اس کی خوابیدہ آنکھوں کے دریچوں کو آہستہ سے وا ہوتے دیکھا اور اسے کسمسا کے نیلی فون سے بلانے والی آواز کی جانب متوجہ ہوتے اور کروٹ لے کر ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے دیکھا۔ سانس روکے میں اس کی آواز کے ترنم کا انتظار کرتا رہا۔ یہ انتظار لمحوں سے صدیوں پر محیط ہوگیا۔ فون مسلسل آواز دیتا رہا۔ چندا چندا' چندا چندا۔۔۔ چندا۔۔۔ چندا' مگر وہ شاید گہری نیند میں تھی مگر اتنی گہری نیند وہ کب سوئی تھی۔ وہ تو ایک آہٹ پر بیدار ہوجاتی تھی۔ میں کہتا تھا کہ تم تو سوتے میں بھی جاگتی رہتی ہو اور اس کا جواب ہوتا تھا کہ ہاں' تمہاری طرح جاگتے میں سونے سے تو بہتر ہے۔ پھر کیا بات ہے؟ رات کو بھی خان اعظم نے اسے کسی ضرورت سے نہیں جگایا مگر خود چندا کو ان کا بہت خیال رہتا تھا۔ خدانخواستہ رات کو اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی تو وہ مجھے ہی آواز دیں گے۔ میں پڑی سوتی رہوں گی تو انہیں کتنی پریشانی ہوگی۔ خان اعظم ستر سال کے ہوچکے تھے اور ابھی بالکل فٹ تھے مگر ان کی خدمت کے لیے صرف چندا تھی۔ گھر میں کوئی نوکر نہیں تھا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ مجھے کچھ حیرانی ہوئی تھی اور جذبات کی رومانی یلغار پر مایوسی کی اوس پڑ گئی تھی۔ شاید اب فون اس کے بیڈ روم میں سرہانے کے قریب نہیں ہے۔ مگر ایک فون کی دوسری ایکسٹینشن کا مقصد ہی یہ تھا کہ جو کال آئے وہ خان اعظم کی عدم موجودگی میں چندا بھی وصول کرسکے بلکہ بعد میں تو خان اعظم کے بیڈ روم کے فون کی گھنٹی دن میں اور رات کو بند کردی جاتی تھی تاکہ ان کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان کو فون کرنے والے بھی بہت کم تھے۔ زیادہ کالیں میرے لیے ہی آتی تھیں۔

شاید فون خراب ہوگا۔ میں نے کروٹ لے کر سوچا۔ معلوم نہیں کیوں میں پُرسکون ہوگیا تھا۔ اس شخص کی طرح جو اعتقاد میں عاجزی اور نیک نیتی کے ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ قبول ہو نہ ہو اس نے دعا تو کی۔

صبح میں جاگا تو گھڑی کی سوئیاں دس بجا رہی تھیں۔ زمین کے نیچے تہ خانے میں دن اور رات کے فرق کو محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لائٹس روشن نہ ہوں اور دروازے بھی بند ہوں تو اندر قبر جیسی تاریکی رہتی تھی اور بجلی کی فراہمی بند ہوجائے تو اندر دیسی ہی گھٹن بھی محسوس ہوتی تھی۔ ائرکنڈیشنر کام چھوڑ دیتا تھا اور اندر کی ہوا کو باہر پھینکنے والا پنکھا چلانے کے لیے جنریٹر کو آن کرنا پڑتا تھا۔

زندگی کی اس صبح میں نے خود کو زیادہ پُرعزم' پُرامید اور بدلا ہوا محسوس کیا۔ ایک پُرخطر' وسوسوں کے آزار اور اندیشوں کے عذاب والے جنگل میں بھٹکنے کے بعد بالآخر میں نے اپنی شناخت رکھنے والا پرانا راستہ پالیا تھا۔ یہ بڑی عجیب بات تھی کہ میں خود کو سچ مچ شاہ عالم محسوس کرنے لگا تھا۔ اس ایکٹر کی طرح جو برسوں اسٹیج پر ایک ہی رول کرتا رہے تو اپنی اصل شخصیت کے رویے کو بھول جائے۔

ناصر عظیم بن کے میرے خیالات اور جذبات کے رنگ روپ میں ایک دل خوش کرنے والا اپنا پن آگیا تھا۔ آپ کسی گھر میں رہتے ہوں پھر وہاں کرائے دار آجائے اور وہ اس پر اپنی مرضی کا بالکل مختلف رنگ کرا کے رہے۔ تو وہاں لوٹ کر آنے کے بعد جب آپ پھر اپنی پسند کا پرانا رنگ کراتے ہیں تو سب کتنا اچھا لگنے لگتا ہے۔ مکان اچانک آپ کا اپنا گھر بن جاتا ہے۔

رئیس کا سارا عشق تو اس کی ریڑھ بنانے والوں نے نکال ہی دیا تھا۔ بدمعاشی میں نام پیدا کرنے والے' بدمعاشوں کے چوہدری اور بدمعاشی کی طاقت سے ہزاروں کے جلسے جلوس درہم برہم کرنے والے' بٹے اور جوئے کے اڈے چلانے والے اور ہر وقت بدمعاشی پر آمادہ رئیس خان نے دراصل موت اور محبت میں مار کھائی تھی ورنہ صبح ہونے سے پہلے وہ ریڑھ کے سارے خاندان کو ریڑھ بنا دیتا۔

میں نے اسے جگایا تو وہ ہائے ہائے کرنے لگا۔ اب اس کا موڈ بدل گیا تھا۔ رات کو جان دینے کی باتیں کرنے والا رئیس اب جوابی کارروائی پر آمادہ نظر آتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے قائل کیا کہ طاقت اور زبردستی سے کسی کا دل نہیں جیتا جاسکتا۔ تو ریڑھ کو اٹھا کے لا سکتا ہے لیکن اسے محبت ہوگی تو وہ پچھتائے گی اور ندامت کے آنسو بہاتی خود تجھ سے معافی مانگنے آئے گی۔

اس نے گالی دے کر کہا "اس کی تو..... اب یہ محبت نہیں عزت کا مسئلہ ہے اپنے لیے پیار ہے۔"

"یعنی تو اس کے گھر میں بدمعاشوں کی طرح گھس کے اسے اغوا کرائے گا تو وہ تیری عزت کرنے لگے گی؟ ابے اٹھانا ہے تو جاریا کو اٹھالا۔"

وہ سر کھجانے لگا "یار اتنی بے عزتی ہوئی ہے اس کی وجہ سے میری۔"

"اور اس کی بڑی عزت بڑھی ہوگی محلے میں۔ حرامی پن تو نے کیا زبردستی اندر گھس کے۔ ابے محبوبہ اور مقروض میں کوئی فرق ہوتا ہے یا نہیں؟ پیار کا رویہ رکھتا تو ریڑھ کا باپ بھی ڈرتا مگر تو نے اس کے ساتھ سلوک کیا وہ جو سود خور افغان کرتا ہے قرض ادا نہ کرنے والے کے ساتھ۔"

وہ کچھ شرمندہ ہوا "ہاں یار۔ آخر کب تک اینٹھی رہتی سالی لیکن کل کا تو دن ہی منحوس تھا۔"

"میں نے چندا کو فون کیا تھا یار۔"

اس اچانک انکشاف سے رئیس اچھل پڑا۔ "اچھا۔ کب۔؟"

"تو سو گیا تھا اس کے بعد مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"ابے ہم سے مت چھپا۔ کیا کہا اس نے' گالیاں دیں؟"

میں نے کہا "اس نے فون ہی نہیں اٹھایا' گھنٹی بجتی رہی دو منٹ۔"

وہ خوش ہوا "یعنی تیرے ساتھ بھی بُری ہوئی؟"

میں نے فون اٹھالیا "اب پھر دیکھتا ہوں۔ تو جا اس تمیں مار خان سے کہہ کہ ناشتا دے گا یا نہیں۔ آج کام بہت سے نمٹانے ہیں۔"

تمیں مار خان نے فوراً دروازے سے سر نکالا "ناشتا ایک دم ریڈی ہوتی جناب۔ آپ میت کا مالک سوتی' جاگتی تو ایک دوسرے کا منہ رکھاتی۔"

خان اعظم کے گھر میں فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی مگر ریسیور کسی نے بھی نہیں اٹھایا۔ یہ میرے لیے حیرانی سے زیادہ پریشانی کی بات تھی۔ میں نے ایکس چینج میں سوئچ روم سپروائزر سے پوچھا تو اس نے مجھے بتادیا کہ فون خراب نہیں ہے۔

"کہاں جاسکتے ہیں وہ لوگ گھر چھوڑ کے۔" میں نے

کہا۔

رئیس نے کہا "کیا پتا قمر کی طرف گئے ہوں۔ وہیں ٹھہر گئے ہوں رات کو۔"

ناشتے کے دوران میں' میں نے رئیس سے کہا "تو بینک جائے گا؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بولا "میری یہ صورت ہے اس قابل؟"

میں نے کہا "بینک والے صورت نہیں دستخط دیکھتے ہیں۔ تو بینک کے لاکر سے وہ کمپیوٹر کی ڈسک لے کر آ۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ کیش چاہیے۔ ناصر کے نام کی چیک بکس تو ہیں نہیں اور شاہ عالم بینک گیا تو پکڑا جائے گا۔"

"کیش کی فکر مت کر یہ پارے ہمارے ہوتے۔ میں جاتا ہوں اس شرط پر کہ تو باہر نہیں نکلے گا" وہ بولا۔

میں نے کہا "وہ کام مجھے بھی ایسے کرنے ہیں جو صرف شاہ عالم کرسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آج وہ سب زنجیریں کاٹ دوں جنہوں نے مجھے شاہ عالم کی زندگی سے باندھ رکھا ہے۔ فکر مت کر' میں اپنا حلیہ اس حد تک خود بھی بدل سکتا ہوں کہ ایک نظر میں کوئی مجھے نہ پہچان سکے۔"

وہ بالآخر مان گیا۔ تمیں مار خان نے اپنی مونچھوں کو اصلی طلسماتی زلف دراز' ہیئر ٹانک چلایا پھر کسی نیپالی بابا کی بتیس جڑی بوٹیوں سے تیار کردہ قد لمبا کرنے والی گولی کھائی اور شوفر کے فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہوگیا۔

میں نے اپنا حلیہ ایسے بدلا کہ رئیس خان نے مجھے وہ لنگی عنایت کی جو ان کا نائٹ سوٹ تھی اور سوتے میں سردی محسوس ہوتی تھی تو اسے وہ چادر بنا کے بھی اوڑھ لیتے تھے۔ اس چارخانے والی تہ بند جیسی لنگی پر میں نے ایک سبز رنگ کا لشکارے مارتا ہوا کرتہ پہنا جس کو رئیس بڑے جوشیلے احتشام اور اعتقاد کے ساتھ اس وقت پہنتا تھا جب اس کے عمران خان کا مقابلہ کسی قومی مرغ بازی چیمپئن شپ میں کسی گواسکر سے ہوتا تھا۔ گہرے سیاہ رنگ کے شوقین مزاجوں والے چشمے پر پشاور کی قراقلی ٹوپی لگانے کے بعد رئیس خان نے مجھے پاس کردیا۔

"چل جائے گا اگر تو براہ راست کسی سے پنگا نہ لے۔"

میں نے کہا "پنگا بھی لینا ہے آج دوست مگر کس سے' یہ ابھی نہیں بتایا جاسکتا۔ اور جب تو ساتھ ہے ہمارے اور تمیں مار خان ہے تو پھر ڈر کیسا؟"

وہ بینک میں گیا تو میں گاڑی میں بیٹھا تمیں مار خان کی بک بک سنتا رہا۔ اس نے مجھے پہلے ایک داستانِ شجاعت سنائی کہ کس طرح اس کو ایک بار ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ سامنے ڈاکو تھے' پیچھے شیر دھاڑ رہا تھا۔ اوپر بادل گرج رہے تھے۔ دائیں بائیں بھیانک جنگل تھا۔ اس نے بجلی کی چمک میں نشانہ لے کر گولی چلائی اور ہر فائر سے ایک ڈاکو فنا کیا۔ جب گولیاں ختم ہوگئیں تو اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح گھمایا اور کشتوں کے پشتے لگا دیے گویا۔

میں نے تنگ آکے کہا "شیر سب دیکھتا رہا یا دُم دبا کے میاؤں میاؤں کرتا ہوا بھاگ گیا؟"

"شیر کالی بی اس کو بولتی۔ تمیں مار خان تم کو مارتی۔ ہم بیوہ ہوجاتا۔ تمہارا بے بی یتیم ہوتی۔ شیر صاب اپنا بی بی کا بات مانتی۔"

میں نے اپنا سر پکڑ کے کہا "یعنی تم ان کی گفتگو بھی سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے جانوروں کی بولی۔ میں تو انسان سمجھتا تھا تمہیں۔"

رئیس کے آنے کے بعد میری جان چھوٹی ورنہ وہ برامان کے بددل اور خاموش ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ رئیس نے فلاپی میرے حوالے کی اور مجھے بتایا کہ اس نے دو لاکھ نکالے ہیں۔

"اب ہم چلیں گے آزاد صاحب کی طرف" میں نے کہا۔

"اس پاگل سے کیا کام پڑگیا۔ اس کی بات اپنے پلّے تو پڑتی نہیں۔"

میں نے کہا "وہ بڑی چیز ہے یار۔ بہت سے کام ہیں جو اس کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا۔ مجھے آئندہ بھی اس کی مدد کی بہت ضرورت پڑے گی۔ مجھے اس سے کسی اچھے اور قابلِ اعتماد وکیل کے بارے میں پوچھنا ہے اور شبنم سے بھی ملنا ہے۔ اس کے سپرد بھی ایک کام کیا تھا میں نے۔ وہ دیں گی۔"

"یار وہ دونوں مجھے اچھا آدمی نہیں سمجھتے۔ تیرے ساتھ یاری بھی پسند نہیں انہیں۔"

میں نے اسے تسلی دی "ابھی انہیں اندازہ نہیں ہے کہ تیری ذات میں کیا گن پوشیدہ ہیں۔ جب معلوم ہوجائے گا تو ہم سے زیادہ قدر کریں گے تیری۔"

مجھے امید تھی کہ اب تک ابوبکر آزاد صاحب اپنے آفس سے لوٹ آئے ہوں گے اور ان کے درخاص پر اپنی شانِ قدامت کے ساتھ موجود چلبلی بھی اس کی گواہ بھی لیکن کال بیل پر دروازہ کھولنے کے لیے شبنم آئی۔

پہلی نظر میں وہ مجھے نہ پہچان سکی پھر اس نے میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ کھڑے ہوئے رئیس کو دیکھا اور حیرت سے ایک چیخ مار کے ہنسی "عالی۔۔۔ تم۔"

میں نے کہا "ارے کیوں مرواتی ہوں مجھے شور کر کے۔"

وہ راستے سے ہٹ گئی "آجاؤ اندر لیکن یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے تم نے؟"

"یعنی پھر بتاؤں تمہیں کہ زندہ رہنے کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔"

اندر سے آزاد صاحب نمودار ہوئے "ہائیں! یہ کیا نمونہ گھس آیا ہے ہمارے گھر میں۔ کون سی نسل کا جانور ہے یہ گویا؟"

میں نے کہا "آداب بجالاتا ہوں آزاد صاحب۔ میں چلبلی کا معالج خاص۔"

وہ ہلکے پھلکے اور پھر ہنسے "بھئی خوب۔ بہت خوب۔ تم نے حیران کیا ہمیں اور گویا پریشان بھی۔"

میں نے کہا "یہ آپ کے سونے کا وقت ہے لیکن مجھے بہت اہم معاملات میں آپ کی راہنمائی درکار تھی۔"

"بھئی سونا تو گویا ایک ثانوی ضرورت ہو گیا۔ کام اولیت رکھتا ہے۔ ویسے بھی ہم دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کے سوتے ہیں۔"

ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ شبنم چائے بنانے چلی گئی۔

میں نے کہا "مجھے خوشی ہوئی شبنم کو آپ کے پاس دیکھ کے۔"

"لیکن ہمیں تو تشویش میں ڈال دیا ہے اس نے گویا۔"

میں نے کہا "آپ اس کی فطرت سے واقف ہیں۔ وہ کبھی دفتر میں بیٹھ کے کام کرنا پسند نہیں کرے گی۔ آپ زبردستی اسے سٹی یا میگزین ایڈیٹر نہیں بنا سکتے۔"

"یعنی برخوردار۔۔۔ تم وہ بھی جانتے ہو گویا۔۔۔ راز درونِ مے خانہ۔ ضرور اس نے بتایا ہو گا تمہیں۔ خیر وہ بھی غنیمت ہے کہ اس نے تمہاری مانی اور ہمارے پاس آگئی۔ کنٹرول ہم اپنے آپ کو نہیں کر سکتے۔ سے کیا کریں گے۔"

میں نے کہا "آپ ضرور جانتے ہوں گے یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔"

وہ ہنسے "ہاں بھئی۔ وجہ شہرت سنی ہے ہم نے بھی۔ ملاحظہ آج فرمایا تمہارے ساتھ۔ عجب غریب صورت رئیس ہے تمہارا دوست گویا۔"

میں نے کہا "اس کا گھر بھی رئیس خانہ ہے۔ آج کل میں ریں روپوش بلکہ مدفون ہوں۔"

"بہت مناسب ہے۔ ایک بار حقیقی طور پر مدفون ہوئے اور دوسری بار گویا مجازی طور پر۔"

میں نے کہا "کیا کروں میں آزاد صاحب۔ لوگ جینے جو نہیں دیتے۔ شاہ عالم نے سب کچھ چھوڑ دیا مگر اب چاہتے ہیں کہ دنیا بھی چھوڑ دے۔ اس طرح ممکن ہے کہ شاہ عالم دنیا میں رہے لیکن دنیا کو نظر نہ آئے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسے "بھئی بہت خوب۔ کوئی سلیمانی ٹوپی وغیرہ مل گئی ہے کہ سر پر رکھتے ہی آدمی اوجھل۔ بڑا لطف آئے گا۔"

میں نے کہا "اس حلیے کو آپ سلیمانی ٹوپی ہی سمجھ لیں۔ شاہ عالم کا چہرہ اب کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"وہ کیا فرمایا ہے فلمی شاعر نے گویا۔ زمانہ ہم کو ڈھونڈے گا نہ جانے ہم کہاں ہوں۔ گایا بھی خوب ہے لتا نے۔۔۔ تو برخوردار چہرہ بدل کے تم کرو گے کیا؟"

میں نے کہا "زندہ رہوں گا۔ یہ کیا کم ہے۔ کچھ عرصہ شاہ عالم کی پُراسرار گمشدگی کا ہنگامہ رہے گا۔ قیاس آرائیاں ہوں گی۔ افواہیں پھیلیں گی۔ میری جان کے دشمن۔"

"شاہ عالم کی جان کے دشمن" انہوں نے تصحیح کی۔

"جی۔۔۔ اب نام بھی تو بدلنا ہی پڑے گا اور کام بھی کچھ اور کرنا ہے۔ وہ بھی آپ کو بعد میں بتاؤں گا" میں نے کہا۔

"بھئی نام ناصر عظیم کیسا رہے گا؟" انہوں نے سوچ کے کہا۔

میں اچھل پڑا "دیکھئے۔۔۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ سے میں نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ اور بہت کچھ آپ کی مدد اور آپ کے مشورے سے ممکن ہوا لیکن شبنم کا حقیقتِ حال سے واقف ہونا اس کے لیے نئے نفسیاتی مسائل کھڑے کرے گا۔ اچھا ہے اگر وہ مجھے شاہ عالم ہی سمجھتی رہے اور مطمئن رہے۔"

وہ متفکر ہو گئے۔ "لیکن برخوردار۔ وہ کوئی ننھی بچی نہیں ہے گویا ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔ اس سے تم حقیقت کب تک چھپا سکتے ہو؟"

میں نے کہا "بجا فرمایا آپ نے۔ اس مسئلے کا بھی کوئی حل نکل ہی آئے گا لیکن ابھی وہ ایک صدمے سے جانبر ہوئی ہے۔ فوری طور پر اسے دوسرا شاک نہیں دیا جا سکتا۔ اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ایک مقصد تو یہی تھا کہ آپ کو سب بتا دیا جائے۔"

"اس حد تک ہم تسلیم کرتے ہیں گویا کہ شاہ عالم رہے تو

تم تو زندہ نہیں رہو گے۔ قانونی یا غیر قانونی طور پر تمہارا انتقال پُرملال ضرور ہو جائے اور بہت جلد۔ تو روپوشی اور مدفون ہو جانے یعنی انڈر گراؤنڈ ہو جانے میں ہی عافیت ہے گویا مگر برخوردار ذرا غور فرماؤ تم خود اپنے لیے کیا مشکلات پیدا کرو گے۔۔۔ شاہ عالم کا قصہ فرض کرو ختم ہوا لیکن اس کے بعد بھی تصویر کے دو رخ ہوں گے گویا۔ یعنی تم وہی ناصر عظیم ہو جاؤ گے مگر شبنم کے لیے نہیں اور شبنم ہو گی تمہارے ساتھ۔ وہ جو تم خادم عثمان اور دیگر شرکائے خباثت کے خلاف جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ رکھتے ہو۔ تم شبنم کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے اور اسے بے خبر بھی رکھنا چاہتے ہو اپنی اصل سے۔۔۔ یہ کیوں کر ممکن ہو گا؟"

"میں نے عرض کیا کہ کچھ مہلت چاہیے مجھے۔ شبنم کی خاطر۔ اس کا خیال نہ ہوتا مجھے کہ میں نے اسے سچ بتا دیا۔ یہ تسلیم کر لیا کہ میں شروع سے ہی شاہ عالم نہیں تھا تو اس کے کتنے منفی اثرات ہوں گے۔ اس بار تو وہ کسی نہ کسی صورت نکل ہی آئی ایک جذباتی گرداب سے مگر اگلی بار وہ یقیناً ڈوب جائے گی۔ اس کا انجام پاگل خانے میں ہو۔ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا اور خود آپ کہاں برداشت کریں گے۔ اس لیے شبنم کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ وہ میرے ساتھ ایک کارِ خیر میں شریک ہو گی۔۔۔ کس حد تک اور کب تک۔۔۔ یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا لیکن خود بالآخر اس طرح شبنم کی زندگی سے نکل جاؤں گا کہ یہ صورت حالات خود اس کے لیے قابلِ قبول ہو۔ مثلاً ایک فلمی فارمولا ہے نفرت پیدا کرنے کا۔ میں اس کے سامنے ایسا ڈراما کروں کوئی کہ وہ خود مجھ سے الگ ہو جائے۔ یہ مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔"

انہوں نے سر ہلایا "چلو ہم مان لیتے ہیں لیکن ایک ذاتی سا سوال ضرور پوچھیں گے تم سے۔"

میں نے کہا "جلدی سے پوچھ لیں۔ وہ آتی ہی ہو گی۔"

"اس سوال کا جواب ہماری ناقص عقل میں نہیں آتا گویا۔ اب تم نے اعلانیہ طور پر اس خاتون کو طلاق دے دی ہے جو تمہاری زوجہ ہی نہیں تھی گویا۔ ایسی ہی مضحکہ خیزیات ہے جیسے ہم جیسا بے بال و پر اعلان کرے کہ ہم نے سر منڈا دیا ہے۔ خیر تو سوال یہ ہے کہ اب کیا قباحت ہے شبنم کے معاملے میں۔۔۔ بھئی ماشاء اللہ وہ صورت کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک ہے اور ذہانت میں تو کروڑوں میں ایک ہو گی پھر یہ کہ تمہارے لیے اتنا۔۔۔ خلوص رکھتی ہے۔"

میں نے کچھ دیر بعد کہا "آزاد صاحب۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ شبنم جیسی لڑکی کسی سے محبت کرے تو اسے اپنی خوش قسمتی پر ناز کرنا جائز لیکن آپ بھی مانیں کہ محبت کوئی خود اختیاری فعل نہیں ہے۔ یہ تو ایک خود رو جذبہ ہے جو دل میں کسی وجہ کے بغیر پیدا ہوتا ہے۔ یہ دلیل کی بات ہی نہیں ورنہ مجھ میں کیا ہے آخر۔۔۔ میرا مطلب ہے شاہ عالم سے اس کی جذباتی وابستگی۔ جو کہ شادی شدہ تھا اور کوئی قابلِ رشک کردار بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس سے ہزار درجہ بہتر مرد شبنم کے ایک اشارے پر اس کے لیے دل و جان قربان کر سکتے تھے مگر وہ اسی کو چاہتی رہی۔ اسے آپ کیا کہیں گے؟ دیوانگی۔۔۔ یا مجبوری؟ شاہ عالم نے اس کا بہت استحصال کیا لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کل کی مجھے خبر نہیں۔ لیکن آج دلائل کی بنیاد پر میں محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔ میں شبنم کو پسند کرتا ہوں۔ بہت پسند کرتا ہوں اس کی ذاتی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا معترف ہوں۔"

مجھے اپنی بات وہیں روکنی پڑی۔ شبنم چائے کی ٹرالی دھکیلتی اندر آئی تو اس کا چہرہ اندر کی خوشی سے دمک رہا تھا اور اپنے بارے میں میری رائے جان کے گلاب ہو گیا تھا۔ اسے میں اپنی بدقسمتی بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایک اتفاق تھا کہ اس نے میری گفتگو کے آخری جملے اندر آتے ہوئے سنے اور میرے اعترافِ محبت نے اس کی اور میری آئندہ زندگی کی AMBIGUITY کو زیادہ دشوار کر دیا۔ اس نے وہ سمجھا جو میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ سمجھے۔

لیکن اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ شبنم کی غلط فہمی یا خوش فہمی کے جال میں ایک گرہ اور پڑ گئی تھی اور وہ مجھے پہلے سے زیادہ دارفتگی بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ یا کم سے کم مجھے ایسا لگا۔

میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ "آزاد صاحب۔ ایک تو مجھے بھروسے کے کسی ایسے وکیل کا پتا دیں جو میرے اس بہروپ پر شک نہ کرے۔ فیس لے اور کام کرے۔"

"بھئی ایسے تو سب ہی وکیل ہوتے ہیں گویا۔ مؤکل کو بھروسا نہ ہو تو ان کا روزگار کیسے چلے۔ مگر خیر" انہوں نے جیب سے کارڈ نکالا "یہ کل آئے تھے اور اپنا کارڈ دے گئے تھے کہ کارڈ۔۔۔ سے یاد فرمایئے بوقتِ ضرورت۔ ہم نے کہا کہ خدا نہ کرے مگر کیا بھروسا ہے زندگانی کا۔ جوش میں ہوش سے محروم ہو کے ہم کسی کا بھی قتل کر سکتے ہیں بلکہ ایک فہرست ہے ہمارے ہاں واجب القتل افراد کی گویا۔ سرِفہرست ہے اس میں جواہر لعل نہرو۔ جو خود کو کاتبِ جواہر رقم نیرنگ۔۔۔ یہ شخص ہے ان کا گویا۔"

میں نے کہا "یہ وکیل۔۔۔ کوئی عقیدت مند ہیں آپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے؟"

"میاں' اپنا لونڈا ہے گویا۔ شاگرد رہا ہے۔ کوئے صحافت میں خوار تھا۔ ہم نے کہا کہ بھئی یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ ریس کورس میں خچر نہیں دوڑ سکتا۔ خچر کیا بناتے ہو قبر بناتے ہو' گورکن بن جاؤ۔ فائدے میں رہو گے۔ اس نے باندھ لی ہماری بات گرہ میں۔"

رئیس نے حیرانی سے کہا "یعنی گورکن ہو گیا وہ کسی قبرستان میں؟"

آزاد صاحب نے قہقہہ مارا "ہو جاتا مگر وہ تو تھا چلتی پھرتی لاش گویا۔ اب بھی ہے۔ پتا نہیں وکالت کیسے چل رہی ہے۔ دماغ کی ضرورت تو اس میں بھی پڑتی ہے۔ جس کو ہم سمجھتے تھے۔ خالی تھا نا اس لیے بجتا تھا۔"

میں نے کہا "دراصل میں اپنی ساری جائداد وغیرہ کے جھنجھٹ سے چھٹکارا چاہتا ہوں۔ اتنا بڑا کام بھی نہیں۔"

شبنم نے چائے مجھے پیش کی "کیا تارک الدنیا ہونے کا سوچا ہے۔ مایا جال سے نکل کے کیا کرو گے آخر؟"

میں نے کہا "بس دیکھ لیا سب کچھ کر کے۔ اب کچھ نہ کر کے دیکھیں گے۔ تم بتاؤ' میں نے جو کام تمہارے سپرد کیا تھا؟"

"کچھ مواد ملا ہے۔ پرانے اخباروں سے۔ میں لاتی ہوں" وہ اٹھ کے پھر اندر چلی گئی۔

"یہ کیا لوٹ مار اور چوری ڈکیتی کا سلسلہ ہے برخوردار۔ ہم تو سن کے دہ رہ گئے گویا۔ دم بخود اور ہاتھوں کے وہ اڑ گئے۔ توتے۔ یہ خادم اور عثمان۔ جن کو بڑی شہرت فی گویا تمہارے مقتول کی حیثیت سے۔ یہ کیا بیچ رہے ہیں دنیا میں ڈالروں کے بدلے۔ ہماری تاریخ' ہماری تہذیب۔ بخدا یہ تو بردہ فروشی سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے ہماری نظر میں۔"

شبنم نے کچھ اخباروں کے تراشے مجھے پیش کیے۔ "ہر اخبار کی فائل دیکھنا تو ممکن نہیں تھا مگر اس کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ ثبوت کافی ہیں۔ لاہور' کراچی سے پشاور تک ہر جگہ عجائب خانوں میں ایک مافیا سرگرم عمل ہے۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے نور چشم کہ تم ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کہ وہ کون لوگ ہیں۔" آزاد صاحب نے کہا "اور جان لیا تب بھی کیا ہو گا۔ کیا ہمارے سرکاری محکمے اور تفتیشی ادارے بے خبر ہیں؟"

میں نے کہا "مجھے تو وہ برابر کے شریک جرم نظر آتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سرکاری حکام اور ذمے دار افسران کا تعاون حاصل کیے بغیر عجائب خانوں سے نوادرات چوری ہو جائیں۔ کروڑوں کی مورتیاں اسمگل ہو کے یورپ اور امریکا پہنچ جائیں۔ قدیم سکے جن کی مالیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا' غائب ہو جائیں اور یہ آج شائع ہونے والی خبریں ہیں۔"

"یہ گزشتہ ایک سال ہی کے تراشے ہیں" شبنم نے کہا۔

"یہ سلسلہ نہ جانے کب سے جاری ہے" میں نے کہا "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہمارے پاس جو خبریں ہیں وہ ٹریلر کی طرح ہیں۔ اصل فلم سامنے آئے گی تو معلوم ہو گا کہ اس ملک کو کتنا ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہے۔ یہاں لیڈر ملک کے بینکوں سے اربوں کے قرضے لے کر کھا گئے۔ ہر سال اربوں روپے رشوت میں جاتے ہیں۔ اربوں کا ٹیکس چوری ہوتا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو نقصان یہ قومی ورثے کی مافیا خاموشی سے پہنچا چکی ہے اور پہنچا رہی ہے' اس کے اعداد و شمار اس سے کہیں بڑے اور بھیانک ہوں گے۔"

"وہ تو ہے۔ تاریخی اہمیت رکھنے والی ہر چیز انمول ہوتی ہے۔ اس کی قیمت کہاں لگائی جا سکتی ہے سکہ رائج الوقت میں گویا" آزاد صاحب بولے۔

میں نے کہا "یہ بڑی منظم ڈکیتی ہے۔ اس میں محکمۂ آثار قدیمہ کے چپراسی سے لے کر عجائب خانوں کے منتظم تک سب ایک دوسرے کے معاون و شریک جرم ہیں۔ ایک آدمی یا چند افراد یہ کام کر ہی نہیں سکتے۔ عجائب خانوں میں جو کچھ ہے اور جو محکمۂ آثار قدیمہ ڈیپارٹمنٹ آف ARCHIVES کے پاس ہے۔ اس ذخیرے کی نہ کوئی حد ہے نہ حساب۔ اس میں سکے' مورتیاں' نایاب نسخے اور مخطوطات۔ نوادرات اور تاریخی اشیا۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں قیمتی چیزیں ہیں۔ لاہور میوزیم ہی کو دیکھ لیں آپ۔ اوپر نیچے اس کے کتنے ہال ہیں اور وہ سب بھرے ہوئے ہیں۔ میوزیم ہر شہر میں ہے۔ آپ کیسے اندازہ کر سکتے ہیں کہ پہلے اس میں کیا تھا جو اب نہیں ہے۔"

"بھئی ریکارڈ ہو گا ہر چیز کا۔"

"آپ ملاحظہ فرمائیں یہ خبر۔ ایک نگراں نے چارج ہی نہیں دیا اور چارج دینے یا لینے والا آپس میں ملے۔ مکا کر لیں کہ بھئی آپس کی بات ہے۔ کسی اور کو کیوں معلوم ہو۔ نیچے والے اپنا کام کر رہے ہوں گے۔ اوپر والوں کو ان کا حصہ مل رہا ہو گا۔ یہاں نوادرات کے خریداروں کے ایجنٹ منہ مانگی قیمت دیتے ہوں گے اور ان کو کسٹم کلیرنس بھی مل جاتی ہو گی۔ ملک سے بہت کچھ ایکسپورٹ ہوتا ہے۔ پھلوں سے چاول اور کپاس تک۔ ان کی آڑ میں نوادرات نکالے جاتے

ہوں گے۔ بین الاقوامی منڈی میں ہزاروں کی چیز لاکھوں کی ہو جاتی ہے۔ یہ بہت لمبی زنجیر ہو گی۔ اس میں صرف میوزیم اور آثار قدیمہ والے ہی نہیں' کلیرنگ ایجنٹ اور کسٹم حکام' ایئرپورٹ اور سی پورٹ پر مامور سیکیورٹی والے۔ ایئر لائنز اور شپنگ لائن۔ خریداروں کے ایجنٹ اور ڈیلر۔ نہ جانے کہاں کہاں کون کون اس مافیا میں شامل ہو گا۔"

"حالی۔ کل تک تم بھی اسی مافیا کا ایک حصہ تھے۔"

میں نے سنبھل کے کہا "بے شک تھا۔ کل تک بہت کچھ تھا۔ جو آج نہیں ہے اور یہی بنیادی سبب ہے ان کی مجھ سے دشمنی کا۔ کوئی مافیا اپنے کسی ممبر کے الگ ہونے کا رسک نہیں لیتی۔"

شبنم نے مجھے غور سے دیکھا "تم ان کے لیے کیا کرتے تھے؟"

"میں۔۔۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ ان کے امپورٹ ایکسپورٹ کی نوعیت کیا ہے۔ میرا باہر آنا جانا تھا۔ مجھے ایک سیاسی شخصیت ہونے کے ناتے کچھ رعایت حاصل تھی۔ میں ان کے لیے کاروباری رابطے کا ذریعہ بنا رہا۔"

"اور ان سے اپنا حصہ بھی وصول کرتے رہے؟" شبنم نے کہا۔

"ہاں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ انجانے میں مجھ سے یہ جرم ہوا۔ اسے غلطی نہیں کہہ سکتا میں۔ دیکھو' میں جو کچھ بھی ہوں۔ تم میرے سیاسی کردار پر نکتہ چینی کر سکتی ہو۔ میرے ذاتی کردار پر انگلی اٹھا سکتی ہو۔ نہ مجھے ایمانداری کا دعویٰ ہے نہ پارسائی کا اور اصول پرستی یا قناعت پسندی کا لیکن میں وطن فروش نہیں ہوں۔ میں اپنی مٹی کا محافظ ہوں۔ اپنی دھرتی ماں کی طرح ہوتی ہے اور کوئی بیٹا ماں کے گیتے کپڑے نہیں بیچتا جن کی ملکیت پر وہ ناز کرتی ہو۔ ہمارا تاریخی ورثہ اس زمین کا گہنا ہی تو ہے۔"

شبنم مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "میں نے صرف سنا تھا کہ لوگ راتوں رات بدل جاتے ہیں۔ خدا جب چاہتا ہے توفیق دیتا ہے اور چور کو قطب کر دیتا ہے۔ تمہاری فطرت کا یہ انقلاب دیکھ کے مجھے یقین نہیں آتا۔ کہ تم شاہ عالم ہو۔"

"ایک بات بتاؤ گی ایمانداری سے۔۔۔ میرے جذبات کا لحاظ کیے بغیر' بالکل سچ؟"

وہ کچھ نروس ہو گئی "بہت مشکل سوال کر کے مجھے کیوں آزمائش میں ڈالتے ہو سب کے سامنے۔"

اس مرحلے پر آزاد صاحب نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں خلوت میں گفتگو کا موقع فراہم کرنا ضروری ہے۔ وہ ایک جماہی لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ "بھئی ہماری طرف سے شب بخیر گویا۔ ہمارے لیے رات شروع ہو گئی اور رات خدا نے آرام کے لیے بنائی ہے۔"

"شبنم۔ میری شخصیت اس کے بالکل برعکس ہے بیشتر معاملات میں۔ میں پرانا شاہ عالم بالکل نہیں ہوں۔۔۔" میں نے کہا "اچھی طرح سمجھ لو یہ بات۔"

اس نے نظر جما کے مجھے دیکھا "تم کہنا کیا چاہتے ہو آخر؟"

میں نے کہا "جو کچھ میں کل کرتا تھا' تمہیں قبول تھا لیکن اس میں تمہارے لیے کوئی رسک نہیں تھا۔ ایک طرح سے تمہیں سیاسی اثر رسوخ کا تحفظ بھی حاصل تھا مگر آج صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔"

"اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے شبنم۔ آخر رخشی نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟ صرف اس لیے کہ ان حالات میں وہ خود کو غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ اس نے عقل سے فیصلہ کیا۔ جذبات سے نہیں۔ کیا تمہیں بھی ایسا ہی نہیں کرنا چاہیے؟"

"نہیں۔ میں رخشی نہیں ہوں" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"پلیز' سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری وجہ سے تم خطرے میں پڑ جاؤ گی۔ میری روپوشی کے بعد تم ایک ذریعہ بن جاؤ گی' مجھ تک رسائی کا۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اگر پولیس کے ہاتھ ملزم نہ آئے تو اس کے گھر والوں کو اٹھا لیا جاتا ہے۔ بیوی بچے' ماں باپ یا بھائی بہن عذاب میں پڑ جاتے ہیں۔ ہر آدمی کی سب سے بڑی کمزوری اس کے جذباتی رشتے ہوتے ہیں۔"

"رخشی نے تو طلاق لے کر تم سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا۔ میں کیسے طلاق لوں آخر؟ اور میں اتنی بزدل اور کم ہمت نہیں ہوں۔ میں تمہارا ساتھ دوں گی ہر حال میں۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی "یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ میرے لیے تو یہ بقا کی جنگ ہے۔ دشمنوں نے دو ٹوک لہجے میں واضح کر دیا ہے کہ یا تو میں پہلے کی طرح ان کے لیے کام کرتا رہوں ورنہ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کوئی خطرہ مول لے ہی نہیں سکتے۔"

"حالی' تم کیسے مقابلہ کرو گے ان کا۔ اور کب تک؟"

"میرے پاس اس کے سوا چارہ نہیں۔ انہیں یہ منظور نہیں کہ میں اپنا راستہ الگ کر لوں۔ انہیں میرے وعدے پر اعتبار نہیں کہ میں خاموش رہوں گا۔ کبھی کسی کو کچھ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بتاؤں گا۔ رہا یہ سوال کہ مقابلہ کیسے کروں گا اور کب تک تو جواب یہ ہے کہ جب تک زندگی ہے۔ مجھے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ زندہ رہنے کی یہی ایک صورت ہے۔ ہمت اور توفیق خدا دے گا۔ اب تو مجھے بھی ضد سی ہوگئی ہے کہ اچھا یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ مرنے کے ڈر سے میں خودکشی نہیں کرسکتا۔ تم مجھے زندہ رہنے کا حق نہیں دیتے تو پھر میں یہ حق حاصل کروں گا۔ جیسے بھی ہوگا۔ موت تو ایک دن سب کو آنی ہے اور یہ فیصلہ بندہ نہیں خدا کرتا ہے کہ کون کب' کہاں اور کیسے دنیا سے رخصت ہوگا۔"

"عالی۔۔۔ بُرا مت ماننا۔ تمہارا اور ایک مافیا کا کیا مقابلہ؟"

"اسی لیے تو میں انڈر گراؤنڈ رہنے پر مجبور ہوں۔ میں کھلی جنگ کیسے لڑسکتا ہوں ان سے اور یہ بالکل یک طرفہ معاملہ بھی نہیں ہے۔ میرے پاس بہت کچھ ہے ان کو تباہ کرنے کے لیے۔ سب سے ایک ساتھ نہ سہی' ایک ایک سے تو نمٹ سکتا ہوں میں۔ یہ بات وہ بھی جانتے ہیں۔ وہ اپنی مافیا کو ایک ناقابلِ تسخیر طاقت سمجھتے ہیں مگر میں ان پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔"

"صرف زبانی دعووں سے کچھ ثابت نہیں ہوتا۔"

"رائٹ۔ اپنی بقا کے لیے دنیا میں طاقت کا توازن ضروری ہے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت نے ۱۹۷۴ء میں ایٹمی دھماکا کیا تھا۔ اب ہمارے لیے ایٹمی طاقت بن جانا انتہائی ناگزیر ہے ان کے پاس ایٹم بم ہے تو ہمارے پاس بھی ہونا چاہیے۔ اپنی حفاظت کے لیے اور برابری کی سطح پر جینے کا حق حاصل کرنے کے لیے۔"

"کوئی ایٹم بم ہے تمہارے پاس بھی؟" شبنم مسکرائی۔

"میرے پاس یہ انفارمیشن بم ہے۔" میں نے اسے کمپیوٹر کی فلاپی ڈسک دکھائی "اس میں ایک مافیا کا سارا کچا چٹھا ہے۔ ابھی میں نے دیکھا نہیں کہ اس میں کس کس محبِ وطن کا نام ہے جو درحقیقت وطن فروش ہے اور کون کون غدار ہے جو معزز بنا بیٹھا ہے۔ قوم کا لیڈر کہلاتا ہے مگر میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ ان سب کے چہرے بے نقاب کرکے چھوڑوں گا۔"

"پھر تو میں نے بھی فیصلہ کرلیا ہے" شبنم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم جہاں بھی رہو گے۔"

میں نے اس کی بات کا مطلب سمجھ لیا "مجھے تو خود معلوم نہیں کہ میرا ٹھکانا کہاں ہوگا۔ بے شک مجھے تمہاری مورال سپورٹ کی ضرورت ہوگی۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور ایسے بہت سے کام ہوں گے۔"

اس نے مایوسی سے کہا "ابھی خود تم نے کہا تھا کہ تم سے تعلق کے باعث سب سے زیادہ خطرات مجھے لاحق ہوں گے۔"

"یہ تو سچ ہے۔"

"پھر کیا تم چاہتے ہو کہ اکیلی میں دشمنوں کی نظر میں رہوں اور وہ تمہارا پتا پوچھنے کے لیے مجھے جب چاہیں اٹھا کے لے جائیں۔ میرے ساتھ جو سلوک چاہیں کریں۔ تم خود تو روپوشی میں محفوظ رہو گے۔"

میں نے کہا "شبنم۔ تم کو اعلانیہ میری مدد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے تمہارے درمیان ایک خفیہ رابطہ ہوگا۔ تم ایک صحافی ہو اور تمہاری رسائی ہر جگہ ہے اور ہر شخص تک ہے۔ تمہارے وسائل میں سب سے اہم وہ ذہانت ہے جس کی مدد سے تم نے اپنی گڈول بنائی ہے۔"

"ابھی تک میں نے قانون شکن عناصر سے براہِ راست کوئی جنگ نہیں لڑی۔ میں نے معاشرتی' سیاسی اور انتظامی خرابیوں کے خلاف ضرور لکھا ہے مگر کسی ایک گروہ یا جماعت کے ساتھ محاذ آرائی کی نوبت نہیں آئی۔"

میں نے کہا "یہ بڑی عقلمندی کی تم نے۔"

"یہ عقلمندی کی بات نہیں۔ میں ڈرتی تھی۔ ایسے بہت سے معاملات تھے جو میں اخبار میں اٹھاتی تو اس کا ردِعمل خطرناک ہوتا۔ میں کسی بااثر اور طاقتور دشمن کی ذاتی دشمنی کا نشانہ بن جاتی۔"

میں نے کہا "تمہیں آئندہ بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ۔۔۔ فی الحال روپوشی میری مجبوری ہے۔ میں بھیس بدل کر دن کہیں گزار سکتا ہوں تو رات کہیں۔ وہ فٹ پاتھ یا ریلوے اسٹیشن کا پلیٹ فارم بھی ہوسکتا ہے۔ ایسی جگہ پر تم کیسے رہ سکتی ہو میرے ساتھ۔ اور فرض کرو میں کسی کے گھر میں رہتا ہوں۔ کوئی خفیہ ٹھکانا بنالیتا ہوں۔ تو وہاں بھی تمہیں ساتھ رکھنا میرے لیے ناممکن ہے۔ ہماری کچھ معاشرتی اور اخلاقی حدود ہیں۔ خودمختار ہونے کا مطلب ہرگز ایسی آزادی نہیں ہونا چاہیے جس میں ہم رشتوں کی قیود سے آزاد ہوجائیں۔ ہم بہرحال مشرقی ہیں اور ایک پاکستانی معاشرے میں رہتے ہیں۔"

خفت سے اس کا رنگ اُڑگیا۔ میں نے واضح الفاظ میں

کہہ دیا تھا کہ تم میری بیوی نہیں ہو کہ میں تمہیں ساتھ لیے پھروں۔ ایک مرد اور عورت کے تعلق میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا احساس نہ ہو تو ذہنی ہم آہنگی بھی بے معنی ہوجاتی ہے۔ جسمانی سطح پر وہ جانور ہوجاتے ہیں' انسان نہیں رہتے۔

"اچھا اگر ضرورت پڑے تو میں کہاں مل سکتی ہوں تم سے۔ تمہارا پتا تو ہونا چاہیے میرے پاس۔۔۔" اس نے افسردگی سے کہا۔

میں نے کہا "تم فکر مت کرو۔ روپوشی تم سے نہیں ہے۔ میں تمہیں پوری طرح باخبر رکھوں گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے ایک ٹھکانے پر ملو' ویسے تو اتنی شہرت ہے تمہاری کہ تمہیں تلاش کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا تاروں بھرے آسمان میں چاند کو۔"

وہ ہنسنے لگی "آگئے نا تعریف اور خوشامد کے اوچھے ہتھیاروں پر۔ عورت کی کمزوری کو مرد اپنی شہ زوری سمجھتے ہیں۔"

"ایک مثال دی تھی میں نے۔ ذرا شاعرانہ ہوگئی مگر غلط نہیں تھی۔ تم کوئی عام عورت نہیں ہو اور مجھے تمہاری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔ یا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

وہ کچھ نروس ہوگئی "مجھے اپنے آپ پر اعتماد ہے اور تم بھی اعتماد کرسکتے ہو میرے اعتماد پر۔"

میں نے کہا "دیکھو' تمہارا موبائل فون نمبر ہے میرے پاس۔ میرے موبائل فون کا نمبر لکھ لو۔ یہ رئیس کا فون تھا جو میں استعمال کررہا ہوں۔ مجھے اخبار کے دفتر کا اور آزاد صاحب کے گھر کا فون نمبر معلوم ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے رابطے میں ہیں۔ میں تم سے ملتا بھی رہوں گا۔"

"لیکن کبھی میں تم سے ملنا چاہوں تو۔؟"

"تو مجھے فون کرو۔ میں بتادوں گا کہ میں کہاں ہوں" میں نے کہا۔

اس کی مایوسی جھنجلاہٹ بن گئی "یعنی وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ یہ نہیں بتاؤ گے کہ رہتے کہاں ہو۔ اپنے گھر کا پتا نہیں دو گے مجھے بھی؟"

"ضرور دوں گا' جب ہوگا" میں اٹھ کھڑا ہوا "ابھی کون سا گھر ہے میرا۔"

"عالی۔ میرا تو دماغ چکرا دیا ہے تم نے۔ مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ باہر سے تم وہی ہو تو اندر سے اچانک اتنے کیسے بدل گئے؟ تمہارا ذہن' تمہارے نظریات اور خیالات۔ تمہارا رویہ اور احساس۔ سب مجھے بالکل اجنبی لگتا ہے۔ تمہاری شخصیت ہی مختلف ہے۔"

میں نے کہا "اس انقلاب کو تم ناپسند کرتی ہو؟"

"ناپسند کا کیا سوال۔ ناقابلِ فہم ضرور ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ راتوں رات کسی نے بدمعاشی سے توبہ کرلی۔ دنیا داری چھوڑدی اور عاقبت کی فلاح کی راہ پر چلنے لگا مگر اس کی کوئی منطقی وجہ ہوتی ہے جو نظر آتی ہے۔ کسی کا نروس بریک ڈاؤن ہوجاتا ہے۔ کوئی رشوت' بے ایمانی اور غیر اخلاقی یا غیر قانونی ذرائع سے ہونے والی آمدنی سے عیش کرتا رہتا ہے مگر اندر سے اس کے ضمیر کی خلش اسے پریشان کرتی ہے یا اچانک اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ اس کا جوان بیٹا مارا جاتا ہے یا بیوی پاگل ہوجاتی ہے یا کوئی اپنی روحانی قوت سے کایا کلپ کردیتا ہے۔"

"تم جانتی ہو میں ایک بار مرکے پھر جی اٹھا ہوں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ مجھے میرے دشمنوں نے زندہ گاڑدیا تھا اور میں کسی معجزے کی طرح قبر سے نکل کے پھر دنیا میں آگیا۔ یہ بتانے کہ شاہ عالم مرا نہیں ہے۔ کیا یہ کم عبرتناک واقعہ ہے؟ فرض کرو تمہاری طرح کوئی مجھے شاہ عالم تسلیم نہ کرتا تو میرے لیے جینا ناممکن ہوجاتا۔ میں پاگل ہوکے خودکشی کرلیتا۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر۔"

"مگر کیا۔ خدا کا شکر ہے جس نے مجھے سیدھے راستے پر ڈال دیا۔"

"اس کے باوجود۔۔۔ جو تمہارا ماضی تھا۔۔۔ وہ تمہاری زندگی کا ایک حصہ ہے۔ تم اسے بھلا نہیں سکتے۔ بھلانا چاہو تب بھی دماغ سے یادوں کو خارج کرنا ناممکن ہوگا مگر بعض اوقات مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہاری یادداشت بھی متاثر ہوئی ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "وہ کیسے؟"

"کیا تمہیں یاد ہے۔۔۔ تم رخشی کے لیے اپنے دل میں کیسے جذبات رکھتے تھے؟ تم کہتے تھے کہ مجھے اس سے محبت نہیں ہے۔ تم صرف ماں باپ کی وجہ سے شادی پر مجبور ہوگئے تھے اور اس رشتے کو اسی لیے برداشت کررہے ہو مگر اب اسے بیوی کی حیثیت سے اپنے ساتھ رکھنا بھی مشکل ہوتا جارہا ہے۔"

"دیکھ لو میں نے چھوڑدیا اسے۔"

"لیکن۔۔۔ تم نے اسے اپنا سب کچھ دے دیا۔ تم تو کہتے تھے کہ کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گا کسی دن۔ تین بار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طلاق کہوں گا اور ایک پھوٹی کوڑی نہیں دوں گا۔ ایک لاکھ حق مہر وصول کرنے کے لیے بھی جائے کسی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے اور میرے خلاف ڈگری لائے اور اب ایک لاکھ حق مہر تو کیا' تم نے اپنی ساری جائداد اس کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کروڑوں کی پراپرٹی اسے دے کے تم مجھ سے کہہ رہے ہو کہ میرا اپنا کوئی گھر نہیں۔"

میں نے کہا "دراصل۔۔۔ مجھے یہ احساس بھی تھا کہ میں نے رخشی پر بہت ظلم کیا۔ بیوی کی حیثیت سے نہ اسے عزت دی اور نہ اس کے حقوق دیے۔ میں نے اسے ذہنی اور جسمانی اذیت میں مبتلا رکھا۔ یہ سب اس کی تلافی کے لیے ہے۔ مجھے پراپرٹی کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اب بھی میرے بینک اکاؤنٹ میں اس سے زیادہ ہے جتنا میں نے رخشی کو دیا' اس سے زیادہ میں نے انویسٹ کر رکھا ہے۔ میری آمدنی متاثر نہیں ہوئی ہے۔"

شبنم میری دلیل سے مطمئن نہیں ہوئی۔ "عالی! تم یہ بھی بھول گئے ہو کہ تمہارا اور میرا پتا ایک تھا۔ جہاں تم تھے وہاں میں تھی اور جہاں میں ہوتی تھی تم خود پہنچ جاتے تھے وہاں۔ اب تم مجھے مشرقی کی اخلاقی اقدار کا مطلب سمجھاتے ہو۔ یہ کہتے ہو کہ ہم ساتھ نہیں رہ سکتے۔"

میں نے برہمی سے کہا "دیکھو' میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ پرانے شاہ عالم کو بھول جاؤ اور مجھ سے بار بار مت پوچھو کہ تم اتنے بدل کیسے گئے ہو۔ کل کا کوئی حوالہ مت نکالو میرے سامنے۔ سمجھ لو مر گیا پرانا شاہ عالم اور یہ نیا شاہ عالم تمہیں پسند نہیں۔ اگر اس کے خیالات اور نظریات سے تمہیں اتفاق نہیں۔۔۔ تو چھوڑ دو مجھے۔ تمہارا اور میرا راستہ الگ ہو سکتا ہے۔ تم اپنی پرانی دنیا میں خوش رہو۔ شاہ عالم جیسے اور بھی بہت مل جائیں گے تمہیں۔۔۔ میں ایک نئی زندگی گزارنا چاہتا ہوں تو مجھے اپنی مرضی سے جینے دو۔ مجھے اپنے ماضی کے جال میں قید رکھنے کی کوشش چھوڑ دو۔"

شبنم دم بخود مجھے دیکھتی رہی۔ پہلے وہ جتنی حیران تھی اب اس سے زیادہ پریشان اور خوف زدہ تھی۔ میرا یہ نیا روپ اچانک اس کے سامنے آیا تھا۔ اس نے ذہنی تذبذب' کشمکش اور پُرشکوک بے یقینی پر اپنی جدوجہد سے قابو پانے میں کامیابی حاصل کرلی تھی مگر مجھے شاہ عالم تسلیم کرلینے کے بعد بھی اس کا احساس زیاں باقی تھا۔ اسے اپنی زندگی میں کسی کمی کا احساس تھا اور ایک خلا محسوس ہوتا تھا۔ شاہ عالم وہی ہے مگر اس کا جذباتی رویہ وہ نہیں ہے۔ اس کا خود غرضانہ التفات بھی التفات تو تھا۔ وہ اپنے مطلب کے لیے شبنم سے قربت رکھتا تھا تو اب وہ قربت ہی خواب فردا ہو گئی تھی۔ شراکت اور اخلاقی اقدار کی دیوار کھڑی کر کے وہ شبنم کے لیے بھی غیر بن گیا تھا۔

اس نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں کو روکا۔ "آئی۔۔۔ آئی ایم سوری۔ میں آئندہ۔۔۔ عادت بنالوں گی کہ تمہارے سامنے گزرے ہوئے وقت کی کوئی بات نہ کروں۔ تم بدلے ہو تو میں بھی خود کو بدل لوں۔"

میں نے کہا "میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب کو چھوڑو۔ مرد تو برتن کی طرح ہوتا ہے اور عورت پانی کی طرح خود کو اس کے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور ہوتی ہے۔ میں خود کو تمہارے مطابق ایڈجسٹ کرلوں گی۔"

مزید کچھ کہنے سننے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ رئیس ہماری گفتگو سے اتنا لاتعلق اور بیزار بیٹھا تھا کہ صوفے پر لیٹ کے سو گیا تھا۔ میں نے اسے جگایا تو وہ کچھ خفیف ہوا اور میرے ساتھ باہر آگیا۔ تیس مار خان برآمدے میں لگی ہوئی چار کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کوئی بچی تھی جو میز پر تاش پھیلا رہی تھی اور معلوم نہیں وقت گزاری کے لیے وہ کیا گیم کھیل رہے تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی تیس مار خان کھڑا ہو گیا "ابھی ہم ڈیوٹی پر جاتی پھر آتی تو تمہارا ساتھ گیم پورا کرتی۔"

وہ بچی ہنسنے لگی "اوئے باشیخے' بھاگ رہا ہے' بے ایمان!"

تیس مار خان کا چہرہ غصے اور شرم سے سرخ پڑ گیا "تم کیا بولتی؟ ہم بے ایمان؟ ہم بھاگتی؟"

وہ بچی اس پر زور زور سے ہنسنے لگی "اور کیا۔ یہ بھاگنا نہیں تو اور کیا ہے؟ صرف سو روپے ہار گیا تو دم نکل رہا ہے۔ ابھی تو بڑی شان دکھا رہا تھا جھوٹے کہ مال بہت ہے۔"

تیس مار خان غصے میں تھر تھر کانپنے لگا "ہم کو جھوٹا بولتی تم؟ ہم تمہارا لحاظ کرتی۔ تم عورت ہوتی۔"

"ارے جا۔ بڑا مرد بنا پھرتا ہے۔ گز بھر کا خود نہیں ہے' ایک فٹ کی مونچھیں لگالی ہیں۔۔۔ ڈھائی روپے والی۔"

اب میں نے اس بچی کو غور سے دیکھا۔ وہ بچی نہیں چار فٹ قد کی عورت تھی جس کی آواز سیٹی جیسی تھی اور زبان کے ساتھ اس کے ہاتھ چل رہے تھے اور آنکھیں چل رہی تھیں۔ وہ بہت تیز طرار عورت تھی اور غالباً اس نے تاش کے پتوں کی چالبازی سے تیس مار خان کو بے وقوف بنا کے لوٹ لیا تھا۔ اگر ہم نہ آتے تو وہ تیس مار خان کو بالکل ہی کنگال کر دیتی۔

"دیکھو۔۔۔ ابھی تم گالی دیتی مونچھ کو۔۔۔ ہم سب برداشت کرتی مگر تم مونچھ کو کچھ بولتی تو۔"

"تو کیا۔ کیا کرے گا تو؟" اس نے ہاتھ چلا کے کہا "گولی ماردے گا مجھے۔ توپ چلادے گا' بم گرادے گا مجھ پر؟ نقلی مونچھوں کو اور کیا کہوں میں؟ اصلی ماں لوں تیرے کہنے سے۔" اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔

میں نے کہا "تیس مار خان۔ چلو' اس سے تم نہیں جیت سکتے۔"

"ایک منٹ صاب۔ ہم اتنا بے عزتی برداشت نہیں کرتی" وہ اس عورت کے سامنے جا کھڑا ہوا "ابی تم ہمارا مونچھ کو پکڑتی' کھینچ کر دیکھتی۔ تم اکھاڑتی تو ہم اپنا نام بدلتی۔ اپنا باپ کا نام بدلتی' دادا کا نام بدلتی۔"

اندر سے شبنم نے آکے اس عورت کو ڈانٹا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا بک بک لگا رکھی ہے تم نے؟"

میں نے تیس مار خان کو کھینچ لیا "چلو تم بھی۔ کیوں اپنا دماغ خراب کر رہے ہو۔"

رئیس نے کہا "دماغ ہے کہاں اس کے پاس۔ وقت خراب کر رہا ہے سالا اپنا بھی اور ہمارا بھی۔"

عورت تو زیر لب بڑبڑاتی اور تیس مار خان کو گھور گھور کے دیکھتے ہوئے اندر چلی گئی۔ تیس مار خان کا غصے اور صدمے سے حال خراب ہو گیا "صاب' یہ ہمارا اتنا بے عزتی خراب کرتی۔ آپ ہم کو بولتی۔۔۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بڑے افسوس سے سر ہلایا۔

"ابے عزتی کا خیال ہوتا تو اس کی ایک بات نہ سنتا۔ دیتا ایک ہاتھ ایسا کہ جو زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی' دانتوں میں آجاتی" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "یار تیس مار خان۔ کون تھی یہ عورت؟"

"یہ عورت نہیں ہوتی صاب۔ شیطان کا سالی ہوتی۔ اللہ معاف کرتی۔ اس کو ہم نہیں چھوڑتی۔ وہ ہم کو نامرد بولتی' جھوٹا بولتی' بے ایمان بولتی۔۔۔ ہم اس کا خانہ خراب کرتی۔ ہم اس کو قتل کرتی" وہ غصے میں بولتا رہا۔

"اب بند کر اپنی بکواس۔ کیوں بیٹھا تھا اس کے ساتھ تاش کھیلنے۔ زندگی میں کبھی لوڈو بھی کھیلا ہے؟" رئیس نے کہا۔

تیس مار خان کا غصہ کچھ سرد ہوا "آپ ٹھیک بولتی صاب۔ ہم بے وقوف ہوتی' گدھا ہوتی۔ وہ ہم کو بلاتی' نہیں ہم اس کو پانی کا واسطے بولتی۔ وہ ہم کو بولتی کہ اندر آتی' تشریف رکھتی پھر وہ ہمارا واسطے چائے بھی لاتی۔"

میں نے کہا "آخر یہ ہے کون؟ نام کیا ہے اس کا؟"

"یہ صاب۔ ادھر کام کرتی۔ نام اس کا ہوتی چھوٹی۔۔۔ سب چھوٹی بولتی۔۔۔ اصل نام بہت مشکل ہوتی۔ بہت لمبا ہوتی۔"

"ایسا ہی ہونا بھی چاہیے۔ اب تجھے تیس مار خان کہنے میں خرچ ہو جاتے ہیں تین سیکنڈ۔ ہم بھی تجھے چھوٹو کہہ کے بلائیں گے" رئیس بولا۔

اس نے ترپ کے رئیس کو دیکھا "صاب' ایسا ظلم نہیں کرتی۔"

"ابے ظلم کیسا۔ یہ جو مستری اور کلینک بنتے ہیں' سب چھوٹے کہلاتے ہیں پہلے تو۔ خواہ وہ لمبے ہوں استاد سے۔"

"صاب جی' ہمارا نام خراب ہوتی۔ عزت خراب ہوتی۔ ہم ابھی نیا دوا کھاتی اور ایک دم لمبا ہو جاتی۔ حکیم صاب بولتی کہ اس دوائی سے قد بھی منگائی جیسا بڑھتی۔ وہ بہت تصویر دکھاتی۔"

میں نے کہا "منگائی کے حساب سے بڑھتے رہے تو دو چار سال میں دگنا ہو جاؤ گے۔ نوفٹ قد ہو جائے گا۔"

"لیکن آپ ہم کو چھوٹو نہیں بولتی۔ ہمارا چھوٹا نام لیتی" اس نے بے حد دکھی لہجے میں گزارش کی۔

رئیس نے کہا "چھوٹا نام کیا لیں۔ صرف تیس کہیں یا پھر مار کہیں؟"

میں نے کہا "فارسی میں مار کہتے ہیں سانپ کو۔ مار آستین یعنی آستین کا سانپ۔"

"آپ خان بولتی۔"

"ابے خان تو ہم خود ہیں۔ بس ہو گیا فیصلہ' تو چھوٹو ہے جب تک کہ کسی طلسماتی جڑی بوٹی یا دوا سے لمبا نہیں بن جاتا" رئیس نے کہا۔

میں نے اسے تسلی دی "یہ عیدی نام ہے۔ بالآخر تم کسی درویش کی دعا یا دوا سے لمبو بھی ہو جاؤ گے۔"

اس نے آسمان کی طرف دیکھ کے ایک آہ بھری "آپ مالک ہوتی صاب۔ آپ بول سکتی۔۔۔ چھوٹو بولتی۔ لوٹا بولتی' ڈڈو بولتی۔۔۔ جیسا کہ نوک مذاق اڑانے کو بولتی۔۔۔ اللہ ہم کو صبر دیتی۔"

میں نے کہا "چھوٹی کے چکر میں کیسے پڑ گئے تم؟"

"ہمارا تقدیر۔۔۔ ہمارا شامت ادھر لے جاتی۔۔۔ وہ تاش لا کے بولتی کہ ہم تم کو تماشا دکھاتی۔ تم شرط لگاتی؟ ہم مان جاتی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کی طویل گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ اس چالاک اور مکار عورت نے حماقت کی حد تک سادہ لوح تیس مارخان کو پہلے چائے پلائی' پھر باتوں میں لگایا اور غالباً اپنے عورت ہونے کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے تیس مارخان کی عقل کو گھاس چرنے بھیج دیا اور تیس مارخان جسے پہلی بار کسی عورت نے گھاس ڈالی تھی' خود گدھا بن کے گھاس کھا گیا۔

چھوٹی نے اسے پتے بازی کا کوئی کرتب دکھایا۔ اس سے کہا کہ لو گڈی میں سے ایک پتا نکالو اور خود اچھی طرح دیکھ کے واپس رکھ دو۔ اب خود ہی اسے پھینٹو۔ اب میں بغیر دیکھے وہی پتا نکال دوں گی۔ تیس مارخان نے کہا کہ ناممکن۔ اس نے کہا کہ اچھا لگاؤ شرط پچاس روپے کی۔ پچاس کا نوٹ پکڑ کے اس نے چند سیکنڈ میں پتا نکال لیا اور تیس مارخان کے سامنے رکھ دیا۔ دوسری بار تیس مارخان نے پتا نکالتے ہوئے بہت احتیاط کی اور گڈی کو خوب پھینٹا مگر وہ پھر پچاس روپے ہار گیا۔ تیسری شرط سو روپے کی تھی۔ وہ آنکھوں پر دوپٹے کی پٹی باندھ کے پتا نکالنے والی تھی اور اس نے دوپٹہ گلے سے اتار کے تیس مارخان کو پیش کردیا تھا کہ لو تم خود پٹی باندھو۔ اس دوپٹے کے لمس اور خوشبو نے اسے مست کردیا تھا۔ آنکھوں پر باندھتے ہوئے گریبان کے نظارے نے تیس مارخان کو مدہوش کردیا تھا۔ اچانک ہمارے آجانے سے اسے ہوش آگیا اور اس کے سو روپے ضرور بچ گئے مگر "بے عزتی خراب ہوگئی۔"

میں نے اور رئیس نے اندازہ کرلیا کہ چھوٹو نے سو روپے نہیں ہارے اپنا دل ہار دیا ہے۔ چھوٹی نے ہمارے سامنے اس کا جو مذاق اڑایا تھا اس پر وہ مشتعل ضرور ہوا تھا مگر یہ غصہ بھی اپنے جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کا ایک انداز تھا۔ وہ اندر سے جتنا خوش تھا' اس سے زیادہ متاثر تھا۔ چھوٹی کی شیریں بیانی' ہوشیاری اور ذہانت۔ ناز و انداز اور ادائے حسن و شباب نے تیس مارخان کی عقل خبط کردی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ہنسنے لگا اور اس کی تعریف کرنے لگا۔ انتہا یہ ہوئی کہ اس نے چھوٹی کی رعایت سے چھوٹو کہلانا بھی قبول کرلیا۔ میں اور رئیس حیران ہونے اور ہنسنے کے سوا کیا کرسکتے تھے۔

بے شک اللہ ہی سب انسانوں کے جوڑے آسمانوں پر بناتا ہے اور انہیں وقت آنے پر کسی بھی بہانے اس دنیا میں ملادیتا ہے۔ پتے بازی سے عشق کی بازی کا سلسلہ تیس مارخان کی بے رنگ زندگی میں ایک انتہائی خوش رنگ انقلاب کا سبب بنا جس نے اس کو یوں بدل دیا جیسے دھوبی کسی میلے کچیلے بدبودار اور شکن زدہ کپڑے کو دھو کے' نیل کلف لگا کے اور استری کرکے نیا جیسا بنا دیتا ہے۔

آہستہ آہستہ میں خود کو آزاد اور سبک دوش محسوس کرنے لگا تھا۔ مجبوری کے جس جال نے مجھے اسیر کرلیا تھا اس کے پھندے ایک ایک کرکے کٹتے جارہے تھے اور احساس جرم و گناہ کا بار کم ہوگیا تھا۔ میرے لیے واپسی کے راستے صاف اور واضح ہوتے جارہے تھے۔

وکیل کے پاس مجھے شام کے بعد جانا تھا۔ میک اپ آرٹسٹ سے ملاقات کا وقت گزر چکا تھا اور اب دوبارہ وہ رات کے بارہ بجے سے پہلے نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے درمیانی فرصت کو استعمال کرنے کے لیے یہ بہتر سمجھا کہ رخشی کے ساتھ شاہ عالم ہاؤس جاکے اپنی زندگی کا وہ افسوس ناک باب بھی بند کردوں جس کی ابتدا بھی شرمندگی تھی اور انتہا بھی۔ مجھے وہ وقت یاد آتا تھا جب میں شاہ عالم کی حیثیت سے شاہ عالم کے بند روم میں شاہ عالم کی بیوی کے ساتھ لیٹا ہوا تھا اور آنکھیں کھول کر دیکھنے پر مجھے شرمندگی اور خوف کے صدمے نے جکڑ لیا تھا۔ بے شک وہ سب غیر اختیاری تھا مگر مدہوشی' دیوانگی یا مجبوری میں سرزد ہونے والے کسی بھی شرمناک فعل پر ہوش آنے پر ندامت کم نہیں ہوتی۔

شاہ عالم ہاؤس میں جو کچھ ہوا۔ یا میں نے کیا' میرے ماضی کا ایک پُرآزار حصہ تھا اور مجھے اس کی یاد کے عذاب کو ایک عمر برداشت کرنا تھا۔ اطمینان اور خوشی کی بات یہ تھی کہ آج میں پورے اختیار کے ساتھ اپنی زندگی پر پورا تصرف حاصل کرسکتا تھا اور مجھے ناصر عظیم بننے سے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ گزرے ہوئے چھ مہینے میرے لیے کسی گندے نالے کی طرح تھے جو میری زندگی کے خوش رنگ اور دل نواز چمن کے درمیان بہنے لگا تھا۔ اب میں اسے پاٹنے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر یہ احساس کیسے ختم ہوسکتا تھا کہ اس مٹی کے نیچے کسی کو نظر نہ آنے والی بدصورتی موجود ہے۔

اچانک مجھے گزشتہ رات کا خیال آیا۔ میں نے چندا سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر گھنٹی بجتی رہی تھی اور کسی نے بھی ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ میں نے موبائل فون نکال کے پھر خان اعظم کے گھر کا نمبر ملایا۔ گھنٹی پھر بجتی رہی۔ ریسیور اس بار بھی کسی نے نہیں اٹھایا۔

میں نے کچھ دیر بعد فون بند کردیا "یار' یہ عجیب بات ہے۔ مجھے تو تشویش ہو رہی ہے۔"

"ابے فون خراب ہوگا۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ میں پوچھ چکا ہوں ایکس چینج نے کہا "فون ٹھیک ہے۔"

"ایکس چینج والے تو ٹھیک نہیں ہیں یار۔ کوئی شکایت کرے گا تو وہ نوٹ کرتے ہیں اور نوٹ کرکے بھول جاتے ہیں۔"

ہم تیسرے پہر رخشی کے پاس پہنچے تو وہ کھانے سے فارغ ہوچکی تھی لیکن فرید کی ماں کے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھی باتیں کررہی تھی۔

"اس وقت کہاں سے آرہی ہے یاروں کی جوڑی!" رخشی نے کہا۔

"حسب معمول خوار ہوکے۔ اپنے نصیب میں یہی ہے" میں نے کہا۔

"کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں؟" فرید کی ماں نے پوچھا۔

"آپ بھی کمال کرتی ہیں" میں نے کہا "لنچ پر آپ نے بلایا تھا اتنے اصرار سے۔ مہمان آگئے ہیں تو ان سے پوچھا جارہا ہے کہ کھانا کھاؤ گے؟"

فرید کی ماں ہنسنے لگی "تم مہمان کب سے ہوگئے؟"

رخشی نے اٹھتے ہوئے کہا "وہ کیا کہتے ہیں۔ ایک دن دو دن مہمان تیسرے دن بلائے جان۔ اب یہ مستقل بلائے جان ہی رہیں گے۔"

"نابی۔ ایسا نہیں کہتے۔ تم بیٹھو' باتیں کرو ان سے' میں کراتی ہوں کچھ بندوبست۔"

میری بات پر رخشی سوچ میں پڑ گئی "شاہ عالم ہاؤس جانا ہے؟ ابھی جاکے سامان اٹھانا ہے؟"

"ہاں۔ یہ شاہ عالم کی زندگی کا آخری دن ہے" میں نے کہا "ابھی مجھے وہاں تمہارے بغیر بھی جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔"

"بعد میں خود وہاں جانا کب چاہوں گی۔ وہ جگہ میرے لیے کسی جیل کی اس کوٹھری سے کم نہیں جہاں کسی نے عمر قید کاٹی ہو۔"

"ہم دونوں کو اپنے اپنے ماضی سے رشتہ توڑ کے آگے جانا ہے۔ اچھا ہے اس وقت کی کوئی بھی نشانی ہمارے ساتھ نہ ہو۔"

"یہ تمہارا ماضی کیسے ہوگیا۔ تم تو اپنے ماضی کی طرف ہی جارہے ہو۔ کیا یہ کام تم نہیں کرسکتے' میرا جانا ضروری ہے؟"

"تمہیں اپنی چیزوں کا فیصلہ خود کرنا ہے کہ کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم ہے۔ میرا تو وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن شاہ عالم کا ہے۔ وہ سب میں تمہارے حوالے کردوں گا۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ وہاں تہ خانے میں شاہ عالم کی پارٹی کا سارا اہم ریکارڈ ہے۔"

"اسے تم عدالتی تحویل میں دینا چاہتے ہو؟"

"لیکن اب وقت نہیں ہے میرے پاس۔ میں وہ سب ایک ٹرک میں بھر کے مٹس یا قریشی کو بھجوادوں گا۔ کسی عدالتی حکم کے بغیر۔ جب شاہ عالم ہی دنیا کی نظر سے اوجھل ہوجائے گا تو ساری تگ و دو اور بک بک بھی ختم ہوجائے گی۔ کیا فرمایا ہے شاعر نے اس موقع کے لیے۔ کہ۔

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا
اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما رہے

رئیس نے سوال کیا "یار' یہ ہما وہی ہے نا پیارے' کوئی پرندہ۔ جو کسی کے سر پر بیٹھ جائے تو وہ بادشاہ ہوجاتا ہے۔"

"ہاں مگر اب بادشاہت ہی کہاں ہے۔"

رئیس نے افسوس سے سر ہلایا "ٹھیک ہی کہتے ہیں یہ سائنس داں۔ بہت سے جانوروں کی نسلیں اب وہ ہوتی جارہی ہیں' کیا کہتے ہیں اسے۔ معدوم۔ پہلے تو ہاتھی سے بڑے سائنوڈارس بھی ہوتے تھے۔"

میں نے کہا "ڈائنوسارس' جاہل۔"

"ابے ہاں وہی۔ تو یہ ہما بھی ایسے ہی ختم ہوگیا ورنہ بادشاہت بھی رہتی۔ ویسے یہ پرندہ کیسا ہوتا ہے؟ تو نے دیکھی ہے تصویر تو ہمیں بھی دکھادے۔ کیا پتا کہیں نظر آجائے تو سالے کو پکڑ کے بٹھادیں تیرے سر پر۔"

میں نے ہنس کے کہا "وہ ایک فرضی بات ہے۔ الہ دین کے چراغ کی طرح۔"

رخشی نے کہا "میں فرید کو فون کرکے بتادوں کہ ہم شاہ عالم ہاؤس جارہے ہیں۔"

"ہاں بھئی' ان کی اجازت تو ضروری ہے" میں نے ان کے لفظ پر زور دے کے کہا۔

وہ کچھ جھینپی "نہیں۔ دراصل کسی کو پتا تو ہونا چاہیے۔ خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے۔ ممکن ہے وہ بھی ساتھ جانا چاہیں۔"

"وہ یقیناً جانا چاہیں گے" میں نے کہا "تم انہیں موقع فراہم کررہی ہو۔ اسے بھی بہانہ چاہیے' ہم کہتے تو بہانہ کرتا۔"

وہ خفا ہونے لگی "میں تو حفاظت کے خیال سے کہہ رہی تھی۔ نہیں تو نہ سہی' چلو۔"

لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے بعد خود میں نے اسے فون کردیا اور حسب توقع اس نے کہا "میں بھی آجاتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے ہنس کے کہا "ہم نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا۔ رخشی کا خیال تھا کہ تم بے حد معصوف ہو اور تمہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں۔ میں نے کہا کہ شرط لگالو' وہ سب کچھ چھوڑ کے آئے گا سر کے بل۔"

رخشی نے مجھ سے فون چھین کے بند کردیا "تم کچھ ضرورت سے زیادہ بولنے لگے ہو۔"

میں نے معصومیت سے کہا "پوری بات کرنے نہیں دی اور الزام یہ کہ باتیں بہت کرتے ہو مگر ایسے تم کس کس کی زباں پکڑو گی۔ باتیں تو کریں گے لوگ۔"

"اپنا پتا ہے کہ تمہارے اور شبنم کے بارے میں کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں لوگ" اس نے جوابی حملہ کیا۔

"ہاں۔ لوگوں سے زیادہ تو میں خود باتیں پھیلاتا ہوں اور مجھ سے زیادہ شبنم ہر بات اعلانیہ کہتی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں' بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اس سے باتیں بنانے والے مایوس ہوتے ہیں کہ اب ہم کیا کہیں۔ بات یہ ہے رخشی بی بی اور پرانی بات ہے۔ کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں۔ قافلہ چلتا رہتا ہے۔ آدمی کو ہونا چاہیے ڈھیٹ اور دو کان اس طرح استعمال کرنے چاہئیں کہ ایک کام کی بات سننے کے لیے اور دوسرا فضول بات اڑانے کے لیے۔"

"اے ہاں یار۔ اپنی بھی یہی پالیسی ہے۔ ایسی کی تیسی بات کا بتنگڑ بنانے والوں اور محاورے کے مطابق ان کی جو چیونٹی کا ہاتھی بنادیتے ہیں" رئیس بولا۔

"صحیح محاورہ ہے رائی کا پہاڑ بنانا۔"

رئیس اڑ گیا "اے رہنے دے۔ یہ زیادہ صحیح ہے۔"

شاہ عالم ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر کرنل خان کا نمبر ملا کے دیکھا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے جواب نہ ملنے سے ایک نامعلوم سی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوئی تھی کہ کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا تھا۔ دل کو اس خیال سے تسلی نہیں ہوتی تھی کہ وہ کہیں جاسکتے ہیں۔ پچھلے کئی برسوں میں ایک بار بھی وہ چوبیس گھنٹوں کے لیے گھر چھوڑ کے کہیں نہیں گئے تھے۔

میں ڈاکٹر کمال فاروقی کو فون کرکے بھی معلوم کرسکتا تھا کہ خان جی اور چندا خیریت سے ہیں مگر ہم اسی سمت میں جارہے تھے جدھر ان کا گھر تھا۔ جو میرا بھی گھر تھا۔

میں نے کہا "چھوٹو۔ گاڑی دائیں ہاتھ پر موڑلو اور اگلے چوک سے پھر دائیں طرف۔"

اس نے پلٹ کے مجھے مجروح نظروں سے دیکھا "گاڑی ہم ایک سو بار موڑتی۔ ہزار بار موڑتی مگر آپ میرا دل توڑتی۔ ہم کو چھوٹو بولتی تو ہمارا کتنا بے عزتی خراب ہوتی۔"

میں نے کہا "یار چھوٹو' کسی کے کہنے سے کوئی چھوٹا نہیں ہوتا۔ شیر کو بکری کہنے سے وہ بکری نہیں ہوجاتا۔ تم بہت بڑے آدمی ہو۔ ماشاء اللہ اتنی بڑی مونچھیں ہیں تمہاری اور ایسی اکڑی ہوئی کہ چاہو تو دونوں طرف ترازو کے پلڑے لٹکادو پھر اتنا بڑا دل ہے تمہارا کہ اس میں چھوٹی رہ سکتی ہے نی الحال۔ بعد میں کوئی بڑی ہو تو وہ بھی۔"

وہ خوش ہوکے دانت نکالنے لگا اور مونچھیں ہلانے لگا۔

خان اعظم کے پرانے وقتوں کے بنگلا نما گھر کے دروازے پر اس نے گاڑی روکی تو ایک لمحے کے لیے مجھ پر تذبذب کی کمزوری غالب آئی۔ میں نے سوچا کہ کہیں سب کے سامنے مجھے بے عزت ہوکے نہ لوٹنا پڑے مگر یہ وقتی خیال تھا۔ خان اعظم کی عادت کو مجھ سے بہتر کون جانتا تھا۔ وہ صرف گرج سکتے تھے' برستے نہیں تھے۔

مجھے مین گیٹ پر اندر سے تالا دیکھ کے حیرانی ہوئی۔ برآمدے میں کھلنے والے دروازے اور کھڑکیاں سب بند تھے۔ دوسرے گیٹ کی طرف جو ہمیشہ بند ہی رہتا تھا۔ ان کی جیپ بھی موجود نہ تھی۔ میں نے گیٹ پر لگا ہوا کال بیل کا بٹن بار بار دبایا تو اندر گلی کی طرف سے ایک شخص نمودار ہوا۔ وہ صورت اور حلیے سے چوکیدار نظر آتا تھا اور چوکیدار ہی ثابت ہوا۔

"خوچہ کیا بات اے؟" اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا "مجھے خان اعظم کرنل خان سے ملنا ہے۔"

"ادھر کوئی کرنل ورنل نئیں رہتا اے۔ بنگلا خالی اے۔"

میں نے کہا "یہ کیا بکواس ہے۔"

"خوچہ' کیسا بات کرتا اے" پٹھان گرم ہوگیا "ام سیٹھ اسحاق کو جانتا اے۔ وہ ام کو اور چوکیداری کا واسطے رکھا۔ بنگلا خریدا اے سیٹھ نے؟"

میں نے کہا "کون ہے یہ سیٹھ اسحاق؟ میری بات کراؤ اس سے' اندر فون ہے؟"

"ام کو سیٹھ کا نمبر نئیں مالوم۔ ابی جاؤ" وہ پلٹ گیا۔

میں دہشت زدہ اور حواس باختہ ہوگیا۔

○☆○

میں دہشت زدہ اور حواس باختہ ہوکے تیزی سے لپکا "شادو!" میں نے چیخ کے کہا "کیا ہوا ہے تجھے شادو؟"

بڑے ملک کے دو حکم کے غلاموں نے مجھے شادو تک

پہنچنے سے پہلے ہی اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑلیا۔ ان کے جسم ٹھوس فولاد جیسے تھے اور ان کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہونے کے لیے میری دیوانہ وار جدوجہد لاحاصل تھی۔ میں عقاب کے پنجے میں دبوچی ہوئی چڑیا کی طرح پھڑپھڑا کے رہ گیا۔

بڑے ملک نے ایک شیطانی قہقہہ لگایا "بڑا زور ہے بھئی جوان۔"

معلوم نہیں کیسے اس وقت میں نے ہوش پر جوش کو غالب نہیں آنے دیا اور عقل کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ اگر میں پاگل ہوکے ملک کو گالیاں دینے لگتا تو شاید آج یہ آپ بیتی سنانے والا کوئی نہ ہوتا۔

مجھے پوری طرح صورت حال کی سنگینی کا اندازہ تھا۔ وہ بڑے ملک کی حویلی تھی جس کے اندر اجازت کے بغیر پرندہ پَر نہیں مار سکتا تھا اور بندہ سانس نہیں لے سکتا تھا۔ میرے چاروں طرف اس کے ایک اشارے پر چلنے والے حکم کے غلام کھڑے تھے جو میری بوٹیاں کرکے ملک صاحب کے شکاری کتوں کو ڈال سکتے تھے۔ رہی نیلم تو چشم دید گواہ کی حیثیت سے اس کو زندہ چھوڑ دینے کا خطرہ مول لیتا ہی بڑے ملک کے لیے خلافِ مصلحت ہوجاتا اور کسی کو بھی پتا نہ چلتا کہ اتنی مشہور فلمی ہیروئن اچانک کہاں غائب ہوگئی۔

فرطِ غم اور احساسِ بے بسی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے روتے ہوئے کہا "بڑے ملک صاحب۔ آپ کو اللہ کا' اس کے رسول کا واسطہ۔ مجھے صرف اتنا بتادیں کہ کیا شادو زندہ ہے؟"

"اوئے زندہ ہے تو کیا؟" اس نے پاؤں کی ٹھوکر سے شادو کو چت کردیا "اور مرجائے گی تو کیا۔ مگر تو کیا لگتا ہے اس کا؟ شادو کہتا ہے اتنی بڑی چیز کو۔ یہ بھی بڑا زور دکھاتی تھی تیرے لیے۔ معاملہ کیا ہے؟"

بڑے ملک کے حواری ہنس پڑے "اوجی۔ عاشقی ماشوکی کے سوا کیا معاملہ ہوسکتا ہے" ایک نے کہا۔

دوسرے نے اس کی تائید کی "آہو جی۔ خصم تو بڈھا رکھ چھوڑا تھا۔ ایسے منڈے شنڈے رکھ لیتی ہوگی دل خوش رکھنے والے۔"

ابھی تک میں نے نیلم کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا کہ خوف سے اس کی کیا حالت ہورہی ہے۔ شاید چشمِ تصور سے اس نے خود کو شادو کی جگہ دیکھا ہوگا تو اس کی آدھی جان ایسے ہی نکل گئی ہوگی۔ وہ اچانک لڑکھڑا کے گری تو سب کی نظر اس پر گئی۔

میں نے شادو کی طرف دیکھا پھر نیلم کی طرف اور دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ "بڑے ملک صاحب! آپ مجھے رکھ لیں' میں ہوں آپ کا مجرم۔ مجھے جو سزا چاہیں دیں۔ شادو کو معاف کردیں۔ اس کی جان بخشی کردیں۔"

ملک نے مونچھوں کو تاؤ دیا۔ "اوئے جان بخشی کیسے کردیں؟ اس نے کیا سمجھ کے ہمیں قانونی نوٹس بھیجا تھا۔ بگاڑ سکتی تھی یہ ہمارا۔ اس کی بہت بڑی قانونی فرم ہے تو کیا اس کے سارے ماتحت وکیل مل کے ہمیں پھانسی چڑھادیں گے؟ اوئے کوئی ایک بال اکھاڑ کے دکھائے ملک کا۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "ملک صاحب۔ غلطی کی اس نے۔ اس کو ایک بار معاف کردیں۔ اس کو اندازہ نہیں تھا آپ کی طاقت کا۔"

نیلم ابھی تک فرش پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔ ملک کی اجازت کے بغیر کوئی اسے نہیں اٹھا سکتا تھا اور نہ اس کے بارے میں فکرمند ہوسکتا تھا لیکن نیلم کی خوش قسمتی تھی کہ اچانک چھوٹا ملک اندر آگیا۔

"اوئے۔ یہ تیری ہیروئن کیوں آئی ہے یہاں اس کے ساتھ؟" بڑے ملک نے دہاڑ کے کہا۔

چھوٹے ملک کی مسکراہٹ کافور ہوگئی "بھائی جی' اس کی بہن ہے۔"

"یہ بکواس کرتی ہے۔ اگر ایسا کہتی ہے اور تو بے وقوف ہے جو ایسی بات پر یقین کرتا ہے۔ یہ کوٹھے والیاں آج فلمی ہیروئن ہوگئی ہیں تو کیا حسب نسب والی بن گئی ہیں۔ ان کا کسی سے کیا رشتہ۔ نہ اس کے ماں باپ کا پتا جس نے ہوش ہی سنبھالا یتیم خانے میں۔ نہ اس کا کوئی آگے پیچھے۔ یہ بھائی بہن کیسے ہوگئے؟"

"جھوٹ بولا ہوگا جی اس نے مجھ سے؟" چھوٹے ملک نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کرلی "میں پوچھ لوں گا اس سے کہ یہ ساتھ کیوں آئی تھی یہاں؟"

"اوئے مردوں کی طرح پوچھنا۔ نامردوں کی طرح نہیں۔ ورنہ چھوڑ جا اسے بھی ہمارے پاس۔"

چھوٹے ملک نے عاجزی سے کہا "آپ فکر نہ کریں بھائی جی۔ میں اس کو اچھی طرح سمجھادوں گا ہر بات۔ میری ذمے داری۔"

بڑے ملک نے سر ہلایا "اوئے اٹھا کے لے جاؤ اسے اندر۔"

میں نے کہا "جناب عالی۔ اس کی ذمے داری میں لیتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوں۔"

ملک نے غصے میں کہا "ذرا میرے پاس لاؤ اس وڈے وڈے دار دے پترنوں۔ یہ ہے کیا شے۔ اتنی بڑی بات کرتا ہے میرے سامنے۔"

مجھے دھکیل کر ملک کے سامنے کیا گیا تو میں راہ میں پڑی ہوئی شاہدو سے ٹھوکر کھا کے اسی کے اوپر گرا۔ وہ بے ہوشی میں کراہی تو میرا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ وہ زندہ تھی مگر اس سے پہلے کہ میں شاہدو کے لیے کچھ کرتا' بڑے ملک کی ٹھوکر میری پسلیوں پر پڑی۔ میں درد سے بلبلا کے دہرا ہوا تو اس نے مجھے ایک اور لات رسید کی۔ اس کے بعد تو گالیوں اور لاتوں' مکوں کی برسات ہوگئی۔ کسی نے بڑے ملک کے ہاتھ میں بید تھما دی تھی۔ اس نے ایک انتقامی جنون کے ساتھ میرے جسم کی کھال ادھیڑ دی۔ میں چیختا رہا اور اس سے گڑگڑا کے رحم مانگتا رہا۔ معافی مانگتا رہا' اسے خدا رسولؐ کے واسطے دیتا رہا مگر بڑے ملک نے اپنی توہین کا بدلہ شاہدو سے لے لیا تھا۔ اب میری باری تھی۔

میں نے بہت برداشت سے کام لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری معمولی سی سرکشی یا گستاخی میرے لیے زندگی کے امکانات کو معدوم کردے گی۔ میرا قصور صرف یہ تھا کہ میں نے بلا ارادہ اور بالواسطہ ہی سہی مگر اس کا نقصان کیا تھا اور شاہدو کا جرم یہ تھا کہ اس نے قانون کی دھمکی دے کر مجھے ملک کی قید سے رہائی دلائی تھی۔

اس وقت میں ملک کے پاؤں پڑ کے خود اپنی جان بھی بچا سکتا تھا اور شاید شاہدو کے لیے بھی زندگی کی بھیک مانگ سکتا تھا۔ وہ فرعون صرف بھیک میں ہر چیز دینے کا قائل تھا۔ جو حق مانگنے کی جرأت کرتا تھا' اس کا انجام عبرت ناک ہوتا تھا۔

شاید بڑے ملک کی مشق ستم جاری رہتی تو زیادہ دیر برداشت سے کام لینا میرے لیے ناممکن ہوجاتا۔ میرے وجود میں نفرت اور وحشت کا شعلہ بھڑک کے آتش فشاں بن گیا تھا جو کسی وقت بھی پھٹ سکتا تھا۔ میں پلٹ کے ملک پر حملہ کرتا اور اس کی چھڑی سے مار مار کے اس کا چہرہ بگاڑ دیتا۔ میں جسمانی طور پر اتنا کمزور بھی نہیں تھا اور کسی کے قابو کرنے سے پہلے میں ملک کی آنکھیں نوچ لیتا اور اس کا گلا دبا دیتا اور کچھ عجب نہ ہوتا اگر اس دہشت میں ملک کا خون بھی کردیتا پھر میرے ساتھ جو ہوتا سو ہوتا۔

لیکن اچانک میرے کانوں نے کسی عورت کی آواز سنی "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ملک کا ہاتھ رک گیا "آپ یہاں کیوں آئی ہو ماں جی!"

"میرے سوال کا جواب دے پہلے۔ کیا تو پاگل ہوگیا ہے؟ اللہ کے عذاب سے ڈر پتر۔ ظلم کی حد ہوتی ہے کوئی۔" وہ بوڑھی عورت بڑے ملک کی ماں تھی جو اسی کے لہجے میں بات کرتی تھی "کون ہے یہ عورت؟"

"ماں جی یہ باتیں آپ کے سمجھنے کی نہیں ہیں۔"

"کیوں نہیں ہیں میرے سمجھنے کی؟" وہ کڑک کے بولی "جو کچھ میرے گھر میں ہو رہا ہے' وہ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے سنا ہے کہ یہ وکیل ہے کوئی؟"

"وکیل نہیں ہے ماں جی!" بڑے ملک نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بڑے ملک کی ماں کے قدموں سے لپٹ گیا۔ "ماں جی' آپ ہمیں بچالیں۔ ہم بے قصور ہیں اور کوئی قصور ہے تو میرا ہے۔ یہ عورت آپ کی بیٹی جیسی ہے۔ اس نے بس مجھے بچانے کی کوشش کی تھی۔ یہ ایک کمپنی کی مالک ہے جس میں بڑے بڑے وکیل کام کرتے ہیں۔ اگر یہ مرگئی تو آپ کی بڑی بدنامی ہوگی۔"

"تو کون ہے؟ سیدھا کھڑا ہو کے بات کر۔ چل اٹھ" بڑے ملک کی ماں نے حکم دیا۔

میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ میں نے اسے ماضی کے کسی حوالے کے بغیر کم سے کم الفاظ میں اپنا قصور بتادیا۔ "اس آدمی کو بھی بڑے ملک صاحب نے بے گناہ مروایا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ مال کسے دینا ہے۔ میں تو خواہ مخواہ مارا گیا بڑی بیگم صاحب۔ میرا کوئی تعلق ہی نہیں تھا اس معاملے سے اور اس عورت نے سوائے مجھے بچانے کی کوشش کے اور کچھ بھی نہیں کیا۔"

ملک نے برہمی سے کہا "یہ کتا بھونکتا ہے' بکواس کرتا ہے۔"

میں نے ملک کی طرف دیکھا "بڑے ملک صاحب۔ اگر یہ جھوٹ ہے تو ادھر آئیں اور اپنی ماں کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیں۔"

میرا وار کارگر ثابت ہوا۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ بڑا ملک اگر کسی سے ڈرتا ہے تو اپنی ماں سے۔ ورنہ (نعوذ باللہ) اسے خدا کا بھی ڈر نہیں۔ خوف خدا ہوتا تو اس کا یہ کردار ہی کیوں ہوتا۔

پیچھے سے چھوٹے ملک نے کمرے میں داخل ہو کے کہا "ماں جی۔ میں تو چھوٹا ہوں۔ انہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کرتا کیونکہ پھر میری خیر نہیں۔ آپ خود دیکھ لیں کہ یہ کیا

کر رہے ہیں؟"

"کیا کر رہا ہوں میں؟" ملک نے پھنکار کے کہا۔

چھوٹا ملک سامنے آگیا "بھائی جی۔ یہ بادشاہت کا زمانہ نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کسی دن باپ دادا کے وقتوں کی عزت کا بھرم بھی نہ رہے۔ پولیس پہنچ جائے آپ کو ہتھکڑی لگا کے گرفتار کرنے۔ آپ جیل کی سلاخوں کے پیچھے نظر آئیں۔"

"چل تو چپ کر۔ مت نکال منہ سے ایسی بات" ماں نے چھوٹے بیٹے کو ڈانٹا۔

"میں بتا رہا ہوں ماں جی۔ وقت بہت بدل گیا ہے اور یہ گاؤں نہیں' شہر ہے۔ یہ جو پھانسی کے پھندے سے لٹکا ہوا ہے' معلوم ہے یہ کون ہے؟ یہ ایک تھانے دار کی بہن کا شوہر ہے۔ ایک پولیس انسپکٹر اپنی بہن کو بیوہ کرنے والے قاتل کے ساتھ سب کچھ کرسکتا ہے۔"

"وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ایسے انسپکٹر میری جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ میں ان کی اوقات جانتا ہوں" ملک چلانے لگا "وہ میرے ٹکڑوں پر پلنے والے کتے ہیں۔"

"انہی میں سے کوئی کتا پاگل ہوجائے تو کاٹ بھی لیتا ہے اور پاگل کتے کے کاٹے کا علاج کوئی نہیں بھائی جی!" چھوٹے ملک نے کہا "آخر کیا سمجھتے ہیں آپ اپنے آپ کو۔ ایک منتخب وزیراعظم کو عدالت کے حکم سے پھانسی ہوگئی کیونکہ اس نے خود قتل نہیں کیا تھا۔ قتل کا حکم صادر کیا تھا۔ کہیں آپ کے ساتھ بھی ایسا نہ ہوجائے۔"

ملک چیخنے لگا "تو چاہتا ہے کہ ایسا ہوجائے۔ تو خود مجھے پھانسی لگوا کے رہے گا۔ میں سمجھتا ہوں تیری نیت کو۔"

"بھائی جی۔ لعنت بھیجتا ہوں میں آپ کی اس جائداد پر۔ کہیں تو اسٹامپ پیپر پر لکھ کے دے دوں۔ سرینڈر ڈیڈ بنادوں۔ میں آپ کے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ کی عزت اور جان دونوں بچانا چاہتا ہوں۔"

بڑے ملک نے شیر کی طرح دھاڑنا جاری رکھا "تمہارا جو جی چاہے کرو۔ میں جو بھی کرتا ہوں اس خاندان کی آن کے لیے کرتا ہوں۔ کل کو یہی دو دو ٹکے کے لوگ تم پر کیس کریں گے۔ تمہیں عدالتوں میں گھسیٹ کر۔ لے جائیں گے۔ حویلی میں پولیس داخل ہوگی' پھر مجھے مت کہنا۔"

"اگر آپ نے اپنا رویہ نہ بدلا تو بالکل یہی ہوگا۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ شاہدو اپنے گاؤں کے کسی کمی' چمار یا مراثی کی بیوی ہے۔ سارا شہر جانتا ہے کہ وہ کتنی بڑی لیگل فرم ہے۔ آپ نے اسے ایسے اغوا کرالیا۔ کیا دیکھنے والوں نے دیکھا نہیں ہوگا۔ آپ ایک نفسیاتی مریض ہوتے جا رہے ہیں بھائی جی۔"

ملک غصے میں پاؤں پٹختا منہ سے جھاگ اڑاتا راستے میں آنے والی کرسی کو ٹھوکر مار کے گراتا باہر نکل گیا۔ ان کے خانہ زاد غلام پہلے ہی کھسک گئے تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ معاملہ اب بڑے ملک صاحب کا نہیں' ایک خاندانی مسئلہ بن گیا ہے جس میں ان کی دخل اندازی پر انہیں جوتے پڑسکتے ہیں۔

بڑے ملک کی ماں اپنے چھوٹے بیٹے کے انکشافات پر خوف اور صدمے سے گم صم ہوگئی تھی۔ چھوٹے ملک نے بھی شاید پہلی بار ماں کی موجودگی میں زبان کھولی تھی اور جو منظر ان کی ماں کی نظروں کے سامنے تھا' وہ انتہائی دہشت زدہ کرنے والا تھا۔ بے شک ان کے آباؤاجداد اپنی رعایا پر ایسے ہی ظلم کرتے آئے تھے مگر وہ وقت اور تھا۔ وہ جگہ اور تھی' ظلم سہنے والے اور تھے۔

"چل اب تو کسی طرح اس معاملے کو ختم کر" چھوٹے ملک کی ماں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تو سیانا ہے۔ کچھ ایسا بندوبست کر کہ بات آگے نہ بڑھے اور آئندہ سب پتا ہونا چاہیے مجھے۔"

"آپ فکر نہ کریں ماں جی۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ آپ ذرا ان کو سنبھال لیں" اس نے شاہدو کی طرف اشارہ کیا "ان عورتوں کو۔ ایک اندر لیٹی ہوئی ہے۔ اسے بھی لے جائیں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سکون کا سانس لیا۔ بڑے ملک کی ماں کا آنا انتظام دست غیب تھا مگر یہ سب بہت دیر سے ہوا تھا۔ اس وقت تک میں قسم کھا کے عہد کرچکا تھا کہ بڑے ملک کو قتل کرنا میرے لیے ایک مقدس فریضے کی ادائیگی بن گیا ہے۔ یہ کام میں ضرور کروں گا۔ آج نہ سہی کل' ایک ہفتے' ایک مہینے یا ایک سال بعد۔ جب بھی مجھے موقع ملے گا۔

شاہدو کو ملازم ایک چادر میں لپیٹ کر اندر لے گئے تو چھوٹے ملک نے مجھے حکم دیا "اس لاش کو اتار۔ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے تو بھی ملازموں کے ساتھ جائے گا۔"

میں نے صاف انکار کردیا "نہیں چھوٹے ملک صاحب۔ نہ میں آپ کا ملازم ہوں اور نہ قبریں کھودنے والا۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر باہر نکل گیا۔ اب اس ہولناک کمرے میں میرے ساتھ صرف وسیم کی لاش تھی جو کھلے سے لٹکی آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے نکل آئی تھیں اور دانتوں میں دبی ہوئی زبان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آدھی باہر تھی۔

چند منٹ بعد وہی دو افراد اندر آئے جنہوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور دھکے دیتے ہوئے اندر لے گئے۔ حویلی جیسی کوٹھی کے عقب میں شاید ایک کنال کا باغیچہ تھا۔ اس کے خوب صورت پھولوں اور سرسبزلان کے آخری حصے میں فٹ بال کے گول پوسٹ جیسا لوہے کا فریم تھا۔ اس فریم میں ایک صوفہ زنجیروں سے لٹکا دیا گیا تھا اور چھوٹا ملک اس پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

"اس کی معشوقہ کو بھی لے آؤ" چھوٹے ملک نے زہر آلود لہجے میں کہا۔

اس وقت ہم سماجی حیثیت' عمر کے رتبے اور تعلیم وغیرہ کے سارے فرق کے باوجود ایک ہی سطح پر آ گئے تھے۔ چھوٹے ملک نے مجھے اپنا رقیب سمجھ لیا تھا۔ یہ بڑا سنگین جرم تھا کہ کتے سے کمتر حیثیت اور اوقات رکھنے والا میرے جیسا لاوارث آدمی چھوٹے ملک صاحب سے ان کی پسند کی چیز چھین کر فاتح بن جائے۔

نیلم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور میری طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد صوفے پر ملک کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ جنسی دہشت زدہ تھی' اس سے زیادہ حیران اور پریشان تھی۔

ملک نے حکم دیا "لے آؤ ہمارے شیروں کو۔"

میں نے خود کو رومن دور کے ان غلاموں کی طرح محسوس کیا جن کی آدم خور بھوکے شیروں سے لڑائی کا تماشا دیکھنے والے شہنشاہ کے ساتھ معزز شہری بھی ہوتے تھے جو اپنے جیسے ایک انسان کو حیوان سے شکست کھا کے اس کی خوراک بنتا دیکھتے تھے اور اسے ایک پُرلطف کھیل سمجھتے تھے۔

مگر میں وہ غلام GLADIATOR نہیں تھا اور نہ چھوٹا ملک کوئی شہنشاہ تھا۔ جب دو شکاری کتے لائے گئے تو میں ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ ان کتوں کی زنجیر رئیس نے تھام رکھی تھی۔

رئیس مجھے دیکھ کے بُری طرح چونکا۔ اس نے ایک نظر چھوٹے ملک کی طرف اور دوبارہ میری طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ ایک ہی زنجیر سے بندھے ہوئے دونوں کتے غرا رہے تھے اور جست لگا کے مجھ پر حملہ کرنے کے لیے بے قرار تھے۔ وہ پتلی کمر والے اونچے قد کے شکاری کتے تھے اور صاف نظر آتا تھا کہ جنگل کے خرگوشوں اور ہرنوں کی طرح ان کے منہ کو ایک اور جانور کا خون لگا ہوا ہے جسے انسان کہتے ہیں۔

دونوں کتوں کے گلے میں چمڑے کے پٹے تھے۔ زنجیر کا ایک سرا ایک پٹے کے کُنڈے میں لگا ہوا تھا اور دوسرا سرا دوسرے پٹے سے منسلک تھا۔ دس گز لمبی اس زنجیر کو رئیس نے درمیان سے پکڑ رکھا تھا۔ کتے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے اور انہیں قابو رکھنا رئیس کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔

نیلم کا رنگ جو پہلے ہی پیلا پڑا ہوا تھا لاش کی طرح سفید ہو گیا "ملک صاحب۔ آخر۔ کیا ہے یہ سب؟"

ملک کی آنکھوں میں ایک حیوانی چمک پیدا ہوئی "ایک تماشا دکھاتے ہیں تمہیں۔"

"کیسا تماشا۔؟" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

ملک اپنے بڑے بھائی کے مقابلے میں زیادہ مہذب تھا اور تعلیم یافتہ تھا لیکن اندر سے وہ اپنے آباؤاجداد کی کئی صفات کا حامل تھا۔ اس کی فطرت میں بھی طاقت کی ہی رعونت تھی جو صدیوں پرانے دورِ شہنشاہیت کے جاگیردارانہ نظام کی عطا کردہ تھی۔ جس نے اللہ کی مخلوق کو حاکم و محکوم' اعلیٰ و ادنیٰ اور امیر غریب کے طبقوں میں بانٹ دیا ہے اور نوشتہ تقدیر کو بنیاد بنا کے یہ عقیدہ عام کر دیا ہے کہ (نعوذ باللہ) یہ نظامِ خدا نے ایسے ہی بنایا ہے کہ حاکم کو حکومت کا اختیار حاصل رہے اور محکوم پر بلاچون وچرا اطاعت فرض ہو۔

میں سمجھ گیا کہ ملک کیا تماشا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کے سامنے بھی ڈراما کیا تھا کہ بڑے بھائی کے مقابلے میں وہ زیادہ معاملہ فہم ہے۔ جمہوری نظام اور قانون کی حکمرانی کے بدلے ہوئے دور کے تقاضوں کو سمجھتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ انہیں بھی اپنا رویہ حالات کے مطابق رکھنا چاہیے۔

جہاں اس کے مفادات کو خطرہ لاحق ہو وہاں چھوٹا ملک ضرور اپنا رویہ بدل لیتا ہوگا۔ سیاست سے اسے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ صرف اپنی موروثی سیٹ پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے صوبائی اسمبلی کا ممبر بن گیا تھا۔ وہ بزنس مین تھا اور خاندان کو آہستہ آہستہ زراعت سے صنعت کے شعبے کی طرف لے جا رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ وہ وقت اب زیادہ دور نہیں ہے جب زمینوں کی ملکیت کی بنیاد پر انہیں اپنے علاقے کے بے تاج بادشاہ کی حیثیت حاصل نہیں رہے گی۔ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارع بھی سر اٹھا کے چلیں گے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے حقِ محنت مانگیں گے۔ ظلم کی چکی میں صدیوں پسنے والے بنیادی انسانی حقوق' مساوات اور قانون کے مطابق انصاف کی بات کریں گے۔

بے شک ابھی یہ سب کچھ صرف فلموں میں پیش کیا جا رہا تھا یا ٹیلی وژن کے ڈراموں تک محدود تھا مگر ذرائع ابلاغ کا دائرہ پھیل رہا تھا اور تعلیم کے ساتھ شعور آنے سے ذہن بدل رہے تھے۔

چھوٹا ملک کسی بڑے بزنس مین سے ڈیل کرتے وقت یقیناً کاروباری ذہانت استعمال کرتا ہوگا۔ اپنے سے بڑے بزنس مین کے سامنے اس کا لہجہ اور رویہ عاجزانہ ہوگا۔ بہت بڑے کاروبار کے مالک کے ساتھ خوشامدانہ تو کسی گروپ آف انڈسٹری کے سربراہ یا ملٹی نیشنل کے صدر کے سامنے غلامانہ لیکن اپنی جاگیرداری میں اور میرے یا رئیس جیسے لاوارثوں کے سامنے اس کا بدلا ہوا رویہ صرف ظاہری تھا۔ وہ کسی بے حیثیت اور کمتر آدمی کو اپنے برابر نہیں بٹھا سکتا تھا اور یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ دو ٹکے میں بکنے والے اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے جھکنے والے اس جیسے خاندانی آدمی کی عزت کے گریبان پر ہاتھ ڈالیں۔

میں نے اسے نیلم کے گھر میں بے عزت کیا تھا یا اس کا خیال تھا کہ اس کے ساتھ بے عزتی کا رویہ اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے نزدیک میں واقعی دو ٹکے کا آدمی تھا اور نیلم کی حیثیت بھی کسی طوائف سے زیادہ نہ تھی۔ بڑے ملک کی بات نے اسے احساس دلایا ہوگا کہ میرے اور نیلم کے درمیان بہن بھائی کا رشتہ واقعی ناممکن تھا۔ نیلم نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اسے بے وقوف بنایا تھا اور وہ مجھے اس سے زیادہ اہم سمجھتی تھی۔

اب چھوٹا ملک مجھے نیلم کے ساتھ تعلق کی سزا دینا چاہتا تھا یا نیلم کو احساس دلانا چاہتا تھا کہ اس کی اوقات کیا ہے۔ وہ مجھ پر اپنے خونی شکاری کتے چھوڑ کے نیلم کو تماشا دکھانا چاہتا تھا اور یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس شہر میں بھی جنگل کا قانون چلتا ہے اور طاقتور کا یہ نظامِ انصاف کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

نیلم نے بھی سمجھ لیا تھا کہ اب کیا تماشا ہونے والا ہے "ملک صاحب' تم میرے بھائی کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" وہ کھڑی ہو گئی۔

ملک نے نیلم کی کلائی پکڑ کے ایک جھٹکا دیا "تمہارا بھائی؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا "کیا تم یتیم خانے میں بھی اس کے ساتھ رہتی تھیں اور تمہارا بھائی یہ کس رشتے سے ہے؟"

نیلم اس کے ساتھ ہی صوفے پر گر گئی "چھوڑو' میرا ہاتھ۔"

ملک نے اسے بالوں سے پکڑ لیا "پہلے بتا مجھے رنڈی۔ اس کا اور تیرا باپ ایک تھا؟ کون تھا وہ؟ نام کیا تھا اس کا؟"

نیلم نے ایک چیخ ماری "چھوڑو مجھے کمینے۔ ورنہ۔"

ملک نے اسے ایک جھٹکا دیا "ورنہ کیا۔ کیا بگاڑ لے گا تیرا یہ آشنا میرا۔ ابھی تیرے اس یار کے میرے کتے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں گے۔ اس کی بوٹیاں اور ہڈیاں تیرے سامنے کھا جائیں گے۔"

میں نے چیخ کے کہا "حرام زادے کی نامرد اولاد۔ بُلا لے اپنی ماں کو بھی یہ تماشا دکھانے کے لیے۔ مجھ پر کتے چھوڑنے سے پہلے پوچھ اس سے کہ وہ تیرے باپ کی حویلی میں کس کس کے ساتھ سوتی تھی؟"

میرا مقصد ملک کو بے عزت اور مشتعل کرنا تھا اور میں اس مقصد میں کامیاب رہا۔ اسے کسی نے ان غلام زادوں کے سامنے ایسی گالیاں کبھی نہیں دی ہوں گی جن کے باپ دادا بھی ملک کے باپ دادا کا نمک کھا چکے تھے اور اس کے بدلے میں پوری خدمت گزاری اور فرمانبرداری کے ساتھ اپنی عزت کے نذرانے بھی پیش کرتے آئے تھے۔

اس نے نیلم کا ہاتھ چھوڑ دیا "اس۔۔۔ کو پکڑ کے یہاں لاؤ" اس نے چیخ کے کہا۔

نیلم کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ ملک کی منت سماجت کرنے لگی "چھوٹے ملک صاحب' معاف کر دیں اس بے وقوف کو۔"

لیکن اس وقت تک چھوٹے ملک کے اشارے پر مجھے اس کے قدموں میں پھینک دیا گیا تھا۔ ملک نے مجھے ٹھڈے مارے اور گالیاں دیتا رہا۔ "اس نے سب کے سامنے میری ماں کو گالی دی ہے۔۔۔ میں نے اسے بچا لیا تھا ورنہ بڑے ملک صاحب اس کو زندہ دفن کرا دیتے۔ میں صرف اسے ڈرا رہا تھا تاکہ یہ باہر جا کے کوئی بات نہ کرے۔۔۔ لیکن اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔"

نیلم ایک دم اٹھی اور ملک سے لپٹ گئی "رحم کریں ملک صاحب۔ آپ کو اپنی ماں کے دودھ کا واسطہ۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ آپ قسم لے لیں مجھ سے۔ یہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا' زبان سے ایک لفظ نہیں نکالے گا۔"

ملک نے اسے جھٹک دیا "چھوڑ مجھے کنجری' تو کیا سمجھتی ہے کہ میں ڈرتا ہوں۔۔۔ وہ تو مجھے خیال تھا بڑے ملک صاحب کا۔"

نیلم پیچھے گری اور زار و قطار رونے لگی۔ اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں ہاتھ ملک کے سامنے جوڑے "آپ مجھے اپنی قید میں رکھ لیں۔ اسے اور شاد کو جانے دیں۔"

میری قوتِ برداشت اس وقت تک جواب دے چکی تھی۔ نیلم کی بات سن کے میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں زخم خوردہ جانور کی طرح اٹھا اور میں نے چیخ کے کہا "نیلم۔" پھر میں نے ایک جست میں چھوٹے ملک کی گردن دبوچ لی جو صوفے پر بیٹھ کے ہانپنے لگا تھا۔

وہ صوفہ جھولے والا تھا۔ میرے وزن کے دباؤ سے جھولا پیچھے ہوگیا۔ میرے پاؤں زمین پر لمبے ہوگئے اور جھولا واپس آیا تو میرے گھٹنوں سے ٹکرایا۔ ملک نے نیچے سے میرے پیٹ میں مکا مارا۔ میں نے نیلم کی چیخ پکار سنی۔ وہ مجھے آواز دے رہی تھی اور زور زور سے رو رہی تھی۔ میں نے رئیس کے چلانے کی آواز بھی سنی مگر مجھ پر پاگل پن سوار ہوگیا تھا۔ یہ صرف چند سیکنڈ کی بات تھی پھر مجھے ملک کے غلاموں نے پیچھے کھینچ لیا اور مجھ پر ہر طرف سے لاتیں مکے برسنے لگے۔ کچھ دیر کے لیے میں ہوش و حواس سے بے گانہ ہوگیا۔

پھر کسی نے مجھ پر پانی پھینکا اور مجھے ہوش آیا تو میں الف ننگا کھڑا ہوا تھا۔ صوفے پر بیٹھا ہوا چھوٹا ملک ایک گلاس میں کچھ پی رہا تھا۔ اس کے قریب صوفے کی پشت سے سر ٹکائے نیلم بے ہوش پڑی تھی۔ رئیس صوفے کے پیچھے کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں وہی زنجیر تھی جس کے دونوں کناروں پر وہ خون آشام کتے بندھے ہوئے زور لگا رہے تھے۔

مجھے اتنی مار پڑی تھی کہ میرے لیے سیدھا کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ میرا وقتی جنون اب بے بسی اور مایوسی کی انتہا میں ڈھل گیا تھا۔ اپنی حالت کا تصور کر کے شرم اور ذلت کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ایک شخص ہاتھ میں پیالہ اٹھائے میری طرف بڑھا تو رئیس چیخنے لگا۔ "چھوٹے ملک صاحب۔ آپ کو خدا رسول کا واسطہ۔ قرآن کا واسطہ۔"

چھوٹے ملک نے پلٹ کے اسے گالی دی "بھونکنا بند کر کتے کی اولاد ورنہ اس کے ساتھ تجھے بھی کھڑا کردوں گا۔"

وہ شاید پانی ہی پی رہا تھا۔ اس نے آدھا گلاس نیلم پر خالی کردیا۔ نیلم نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور میری طرف دیکھا۔ پیالہ لے کر آنے والے نے میرے جسم پر کوئی سفید چیز انڈیل دی۔ اس میں مرچ مسالے کی بو بھی شامل تھی۔ یہ وہی تھا جو کتوں کو مجھ پر چھوڑنے سے پہلے میرے بدن پر ان کی خونی بھوک جگانے کے لیے پھیلا دیا گیا تھا۔ وہ اسی بُو پر لپکتے تھے اور اپنے شکار کو بھنبھوڑ کر اس کا گوشت پوست اپنے نکیلے دانتوں سے چبا ڈالتے تھے۔

پھر پلک جھپکتے میں سب کچھ بدل گیا۔ صوفے کے پیچھے سے رئیس نے وہی زنجیر جس سے کتے بندھے ہوئے تھے چھوٹے ملک کی گردن میں ڈال دی اور ایک بَل دے دیا۔ کتے مخالف سمت میں زور لگا رہے تھے کیونکہ انہیں اپنے شکار کی اشتہا انگیز بُو کھینچ رہی تھی۔

ملک تڑپا اور اس نے دیوانہ وار ہوا میں ہاتھ پاؤں چلائے۔ اس کے نمک خواروں نے اس تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ دو نے فوراً کتوں کو پکڑ لیا اور انہیں ملک کی طرف کھینچا تاکہ زنجیر ڈھیلی ہوجائے مگر اس سے پہلے کہ ملک آزاد ہوتا یا کتے چھوڑے جاتے، میں نے نیلم کی آواز سنی "خبردار جو کوئی اپنی جگہ سے ہلا۔"

مجھے اس کے ہاتھ میں ریوالور نظر آیا۔ اس نے یقیناً چند سیکنڈ کی مہلت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چھوٹے ملک کی جیب سے نکالا ہوگا۔ نیلم کی آواز ہی نہیں اس کا ہاتھ بھی کانپ رہا تھا مگر وہ پوری طرح ہوش میں تھی۔

"رک جاؤ۔ سب رک جاؤ۔ بالکل کوئی حرکت نہ کرے ورنہ میں گولی مار دوں گی ملک کو۔" نیلم نے ریوالور کی نال کا رخ ملک کے سر کی طرف رکھا۔

سب پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ کتوں کے سوا جو اب بھی غرا رہے تھے اور زور لگا رہے تھے، سب پتھر کے بُت کی طرح منجمد ہوگئے۔

"رئیس۔ زنجیر نکال لے۔" نیلم نے حکم دیا۔

ملک کے حلق سے خرخر کی آوازیں آنی بھی بند ہوگئی تھیں اور وہ صوفے پر کسی لاش کی طرح بے دم پڑا تھا لیکن وہ زندہ تھا۔ رئیس نے زنجیر کو اس کی گردن سے نکال لیا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔

اب مجھے بھی ہوش آیا اور میں نے اِدھر اُدھر اپنے کپڑے تلاش کیے۔ کپڑے کچھ فاصلے پر موجود تھے۔ خود اعتمادی کی بحالی کے لیے ضروری تھا کہ میں حیوان سے پھر انسان بن جاؤں۔ حالات نے ایک دم پلٹا کھایا تھا اور یہ سب رئیس کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ نیلم کی حاضر دماغی اور ہمت کی جتنی تعریف کی جائے، کم ہے۔ چند سیکنڈ پہلے رونے دھونے اور خوف سے کانپنے والی لڑکی ریوالور یوں ہاتھ میں تھامے کھڑی تھی جیسے کوئی فاتح جنرل کسی شکست خوردہ فوج کے سپہ سالار سے ہتھیار ڈلواتا ہے۔

دو افراد جنہوں نے کتوں کے پٹے پکڑ رکھے تھے تاکہ زنجیر کی گرفت ان کی مخالف سمت میں زور آزمائی سے سخت نہ

ہو، نیلم پر نظر جمائے کھڑے تھے اور اس لمحے کے انتظار میں نظر آتے تھے جب انہیں پھر صورتِ حال کو اپنے حق میں کرنے کا موقع ملے۔ ان میں سے ایک پُر تشویش نظروں سے چھوٹے ملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دوسرے نے حقِ نمک ادا کرنے کے لیے احمقانہ جرأت اور جاں نثاری کے جذبے کا مظاہرہ کیا اور کتے کے پٹے سے زنجیر کا ہک الگ کردیا۔

میں اس وقت کپڑے اٹھا چکا تھا جب ایک کتا خطرناک انداز میں غراتا اور جست لگاتا میری طرف آیا۔ میرے اوسان خطا ہوگئے۔ اس خونخوار جانور سے خالی ہاتھ لڑنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ قریب ترین درخت بھی مجھ سے پچاس گز دور تھا لیکن اس کے سوا کوئی جائے پناہ بھی نہ تھی۔

میں بھاگا ہی تھا کہ فضا میں ایک فائر گونجا اور پھر کتے کی ایک بھیانک چیخ سنائی دی۔ میں نے رک کر اور پلٹ کر دیکھا تو کتا سبزے پر لوٹ رہا تھا اور ہریالی میں اس کے خون کی سرخی پھیل رہی تھی۔ یہ منظر میری آنکھوں کے لیے بھی اتنا ہی ناقابلِ یقین تھا جتنا دوسروں کے لیے۔ وہ سب دہشت زدہ اس لڑکی کو دیکھ رہے تھے جو بے انتہا حسین تھی اور بہت نازک اندام اور پُرکشش تھی۔ بڑی کامیاب ہیروئن تھی اور بہت شہرت رکھتی تھی۔ اچھی بھی اور بُری بھی۔ وہ فلموں میں گاتی ناچتی نظر آتی تھی۔ حسن و شباب کی بجلیاں گراتی نظر آتی تھی اور وہ سب کچھ کر سکتی تھی جو عملی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں کر سکتی۔

ابھی ابھی اس نے ثابت کردیا تھا کہ صرف نظر کا ہی نہیں، اس کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی کا نشانہ بھی بے خطا ہے۔ اس نے صرف ایک گولی چلائی تھی اور ایک کتے کو مار ڈالا تھا۔ اب اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس کا پیغام اور چیخ سب نے سمجھ لیا تھا۔

کپڑے پہن لینے کے بعد میں نے ملک کو دیکھا۔ وہ اپنی گردن سہلاتا اٹھ بیٹھا تھا اور سر کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا لیکن اس کی نظریں بے یقینی سے نیلم کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کتے کو دیکھ رہی تھیں جو تڑپ تڑپ کے ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ اپنے جاں نثاروں کو دیکھ رہی تھیں جو کتے کی موت مرنے کے تصور سے ہی دہشت زدہ نظر آتے تھے۔

رئیس نے زنجیر کو جھٹک کے دوسرے شخص کو متوجہ کیا "کیوں پیارے، اب تو خود جائے گا یا اپنے باپ کو بھیجے گا مرنے کے لیے۔ چل کھڑا ہوجا الف کی طرح ہاتھ اٹھا کے۔"

اس شخص نے نیلم کی طرف یوں دیکھا جیسے پوچھنا چاہتا ہو کہ کیا آپ کا بھی یہی حکم ہے؟ نیلم نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اس نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ رئیس نے کتے کو زنجیر کے ساتھ ایسے کھینچا جیسے وہ ڈور سے بندھی ہوئی پتنگ ہو۔ "آجا آجا، بچ گیا تو سالے، ورنہ بھوکے پیٹ میں لگتی گولی۔"

میں نے آگے بڑھ کے نیلم کے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔ دوسرے ہاتھ کو میں نے اس کے شانوں پر پھیلایا اور اسے اپنے قریب کرلیا "بس، اب تم ایزی ہوجاؤ۔ چاہو تو پیچھے بیٹھ جاؤ۔ تم نے کمال کردیا آج۔"

"ٹھیک ہے پیارے، ہم نے تو کچھ کیا ہی نہیں" رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے ریوالور سے ملک کو اشارہ کیا "چلو اٹھو اور چلو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے بڑی مشکل سے کہا "کہاں چلوں؟"

"ہمارے ساتھ" میں نے کہا "اور کوئی سوال مت کرنا ورنہ تمہارے ٹخنے میں سوراخ کردوں گا۔ زندہ رہے تو ساری عمر لنگڑاتے پھرو گے۔"

چھوٹا ملک اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم کیا سمجھتے ہو کہ یہاں سے زندہ بچ کے چلے جاؤ گے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ یا ہم اور تم زندہ سلامت جائیں گے ورنہ ہمارے ساتھ تمہاری لاش بھی گرے گی۔ یہ بات دوسروں کو بھی سمجھادو کہ ہمارے راستے میں نہ آئیں۔"

رئیس نے لمبی زنجیر کا ایک حلقہ بنا کے پھر پیچھے سے چھوٹے ملک کی گردن میں ڈال دیا "چلو پیارے۔ ذرا باہر کا راستہ بتاتے جاؤ۔ باقی سب کھڑے رہو اٹن شن۔"

ملک نے شدید احساسِ ذلت کو خاموشی کے ساتھ قبول کیا۔ فائر کی آواز پر اور کتے کے چلانے کی آواز سن کے حویلی کے اندر سے بڑے ملک کی ماں اور دوسرے لوگ بھی باہر آگئے تھے۔ ان میں شاید دونوں ملکوں کی گھر والیاں بھی ہوں گی اور ملازم بھی ہوں گے۔ اگر گنجائش ہوتی تو وہ اپنی جان پر کھیل کے بھی چھوٹے ملک کو بچا لیتے۔ ان کے پاس اسلحے کی کوئی کمی نہیں ہوگی مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ ریوالور میں موجود گولی اور چھوٹے ملک کے سر میں چند فٹ کا فاصلہ ہے اور یہی زندگی سے موت کا فاصلہ ہے۔ ایک سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کے اس فرق کی راہ میں مزاحمت کی کوئی دیوار حائل نہیں ہوسکتی تھی۔

چھوٹے ملک کی ماں سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے پہلے ہی صورتِ حال کو کنٹرول کرلیا تھا اور ایک بار پھر وہ آگے بڑھی "ٹھہرو" اس نے پُرتحکم لہجے میں کہا۔

میں نیکم کے ساتھ الٹے قدم باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میرے سامنے ملک تھا جس کے گلے میں زنجیر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے رئیس تھا جس نے ایک ہاتھ سے زنجیر تھام رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے کتے کو پکڑ رکھا تھا۔ ہم سب ایک ساتھ رک گئے۔

ملک کی ماں نے دوسرے سب ملازمین کی طرف دیکھا۔ "میری اجازت کے بغیر کوئی بھی کچھ نہیں کرے گا۔ آئی بات سمجھ میں؟"

باقی سب تماشا دیکھنے والوں کی خاموشی نے اثبات میں جواب دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئی "اے لڑکے کیا نام ہے تمہارا؟ ناصر، تم میرے بیٹے کو یرغمال بنا کے اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا "آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ واپس آجائے گا اور ہم اس کی جان کے بدلے میں آپ سے کچھ نہیں مانگیں گے مگر یہاں سے زندہ سلامت نکلنے کے لیے یہ ضروری ہے۔"

"دیکھو۔ میری بات سنو۔ میں تمہیں روک نہیں سکتی" وہ ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگی "لیکن ہم عزت دار لوگ ہیں۔"

میں رک گیا "مگر آپ کی نظر میں ہم جیسا کوئی عزت کا مستحق نہیں ہے۔ ہم پیدائشی بے عزت لوگ ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "تم نے ایک ہی زنجیر سے کتے کو بھی باندھ رکھا ہے اور میرے بچے کو بھی۔ تم اسے عزت کے ساتھ بھی لے جاسکتے ہو۔"

"کیوں؟" میں بھڑک اٹھا "آپ کے گھر میں آپ کے بیٹوں نے میرے ساتھ کتنی عزت کا سلوک کیا تھا؟ آپ ماں ہیں۔۔۔ آپ ضرور جانتی ہوں گی کہ آپ کے یہ سپوت اور ان کے عزت دار باپ انسانوں کی جان اور آبرو کے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیلتے آئے ہیں۔ کبھی انہیں روکا آپ نے یا نہیں روکا ہوگا کیونکہ یہ آپ کے بس کی بات ہی نہیں تھی پھر آپ مجھے کیوں روک رہی ہیں؟"

ملک کی ماں کا چہرہ دکھ، بے بسی اور ندامت کی تصویر بن گیا "آخر میں نے ہی تمہاری جان بچائی تھی۔"

"ایسا مت کہیں۔ تمہارے بیٹوں کو خوش فہمی تھی کہ میری جان لے سکتے ہیں۔ تمہیں غلط فہمی ہے کہ ہماری جان تم نے بچائی۔ جان کا مالک خدا ہے۔ جان دینے یا لینے کا اختیار اس نے کسی ملک یا چوہدری جیسے نمرودیا فرعون کو دیا ہوتا تو یہ دنیا ایک جیل خانہ ہوتی جہاں غریب اور کمزور نشدد کے شیطانی طریقوں سے اذیت ناک موت مرتے رہتے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابھی میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ تمہارا یہ بیٹا اسے تماشا کہہ رہا تھا۔ میرے قریب آکر دیکھو، سونگھو، میرے جسم سے دہی اور مسالے کی خوشبو کیوں آرہی ہے؟ بس خدا کو ایسا منظور نہ تھا ورنہ یہ کتے مجھ پر چھوڑ دیے جاتے اور میرا یہ زندہ، جیتا جاگتا انسانی جسم ان کتوں کی خوراک بن جاتا۔ یہ کوئی پہلی بار کی بات نہیں، ایسا نہ جانے کتنی بار ہوا ہوگا۔"

"تم۔۔۔ رحم بھی تو کرسکتے ہو؟"

میں نے چوکس رہتے ہوئے ریوالور کا رخ ملک کے سر کی طرف رکھا "ہاں۔ اگر کوئی رحم کے قابل ہو۔ سانپ اور بچھو جیسے انسانوں پر نہیں۔ ان کا سر کچل دینا چاہیے تاکہ وہ

کسی اور کو نہ ڈس سکیں۔"

لیکن دلا ئل سے ماں کی مامتا کے جذبات نہیں بدل سکتے تھے "خدا کے لیے اس کو چھوڑ دو۔ اس کی جان لے کر تمہیں کیا ملے گا۔ اگر لینی ہے تو میری جان لے لو۔ مجھے لے چلو اپنے ساتھ۔"

میں نے اپنے دل کو پتھر کرلیا "تم باتوں میں لگا کے میرا وقت ضائع کررہی ہو۔ ضرور تم نے پولیس کو فون کردیا ہوگا۔ تم چاہتی ہو کہ وہ ہمیں ہر طرف سے گھیرے میں لے کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیں مگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ میں جیل نہیں جاؤں گا۔ میں اور تمہارا بیٹا ایک ساتھ اس دنیا سے جائیں گے۔"

وہ زاروقطار رونے لگی "تمہیں خدا رسول کا واسطہ۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں تمہارے آگے۔"

میں نے ملک کی طرف دیکھا "چھوٹے ملک صاحب۔ ذرا دیکھو غور سے۔ منظر بدل گیا ہے یا صرف کردار بدلے ہیں؟ کچھ دیر پہلے بھی ایک عورت نے ایسے ہی آنسو بہاتے ہوئے یہی الفاظ تم سے کہے تھے۔"

چھوٹے ملک کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ وہ غصے اور بے بسی سے اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ "آپ اندر جاؤ ماں جی۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اور کچھ ہوا تو بھائی صاحب ہیں۔"

"ہاں۔ وہ بڑی دھوم دھام سے جنازہ اٹھائیں گے خاندان کی عزت پر قربان ہوجانے والے چھوٹے بھائی کا۔ شاندار سوئم اور چہلم کریں گے۔"

ملک کی ماں نے ایک چیخ ماری اور لڑکھڑا کے گر گئی "ایسا مت کہو خدا کے لیے۔" وہ دھاڑیں مارنے لگی۔

ملک اس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رئیس نے زنجیر کو جھٹکا دیا۔ "ابے آگے چل، بڑھیا کو کچھ نہیں ہوا۔ ایسے ہی ڈراما کررہی ہے۔"

چھوٹے ملک نے اسے غرا کے گالی دی اور ایک لات ماری جو رئیس کے پیٹ میں لگی۔ رئیس درد سے دہرا ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں سے زنجیر چھوٹ گئی۔ خوں خوار کتا بے قابو ہو کے میری طرف لپکا۔ وہ بھوکا تھا اور انسانی گوشت کی خوشبو اسے پاگل کررہی تھی۔ ملک کی گردن زنجیر کے حلقے سے آزاد ہوگئی۔

ایک لمحہ ضائع کیے بغیر میں نے ریوالور کا رخ بدلا اور گولی چلادی۔ مجھ پر جست لگانے والا کتا مجھ سے صرف دو فٹ دور تھا۔ اس نے ایک بھیانک آواز نکالی اور بھد سے زمین پر گر کے دردناک آوازوں کے ساتھ تڑپنے لگا۔

چھوٹے ملک نے اس مہلت سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کی۔ اس نے رئیس کو دبوچ کے ڈھال بنانے کے لیے کسی وحشی درندے کی طرح حملہ کیا مگر رئیس اس کے مقابلے میں موٹا پتلا اور پھرتیلا تھا۔ وہ ملک کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ ملک منہ کے بل گرا اور پھر اٹھا تو میں نے ریوالور کا دستہ گھما کے اس کے منہ پر مارا۔ ملک کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ خون اس کی ناک سے اور ہونٹوں کے کناروں سے رسنے لگا۔

"سیدھی طرح باہر چل ملک زادے" میں نے کہا "پھر کوئی حرکت کی ایسی ویسی تو تیسری گولی سے مارا جائے گا کتے کی طرح۔"

رئیس نے اسے دھکا دیا اور ملک پھر آگے چلنے لگا۔ اس کی گاڑی گیراج میں کھڑی ہوئی تھی۔ رئیس نے دروازہ کھولا اور اسے ڈرائیور کی جگہ بٹھادیا۔ گاڑی میں چابیاں پہلے سے لگی ہوئی تھیں۔ چند قدم دور کھڑے ہوئے وردی والے ڈرائیور نے اس منظر کو انتہائی حیرت اور خوف سے دیکھا۔ وہ گن مین بھی تھا مگر اس نے مداخلت کی کوشش ہی نہیں کی۔ اگر اسے ملک سے کوئی پرانا بدلہ چکانا ہوتا تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ وہ جاں نثاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملک کو ہمارے قبضے سے چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن اس کے نتیجے میں ملک اپنی جان سے جاتا۔ دیگر جاں نثار بھی اس لیے دُبکے رہے کہ ملک کو کچھ ہوا تو الزام بہرحال ان کو دیا جائے گا۔ بہادری ان کی تقصیر بن جائے گی۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ اپنی جگہ تھا کہ کسی مداخلت کرنے والے کا انجام وہی ہو جو وفادار کتوں کا ہوا تھا۔ میں ایک گولی اس پر بھی خرچ کردوں۔

میرے اشارے پر ڈرائیور کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا آیا "حکم فرمائیں جناب عالی؟" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا اور ملک کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا "اندر جاؤ اور ان دونوں معزز خواتین کو لے آؤ جو ملک صاحب کی مہمان تھیں۔"

"وہ جی۔۔۔ مجھے۔۔۔ کچھ پتا نہیں۔۔۔ اور اجازت نہیں۔۔۔ اندر جانے کی" وہ ہکلانے لگا۔ اس کا ہکلانا ایک معذوری تھی۔

چھوٹے ملک کی ماں خود ہی اٹھ کے آگئی "میں۔۔۔ میں لاتی ہوں ان کو۔"

میں نے کہا "کوئی چالاکی مت دکھانا۔ ہمیں تو رونے والا کوئی نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا دو میں سے ایک ہی بیٹا رہ جائے۔"

"نہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گا۔۔۔" وہ کانپتی آواز میں بولی اور سسکیاں لیتی اندر چلی گئی۔

مائیں بڑی مظلوم ہوتی ہیں۔ سکھ کے سپنے دیکھتے ہوئے بڑے دکھ اٹھا کے بیٹوں کو پالتی ہیں مگر جب اولاد کی جوانی کے ساتھ ان کا بڑھاپا آتا ہے تو ملک جیسے بیٹے ان کی جھولی میں اور دکھ ڈال دیتے ہیں اور وہ اتنی بے بس ہوتی ہیں کہ پھر بھی الزام اپنے آپ کو دیتی ہیں۔

شادو اور نیلم کے آنے تک انتظار کے چند منٹ میرے اعصاب پر چند گھنٹوں سے زیادہ بھاری ثابت ہوئے۔ مجھے ایک ڈر یہ تھا کہ بڑا ملک نہ آجائے۔ وہ یقیناً گھر میں موجود نہیں تھا ورنہ خون خرابا ضرور ہوتا۔ اسے اپنے غصے پر قابو نہیں تھا مگر اس کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ چھوٹا ملک زیادہ خطرناک ہے۔ بڑا بھائی جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا تھا مگر چھوٹے کی شخصیت پُرفریب تھی۔ وہ چالاک اور کینہ پرور بھی تھا۔

مجھے یہ خطرہ بھی تھا کہ کسی کی بے وقوفی سے بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔ میں کشت وخون نہیں چاہتا تھا۔ نہ میں خود مرنا چاہتا تھا اور نہ ملک کو مارنا چاہتا تھا۔ اس کی ماں ابھی تک ضبط اور حوصلے سے کام لے رہی تھی مگر یہ ہو سکتا تھا کہ جذباتی ہو کے وہ ملازموں پر چلانے لگے کہ بے غیرتو' نمک حرامو' لعنت تمہاری مردانگی پر اور تمہاری جوانی پر۔ اسلحہ رکھ کے چوڑیاں پہن لو۔ ایک لونڈا میرے بیٹے کو اور تمہارے مالک کو اغوا کر کے لے جا رہا ہے اور تم کھڑے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے ہو۔

مجبور ہو کے یا مشتعل ہو کے وفادار جان کی بازی لگانے آجاتے تو میرے ریوالور کی باقی چار گولیوں سے ملک سمیت چار افراد ضرور مارے جاتے مگر جب لاشیں گنی جاتیں تو ان میں ہمارے چھٹی جسم بھی شامل ہوتے۔

یہی حالت رئیس کی تھی۔ وہ پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اندر سے وہ کتنا خوف زدہ اور پریشان ہوگا۔ بلاشبہ جوش میں اس نے ناقابلِ یقین جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اور میں بجا طور پر اس کی دوستی پر ناز کر سکتا تھا لیکن اب صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ کرنے سے رئیس خان کے بھی ہوش گم تھے۔

اس نے بے چینی سے میری طرف دیکھ کر سرگوشی کی "یار' یہ کیا ہو رہا ہے پیارے؟"

میں نے کہا "جو ہو رہا ہے خاموشی سے دیکھتا رہ۔"

"ابے یار' قسم اللہ کی بڑا ڈر لگ رہا ہے اب مجھے۔ کہیں اندر انہوں نے شادو اور نیلم کو مرغیاں بنا لیا پھر۔۔؟"

"مرغیاں نہیں جاہل کی اولاد' پرغمال۔"

"ابے ہاں وہی۔ بڑھیا نے کہا کہ تم ملک کو چھوڑو پھر چھوڑوں گی میں انہیں اور تم نے اسے مارا تو میں ان دونوں کو ماردوں گی۔"

میں نے کہا "ڈر تو مجھے بھی ہے۔ ہم دشمن کے قلعے کے اندر ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے؟ صرف چار گولیاں۔"

رئیس نے کہا "ابے یار۔ میں اس کی بندوق نہ لے لوں۔ یہ جو وردی پہنے بُت بنا کھڑا ہے۔ ملک کا شوفر۔"

مجھے یہ آئیڈیا پسند آیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے ملک کی طرف دیکھا۔ وہ ونڈ اسکرین کے پار خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہا تھا۔ شاید بڑے ملک صاحب کی راہ دیکھ رہا تھا کہ وہ اچانک آجائیں تو جنگ کا نقشہ بدل سکتا ہے۔ یا کسی کے فون پر مسلح پولیس کے کمانڈو دستے پہنچ جائیں تو ایک پستول کے بل پر خود کو فیلڈ مارشل سمجھنے والا چوہے کی طرح پکڑا جا سکتا ہے۔

میں نے ریوالور کا رخ ڈرائیور کی طرف کرنے سے پہلے اپنا بوجھ گاڑی کے دروازے پر ڈال دیا تھا کہ ملک آسانی سے باہر نہ آسکے "یہ گن نیچے رکھ دو اور دس قدم پیچھے وہیں چلے جاؤ جہاں پہلے کھڑے تھے۔"

"سرجی!" ڈرائیور نے سنجیدگی سے کہا "یہ گن نہیں کلاشنکوف ہے۔"

"ابے یہ طیارہ شکن توپ ہے تب بھی تجھے کیا" رئیس نے اسے ڈانٹا "انگریزی میں سب کو گن کہتے ہیں۔"

اس نے یہ دلیل تسلیم کرلی۔ رئیس نے کلاشنکوف اٹھائی ہی تھی کہ اندر سے نیلم اور شادو ایک ساتھ نمودار ہوئیں۔ نیلم کے مقابلے میں شادو کی حالت ابتر تھی اور اسے ایک طرف سے نیلم نے سنبھال رکھا تھا اور دوسری طرف سے ملک کی ماں نے سہارا فراہم کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ کراہتی ہوئی یوں چل رہی تھی جیسے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہے۔ ملک کی ماں کا انداز مصالحانہ تھا۔ وہ بیٹے کی خاطر بھرپور تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ اس امید میں کہ اس جذبۂ خیر سگالی کے جواب میں ہمارے انتقامی جارحانہ رویے میں لچک پیدا ہو جائے گی۔

نیلم نے آہستگی سے شادو کو ایک دروازے سے پچھلی سیٹ پر بٹھا کے آگے دھکیلا اور پھر کھڑکی کے ساتھ خود بیٹھ گئی۔ دوسری طرف بیٹھ کے میں نے دروازہ بند کرلیا تو رئیس بھی کلاشنکوف کا رخ اہلِ خانہ کی طرف رکھتے ہوئے الٹے پاؤں آیا اور ملک کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

"چلو۔" میں نے ملک سے کہا اور صرف اسے دہشت

زدہ کرنے کے لیے ریوالور اس کی گدی سے لگا دیا۔ اس کی سرد نالی کے سفاک لمس نے یقیناً ملک کی رگوں میں دوڑنے والے گرم خون کا ابال ختم کر دیا ہوگا۔

میں نے اپنے پیچھے دم بخود' افسردہ اور بے چارگی کے دکھ میں مبتلا لوگوں کو دیکھا جن میں ملک کی ماں کے علاوہ خاندان کی عالی نسب خواتین تھیں۔ ان کی اولاد بھی تھی اور ان کے ٹکڑوں پر پلنے والے ملازم تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ بے بسی کی ندامت تھی اور ایک التجا تھی کہ ہم چھوٹے ملک کو وہ سزا نہ دیں جو وہ آج تک اپنے آباؤ اجداد کی روایت کے مطابق دشمنوں اور خطاکاروں ' سرکشی کرنے والوں اور بے گناہ پکڑے جانے والوں سب کو غیر انسانی بے حسی کے ساتھ دیتا آیا تھا۔ معلوم نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔ جب کسی خونی یا قاتل کو انصاف کے تقاضوں کے مطابق موت کی سزا دی جاتی ہے تو اس کے لیے لوگوں کے دل میں رحم کے جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ جب ان کا وقت تھا تو انہوں نے کسی پر رحم نہیں کیا تھا۔

گاڑی گیٹ تک پہنچی تو سیکورٹی گارڈ نے سلام کرتے ہوئے گیٹ کھول دیا کیونکہ گاڑی چھوٹے ملک صاحب کی تھی اور وہ اسے خود چلا رہے تھے۔ باہر آتے ہی میرے اعصاب پر سے خوف کا وہ دباؤ ہٹ گیا جو اندر سے مجھے کمزور کرتا تھا۔ میں نے ایک دم فتح ہونے والے عزم اور کامیابی سے ملنے والے اعتماد کی طاقت کو اپنے جسم میں برقی رو کی طرح دوڑتا ہوا محسوس کیا۔

نیلم نے مسکرا کے میری طرف حوصلہ افزا نظروں سے دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر بھی سکون نظر آیا۔ عذاب جیسا بھی تھا جو ہو ستم جتنا بھی تھا۔ امتحان برداشت کا کیسا بھی تھا' ہم نے ایک ساتھ ایک دوسرے کے لیے تحفظ اور سلامتی کی ضمانت کو مقصد بنا کے جدوجہد کی تھی۔ کسی نے صرف اپنی جان بچانے کا نہیں سوچا تھا۔ کوئی خود غرض یا بزدل ثابت نہیں ہوا تھا۔

شادو کا سر سیٹ کی پشت سے لگا ہوا تھا مگر وہ خود بخود جھک کر مجھ پر آگئی تھی اور اس کا سر میرے شانے پر ٹک گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ کبھی کراہنے لگتی تھی یا اس کا بدن کانپنے لگتا تھا۔ اس کے قرب سے گزرے ہوئے وقت کے ان گنت مہربان لمحوں کی خوشبو پھوٹ رہی تھی جو یادوں کے تار چھیڑتی تھی تو دل کے زخم سلگتے تھے۔

سڑک پر ساتھ دوڑنے والی ایک گاڑی میں کیسٹ چل رہا تھا۔ لتا نے اپنی سحر آفریں آواز میں میرے خیالات اور جذبات کی ترجمانی کی۔ یہ کہاں آگئے ہم یونہی ساتھ چلتے چلتے۔۔۔ اور میں نے شادو کے چہرے پر آجانے والے بالوں کو نرمی سے ہٹا کے سوچا۔ ہم چلے کہاں سے تھے؟

نیلم نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' یہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں نے اس کے ہمدردانہ لہجے سے تسلی محسوس کی "تم جھوٹ تو نہیں بول رہی ہو مجھے بہلانے کے لیے۔"

"ہم اسپتال چلتے ہیں۔ تمہیں ڈاکٹر خود بتا دیں گے۔"

چھوٹے ملک کی موجودگی میں یہ سوال نہیں پوچھا جا سکتا تھا کہ کون سے اسپتال میں۔ مجھے تو اس کینہ پرور شخص کی طرف سے یہ تشویش بھی لاحق ہو گئی تھی کہ وہ بعید میں آج کی ذلت کا بدلہ لینے کے لیے کس انتہا تک جائے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس کے اغوا کیے جانے کی اطلاع پولیس کو فراہم کر دی گئی ہوگی۔ وہ معمولی آدمی نہیں تھا۔ میں اسے اغوا کرنے کے جرم میں پکڑا جاتا تو میرا انجام عبرت ناک ہوتا۔ نیلم کو اپنے تعلقات کی بنا پر تحفظ حاصل تھا تو شادو کو اپنی پوزیشن کے باعث۔ صرف میں اور رئیس ہی تھے جن کا خدا کے سوا کوئی نہ تھا۔

ملک میری ہدایات کے مطابق گاڑی دائیں بائیں دوڑاتا جا رہا تھا۔ اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں کیا تھا اور ہمیں کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ ہمارے مقابلے میں وہ زیادہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم نے اسے صرف ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ہم اسے کسی ایرے غیرے کی طرح مار کے اس کی لاش کو دریائے راوی میں نہیں پھینک سکتے اور غائب نہیں کر سکتے۔ اس کے پیچھے ایک بارسوخ فیملی کی طاقت تھی جس کے سامنے قانون بھی بے بس ہو جاتا تھا۔

گورنر ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے میں نے الٹے ہاتھ کی سڑک پر گاڑی رکوالی۔ اس سڑک سے بہت کم ٹریفک گزرتی تھی۔ یہ سڑک آگے جا کے میو گارڈن کے پچھلے حصے کا احاطہ کرتی ہوئی نہر کی جانب چلی جاتی تھی۔ اس پر سائیکل یا موٹر سائیکل سوار تانگے اور کاریں ضرور آتے جاتے تھے مگر پیدل چلنے والا کوئی کم ہی نظر آتا تھا۔

میں نے ملک کے ریوالور کو خالی کیا اور اسے ایک رومال سے صاف کر کے اپنی شناخت کے نگنر پرنٹس مٹا دیے "یہ تمہاری امانت۔ اب مجھ پر یہ الزام نہیں رہا کہ میں نے تم سے اسلحہ چھینا۔"

اس نے تلخی سے کہا "اور بہت سے الزامات ہیں تم پر۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جن کے لیے مجھے یہ ریوالور پھر لوڈ کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا "ایک ریوالور میرے پاس بھی ہے۔ اس میں بھی چھ گولیاں آتی ہیں اور جیسے میں نہیں جانتا کہ میرا نام کس گولی پر لکھا ہوا ہے ایسے ہی تم بھی کچھ نہیں جانتے۔ میری زندگی تو بے حیثیت ہے۔ ابھی میں نے کچھ بھی نہیں کیا جس سے میری قدر و قیمت یا وقعت کا تعین ہو سکے لیکن تم ایک وی آئی پی ہو۔ تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔ باپ دادا کا نام و نسب۔ ان کی جاگیر' تمہارا کاروبار اور تمہاری اپنی عزت و شہرت کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ اپنی طاقت اور مالیت کے حساب سے تم ایک ہاتھی ہو تو میں ایک چیونٹی۔"

اس نے کہا "تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ چیونٹی بھی ہاتھی کو مار سکتی ہے۔"

"عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ میں یہ بھی واضح کرنا چاہتا تھا کہ ایک چیونٹی کی موت اور ہاتھی کی موت میں فرق نہ ہونے کے باوجود فرق ہے۔ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا مشہور ہے' چیونٹی کا مرتا کیا اور جینا کیا۔"

"تم مجھے کیا عقل سکھا رہے ہو۔"

میں نے کہا "تمہیں ایک OPTION پر غور کرنا چاہیے ملک صاحب۔ تمہارے اور میرے درمیان اختلاف یا دشمنی کی نہ کوئی وجہ ہے نہ بنیاد۔ بڑے ملک صاحب کی بات الگ ہے۔ میری بے وقوفی سے ان کا کچھ نقصان ہو گیا تھا۔ اس کی سزا بھی میں نے خواہ مخواہ پائی۔ انہوں نے اصل مجرم کے ساتھ جو بھی کیا' مجھے اس سے کوئی سروکار نہ تھا مگر میرے معاملے کو وہ بہت آگے لے گئے۔ اب ان کے ساتھ آگے میرا جو حساب ہو گا وہ آپ کے حساب سے الگ ہے۔"

"ہاں۔ میرا اور تمہارا حساب الگ ہے۔"

میں نے کہا "معلوم نہیں آپ نے کیوں یہ فرض کر لیا کہ میں خدانخواستہ آپ کو بے عزت کرنا چاہتا تھا۔"

"آج میری بہت عزت فرمائی تم نے؟" وہ چنگھاڑا۔

میں نے کہا "ملک صاحب۔ اس معاملے میں پہل آپ نے کی تھی۔ میں نے آپ کا کیا بگاڑا تھا کہ آپ مجھ پر کتے چھوڑنا چاہتے تھے۔ میں نے جو کیا اپنے دفاع میں کیا۔ آپ کے دو کتوں کا نقصان ہوا' وہ میں پورا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ رہی عزت کی بات تو جو تماشا میں بنا' وہ آپ نہیں بنے۔ اگر آپ یہ لڑائی جاری رکھیں گے تو مجبوراً میں بھی لڑوں گا۔ آپ کی جنگ کا اپنا طریقہ ہے تو میرا بھی ایک طریقہ ہے جس کا پتا وقت آنے پر چل جائے گا۔ اچھا یہی ہے کہ ہم دونوں سب کچھ بھول جائیں۔"

"میں بھول جاؤں کہ تم نے میرے ساتھ کیا کیا تھا؟" وہ بھڑک اٹھا۔

"نہیں۔ آپ یہ یاد رکھیں کہ انجام موت سے بڑھ کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ میری یا آپ کی۔ مجھے مار کے آپ کو کیا ملے گا؟ اور آپ مارے گئے تو آپ کا کتنا نقصان ہو گا؟ دونوں کا مقابلہ کر لینا پھر جو تمہاری مرضی۔ اب تم جا سکتے ہو۔ یہاں سے کچھ پیدل چل کے تمہیں کوئی سواری ضرور مل جائے گی۔ تمہاری یہ گاڑی رات کو تھانہ آر اے بازار والے خود تمہارے گھر پہنچا دیں گے۔ تمہارا ان کو ایک فون کر دینا بھی کافی ہو گا۔"

ملک کے نیچے اترتے ہی میں بھی اترا اور اس کی جگہ بیٹھ گیا۔ وہ زخم خوردہ سانپ کی طرح مجھے گھورتا رہا اور پھر نفرت اور اشتعال بھری نگاہیں مجھ پر ڈالتا مال روڈ کی جانب چل پڑا۔ میں نے گاڑی کو مخالف سمت میں دوڑایا اور چند منٹ میں نہر تک پہنچ گیا۔ وہاں میں نے گاڑی کو ایک کنارے پر روک کے ایک کپڑے سے ہر اس جگہ کو صاف کر دیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات مل سکتے تھے۔

رئیس اتنی دیر میں دھرمپورے کے پُل تک گیا اور کچھ دیر بعد ایک ٹیکسی لے آیا۔ میں نے گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا تھا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ گاڑی میں کوئی خرابی ہو گئی ہے۔ گاڑی کی چابیاں میں نے گلوز کمپارٹمنٹ میں ڈال دیں اور اس کا پچھلے والا ایک دروازہ لاک کیے بغیر چھوڑ دیا۔

نیلم کی مدد سے میں نے شادو کو باہر نکالا جو ابھی تک بے ہوش تھی اور مجھے اس کی حالت پہلے کے مقابلے میں زیادہ خراب لگ رہی تھی۔ کوئی ڈاکٹر ہی اس کا معائنہ کرنے کے بعد یہ بتا سکتا تھا کہ بڑے ملک نے شادو پر کیا تشدد کیا تھا اور اس سے شادو کو کتنا نقصان ہوا تھا۔

نیلم خود بھی کم خوف زدہ نہ تھی مگر میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے مجھے مسلسل تسلی دے رہی تھی کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ "بس اس پر دہشت کا اثر ہے۔ چند گھنٹوں میں یہ بالکل نارمل ہو جائے گی' ٹیک اٹ ایزی۔"

"اسے اسپتال میں داخل کرانا ضروری ہو گا نیلم!" میں نے کہا۔

"ہاں۔ فی الحال ہم اسے اپنے گھر میں نہیں لے جا سکتے" وہ بولا۔

میں نے کہا "اسپتال والے کہیں گے یہ پولیس کیس ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ شادو کی یہ حالت کسی حادثے کی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر ایک نظر میں سمجھ جائیں گے کہ ساری

علامات جسمانی۔ اور شاید جنسی تشدد کی ہیں۔"

نیلم نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا۔ ہم سرکاری اسپتال نہیں جا رہے ہیں۔ تم جس ڈاکٹر کے زیر علاج ہو۔ اس کا کلینک پیچھے ہی ہے۔ اس کی پہلی بیوی لیڈی ڈاکٹر ہے۔ وہاں شادو کی دیکھ بھال بھی اچھی ہو گی اور کسی کو کچھ معلوم بھی نہیں ہو گا۔"

"کیا ملک اسپتالوں میں دیکھے گا؟"

"اس سے کچھ بعید نہیں۔"

میں نے کہا "وہ تم سے بھی معلوم کرے گا۔"

نیلم نے کہا "میں اسے بتا دوں گی کہ ناصر نے کچھ آگے جا کے مجھے بھی اتار دیا تھا اور گاڑی میں شادو کو لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ غائب ہے۔"

میں نے کہا "نیلم۔ تمہیں اپنی حفاظت اب پہلے سے زیادہ کرنا ہو گی۔ میری وجہ سے تم خواہ مخواہ مشکل میں پڑ گئی ہو۔"

"تم میری فکر مت کرو۔ میں ملک کو سمجھا لوں گی۔ کسی نہ کسی طرح" اس نے ایک ٹھنڈی گہری سانس لی اور باہر دیکھنے لگی "ورنہ بھگت لوں گی۔"

"تمہیں کچھ عرصہ محتاط رہنا چاہیے۔ اپنے ساتھ باڈی گارڈ رکھو کہیں باہر آتے جاتے۔ گیٹ پر مسلح محافظ بھی ہونا چاہیے جو آنے جانے والوں پر نظر رکھے۔ ابھی تو اس کا جی چاہتا ہے سیدھا اندر پہنچ جاتا ہے" میں نے کہا۔

"اور تم کیا کرو گے؟" اس نے پلٹ کے سوال کیا "ملک کے عتاب کا اصل نشانہ تم بنو گے۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے اور میں نے سوچ لیا ہے کہ مجھے اپنے لیے کیا کرنا ہے۔ تمہارے لیے کیا کرنا ہے اور شادو کے لیے کیا کرنا ہے؟"

نیلم کی کوٹھی کے پیچھے ایک اسٹریٹ چھوڑ کے نوید کلینک تھا۔ ڈاکٹر نوید کے بارے میں وہ مجھے تفصیل سے سب کچھ بتا چکی تھی۔ وہ نیلم کا پرانا معالج تھا اور اس کا کلینک بھی ایک مکمل اسپتال تھا۔

شادو کو اندر لے جانے کے لیے نیلم نے ایک وارڈ بوائے کو اسٹریچر کے ساتھ بھیج دیا۔ میں شادو کے ساتھ رہا۔ مجھے ریسیو کرنے کے لیے وہی نرس موجود تھی جو ڈاکٹر نوید کی دوسری بیوی بن چکی تھی۔

"تم تو بالکل ٹھیک لگ رہے ہو مجھے" وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔

"سب تمہاری مہربانی ہے" میں نے کہا۔

"یہ کون ہے' تمہاری بیوی؟"

"نہیں" میں نے کہا "یہ شادو ہے' میرا مطلب ہے شاہدہ پروین ہے۔"

"جھوٹ کون بول رہا ہے۔ نیلم یا تم؟ اس نے کہا کہ تمہاری بیوی بیمار ہے" وہ اسی دروازے پر رکی جس کے باہر ڈاکٹرا نجم نوید کے نام کی پیتل کی تختی لگی ہوئی تھی۔

میں نے کہا "جھوٹ کسی نے نہیں بولا۔ یہ میری ہونے والی بیوی ہے۔"

اس نے مجھے آنکھ ماری اور مسکرا کے دروازہ کھول دیا۔ اندر ڈاکٹر نوید کی پہلی بیوی ڈاکٹرا نجم کے شاندار کمرے میں نیلم اس سے رازدارانہ انداز میں کوئی بات کر رہی تھی۔ ڈاکٹر نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وارڈ بوائے اسٹریچر پر لیٹی ہوئی شادو کو چھوڑ کے اور دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا تو ڈاکٹرا نجم نے سرسری انداز میں شادو کا معائنہ کیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چند منٹ کے بعد اس نے بیل بجا کے اپنے اسسٹنٹ کو طلب کیا "مسز جمیل کو پرائیویٹ وارڈ نمبر چار میں لے جاؤ" اس نے شادو کی طرف اشارہ کیا۔

وہ کچھ حیران ہوا "میڈم۔۔۔ وہ تو خالی نہیں ہے۔"

"بھئی مسز جمیل کو ایک نمبر میں شفٹ کردو" ڈاکٹر انجم نے کہا۔

نوجوان اسسٹنٹ نے سر کھجایا "کیا۔۔۔ یہ بھی مسز جمیل ہیں؟"

ڈاکٹر انجم مسکرائی "کیا ایک نام کے دو مریض نہیں ہوسکتے راحیل!"

"ہوسکتا ہے میڈم مگر میں سمجھا جمیل صاحب کی دوسری بیگم بھی پہنچ گئی ہیں پیچھے پیچھے۔۔۔" راحیل نے کہا۔

"ایسا بھی ہوسکتا تھا۔ ناممکن کیا ہے؟" ڈاکٹر انجم نے کہا۔

اس نے ایک آہ بھری "ناممکن کچھ بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ ہمیں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں ملا ابھی تک۔ زندگی کے چار دن۔۔۔ دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں۔"

"چلو فضول ڈراما مت کرو میرے سامنے۔ خود بھاگتے ہو شادی کے نام سے۔ اکیلے ہی عیش ہو رہی ہے تو ذمے داری کے جھنجٹ میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کو تو کل ہو سکتی ہے۔ شادی۔۔۔"

"کیا؟" اس نے دانت نکالے۔ "مجھے یقین تھا کہ ایک دن آپ مان جائیں گی۔ آپ چھوڑیں ڈاکٹر نوید کو۔ کل میں آجاؤں گا کھڑے کھڑے سر اڑا لے۔"

"شٹ اپ۔" ڈاکٹر انجم ہنسنے لگی "دیکھو' ایک مسز جمیل یہاں پرسوں ایڈمٹ ہوئی تھیں۔ ان کی ایڈمشن ریکارڈ میں کوئی انٹری نہیں ہوگی۔ فرض کرلو کہ یہ واقعی دوسری ہیں۔"

"یہ تیسری یا چوتھی ہوں تب بھی مجھے فرق نہیں پڑتا۔"

"راحیل' یہ مہمان ہیں ہمارے۔ انہیں لے جاؤ رخسانہ کے پاس" وہ بولی اور پھر مجھ سے مخاطب ہوئی "مسٹر جمیل۔ میں ابھی ان کا مکمل معائنہ کرتی ہوں' سارے ٹیسٹ ہوں گے' اس کے بعد ہی میں کچھ بتا سکوں گی۔"

میں نے کہا "تھینک یو ڈاکٹر۔ ابھی آپ اتنا تو بتا سکتی ہیں کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ تم اب بے فکر ہوجاؤ۔ باقی کام ہمارا ہے۔"

میں باہر آیا تو دوسری مسز نوید یعنی رخسانہ مجھے مخالف سمت سے آتی ہوئی ملی۔ راحیل نے اسے ڈاکٹر انجم کا پیغام دیا۔

"انہوں نے کہا کہ آپ انہیں اپنا مہمان۔ بلکہ اپنا ہی سمجھیں۔"

وہ مسکرا کے میرے ساتھ چلنے لگی "کیا ہوا؟"

راحیل نے پلٹ کے کہا "انہیں کیا معلوم۔ ویسے لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

ڈاکٹر راحیل پُرلطف آدمی تھا۔ وہ ہر وقت سب سے چھیڑ چھاڑ کرتا تھا مگر اس کی بات کا کوئی بھی برا نہیں مانتا تھا۔ اس نے ڈاکٹر انجم کی بات کا مطلب سمجھ لیا تھا۔ ایسی رازداری کے معاملات اسپتالوں میں عام ہوتے ہیں۔ اس نے بڑی ڈپلومیسی سے اصل مسز جمیل کو چار نمبر سے ایک نمبر کمرے میں شفٹ کیا اور بہت معذرت کی "معلوم نہیں یہ کمرا کس نے دے دیا آپ کو۔ دراصل کچھ اسٹاف یہ بات نہیں جانتا" اس نے چھت کی طرف دیکھا "اس کی چھت کچھ کمزور ہے۔ ابھی تو خیر اے سی چل رہا ہے مگر پنکھا چلانے سے ہلنے لگتی ہے۔"

ظاہر ہے اس کے بعد اور ریجنل مسٹر جمیل نے خود وہاں ایک منٹ رکنا گوارا نہیں کیا۔ شادو کو اس کی جگہ لٹا دیا گیا مگر باہر دروازے پر ایک خانے میں لگا ہوا نام کا کارڈ نہیں ہٹایا گیا۔ شاید ایک نمبر کمرے کے باہر کوئی کارڈ نہیں لگایا گیا ہوگا۔

دروازہ بند کرنے کے بعد رخسانہ نے مجھ سے پوچھا۔ "یعنی تم باپ بننے والے ہو۔" وہ شادو کا بی پی چیک کررہی تھی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کیسے فرض کرلیا تم نے؟"

"ابھی ڈاکٹر راحیل نے کیا کہا تھا؟"

میں نے کہا "اس جوکر کی بات کو سیریس مت لو۔ میری ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

رخسانہ نے شادو کا معائنہ جاری رکھا "ہوں پھر یہ کون ہے جس کے لیے تم اتنے پریشان ہو۔ تمہاری بہن؟"

"نہیں۔ میری کوئی بہن نہیں ہے" میں نے کہا۔

"آئی سی پھر یہ ضرور وہی معاملہ ہے۔ تم اس سے محبت کرتے ہو اور یہ تمہیں چاہتی ہے لیکن تم دونوں فی الحال یہ بچہ نہیں چاہتے۔۔۔" رخسانہ فائل میں کچھ لکھتی رہی۔

رخسانہ کی زبان سے دوسری بار بچے کا ذکر سن کے میرے کان کھڑے ہوئے۔ وہ پرانی تجربہ کار نرس تھی۔ کسی عورت کو ایک نظر دیکھ کے یہ بات تو ایک دائی یا پرانی مائی بھی بتا سکتی ہے کہ وہ اُمید سے ہے۔

میں نے کہا "آر یو شیور۔۔۔ کہ یہ ماں بننے والی ہیں؟"

رخسانہ نے پلٹ کر مجھے دیکھا "اس میں شک کی کون سی بات ہے؟"

ڈاکٹر راحیل دروازہ کھول کے کمرے میں آیا۔ اس نے میرا سوال اور رخسانہ کا جواب سن لیا تھا "ہاں۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

یہ میرے لیے کسی وجہ کے بغیر ایک جذباتی صدمہ تھا۔ ہاشمی صاحب دنیا سے سدھار گئے تھے مگر اپنی نشانی چھوڑ گئے تھے۔ شادو اس نشانی کو اپنے پیٹ میں پال رہی تھی۔ وہ ہاشمی صاحب کے بچے کی ماں بننے والی تھی۔

بے شک اس میں حیرانی کی کوئی بات نہ تھی۔ شادو نے ہاشمی صاحب سے شادی کی تھی تو ایک نہ ایک دن شادو کو ماں اور انہیں اس بچے کا باپ بننا تھا مگر نہ جانے کیوں اس انکشاف سے میرے حلق کا ذائقہ کڑوا ہوگیا۔ میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کے رخسانہ اور ڈاکٹر راحیل نے بجا طور پر یہ فرض کیا کہ میں روایتی قسم کا بے ضمیر اور محبت کے نام پر ہوس کے جذبات کی تسکین کرنے والا بزدل آدمی ہوں جو اس کھیل کے انجام سے خائف ہے۔

ڈاکٹر نوید سے نیلم کے دیرینہ مراسم کا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میں اور شادو خاصی حد تک چھوٹے ملک کی دسترس سے محفوظ ہوگئے تھے۔ اگر وہ انتقام کے جذبات سے مغلوب ہوکے اپنے آدمی ہمارے پیچھے لگا دیتا کہ جاؤ' وہ جہاں بھی ہیں انہیں تلاش کرو۔ تو انہیں ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ نہ شادو واپس اپنے گھر پہنچی تھی اور نہ میں اپنے اصل ٹھکانے پر گیا تھا یعنی ماسی ہیرا اور ڈاکٹر رانجھا کے گھر جہاں سے مجھے بڑے ملک نے اٹھوایا تھا۔ ہیر کلینک بند پڑا تھا اور ڈاکٹر رانجھا کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ دکان بڑھا کے کہاں گیا۔

یہ ہوسکتا تھا کہ چھوٹے ملک کے حکم پر ہمیں ہر ہوٹل اور شہر کے ہر اسپتال میں تلاش کیا جائے۔ نوید کلینک کوئی بہت مشہور اور بہت بڑا اسپتال نہیں تھا لیکن بالفرض محال وہ یہاں بھی آجائے تو انہیں مایوسی ہوتی۔ اسپتال کے ریکارڈ میں نہ کوئی ناصر عظیم تھا نہ کوئی شاہدہ پروین تھی۔ کسی کو مسز عظیم کے نام سے بھی داخل نہیں کرایا گیا تھا۔ اگر وہ ہمارے حلیے بتاتے تب بھی انہیں وہی جواب ملتا۔ آج کی تاریخ میں جو داخلے ہوئے ہیں' ان کا ریکارڈ دیکھ لیں۔ ایک بچہ ہے۔ ایک خاصے عمر رسیدہ بزرگ ہیں۔ مسز جمیل کا داخلہ دو دن پہلے ہوا تھا۔

جب ڈاکٹر انجم آئی تو مجھے کمرے سے نکال دیا گیا۔ رئیس کو برآمدے میں کھڑا دیکھ کے مجھے شرمندگی ہوئی۔ میں اسے بالکل بھول گیا تھا۔ وہ لاؤنج میں رک گیا تھا اور میں شادو کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے سے نکلا تو سیدھا وارڈ نمبر چار میں آگیا تھا۔

"سوری یار۔ تو کب سے کھڑا ہے یہاں؟ اندر آجاتا۔"

وہ ہنسنے لگا "ابے نہیں یار' اپنا کیا کام اندر۔ یہ بتا شادو کے لیے ڈاکٹر نے کیا کہا؟ چل کینٹین میں بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "نیلم کہاں ہے؟"

"نیلم تو چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب کی گاڑی میں۔ جاتے ہوئے کہہ گئی تھی کہ ہم ادھر کا رخ ہرگز نہ کریں۔ اس کے گھر کا۔"

میں متفکر ہوگیا "وہ اکیلی ہی چلی گئی؟"

"اور کیا تجھے ساتھ لے جاتی۔ اپنی وجہ سے ہی وہ بھی مشکل میں پڑی بے چاری۔"

ایک کمرے کی کینٹین اسپتال کی ضرورت کے لیے کافی تھی۔ اس وقت بھی وہاں کوئی نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ کمروں میں یا وارڈ میں کھانے پینے کی چیزیں منگواتے تھے۔

"شادو ماں بننے والی ہے رئیس" میں نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد کہا۔

اس نے چونک کے کہا "ابے نہیں یار!"

میں نے کہا "نہیں کیا' شادی کس لیے کی تھی اس نے آخر؟"

"یعنی۔۔۔ بچہ ہاشمی صاحب کا ہے؟"

میں نے جھنجلا کے کہا "اور کیا تیرے باپ کا ہوگا۔"

وہ ہنسنے لگا "وہ تو میں ہوں۔ قسم اللہ کی اپنے جیسا دوسرا پیدا کرکے دکھائے کوئی' مگر باپ کیا ہوگا؟"

"ڈاکٹر راحیل کہہ رہا تھا کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟"

"سالے' میں پوچھ رہا ہوں کہ شادو کا کیا ہوگا' وہ کہاں رہے گی؟ گھر جائے گی تو وہاں اکیلی ہوگی پھر اٹھا کے لے جائیں گے وہ حرامی برادران۔ میرے تو ابھی تک بدن میں کپکپی محسوس ہوتی ہے۔ سالوں نے مجھے ملازم رکھ لیا تھا کتوں کی دیکھ بھال پر۔ کہتے تھے کہ مہینے کے پانچ ہزار ملیں گے اور جیت کا انعام الگ۔"

"جیت کیسی۔۔۔؟"

"ابے وہ کتوں کی اور جنگلی سوروں کی لڑائی دیکھتے ہیں۔ جیسے اپن کو عمران خان اور گوا سکر کی لڑائی دیکھنے کا شوق ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سؤر ہی مارا جاتا ہے آخر میں۔ وہ کتے کے مقابلے میں طاقتور ہو اور غالب آنے لگے تو اسے ہر طرف سے نیزے مار کے گرا دیتے ہیں۔ کتا کبھی لہولہان ہو جاتا ہے۔ کبھی مر بھی جاتا ہے۔ ایک ایک لاکھ کے کتے ہوتے ہیں۔"

"دو لاکھ کا خون کر دیا ہم نے۔ ایک کو نیلم نے مار دیا' حرام زادہ نیا تماشا کرنے والا تھا۔ ہم کیا جنگلی سؤر ہیں۔"

رئیس نے کہا "یار' میں نے صرف سنا تھا کہ ظالم بادشاہ ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈال دیتے تھے' کتے چھوڑ دیتے تھے۔"

میں نے کہا "یہ بے تاج بادشاہ ہیں اپنے علاقے کے۔ بادشاہ بھی قانون سے بالاتر ہوتا تھا' قانون ان کے لیے بھی کچھ نہیں۔ میں ذرا نیلم سے بات کرلوں۔"

فون کاؤنٹر پر دیکھ کے مجھے یہ خیال آیا تھا۔ وہ ابھی گھر پہنچی تھی۔ میری شکایت پر ہنسنے لگی "تم میری نہیں اپنی فکر کرو' شادو کو دیکھو۔"

"تمہاری فکر کیسے نہ کروں میں۔ میری خاطر تم نے چھوٹے ملک سے دشمنی مول لی۔ تم نے اس کا ریوالور نہ نکالا ہوتا تو کیا ہم نکل سکتے تھے' وہاں سے زندہ سلامت۔ ایک کتے کو شوٹ کر دیا تم نے جو پورے ایک لاکھ کا تھا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی "میرے نشانے کی تعریف کیوں نہیں کرتے؟"

"اس کی تو بہت مشق ہے تمہیں۔"

"میں ایک شوٹنگ کلب کی ممبر ہوں" اس نے مجھے فخر سے بتایا "ایک بار مقابلے میں دوسری پوزیشن لی تھی۔"

"کہتے ہیں ہاتھ کا ہنر کام آتا ہے۔ تمہارے ہنر نے تمہارے لیے خطرات پیدا کر دیے ہیں۔"

"میں اسے بھی کتے کی طرح شوٹ کر دوں گی۔"

"ایسے ڈائیلاگ تمہاری فلم میں اچھے لگتے ہوں گے۔ اگر اس نے تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم کیا کرو گی؟"

"میں بابا جی کو سب بتا دوں گی۔ باقی انتظام وہ سنبھال لیں گے۔ انہیں سب سے نمٹنا آتا ہے۔ میں نے خود بھی فیصلہ کیا ہے کہ ایک بات کا سب کے سامنے چرچا کروں۔ سب سے کہوں کہ مجھے چھوٹے ملک نے حویلی میں ڈانس کے لیے بلایا تھا اور میرے انکار سے مشتعل ہو کے اغوا بھی کرا لیا تھا مگر اس کی ماں کی مداخلت سے میری گلوخلاصی ہوئی۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ پھر کوئی حرکت کرے گا کیونکہ وہ ٹیلی فون پر مجھے دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔"

"ایسی باتوں سے کیا ہو گا؟ وہ زیادہ مشتعل ہو جائے گا۔"

"نہیں پھر مجھے کچھ ہوا تو شک براہِ راست اس پر کیا جائے گا اور ایک نہیں دس افراد گواہی دیں گے کہ میں نے اپنے خدشات کا پہلے ہی اظہار کر دیا تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ ڈی آئی جی سے ملوں۔"

"اس کے آفس میں؟"

"نہیں" وہ ہنسی "جہاں وہ بلائے۔ اس کے بعد وہ چھوٹے ملک کو خود سمجھا دے گا کہ بس اب بات ختم ہو جانی چاہیے۔ ڈی آئی جی جیسے لوگوں کا اشارہ سب سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد ضروری ہوا تو میں ایک پریس کانفرنس بھی کر سکتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ چھوٹا ملک مجھے فون پر دھمکیاں دے گا۔ میں وہ ریکارڈ کر لوں گی اور پریس کانفرنس میں سنوا دوں گی۔ میرے ذہن میں اپنی حفاظت کا پورا لائحہ عمل ہے۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا "فائن' تم نے میرے سر پر سے بڑا بوجھ کم کر دیا ہے' مگر یہ تفکرات کا بوجھ تھا۔ تمہارے احسانات کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔"

"میرے احسانات کو چھوڑو۔ شادو کے احسانات کی بات کرو۔ اس کے ساتھ یہ سب اس لیے ہوا کہ شادو نے تمہاری زندگی بچانے کی کوشش کی تھی۔ اب تمہیں ثابت کرنا ہے کہ تم مرد ہو اور احسان فراموش نہیں ہو" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں شادو کے ساتھ ہوں۔ اس کی حفاظت کے لیے۔"

"خود بھی کہیں مت جانا ابھی۔ میں نے ڈاکٹر نوید سے بات کرنی ہے اور اس کی بیوی سے بھی۔ تم جب تک چاہو ان کے گیسٹ روم میں رہ سکتے ہو۔ وہ خود پیچھے انگیسی میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ ایک اور احسان ہے تمہارا۔ معلوم نہیں میں اس کا بدلہ کیسے چکاؤں گا۔"

"احسان کا بدلہ احسان سے ہی چکایا جا سکتا ہے اور اس کی توفیق خدا دیتا ہے۔ موقع خدا فراہم کرتا ہے مگر تم انتظار مت کرو۔ اگر یہ میرا قرض سمجھتے ہو تم تو کسی ضرورت مند کو ادا کر دو مثلاً شادو کو" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں اس کی دانشوری پر حیران رہ گیا۔ وہ ایک عام قسم کی خوب صورت لڑکی تھی جو پہلے ماڈلنگ اور پھر ایکٹنگ کے میدان میں صرف اپنے پُرکشش بدن اور ساحرانہ اداؤں سے نامور تھی اور ان کے بارے میں عام رائے یہی مستند سمجھی جاتی ہے کہ بس دیکھنے کی چیز ہوتی ہیں۔ NO BRAINS BEAUTY BUT تاہم تکلم صرف کتابی اور اکتسابی نہیں ہوتا اور ذہانت کی کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔

رئیس ابھی تک نروس تھا اور میری طرح اس کے ذہن میں بھی آنے والے دن کا خیال اپنے پُرخوف پنجے گاڑے بیٹھا تھا۔ ہم کینٹین سے واپس لوٹے تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے رخسانہ کو تلاش کر لیا' وہ جنرل وارڈ میں تھی اور معمول کے مطابق مریضوں کے چارٹ پر اندراجات کر رہی تھی۔

"ڈاکٹر انجم آپریشن تھیٹر میں ہیں" اس نے کمرے میں آ کے بتایا۔

"شادو کے ساتھ؟"

"ہاں۔ اس کے ساتھ ایک قانونی مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔ آپریشن کے پیپرز کون سائن کرے گا؟"

"میں کر دیتا ہوں۔ کیا کوئی خطرے کی بات ہے؟"

"نہیں۔ تم اس کے کیا ہو؟" وہ بولی "کاغذات پر شوہر' باپ یا بھائی دستخط کر سکتے ہیں۔ یا چچا دادا وغیرہ۔"

"ایسا تو کوئی رشتہ کسی سے بھی نہیں ہے۔ نہ میرا نہ شادو۔ شاہدہ کا۔ یہ کس قسم کا آپریشن ہے؟"

"D.N.C میرا خیال ہے کہ۔ بچہ ضائع ہو گیا ہے۔"

"وہ کیسے۔؟" مجھے ایک اور شاک لگا۔

"اگر تم نہیں جانتے تو میں کیسے بتا سکتی ہوں۔ اگر کوئی حادثہ پیش نہیں آیا تو پھر سمجھ لو کہ خدا کی مرضی" وہ بولی۔

رئیس نے کہا "سسٹر۔ شادو کی جان تو بچ جائے گی نا؟"

"مجھے پوری اُمید ہے۔ ڈاکٹر انجم بہت ماہر گائنی ہیں اور یہ رولین کا کیس ہے۔ ہو سکتا ہے خون کی ضرورت پڑے' کیا گروپ ہے تمہارا؟"

میں نے شرمندگی سے کہا "مجھے نہیں معلوم۔ مگر میں لے آؤں گا۔"

"بلڈ بینک والے DONOR مانگتے ہیں۔ تم دونوں چلے جاؤ ابھی۔ میں پوچھ لیتی ہوں انجم سے۔" وہ کمرے سے نکل گئی۔

رخسانہ اور انجم رشتے میں سوکنیں تھیں مگر ڈاکٹر نوید کو ان سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ دوستوں کی طرح رہتی تھیں اور اسپتال کو بہت اچھی طرح چلا رہی تھیں۔ رخسانہ آج بھی نرس کی ڈیوٹی اسی طرح دے رہی تھی جیسے ڈاکٹر نوید کی بیوی بننے سے پہلے دیتی تھی۔

رئیس غصے میں بڑے ملک کو گالیاں دینے لگا "قسم اللہ کی۔ شادو کو کچھ ہوا تو میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یار' جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس سے زیادہ بھلا کیا ہو گا؟"

رخسانہ دوبارہ کمرے میں آئی اور اس نے ہمیں ایک سلپ پکڑا دی "انجم نے کہا ہے کہ فوراً جاؤ' خون P.W.A سے لانا ہے۔"

میں نے کہا "P.W.A کیا ہے؟"

"PATIENT WELFARE ASSOCIATION" میو اسپتال میں ہے۔ وہ صحیح کراس میچ کر کے دیں گے اور اسکریننگ بھی ٹھیک ہو گی۔ تمہیں دو تین گھنٹے انتظار کرنا پڑے گا" رخسانہ نے کہا۔

لیبارٹری میں نوجوان ڈاکٹر لڑکے لڑکیاں بڑی جانفشانی اور لگن کے ساتھ ضرورت مندوں کو صحیح خون کی فراہمی کا مقدس فریضہ بڑے مشکل حالات میں سرانجام دے رہے تھے۔ ان کے پاس جگہ محدود تھی۔ وسائل محدود تھے۔ گرمی' رش اور تھکاوٹ کی پروا کیے بغیر وہ باری باری سب سے نمٹ رہے تھے اور پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ وہاں سب پریشان تھے اور سب کی ضرورت اہم تھی۔ لوگ سفارش لاتے تھے۔ فون کراتے تھے کہ مریض کو پہلے خون دے دو' مسئلہ زندگی اور موت کا ایک جیسا ہونے کے باوجود سب کا رویہ ایک سا نہیں تھا۔ کچھ لوگ یہاں بھی دولت پھینک کر غریب پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے مگر ڈاکٹروں کی نئی نسل ان سب سے بے نیاز "پہلے آؤ پہلے پاؤ" کے اصولوں پر سختی سے کاربند تھی۔

یہ احساس اور یہ جذبہ بعد میں حصولِ زر کی دوڑ میں خودغرضی کے قدموں تلے کچلا جاتا ہے اور دم توڑ دیتا ہے۔ یہی ڈاکٹر بڑے اور نامور ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑے اور نامور لوگوں تک محدود ہو کے رہ جاتے ہیں۔ سفارش اور پیسہ دونوں کی قدر اصولوں سے زیادہ کرنے لگتے ہیں۔ ممکن ہے وہ پچھتاتے بھی ہوں کہ شروع شروع میں ہم کتنے جذباتی احمق تھے کہ سچ مچ خدمتِ خلق' کارِ ثواب اور نیکی کے چکر میں پڑ گئے تھے۔ ان سے کہیں دنیا میں کچھ ملتا ہے؟

ہم خون ملنے کے انتظار میں بار بار گھڑی دیکھتے رہے۔ ہر آواز پر دوڑ کے جاتے رہے۔ ہم چائے پینے بھی نہیں گئے لیکن چائے والا خود کیتلی اٹھائے آواز لگاتا گزرا تو ہم نے ایک بے مزہ محلول تین چار پچھتانے کے لیے پی لیا۔ اس سے تسکین خاک ہوتی۔

مجھے شادو کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ اس کا سُتا ہوا بیمار اور دکھی چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ رئیس بھی خاموش رہا۔ ہم پریشانیوں کے ایک ہی عذاب کی دلدل میں تھے اور کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ایک دوسرے کے لیے اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خاموش غمگساری اور رفاقت کا سہارا فراہم کر رہے تھے۔

یہ جان کر مجھے صدمہ ہوا تھا کہ شادو جس بچے کو جنم دے گی' وہ ہاشمی صاحب کا ہوگا اور شادو کی ساری محبت اب اس کے لیے وقف ہوگی۔ یہ بڑی خود غرض اور منفی سوچ تھی مگر میں اپنے خیالات کا رخ گاڑی کی طرح اسٹیئرنگ گھما کے نہیں موڑ سکتا تھا۔ اس کے ABORTION کی خبر بھی شاک کی طرح تھی مگر اس میں تشویش کا پہلو صرف شادو کے لیے تھا۔ نہ جانے کیوں میں نے اس بچے کے بارے میں سوچا ہی نہیں جو وجود پاتا تو خوش قسمتی کی علامت سمجھا جاتا مگر وہ آدھے راستے سے ہی واپس عدم کی دنیا میں لوٹ گیا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کا باپ کتنا بڑا وکیل تھا اور کتنا دولت مند تھا۔ وہ تو مرنے کے لیے بھی ولایت گیا تھا۔ شاید اسی ولایت سے شادو اس کی نشانی ساتھ لائی تھی۔

اب وہ پیدا نہ ہونے والا بچہ مرگیا تھا تو مجھے بڑا عجیب سا سکون کا احساس شرمندہ کر رہا تھا۔ جیسے دستِ قدرت نے مجھے خوش قسمتی کے پھولوں سے بنا ہوا ایک گلدستہ تھمادیا تھا مگر ان پھولوں میں ایک بچھو بھی تھا جس کو قبول کیے بنا چارہ نہ تھا۔ وہ بچھو اب اپنی موت آپ مرگیا تھا اور میں گلدستہ چوم سکتا تھا۔ آنکھوں اور سینے سے لگا سکتا تھا اور اپنے پاس سجا کے رکھ سکتا تھا۔

میری یہ سوچ میرے لیے شرمناک حد تک درجۂ انسانیت کے شرف سے گری ہوئی اور لائقِ صد ملامت تھی مگر اس وقت میرے جذبات کی کیفیت پر میرا اختیار ہی نہ تھا۔ میں شادو کے لیے ذلیل کہلانے پر تیار تھا' کمینہ ہوگیا تھا تو مجھے اس پر ندامت نہ تھی۔ عشق میں ذلت و رسوائی کو کس نے باعثِ افتخار نہ سمجھا؟

ہمارا نام پکارا گیا تو ہم ایک ساتھ لپکے۔ ایک ڈاکٹر نے گرم گرم سیال خون کے دو پلاسٹک بیگ مجھے تھمادیے اور اس کے ساتھ ایک سلپ تھمادی۔ اس پر ہمارے بلڈ گروپ لکھے ہوئے تھے۔

باہر آکے میں نے رکشا ٹیکسی کے لیے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ رئیس نے کہا "چل آگے مل جائے گا کوئی۔"

میں نے گھڑی دیکھی "بہت دیر لگی یہاں۔۔۔ پتا نہیں شادو کس حال میں ہوگی؟"

"اللہ اپنا فضل کرے گا پیارے!" رئیس نے ایک رکشا روک کر کہا "تو جا۔"

"کیوں' تو کہاں جائے گا؟"

"میں۔۔۔ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے یار۔ نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا میرا۔"

"بریک ڈاؤن' جاہل کی اولاد۔"

"ابے جا" وہ بگڑ کے بولا "اپن جا رہے ہیں اپنی چنڈال چوکڑی کے پاس۔ ہمیں ساتھ نہیں رہنا چاہیے ایسے بھی۔"

"رئیس خبیث تو ان کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ رہا ہے؟"

وہ بولا "اکیلے تو ہم ہیں پیارے قسم اللہ کی۔ تیرے ساتھ تو سب ہیں۔ نیلم بھی ہے اور شادو بھی۔ تو ڈاکٹر مشہود کے گھر جا سکتا ہے اور یہاں بھی بندوبست ہو گیا ہے تیرے لیے۔ اپنا ٹھکانا کہیں نہیں سوائے پرانے ٹھکانے کے۔"

میرے آواز دینے کے باوجود وہ روانہ ہوگیا۔ وقت کم نہ ہوتا تو میں اس کے پیچھے دوڑتا اور اسے پکڑ لاتا۔ اس نے چند قدم دور جا کے چلا کے کہا "میں پتا کروں گا فون کر کے۔"

میں نے پیچھے مڑ کے اور چلا کے کہا "آئے گا نہیں سور کے بچے!"

اس نے ہاتھ ہلایا۔ "آؤں گا آؤں گا" پھر وہ بھیڑ میں گم ہوگیا اور رکشا چل پڑا۔

شادو چار نمبر وارڈ میں تھی۔ اس کے چہرے کی زرد رنگت دیکھ کے میں پریشان ہوگیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے جسم سے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا گیا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانس لینے کی رفتار بھی بہت مدھم تھی۔ ایک سرخ رنگ کا کمبل اس کے سینے تک پھیلا ہوا تھا۔ شادو کے نازک ہاتھ اس سرخ رنگ پر پھیلے ہوئے کچھ زیادہ ہی سفید نظر آرہے تھے۔ خون کی ایک بوتل سے قطرہ قطرہ خون اس کے جسم میں منتقل ہو رہا تھا۔ دوسری طرف کے اسٹینڈ سے لگی ہوئی بوتل میں گلوکوز تھا جس میں شاید تمام جان بچانے والی ضروری دوائیں ڈال دی گئی ہوں گی۔

کرسی پر بیٹھی ہوئی رخسانہ نے خون مجھ سے لے لیا "ایک بوتل ہم نے اپنے پاس سے لگادی تھی۔ ایمرجنسی کے لیے رکھتے ہیں۔ اگر گروپ عام قسم کا ہو۔"

میں نے کہا "شادو کیسی ہے؟"

اس نے کچھ تذبذب کے بعد جواب دیا "دیکھ لو۔ ٹھیک ہی ہے لیکن ابھی CARE کی ضرورت ہے۔ مکمل صحت یابی میں وقت لگے گا۔"

"یہ کب تک ہوش میں آئے گی؟"

"CAN'T SAY۔ چند گھنٹے تو لگیں گے۔ اسے مکمل بیڈ ریسٹ کی ضرورت ہوگی۔ ضرورت پڑی تو آئی سی یو میں شفٹ کردیں گے۔۔۔ تم انجم سے مل لو۔ وہ بات کرنا چاہتی ہے تم سے۔"

میں نے جھک کر آہستہ سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ رخسانہ مجھے بڑے غور سے دیکھتی رہی۔

"ایک بار تم نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا؟"

میں نے کہا "اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا تم نے۔"

"وہ سوال ہی غلط تھا۔ محبت تو سب کرتے ہیں" وہ بولی "صحیح سوال تمہاری حالت دیکھ کے میرے ذہن میں آتا ہے۔ کیا تم نے کسی سے ناکام محبت کی تھی؟"

میں نے اقرار میں سر ہلا کے شادو کی طرف دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر باہر نکل گیا۔ کتنا عرصہ میرا سوال ایک کانٹے کی طرح رخسانہ کے دل میں چبھتا رہا۔ میں نے سوچا اور آج وہ اسے غلط کہتی ہے یا صرف اس لیے کہ وہ جواب دینے کے لیے بے قرار تھی۔

ڈاکٹر انجم سے ملنے کے لیے مجھے انیکسی کی طرف جانا پڑا۔ پہلے کبھی وہ اسی کوٹھی میں رہتے تھے اور یہیں پریکٹس کرتے تھے۔ جب انہوں نے کلینک کو وسعت دے کر اسپتال بنانے کا فیصلہ کیا تو پچھلے حصے میں ایک چھوٹی سی انیکسی بنالی۔ اس میں تین بیڈ روم تھے۔ ایک نیچے اور دو اوپر۔ ان کے بچے نہیں ہوئے تھے چنانچہ انہیں ایک ہی بیڈ روم کافی تھا۔ بچے دوسری شادی کے بعد ابھی تک نہیں ہوئے تھے چنانچہ وہ نیچے والا گیسٹ بیڈ وقتی طور پر مجھے رہائش کے لیے دے سکتے تھے۔

ڈاکٹر انجم کھانے کی میز پر اکیلی تھی۔ "نوید کسی ایمرجنسی میں پھنس گئے ہیں اور رخسانہ کو میں خود شاہدہ کے پاس چھوڑ آئی ہوں۔ تم بیٹھو' کھانا کھاؤ۔"

ویٹر نے میرے سامنے برتن لگا دیے۔ جب میں نے کھانا شروع کیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا بھوکا ہوں۔ ہم کچھ دیر خاموشی سے کھاتے رہے پھر ڈاکٹر انجم نے ویٹر کو رخصت کردیا "ابھی کچھ نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "شادو کی حالت مجھے اچھی نہیں لگتی۔"

"اچھی ہو بھی نہیں سکتی۔ بہت خون ضائع ہوگیا۔ وہ پہلے ہی اچھی صحت کی مالک نہیں تھی۔"

"اب تو کوئی خطرے کی بات نہیں ہے؟"

"یہ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد معلوم ہوگا۔"

لقمہ میرے حلق میں اٹک گیا "چوبیس گھنٹے۔۔۔ یعنی۔۔۔ وہ مر بھی سکتی ہے۔"

"یہ چانس تو ہر کیس میں ہوتا ہے۔ اس میں بہت کم ہے۔ ابھی میں RESPONSE دیکھ رہی ہوں۔ تم کھانا کھاؤ۔"

میں نے ہاتھ کھینچ لیا "بس کھالیا۔ RESPONSE ٹھیک نہ ہوا تو۔۔۔"

"میں اسے آئی سی یو میں رکھوں گی۔ ہم کنٹرول کرلیں گے لیکن۔۔۔ ڈاکٹر کوشش کر سکتا ہے' گارنٹی نہیں دے سکتا۔"

میرے سینے میں ایک غبار سا بھر گیا جس سے میرا دم گھٹنے لگا "ڈاکٹر۔۔۔ جو کہنا ہے ایک بار میں کہہ دو۔"

"دیکھو۔ یہ کیس ہم نے نیلم کی وجہ سے لے لیا۔ اس میں بہت سی لیگل COMPLICATIONS ہو سکتی ہیں۔ تم اس کے کچھ نہیں ہو۔ وہ بچہ ایک وکیل کا تھا جو مر چکا ہے۔ جس کمپنی کی مالک یہ لڑکی ہے' اس میں بہت سے سینئر وکیل ہیں جو تمہارے اور ہمارے لیے بہت سنگین قانونی مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ مثلاً وہ پوچھ سکتے ہیں کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا؟ یہ میڈیکو لیگل کیس تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں بہت کچھ سامنے آجائے گا۔"

میں نے کہا "مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ اس لڑکی پر بہت تشدد ہوا جو ABORTION کی وجہ بنا۔ اس کے ساتھ گینگ ریپ ہوا۔"

میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا "GANG RAPE؟"

"یس۔ وہ کم سے کم تین چار ہوں گے' وہ کون لوگ تھے؟"

میرا خون تیزاب بن کے میرے سر میں جمع ہوگیا "میں جانتا ہوں ان سب کتوں کو۔"

"لیکن تم نے ان کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی۔ لکھوا بھی نہیں سکتے۔ وہ تمہیں بھی ریپ کرنے والوں میں شامل کرادیں گے۔ تمہیں اور تمہارے دوست کو مجرم بنادیں گے۔ ہمارے پاس ابھی D.N.A ٹیسٹ جیسے سائنسی طریقے نہیں ہیں۔ کسی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے۔ تمہیں پولیس پکڑے گی اور تم سے اقبالِ جرم بھی کرالے گی۔ آخر میں ہوگا کچھ بھی نہیں۔ بچہ مرگیا' باپ مرگیا' ماں بھی مرجائے گی پھر کیا ہوا؟ انسانوں کی اس دنیا میں کون سی کمی ہے۔ ہم ایسے کیس دن رات ڈیل کرتے ہیں۔ اس بے کردار' ضمیر فروش معاشرے میں انسانی جان کی کوئی قیمت نہیں۔"

میرا دماغ چکرا گیا "ڈاکٹر صاحب! آپ بتائیں مجھے کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنا چاہیے؟"

"ابھی وقت ہے۔ تم خود کو بھی مصیبت سے بچا سکتے ہو اور ہمیں بھی" ڈاکٹر انجم نے کہا "یہ جس لیگل فرم کی مالک ہے' وہاں جا کے سب بتا دو۔ جو بھی وہاں سینئر وکیل ہو' اسے بتا دو کہ مجرم کون ہیں؟"

"اتنا تو مجھے کرنا ہی پڑے گا۔ شاید اس سے بھی زیادہ۔" میں نے کہا "حالانکہ مجھے اس میں امید کم اور خطرہ زیادہ نظر آتا ہے۔ قانون کے عمل کی رفتار بہت سست ہے اور غیر قانونی طاقت رکھنے والوں کی گولی نظر بھی نہیں آتی۔"

"تم صرف اپنا دفاع کرو۔ جارحیت لاحاصل ہے۔ عدالت میں کچھ ثابت کرنے میں بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور ثبوت گواہ نہ ملیں تو انصاف مانگنے والا خود بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کے اٹھاؤ۔"

"میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس سے آپ کے لیے یا نیلم کے لیے مزید پریشانی کے اسباب پیدا ہوں" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک بات اور۔۔۔ کل کو خدانخواستہ ہم ملوث ہوئے۔۔۔ تو ہماری مجبوری ہوگی جھوٹ بولنا۔۔۔ ہم انکار کر دیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ نہ ہم تمہیں جانتے ہیں اور نہ ہم نے کبھی شادو کے لیے کچھ کیا تھا۔۔۔ آئی ایم سوری مگر ہمیں اپنی عزت کا بھی خیال ہے۔۔۔ اور ہم ابھی زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ اپنے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی۔"

میں نے سر ہلایا "میں احسان فراموش نہیں ہوں کہ آپ کا نام بھی لوں کہیں۔"

"ویسے ابھی تمہارے لیے گیٹ بند ہے۔ تم اس کے کمرے میں رک بھی سکتے ہو مگر رات کے دوران میں بھی تمہیں بار بار کمرے سے باہر آنا پڑے گا۔ جب بھی نرسنگ اسٹاف ضرورت محسوس کرے گا' یہاں تم آرام سے سو سکتے ہو۔"

میں نے کہا "یہاں بھی نیند نہیں آئے گی مجھے پھر کیوں نہ میں وہیں رہوں۔ اسے کتنے دن اور لگیں گے یہاں؟"

"DEPENDS" وہ بولی "وہ کتنی جلد صحت یاب ہوتی ہے۔ اور ہونا چاہتی ہے۔ ایک ہفتہ سمجھ لو' کم و بیش۔"

میں لوٹ کے شادو کے کمرے میں گیا تو شادو کی حالت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اب وہاں ایک نرس تھی جو میرے آتے ہی کھڑی ہو گئی۔ "۱۱۰ کے ساتھ آپ ہیں سر۔ ATTENDANT؟ رات کو آپ رہیں گے؟"

"ہاں۔۔۔ کوئی خاص بات۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔ چار کمرے چھوڑ کے اسٹاف ڈیوٹی روم ہے۔ اس کے ساتھ والا کمرا آر ایم او کا ہے۔ یہ بٹن دبا کے آپ مجھے بلا سکتے ہیں۔ اگر ایمرجنسی ہو" اس نے باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

میں بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا۔ شادو بظاہر بہت پرسکون تھی مگر وہ بہت کمزور نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے کراہی اور اس نے سر کو دائیں بائیں بے چینی سے ہلایا۔

میں نے کہا "شادو۔۔۔ آنکھیں کھولو۔۔۔ دیکھو میری طرف۔"

وہ پھر بے حس و حرکت ہو گئی۔ میں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رکھ لیا "شادو۔۔۔ دیکھو میں ناصر ہوں۔۔۔ تمہارا ناصر' وہی پرانا ناصر جس نے تمہارے لیے گدائی کا کشکول اٹھانا بھی قبول کر لیا تھا۔"

وہ خاموش پڑی رہی۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو چھیڑا' سہلایا اور چہرے پر لا کے دیکھا۔ میں نے ایک انگلی سے اس کے زرد رخساروں کو اور اس کے سوکھے ہونٹوں کو چھوا۔ وہ پھر کراہی اور اپنا سر ادھر سے اُدھر ہلانے لگی۔ اضطراب اور بے چینی کے آثار اس کی صورت سے ہویدا تھے۔

میں نے کہا "شادو۔۔۔ شادو کیا بات ہے؟"

اس کے لب ہلے "چھوڑ دو۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔"

میں نے کہا "دیکھو۔۔۔ یہاں کوئی نہیں ہے میرے سوا۔۔۔ میں ناصر ہوں۔"

وہ زیادہ بے چین ہو گئی "خدا کے لیے۔۔۔ مجھے جانے دو۔"

سرہانے کی طرف آ کے میں نے اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو چوما۔ اس کے گالوں کو چوما "میری جان' میں تمہارے پاس ہوں۔ میری طرف دیکھو۔"

وہ آنکھیں کھولے بغیر سسکیاں لینے لگی۔ آنسو کے دھارے خود بخود اس کی آنکھوں کے گوشوں سے بہہ نکلے۔ یہ یقیناً میرے قرب کا اثر تھا میرے وجود کی گرمی اور مہک تھی جس نے اس کے حواس پر یلغار کی تھی۔ میں نے لاشعور کے ٹھہرے ہوئے منجمد خیالوں کی جھیل میں پتھر پھینک کے تموج پیدا کر دیا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ ایمرجنسی کال بیل سے نرس کو بلا لوں مگر وہ پھر ساکت اور پرسکون ہو گئی تھی۔ اس کے

دونوں ہاتھوں میں خون اور گلوکوز کی نلکیاں لگی ہوئی تھیں۔ اگر اس کا اضطراب بڑھ جاتا تو وہ ہاتھ پاؤں بھی چلانے لگتی' اس سے اس کی نلکیاں نکل سکتی تھیں۔

میں نے کمرے کے دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور پوری احتیاط کے ساتھ بیڈ پر سرہانے کی طرف بیٹھ گیا۔ میں نے تکیہ ہٹا کے شادو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا پھر میں نے اس پر جھک کے اسے آواز دی۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا تو میرا دل بڑے زور سے دھڑکا "شادو۔۔۔ دیکھو شادو۔۔۔ یہ میں ہوں۔"

اس نے آہستہ سے کہا "ناصر۔۔۔ مجھے چھوڑ کے مت جانا۔" پھر اس نے اپنے ہاتھ سے مجھے چھونا چاہا یا شاید میرا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔ اس کی یہ حرکت بالکل اضطراری تھی اور غیر ارادی مگر اس سے ایک نلکی نکل گئی۔ قطرہ قطرہ ٹپکنے والا لہو سفید چادر پر گرا اور سرخ دھبا بن کے پھیلنے لگا۔

میں گھبرا گیا۔ شادو پھر بے ہوشی میں ڈوب گئی تھی مگر نہ جانے کیوں وہ مجھے پہلے سے زیادہ پرسکون لگی۔ میں نے اس کا سر پھر تکیے پر رکھا اور ایمرجنسی کال بیل کا بٹن دبا کے دروازہ کھول دیا۔

نرس فوراً ہی نمودار ہو گئی "کیا بات ہے سر؟"

میں نے خون کے دھبے کی طرف اشارہ کیا "یہ نلکی نکل گئی ہے۔"

"یہ کیسے ہوا؟" وہ جھک کر ٹیوب کی سرنج فٹ کرنے لگی "کیا انہوں نے ہاتھ ہلایا تھا؟"

"ہاں۔ کچھ بے چینی تھی۔ یہ بے ہوشی میں کچھ بول رہی تھی۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ان کے REFLEXES نارمل ہو رہے ہیں۔ آپ خیال رکھیں۔ اگر ANXIETY بہت زیادہ ہو تو بتائیں۔ میں یہ چادر بدل دیتی ہوں" نرس نے کہا۔

آدھی رات کے بعد ڈاکٹر نوید اور انجم دونوں معمول کے مطابق راؤنڈ پر آئے تو انہوں نے مجھ سے مزید سوالات کیے۔ نرس انہیں پہلے ہی بتا چکی تھی کہ شادو نے ہاتھ ہلائے تھے اور کچھ بولی تھی۔

میں نے انہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتایا "ایسا میری غلطی سے ہوا۔ میں اس سے باتیں کرتا رہا حالانکہ وہ جواب نہیں دے سکتی تھی اور پھر میں نے تکیہ ہٹا کے شادو کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔۔۔ مگر میں اس کے دکھ کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہوں۔"

وہ میری بات غور سے سنتے رہے پھر ڈاکٹر نوید نے میرے کندھے پر تھپکی دی "ہم اسی لیے کسی مریض سے قریبی جذباتی رشتہ رکھنے والے کو یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ان کی INTERFERENCE بعض اوقات مریض کے حق میں نقصان دہ ہوتی ہے لیکن یہ اچھا ہی ہوا ایک طرح سے۔۔۔ دوا نے وہ کام نہیں کیا جو تمہاری موجودگی نے کیا۔ مریض کو ایک جذباتی سہارے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ وہ دعا کا ہو یا پیار کا۔"

ڈاکٹر انجم نے سر ہلایا "اب یہ جلدی RECOVER کرے گی۔ اس کے لاشعور میں یہ احساس شامل ہو گیا ہے کہ تم اس کے پاس ہو مگر اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو' اچھا ہے کہ سو جاؤ۔ یہ بھی صبح تک سکون سے سوتی رہے گی۔ ہم نے ایک TRANQUILISER بڑھا دیا ہے۔"

میں دوسرے بیڈ پر لیٹ گیا۔ نرس نے کچھ دیر بعد اسے ایک انجکشن لگا دیا تھا۔ شادو اب بالکل بے حس و حرکت سوئی ہوئی تھی۔ میرے خیالات کا سمندر جاگ اٹھا تھا اور اب میں شادو کے بارے میں نہیں' ان کے بارے میں سوچ رہا تھا جو شادو کے ساتھ حیوانیت کے مرتکب ہوئے تھے۔

میرے تصور میں ایک ہی تصویر تھی جس میں شادو بڑے ملک صاحب کے پیروں میں پڑی نظر آتی تھی۔ بے بس' بے لباس اور بے جان سی پھر یہ تصویر غائب ہو جاتی تھی اور اندھیرے اسکرین پر گینگ ریپ کے الفاظ ابھر آتے تھے اور میں سوچنے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ کون ہوں گے؟ خود چھوٹے بڑے ملک یا ان کے غلام جو صرف جسمانی طور پر نہیں' ذہنی طور پر بھی پوری طرح ان کے تابع تھے۔ اس حد تک کہ وہ روبوٹ ہو گئے تھے۔ مشینی آدمی۔ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے۔ ان کی اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت صدیوں کی غلامی نے ختم کر دی تھی۔ ان سے جو کہا جاتا تھا وہ آنکھیں بند کر کے اس پر عمل کرتے تھے۔ شادو کی جگہ کوئی اور ہوتی جس کے ساتھ ان کے خون کا مقدس رشتہ ہوتا' کسی کی اپنی ماں یا بہن۔۔۔ تب بھی شاید وہ انکار نہیں کرتے۔

کیا آدمی زندگی سے اتنا پیار کرتا ہے۔ اس کے لیے اتنا بزدل' بے حس اور بے غیرت ہو جاتا ہے۔ تن کے دو کپڑوں اور روٹی کے دو ٹکڑوں کی خاطر وہ رشتوں کی آبرو کو قربان کر سکتا ہے۔ باپ کی جان لے سکتا ہے اور ماں کی آبرو پر ہاتھ ڈال سکتا ہے چونکہ میں اپنے ذہن سے سوچ رہا تھا اس لیے مجھے ہر سوال کا یہی جواب ملتا تھا کہ ایسا ناممکن ہے۔

لیکن شادو کے ساتھ جو بھی ہوا تھا' وہ ناممکن نہیں سمجھا جا سکتا تھا اور اب مجھے کسی کو کچھ نہیں بتانا تھا کہ میں کیا سوچ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا ہوں اور کیا کرنے والا ہوں پھر جو میں سوچوں گا وہ ضرور کروں گا اگر رئیس کو' نیلم یا شادو کو شک بھی ہو گیا تو وہ میرے لیے اپنے ارادوں کی تکمیل کو ناممکن بنادیں گے۔ وہ میرے راستے میں دیواریں کھڑی کردیں گے۔ قسموں اور التجاؤں کی اور آنسوؤں کی۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی اور نرس نے اندر جھانک کے کہا "آپ کا فون ہے سر۔ ڈیوٹی روم میں۔"

میرا خیال تھا کہ یہ رئیس ہوگا مگر دوسری طرف نیلم تھی۔ اسے گھر پر گالیوں اور دھمکیوں والی ٹیلی فون کالز کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنے بابا جی کے مشورے پر صفراں کے ساتھ ایک فلمی دلن کے گھر شفٹ ہو گئی تھی۔ سلطان راہی فلموں میں جتنا قابل نفرت' بدکردار اور شیطان صفت آدمی نظر آتا ہے عملی زندگی میں اس کے بالکل برعکس انتہائی نیک اور فرشتہ سیرت شخص ہے اور بیچ وقت عبادت گزارتا ہے۔ وہ پنجابی فلموں میں جتنا کھن گرج کے ساتھ بولتا ہے نجی زندگی میں اتنا ہی نرم گفتار اور نرم خو ہے۔ اس کے ساتھ نیلم خود کو بہت محفوظ سمجھتی ہے۔

پھر اس نے شادو کے بارے میں پوچھا اور میں نے اسے سب بتادیا۔

وہ بولی "شادو بڑی خوش قسمت ہے۔ مجھے حسد محسوس ہوتا ہے اس سے۔"

میں نے کہا "کمال ہے۔ اس سے زیادہ بدبخت کون ہو سکتا ہے۔ بچپن سے جوانی تک فقیری کی ذلت والی زندگی تھی۔ محبت اسے راس نہ آئی۔ شادی کی تو شوہر نہ رہا۔ اب جو کچھ اس کے ساتھ ہوا کیا اسے خوش قسمتی کہا جا سکتا ہے۔ ہوش آئے گا تو اسے پتا چلے گا کہ اس کی مامتا کا خزانہ بھی لٹ گیا ہے۔"

"وہ سب تو ہے۔ مگر اتنی محبت اور ایسی محبت کسی نے مجھ سے نہیں کی۔ جیسی تم کرتے ہو اس سے۔ خیر اس وقت میں نے صرف خیریت معلوم کرنے اور اپنی خیریت کی خبر سنانے کے لیے تمہیں نہیں جگایا۔"

"میں جاگ رہا تھا' پوری طرح۔"

وہ ہنسی "میرا بھی یہی خیال تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہیں ایک اچھی خبر بھی سنادوں۔ ایک فون ان کا بھی آیا تھا۔ تمہارے لیے۔"

"کن کا؟"

"تمہاری ماسی ہیر کا اور ڈاکٹر رانجھا کا۔"

میں نے بے چینی سے کہا "کہاں ہیں وہ لوگ۔"

"یہ انہوں نے نہیں بتایا۔ مجھے قسم دی تھی انہوں نے کہ تمہیں فون کے بارے میں بھی نہ بتاؤں مگر میں نے اسی وقت طے کرلیا تھا کہ قسم توڑ دوں گی۔ میں نے تم سے کہا تھا ناکہ وہ تم سے لاتعلق رہ نہیں سکتے زیادہ دن۔"

"تم نے کیا بتایا انہیں؟"

"میں نے کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا ایسے غائب ہو گئے' ناصر بہت پریشان ہے۔ ہر وقت آپ کو یاد کرکے روتا رہتا ہے۔ کہتا ہے انہوں نے مجھ پر اعتماد نہیں کیا۔ میری بات نہیں سنی۔ اسے بہت دکھ ہے آپ کے ساتھ ہونے والے سلوک پر مگر اس میں ناصر قصوروار نہیں تھا۔"

"پھر کیا کہا انہوں نے؟"

"ڈاکٹر رانجھا نے کہا کہ چلو جو نصیب میں تھا وہ ہوا۔ اب وہ ٹھیک ہے نا۔ اسے مت بتانا کہ ہم نے فون کیا تھا۔ اللہ اسے نیک ہدایت دے اور وہ سکھی رہے جہاں بھی رہے۔ ہماری یہی دعا ہوگی ہمیشہ۔ کبھی کبھی تم سے پوچھ لیں گے اس کی خیر خبر۔ تم اس کا خیال رکھنا۔"

"اپنا پتا ٹھکانا نہیں بتایا انہوں نے؟"

"نہیں۔ میں نے بہت کہا کہ میں ناصر کو نہیں بتاؤں گی۔ کبھی خود آنا چاہوں تو کہاں آؤں مگر وہ اتنے بے وقوف نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم کیا کروگی ہم سے مل کے اور وقت کہاں ہوگا تمہارے پاس ہم سے ملنے کا۔"

"تم نے یہ سب بھی بتایا ہوگا جو چھوٹے ملک نے ہمارے ساتھ کیا؟"

"بالکل نہیں۔ میں کیا پاگل ہوں کہ انہیں اور دکھی کرتی۔ ویسے میرے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہی تھی۔ واپس گھر آکے میری بھوک نیند سب اڑ گئی تھی۔ دیکھ لو جاگ رہی ہوں ابھی تک۔"

میں نے کہا "یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہارا کیریئر متاثر ہوگا۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو پھر مجھے کچھ کرنا پڑے گا۔"

"تم کیا کروگے؟" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "میں تم سے ملنا چھوڑ دوں گا۔ بات تک نہیں کروں گا تم سے۔"

"تم ایسا کر ہی نہیں سکتے۔ مجھے معلوم ہے" اس نے ہنس کے کہا اور فون بند کردیا۔

نرس جو شاید پہلے فراغت سے اونگھ رہی ہوگی' بڑی دلچسپی سے ہماری باتیں سنتی رہی تھی۔ وہ مجھ سے نیلم کے بارے میں پوچھتی رہی۔ میں اسے کیسے جانتا ہوں۔ اس کے ساتھ میرا تعلق کب سے ہے۔ وہ اتنی مشہور فلم اسٹار ہیں'

میں آٹوگراف لینا چاہتی ہوں ان کی ایک تصویر پر۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ میری ایک تصویر بن جائے۔ میری ہمت نہیں پڑتی ڈاکٹر نوید سے کہنے کی۔ وہ ان کے پرانے شناسا ہیں۔"

میں اسے مطمئن کرکے واپس آیا تو صبح کے پانچ بجے تھے۔ کھلی کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی۔ میں نے صبح کے روشن ستارے کو دیکھا اور کسی قریبی مسجد سے آنے والی فجر کی اذان سنی۔ میں نے دعا مانگی۔ خدا ہمیں صبر دے اور استقامت دے۔ حوصلہ دے اور اپنی امان میں رکھے تم سب کو۔"

پھر میں نے پلٹ کے دیکھا تو شادو میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے پاس جا کے بیڈ سائڈ پر ٹک گیا۔ اسے ہوش میں دیکھ کے میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا "خدا کا شکر ہے کہ تم نے میری طرف دیکھا تو سہی۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں۔ یا سنی تو اس کا مطلب نہیں سمجھی۔

"کیا بات ہے۔ میں اپنا تعارف کراؤں؟ مجھے پہچانا نہیں؟"

مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں کے کنارے مسکراہٹ سے روشن ہو گئے ہیں پھر اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور آنسوؤں کے دھارے پلکوں کے نیچے سے بہہ نکلے۔ میں نے انہیں نرمی سے صاف کردیا "مت رو شادو۔ اب کوئی فائدہ نہیں رونے کا۔"

اس نے پھر آنکھیں کھولیں اور کمزور آواز میں بولی "تم اچھے ہو نا؟"

میں نے کہا "نہیں' میں خراب ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔"

اس نے اپنی انگلیوں سے میرا ہاتھ دبایا "تم۔ خفا ہو مجھ سے۔؟"

"کوئی اپنے آپ سے خفا ہو سکتا ہے شادو۔"

وہ کچھ دیر اپنی قوت اور ہمت کو مجتمع کرتی رہی "مجھے پتا ہے۔ تم کتنے ناراض ہو۔"

میں نے اس کی آنکھوں کو اور اس کے گالوں کو اور ہونٹوں کو دیوانہ وار چوم کے کہا "جان' تم سے ناراض ہو کے میں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں۔"

اس کے زرد گالوں پر ہلکی سی لالی آگئی "تم سمجھتے ہو۔ میں نے دھوکا دیا تمہیں۔ بے وفائی کی تمہارے ساتھ۔"

"مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"

"تم مجھے معاف کرسکتے ہو ناصر۔؟" وہ پھر رونے لگی۔

میں نے کہا "جان' کچھ اپنا خیال کرو۔ تمہاری حالت ایک دن میں کتنی بہتر ہو گئی ہے۔ کل تک یہ تھا کہ تمہیں آئی سی یو میں رکھنا پڑے گا۔ اس وقت تم مجھ سے باتیں کررہی ہو۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو دکھی مت کرو۔ یہ بھی ہوتا ہے۔ سب ہوتا ہے زندگی میں مگر برا وقت گزر جاتا ہے اور اچھے دن پھر آتے ہیں۔ اسی امید پر جیتے ہیں سب۔ ابھی میں باتیں کروں گا اور تم سنو۔ جب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی تو میں تمہارے سوا کسی کی نہیں سنوں گا۔"

وہ اب واضح انداز میں مسکرائی "ناصر!"

"بولو کیا بات ہے؟"

"کیا تم جانتے ہو۔؟" وہ نظر جھکا کے بولی۔

"میں نے کہا ہے ناکہ خاموش ہو جاؤ۔ چلو سو جاؤ" میں نے کہا۔

"تم لائے تھے مجھے یہاں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "تم لائی تھیں مجھے یہاں۔"

اس نے خون اور گلوکوز کی بوتلوں کو دیکھا "یہ۔ کون سا اسپتال ہے؟"

"فکر مت کرو۔ میرے ایک جاننے والے ہیں۔ ڈاکٹر نوید' ان کی بیوی بھی ڈاکٹر ہیں' ڈاکٹر انجم۔ دونوں بڑے اچھے لوگ ہیں اور ہاں' ڈاکٹر صاحب کی ایک نہیں دو بیویاں ہیں۔ دوسری رخسانہ نرس ہے۔ وہ بھی بہت اچھی ہے۔ میں بھی دو شادیاں کروں گا۔ اگر تم جیسی دو مل گئیں۔"

وہ پھر مسکرائی "پہلی تو ابھی تک ملی نہیں۔"

"ملی تھی پھر کھو گئی۔ اب دوبارہ مل گئی ہے" میں نے کہا۔

وہ بولنے سے تھکن محسوس کرنے لگی تھی۔ کچھ دیر کے لیے وہ آنکھیں بند کیے خاموش پڑی رہی۔ اس وقت وہ مجھے بہت حسین لگی پہلے سے بھی زیادہ۔ دنیا کی سب سے حسین لڑکی سے بھی زیادہ حسین' میں مسحور بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اسے نیند آگئی ہے۔

اس نے اچانک آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا "ناصر۔ انہوں نے۔ انہوں نے میرے بچے کو۔ قتل کردیا۔"

آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے اور تکیے میں جذب ہونے لگے۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری شادو۔ مجھے بھی بہت دکھ ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں... ماں بننا چاہتی تھی" اس نے کہا۔

"تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔ یہ حق تمہیں ضرور ملے گا۔ ابھی بہت زندگی پڑی ہے۔ یہ ایک حادثہ تھا۔ کسی وجہ کے بغیر ہی پیش آسکتا تھا۔"

"مگر اس کی وجہ..."

میں نے اس کے منہ پر انگلی رکھ دی "کوئی ضرورت نہیں دکھ دینے والی باتیں یاد کرکے آنسو بہانے کی۔ سب ٹھیک ہوجائے گا جب تم ٹھیک ہوجاؤ گی۔ ہم مل کے سب ٹھیک کرلیں گے۔ میں اور تم۔"

"ایک وعدہ کرسکتے ہو مجھ سے... میری بات مانو گے؟"

میں نے کہا "ایک بات کے سوا ہر بات مانوں گا۔"

"وہ بات پہلے بتادو۔"

میں نے کہا "میں تم کو نہیں چھوڑوں گا۔ کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔ بس یہ مت کہنا مجھ سے۔"

اس کی آنکھوں میں صبح کے ستارے جیسی روشنی جھلملائی جسے میں نے ابھی کچھ دیر پہلے دیکھا تھا "اچھا بابا... یہ نہیں کہوں گی۔"

"اس کے علاوہ ہر بات مانوں گا۔ تم کہہ کے تو دیکھو۔"

اس نے کہا "اپنا ہاتھ رکھو میرے دل پر اور کھاؤ میری محبت کی قسم۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی خاص مقصد کے تحت مجھے ٹریپ کررہی ہے مگر اس وقت میں شادو کو انکار نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا جہاں اس کا دل تھا "میں تمہاری محبت کی قسم کھاتا ہوں۔"

اس نے سکون کا ایک گہرا سانس لیا اور خاموشی سے آنکھیں بند کرلیں۔

"اے لڑکی۔ یہ کیا ہے؟" میں نے اس کے گال پر پیار سے چپت لگا کے کہا "بات تو بتاؤ کیا حکم ہے میرے لیے؟"

"بتاؤں گی... ایک نہیں بہت سے حکم دوں گی۔ دیکھوں گی تم کتنے سچے ہو۔ کتنا مان رکھتے ہو اپنی قسم کا۔"

میں اندیشوں اور وسوسوں میں مبتلا ہونے لگا۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کیا منوائے گی۔ مجھے ایسے وعدے کا بلینک چیک اسے سائن کرکے نہیں دینا چاہیے تھا۔ ایک بات اس نے میری مان لی تھی مگر اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں ایسی ہوں گی جو مانی نہیں جاسکتیں... مثلاً... مثلاً... وہ کہے کہ مجھے زہر پلادو اپنے ہاتھوں سے کیونکہ میں اسی طرح مرنا چاہتی ہوں... خیر، قسم توڑی جاسکتی ہے۔ اس کا جو بھی کفارہ ہو ادا کیا جاسکتا ہے۔

اب وہ سو رہی تھی۔ نرس دروازہ کھول کے اندر آئی اور اس نے مجھے مسکرا کے گڈ مارننگ کہا پھر مجھ سے پوچھا۔

"آپ کی وائف اب کیسی ہیں سر!"

"بہت بہتر۔ ابھی باتیں کررہی تھیں مجھ سے۔"

"فائن۔ شاک کی کیفیت میں نروس بریک ڈاؤن سے برین ہیمرج تک کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بہادر عورت ہیں۔ بہت جلد RECOVER کرلیا" اس نے ٹمپریچر کو چارٹ پر لکھا اور بلڈ پریشر دیکھنے کے لیے شادو کے ہاتھ پر پٹی کو لپیٹنے لگی۔

میں نے کہا "کل رات تو میں بھی مایوس تھا۔"

اس نے بلڈ پریشر کے آلے میں غبارے سے ہوا بھری۔ اسٹیتھ اسکوپ کو بازو پر رکھا اور پارے کو اترتا دیکھتی رہی "صدمہ تو باپ کے لیے بھی ہوتا ہے لیکن ماں زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ کتنا عرصہ ہوا آپ کی شادی کو۔ یہ پہلا بچہ ہوگا آپ کا۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا "یس لیکن میں اس پرسنل معاملے میں کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتا۔"

اس نے کہا "آئی ایم سوری سر!" اور اسٹینڈ کو ایک ہاتھ سے چلاتی ہوئی کمرے سے باہر لے گئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا مگر یہ میرے لیے زندگی کی بڑی عجیب صبح تھی۔ اس... ایک رات میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے رات بھر ٹرین میں سفر کیا اور تاریک رات کا سفر ختم ہوا تو باہر کا منظر اب بالکل نیا اور اجنبی ہے۔ زمین آسمان، درخت اور ہوا۔ سب بدل چکے ہیں۔

ڈاکٹر آٹھ بجے آئی تو میری رپورٹ سے خاصی مطمئن ہوئی "اب آپ باہر تشریف لے جائیں۔"

میں نے کینٹین میں جا کے خوب ڈٹ کے ناشتا کیا۔ میں گزشتہ شام کے مقابلے میں زیادہ پُرسکون اور پُریقین تھا۔ وہ دھند چھٹ گئی تھی جو میرے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ اب میں جانتا تھا کہ مجھے کب کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ میرے خیالات واضح تھے اور ان کی ایک سمت تھی جسے میں محسوس کرسکتا تھا۔

مجھ پر ذہنی اور جسمانی تھکن کے ساتھ شب بھر کی بے خوابی کا اثر تھا مگر ابھی میرے لیے سونا اور آرام کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے نیند نہیں آئے گی۔

باہر نکلنے میں خطرہ تھا مگر شادو کے ساتھ اسپتال کے ایک کمرے میں قید رہنے سے زیادہ ضروری اور اہم کام تھے جو مجھے

بلا رہے تھے۔ میں نے دوبارہ کمرے میں جا کے دیکھا تو شادو سو رہی تھی۔ ڈاکٹر انجم نے مجھے بتایا کہ اس کی حالت خطرے سے باہر ہے اور دو چار دن میں وہ چلنے پھرنے کے قابل بھی ہوجائے گی۔

میں نے اپنے حلیے اور لباس کو دیکھا تو مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں انہی کپڑوں میں تھا جو وہی اور مسالے کی بو سے سڑ رہے تھے اور شاید اپنے حلیے سے میں وحشت کا مارا لگتا تھا۔ مجھے فوری طور پر غسل کی اور نئے لباس کی ضرورت تھی مگر میرے کپڑے اس گھر میں تھے جہاں اب کوئی نہیں تھا۔ نیلم کے گھر میں رہتے ہوئے میں نے نہ جانے کس کے کپڑے استعمال کیے تھے اور اس وقت بھی وہی میرے بدن پر تھے۔ میں نے بہت سوچ کے یہ فیصلہ کیا کہ میں گھر سے ضرورت کی کچھ چیزیں لے آؤں۔ ابھی میرا وہاں جا کے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کم سے کم ایک ہفتے تک مجھے شادو کی تیمارداری میں ڈاکٹر نوید کے کلینک سے باہر نہیں جانا تھا۔ ابھی شادو بھی لوٹ کے اپنے گھر نہیں جاسکتی تھی۔ اس کے بعد کے لیے یہی کہا جاسکتا تھا کہ جہاں قسمت لے جائے۔

وہ جگہ اُجاڑ اور ویران پڑی تھی جہاں بڑے ارمانوں سے اور بڑی تیاری کے ساتھ ڈاکٹر زرا انجم نے "ہیر کلینک" کا بورڈ لگایا تھا اور اس کا شاندار افتتاح فرمایا تھا۔ دکھ کی ایک لہر میرے وجود کو کاٹتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے جوان کے لیے کیا' بڑی محبت اور نیک نیتی کے ساتھ کیا تھا مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دنیا امید پر قائم "ہیر کلینک" ایک دن پھر آباد ہوگا۔ آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک۔

زینے کے دروازے پر میری خریدی ہوئی چھوٹی سی کار بھی افسردہ و سوگوار نظر آئی تھی۔ جب میں اور ڈاکٹر زرا انجم اسے خرید کے لائے تھے تو ہم کتنے خوش تھے۔ ہم ماسی ہیر کو سرپرائز دینا چاہتے تھے اور ڈاکٹر زرا انجم اس کی خوشی کے تصور سے ہی EXCITED تھا۔ اے بس آرزو کہ خاک شدہ۔ اس سے بڑا سرپرائز ہمیں بڑے ملک نے دیا۔ خوشی کا خواب یکلخت ایک پُردہشت حقیقت میں ڈھل گیا۔

اوپر جانے والے زینے کا دروازہ مقفل تھا اور میرے پاس اس کی چابی بھی نہیں تھی۔ مجھے ایک قفل ساز کو لا کے تالا کھلوانا پڑا۔ اوپر ہر چیز پر اداسی کی گرد جمی ہوئی تھی۔ نیا رنگین ٹی وی چپ تھا۔ پردے قالین' اس گھر کے درودیوار سب سناٹے میں تھے۔ خاموشی ایک سوال بن کے گونجتی تھی کہ یہ سب کیا ہوا اور کیسے ہوگیا مگر میرا دل پوچھتا تھا کہ کیوں ہوگیا۔ اچھی طرح نہانے اور جوتے کپڑے بدلنے کے جلدی جلدی میں نے ایک سوٹ کیس میں اضافی کپڑے ڈالے اور ضروری کاغذات اس کی پاکٹ میں پہلے سے موجود تھے..... ٹی وی کے اوپر کار کی چابی بہت نمایاں جگہ رکھی گئی تھی تاکہ مجھے تلاش نہ کرنی پڑے۔ اسی سوٹ کیس میں کپڑوں کے نیچے میں نے ریوالور بھی چھپادیا جو میں نے ڈاکٹر مشہود کے گھر سے چرایا تھا۔

ڈاکٹر مشہود کے گھر کی یاد ہمیشہ میرے دل کو بیک وقت رنج اور مسرت عطا کرتی تھی۔ وہاں میں نے جو وقت گزارا تھا اس میں ہر آرام اور آسائش تھی اور جتنی محبت مجھے اس گھر سے ملی تھی' اس نے مجھ میں وہ اعتماد پیدا کیا تھا جو آج میرے کام آرہا تھا۔ اس گھر سے جدا ہونے کے رنج میں تھوڑا سا احساس ندامت وملامت بھی شامل تھا۔ بیگم صاحبہ کے خیال سے آج بھی میرے دل میں بڑی لطیف راحت آفریں اور خواب آور گدگدی سی ہوتی تھی اور ایک مخصوص کیفیت کی خوشبو اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ میرے اعصاب پر چھانے لگتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی میری نظریں جھک جاتی تھیں۔ ڈاکٹر مشہود مجھ پر کتنا اعتماد کرتے تھے اور آج بھی میری خیرخواہی میں کم نہ تھے حالانکہ میں نے انہیں ہمیشہ مایوس کیا تھا۔

میری کار پر بھی مٹی کی تہ بچھ گئی تھی۔ میں نے اسے ایک کپڑے سے جھاڑ کے صاف کیا اور چابی لگا کے اسٹارٹ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس کی بیٹری ڈیڈ تھی۔ دو مزدور ٹائپ افراد نے اسے دھکا لگایا تو ہلکی پھلکی سوزوکی ایف ایکس ووڈی اور اس کا انجن فرّاٹے کے اسٹارٹ ہوگیا۔

اس وقت میں نے اپنے وجود میں نئی توانائی کو کار کی رفتار کے ساتھ بڑھتا محسوس کیا۔ کار میں بیٹھنے کے بعد میں بے دست وپا نہیں رہا تھا۔ میں زیادہ محفوظ بھی ہوگیا تھا اور باوسیلہ بھی اور بااعتبار بھی۔ پیدل چلنے والے ناصر عظیم کے مقابلے میں کار سوار ناصر عظیم کی پہنچ میں ہر جگہ تھی اور سارے فاصلے سمٹ کے غیر اہم ہوگئے تھے۔

میں نے اس کے شیشوں پر کالے اسٹیکر کی شیٹ لگوائی جس سے شیشے سیاہ نظر آنے لگے۔ اب میں باہر کی دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔ میں خود باہر والوں کی نگاہوں سے محفوظ تھا۔ بینک سے کچھ رقم نکلوانے کے بعد میں نے سید حاجی بشیر چوہدری کی طرف رخ کیا۔ وہ تھانے دار تھا اور ہر تھانے دار کی طرح تھانے میں موجود نہیں تھا۔ تاہم مجھے ڈیوٹی افسر نے وہ جواب نہیں دیا جو پبلک کو دیا جاتا ہے کہ صاحب گشت پر ہے۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے وائرلیس پر بات کی اور پھر میری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بشیر چوہدری سے بات کرادی۔

"اوئے کدھر ہے تو۔ میں نے سارے شہر میں بندے لگا رکھے ہیں تیرے پیچھے" وہ بولا۔

میں نے کہا "ایسا کیا جرم کیا ہے میں نے چوہدری صاحب۔ آپ بتائیں میں کہاں حاضر ہو جاؤں گھر آجاؤں؟"

"گھر۔ نہیں۔ تو وہیں ٹھہر۔ میں آتا ہوں" وہ بولا۔

اس کی ہدایت پر میرے لیے ایس ایچ او صاحب کا کمرا کھول دیا گیا۔ اے سی چلا دیا گیا اور ایک کانسٹیبل نے مجھ سے کچھ ٹھنڈا گرم لانے کا بھی پوچھا مگر میں نے ایک شانِ بے نیازی سے انکار کر دیا کہ چوہدری صاحب آجائیں' پھر وہ خود منگا لیں گے جو منگوانا ہوگا۔

بشیر چوہدری خاصی پریشانی کے عالم میں نمودار ہوا۔ اس نے کیپ اتار کے میز پر پھینکی اور کرسی پر گر کے جوتے اتارنے لگا "اچھا کیا تو آگیا۔"

میں نے کہا "میں آپ سے ملنے کے لیے نہیں' ایک رپورٹ لکھوانے آیا ہوں۔"

"کیسی رپورٹ؟ کس کے خلاف؟"

"آپ لکھ سکتے ہو مگر ہمت کی بات ہے چوہدری صاحب۔"

اس نے پاؤں میز پر پھیلا دیے "اب تو کہے کہ چیف سیکریٹری کے خلاف رپورٹ لکھو' اختیارات کے ناجائز استعمال کی یا ڈی آئی جی صاحب کے خلاف رشوت لینے کی۔ تو میں اتنا پاگل نہیں ہوا ابھی۔"

"میں قتل کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہوں۔ ایک بااثر سیاسی شخصیت کے خلاف۔"

"او چل رہنے دے میاں۔ نوکری کا کونڈا مت کر۔ ویسے ہی بہت پریشان ہوں میں" وہ بولا۔

"میں بھی پریشانی میں آیا ہوں آپ کی مدد مانگنے۔"

"کھانا کھالیا ہے تو نے۔ نہیں کھایا ہوگا۔" اس نے گھنٹی بجا کے کسی کو بلایا اور کھانا لانے کا حکم صادر کیا۔

میں نے کہا "چوہدری صاحب۔ مجھے معلوم ہے آپ کی پریشانی کا سبب۔"

وہ چونکا "کیا معلوم ہے تجھے؟"

میں نے کہا "آپ اپنے بہنوئی وسیم کے لیے پریشان ہوں گے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اللہ بخشے ابا جی کو۔ زندگی میں ایک ہی غلطی کی تھی انہوں نے جو مجھے بھگتنی پڑ رہی ہے۔ اس سے بہن کا رشتہ کر دیا تھا۔"

میں نے کہا "گالی مت دیں چوہدری صاحب۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔"

میری بات کا اثر آہستہ آہستہ ہوا۔ وہ دراز میں سے کچھ نکالنے کے لیے جھکا تھا کہ سیدھا ہو گیا "کیا۔ کیا کہا تو نے۔؟"

"اسی قتل کی ایف آئی آر درج کرانے آیا تھا میں۔"

"وسیم کو قتل کر دیا ہے کسی نے؟ کس نے۔؟"

میں نے کہا "ہاں۔ بڑے اور چھوٹے ملک سے واقف ہیں آپ۔ وسیم نے بڑے ملک کا کچھ نقصان کیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مگر اس میں وسیم کی کیا غلطی تھی۔ اسے کسی نے بتایا نہیں تھا کہ وہ مال کس کی سپرداری میں دینا ہے" اس نے پولیس والوں کی مخصوص اصطلاح استعمال کی۔

"غلطی بہرحال غلطی ہے۔ بڑے ملک نے اس جرم میں اسے پھانسی دے دی۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ بری خبر مجھے سنانے کے لیے آنا پڑا۔"

اس کی نظریں مجھ پر جم... کر رہ گئی تھیں "پوری بات بتا۔ تو نے دیکھا ہے یا سنا ہے کسی سے؟"

میں نے اسے پوری بات بتا دی۔ اس کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ میں نے اسے وہ سب بتا دیا جو میرے' نیلم کے اور شادو کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بے حرکت بیٹھا سنتا رہا۔

آفس والے کمرے کے پیچھے ایس ایچ او کا نجی کمرا تھا جس میں ایک بیڈ بھی لگا ہوا تھا۔ اردلی نے اس کمرے میں کھانا لگا کے اسے بتایا تو اس نے سر ہلا دیا۔ اردلی نے دوسری بار کہا تو وہ گرم ہو گیا۔ "دفع ہو جا ادھر سے۔ سن لیا ہے میں نے۔"

میں نے کہا "اب آپ ہی بتائیں' میں کیا کروں؟"

"اوئے تو کیا کرے گا جب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے اور خلا میں دیکھتے ہوئے بولا "اور پھر وہ کون سا معصوم بے گناہ تھا۔ اس کے اعمال نے مروا دیا اسے۔ ساری زندگی ایسی ہی چھوٹی موٹی ہیرا پھیری کرتا رہا۔ بندہ کرے بدمعاشی تو بڑی کرے۔ ایویں ایمان اور عاقبت خراب کی۔ دنیا میں بھی کچھ نہیں ملا' یہ کب کی بات ہے؟"

"کل کی۔ کل دوپہر کی۔"

"تو نے بہت دیر سے بتایا مجھے" وہ بولا۔

"رات بھر شادو کی حالت خراب رہی۔ صبح ڈاکٹر نے کہا۔ کہ اب خطرے کی بات نہیں رہی پھر میں بس یہ کپڑے بدلنے گیا اور ادھر آگیا۔"

اس نے دکھ سے سر ہلایا "اب تک تو لاش بھی غائب

کر دی ہوگی انہوں نے۔ بڑی مصیبت ہو گئی میرے لیے یار۔ بڑی مشکل سے وہ لیٹ کے گھر آیا تھا۔ بیوی بچے خوش بھی نہیں ہوئے تھے کہ قتل ہو گیا۔" اس نے عادتاً پھر اسے گالی دی جیسے قتل ہونے کے لیے وہ خود اپنی مرضی سے گیا تھا۔

"اب آپ کیا کریں گے؟"

"اب کیا ہو سکتا ہے میاں۔ بندہ تو واپس آ نہیں سکتا۔ جب تک زندہ تھا ہمارے لیے مشکل تھی۔ اب مر گیا تو اس کے لیے خود کو زیادہ مشکل میں ڈالنے کا کیا فائدہ۔ ہم نے بھی اسے کہیں گاڑنا ہی تھا۔ انہوں نے بھی گاڑ دیا ہوگا۔ ہم کون سا مزار شریف بنوا کے سال کے سال عرس اور قوالی کراتے۔ اللہ مغفرت کرے اس کی۔ یہ اللہ کی مرضی۔"

"اپنی بہن کو کیا بتائیں گے آپ؟"

"کچھ نہیں۔ تو نہ بتا تو مجھے کیا معلوم ہوتا۔ فرض کر لے کہ تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں کیسے جا کے کہوں کہ تیرے خاوند کو ایک بہت طاقتور بندے نے اپنے گھر بلا کے ٹانگ دیا ہے اور دفنا دیا ہے کہیں۔ وہ پاگل سمجھتی ہے کہ تھانے دار سے زیادہ طاقتور کون ہو سکتا ہے۔ دہائی مچائے گی کہ اسے پکڑو' پھانسی پر چڑھا دو۔ مجھے اس کی قبر پر لے چلو۔ اس سے اچھا ہے وہ انتظار کرتی رہے۔ وہ پہلے بھی چلا گیا تھا۔ ایک بار خود آگیا جب اس کنجری نے ٹھڈا مار کے نکال دیا۔ دوسری بار تو پکڑ لایا' اب کے ہمیشہ کے لیے گیا۔ خود ہی پتا چل جائے گا بالآخر اسے۔ مایوس ہو جائے گی تو صبر کر لے گی رو دھو کے۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے بھی صبر کر لیا ہے؟"

وہ بگڑ کے بولا "اوئے پاگل دے پتر۔ صبر نہ کروں تو اور کیا کروں۔ چھاپا ماروں اور اسے ہتھکڑی لگا کے لے آؤں؟ کسی ثبوت کے بغیر۔ تیری گواہی کو پوچھتا کون ہے اور گواہی دے گا تو تیرے اپنے قتل کے گواہ نہیں ملیں گے۔ چل کھانا کھائیں۔"

میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ "آپ کچھ بھی نہیں کریں گے؟"

اس نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا "پھر وہی بے وقوفوں والا سوال۔ اوئے ایک معمولی تھانے دار کیا کر سکتا ہے آخر؟ میں نے تیری بات مان لی۔ اب اگر میں نے کچھ کرنا ہوگا تو تجھے کیوں بتاؤں گا اور تو بھی بس ڈرٹوٹ جا۔ چپ کر کے بیٹھا رہ۔ جو کرنا ہے ایسے کر کہ پکڑ کوئی نہ سکے۔ آئی بات سمجھ میں۔ ان کے پاس بدمعاشی اور سیاسی اثر رسوخ کی طاقت ہے مگر اس سے بڑی ایک طاقت ہوتی ہے یہاں" اس نے اپنی کھوپڑی پر انگلی ماری۔

ہم خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ پہلے مجھے کچھ مایوسی ہوئی تھی لیکن بشیر چوہدری نے بعد میں جو کہا وہ قابلِ غور تھا۔ میں نے کچھ کرنا ہوگا تو تجھے کیوں بتاؤں گا۔ اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا تھا کہ وہ کچھ کرے گا۔ کھلی جنگ لڑنا ممکن نہ ہو تو گوریلا وار کے ذریعے بھی مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی صلاح اس نے مجھے بھی دی تھی۔ اپنا کام کرو مگر کسی کے ہاتھ مت آؤ۔ عقل اور ذہانت سے طاقتور دشمن کو شکست دی جا سکتی ہے اور وہ تمہارے پاس ہے۔

میں چلنے لگا تو اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی "دیکھ پتر۔ دنیا میں سنبھل کے چل۔ بہت آگے جانا ہے تو نے، مجھے نظر آرہا ہے۔ مجھے بڑا دکھ ہوگا اگر تو وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا اوپر۔ اور ملنے کے لیے آتے رہنا۔ کوئی کام ہو تو بتانے سے مت شرمانا۔ کر سکتے ہوں گے تو ضرور کریں گے۔"

اس کا رویہ بہت حوصلہ افزا تھا۔ بظاہر وہ ایک روایتی قسم کا تھانے دار تھا مگر میں نے اس کی نجی زندگی میں جھانک کے دیکھا تھا تو وہ مجھے عام آدمی نظر آیا تھا جو بھائی بھی تھا' باپ بھی اور شوہر بھی۔

لوٹ کر نوید کلینک جاتے ہوئے مجھے رئیس کا خیال آیا۔ وہ گھبرا گیا تھا۔ میرے ساتھ اس کے رشتہ' خلوص کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا تھا چنانچہ ہمیشہ اس کو میرے ساتھ یوں قبول کیا جاتا تھا جیسے فصلِ بہار کے ساتھ کچھ لوگوں کو بہ امرِ مجبوری POLLEN کی الرجی کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس کی شخصیت خود بھی غیر اہم ہو کے پس منظر میں چلی جاتی تھی اور وہ خود کو میرا طفیلی محسوس کرنے لگتا تھا۔ ظاہر ہے یہ اسے پسند نہیں تھا۔ وہ اسی لیے اپنی چنڈال چوکڑی کی طرف چلا جاتا تھا کہ وہاں سب اسی جیسے تھے۔

میں نے گاڑی کو عقبی حصے میں انکسی کی طرف کھڑا کیا اور سوٹ کیس کو گیسٹ بیڈ میں رکھوانے کے لیے ملازم کے سپرد کر دیا۔ میں اسپتال پہنچا تو سب سے پہلے مجھے رخسانہ نظر آئی۔ وہ مجھے دیکھ کے حیران رہ گئی "تم تو پہچانے نہیں جاتے۔"

میں نے کہا "تم نہ پہچانو۔ پہچاننے والے پہچان جائیں گے۔ کیا خبر ہے شادو کی؟"

"پوچھ تو ایسے رہے ہو جیسے میرے جواب سے مطمئن ہو کے واپس چلے جاؤ گے" وہ بولی "تمہارے جانے کے بعد اس کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی۔"

"کیوں۔ کوئی پے چیدگی پیدا ہو گئی تھی؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں۔ بس نہ جانے کیوں وہ سمجھی کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ تم اس کے پاس ہو۔ پہلے ANESTHESIA کا اثر تھا پھر وہ SEDATION میں تھی۔ بڑی مشکل سے اسے یقین دلایا گیا کہ ایسا نہیں ہے۔ تم کسی کام سے گئے ہو اور واپس آؤ گے۔ وہ کہتی رہی کہ تم سب جھوٹ بول رہے ہو۔ ناصر یہاں نہیں آسکتا۔ اسے نفرت ہے میری صورت سے بھی۔ وہ HYSTERIC ہوگئی تھی۔"

میں شاود کے پاس پہنچا تو وہ سو رہی تھی۔ ایک نرس اس کے پاس کرسی پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ اس سے مجھے مزید تفصیلات حاصل ہوئیں۔ شاود نے جذباتی ہیجان کے دورے میں خون اور گلوکوز کی نلکیاں نکال دی تھیں اور اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ یہ صرف میرے خیال کا ردِعمل نہیں تھا۔ وہ سب جو اس کے لاشعور میں پھوڑے کی طرح پک رہا تھا ایک دم زہریلے مواد کی طرح پھوٹ کے باہر آگیا تھا۔

میں نے شاود کو ڈسٹرب نہیں کیا اور ڈاکٹر انجم کی تلاش میں باہر آگیا۔ وہ پانچ بجے سے او پی ڈی میں بیٹھتی تھی — ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ ان کے ساتھ اپائنٹمنٹ رکھنے والے میٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر انجم چائے پی رہی تھی۔ وہ خفا ہونے لگی "تم ذرا سی دیر کے لیے گئے تھے؟"

میں نے کہا "سوری۔ مجھے ایک ضروری کام میں دیر ہوگئی۔"

"جب تک وہ ٹھیک نہ ہوجائے تمہارے لیے کوئی اور کام زیادہ ضروری نہیں ہونا چاہیے۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ اس کے مینٹل ڈیپریشن کی کیا کیفیت ہے۔ ایک ساتھ کتنے سنگین مسائل کا سامنا ہے اسے۔ کوئی بھی عورت کتنے بھی مضبوط اعصاب کی مالک ہو' پاگل ہوجائے گی۔ اس کا شوہر مرگیا' پھر یہ انتہائی شرمناک واقعہ ہوا۔ گینگ ریپ کوئی معمولی بات ہے۔ خودکشی کرلیتی ہیں عورتیں اگر جانبر ہوجائیں۔ اس کا بچہ مرگیا۔۔۔ میں تو کہتی ہوں فولادی اعصاب کی مالک ہے یہ لڑکی۔ ایک کے بعد ایک جذباتی سانحہ پیش آیا اور وہ زندہ ہے لیکن ایسے وہ زندہ نہیں رہے گی۔ اسے ڈیپریشن مار ڈالے گا۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی مقصد' کوئی امید کوئی سہارا ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ یہ سب اس کو میں فراہم کروں گا۔ آج مجھ سے کوتاہی ہوئی۔"

"میں نے اندازہ کرلیا ہے۔ اس کو تم اور صرف تم زندگی کی طرف لاسکتے ہو۔ وہ موت کی طرف زیادہ کشش محسوس کرتی ہے۔ جو ان حالات میں ایک فطری خواہش کی بات ہے۔ اب ٹائم ہوگیا ہے میرے PATIENTS دیکھنے کا" اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

میں اپنے آپ سے شرمسار لوٹ کے شاود کے پاس آگیا۔ میں نے نرس کو رخصت کردیا "اب آپ کی ضرورت ہوگی تو میں بلالوں گا۔"

"آپ میڈم کو بھی بتادیں۔ میری ڈیوٹی انہوں نے لگائی تھی" اس نے باہر جاتے ہوئے کہا "مس نیلم آئی تھیں ابھی دو منٹ پہلے۔ آپ کو پوچھ رہی تھیں۔ یہ ٹی وی چھوڑ گئی ہیں اور یہ۔۔۔"

ایک کارنر میں چودہ انچ کا ٹی وی اور اس پر پلاسٹک میں لپٹا ہوا پھولوں کا گلدستہ (BOUQUET) رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک کارڈ "GET WELL SOON" کا تھا جس پر نیلم کا نام تھا۔ مجھے اس سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس ہوا۔ میں پندرہ بیس منٹ ڈاکٹر انجم کے کمرے میں رہا اور وہ اتنی دیر میں آکے چلی گئی۔ شاید وہ انتظار نہیں کرسکتی تھی۔

او پی ڈی کا ٹائم ختم ہونے کے بعد انجم پھر آئی اور اس نے ایک نظر چارٹ پر ڈال کے شاود کو دیکھا۔ "میرا خیال ہے کہ آج رات تمہیں بھی ضرور سونا چاہیے۔ کیا تم نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ تمہاری آنکھوں کے گرد نیند کی کمی سے اور تھکن سے حلقے پڑگئے ہیں۔"

"میں نے سونے کی بہت کوشش کی تھی۔"

"آج تم بغیر کوشش کے سوجاؤ گے۔ کھانا یہاں کھاؤ گے اکیلے یا ہمارے ساتھ" وہ بولی۔

میں نے کہا "یہاں شاود ہے۔"

"اسے فی الحال گلوکوز کافی ہے۔ اگر رات کو مانگے تو فریش جوس' دودھ سے شروع کریں گے پھر SEMI-LIQUID ڈائٹ۔ انشاء اللہ دو دن میں شی ول بی نارمل۔۔۔ لیکن تم یہاں رہو گے۔ وہ دوا علاج سے زیادہ تمہاری ضرورت کو محسوس کرتی ہے اور اس قسم کے کیس میں PSYCHOLOGICAL فیکٹر ہی اہم ہوتا ہے۔"

"میں اب یہاں سے ہلنے والا نہیں۔"

"GIVE HER CONFIDANCE" اور ایک چیز جو تمہیں پھر RESTORE کرنی ہوگی۔ زندہ رہنے کی خواہش اور WILL۔۔۔"

میں جوتے اتار کے کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھا رہا اور۔۔۔

ٹی وی دیکھتا رہا بلکہ ٹی وی کو دیکھتا رہا کیونکہ جو پروگرام چل رہا تھا وہ میں نے نہیں دیکھا۔ میری نظر بار بار شاود پر جاتی تھی اور میرے خیالات کا مرکز بار بار بدل جاتا تھا۔ میں ماضی کی پرچھائیوں اور مستقبل کے تصورات کے درمیان بھٹک رہا تھا۔

رات گیارہ بجے ڈاکٹر نوید' انجم اور رخسانہ ایک ساتھ آگئے۔ وہ راؤنڈ پر تھے۔ میرے پاس بیٹھ کے گپ شپ کرتے رہے۔ انہیں میرے اور شاود کے تعلق کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ شاود سے میری پہلی ملاقات کہاں اور کن حالات میں ہوئی تھی۔ یہ تعلق کس طرح چاہت میں بدلا تھا اور وقت کی ساری آزمائشوں کی حوصلہ شکنی اور مایوسیوں کی دل شکنی کے باوجود جذبات کی سطح پر آج بھی روزِ اوّل کی طرح قائم تھا۔ تو وہ بڑی حیرانی سے سنتے رہے۔ شاید یہ میرا اندازِ بیاں تھا یا ایک اور لو اسٹوری کا حقیقی CHARM جو افسانے سے زیادہ دلچسپ تھا لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا' یہ ان کی سازش تھی۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نوید کے گھر کا ملازم چائے لے آیا۔ جو ہم سب نے پی۔ چائے پی کے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس پُر لطف محفل میں سب ہنستے ہنساتے رہے تھے۔ اس سے میرے اعصاب کی کشیدگی کافی حد تک کم ہوگئی تھی۔ ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد میرے جسم پر تھکن سی غالب آنے لگی۔ شاود گہری پُرسکون نیند میں تھی۔ میں دوسرے بیڈ پر دراز ہوگیا اور ٹی وی آن کردیا۔ اس کی آواز بہت کم تھی۔ چند منٹ کے بعد میں نے غنودگی محسوس کی اور میں سوگیا۔ ٹی وی اسی طرح آن رہا۔ ڈاکٹر نوید اور انجم نے چائے میں مجھے خواب آور گولی دے دی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ آج رات بھی میرے لیے سکون سے سونا مشکل ہوگا اور انہوں نے مجھے گولی دینے کی کوشش کی تو میں کھانے سے انکار کردوں گا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ ٹی وی بند تھا اور شاید رات کے وقت چکر لگانے والی کسی نرس نے آف کیا ہوگا۔ کمرے میں صرف نائٹ بلب روشن تھا۔ کمرے کی کھڑکی بھی بند تھی اور اے سی چل رہا تھا۔ شیشوں پر صبح کا اجالا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس پر گہرے رنگ کا پردہ پھیلا دیا گیا تھا۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو آٹھ بجے تھے۔ میں آٹھ گھنٹے تک بے خبری کی نیند پوری کرکے اٹھا تھا۔ میں نے اے سی بند کیا کیونکہ کمرے میں خاصی خنکی ہورہی تھی۔ پردہ ہٹا کے کھڑکی کھولی اور صبح کی تازہ ہوا کو روشنی کے ساتھ اندر آنے کا راستہ فراہم کیا۔

جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو شاود مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کے کہا "ہیلو۔ گڈ مارننگ۔ تم کب سے جاگ رہی ہو؟"

"زیادہ دیر نہیں ہوئی" وہ بولی "تم سو رہے تھے؟"

میں نے خفت سے کہا "ہاں۔ پتا نہیں اتنی گہری نیند اچانک کیسے آگئی۔ ضرور انہوں نے چائے میں کچھ دیا ہوگا۔"

"کس نے۔۔۔ کیا دیا ہوگا؟"

"کوئی خواب آور گولی ہوگی۔ ڈاکٹر نوید' انجم اور رخسانہ۔ سب ایک ساتھ اسی لیے آئے تھے۔ گپ شپ بہانہ تھی تاکہ مجھے شک نہ ہو۔" میں اس کے پاس بیڈ کے ایک کنارے پر ٹک گیا "تم بتاؤ۔"

"میں۔۔۔ کیا بتاؤں؟"

"کل اتنا ہنگامہ کیوں کیا تھا؟" میں نے کہا "اب دیکھ لو مجھے ہاتھ لگا کے۔ چھو کے' میں خواب نہیں حقیقت ہوں۔ تمہارے پاس ہوں۔"

اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ مجھے حیرانی سے دیکھتی رہی "ایسا کہا تھا میں نے؟ تم کہاں چلے گئے تھے آخر؟"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "اب نہیں جاؤں گا۔ جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔"

"کہاں؟" وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔

"کہیں بھی۔ جہاں تم کہو گی' جہاں تم چاہو گی۔"

"میں لوٹ کے وہاں جانا نہیں چاہتی۔۔۔ اپنے گھر" وہ بولی۔

"میں اپنے گھر لے جاؤں گا تمہیں" میں نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو گی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "اور پھر میں وہیں رہوں گی۔ وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں۔۔۔ جب تک موت ہمیں جدا نہ کردے۔"

محاورے کو الٹ کے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھ پر خوشی کا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا۔ جذبات کا ایک بلاخیز ریلا آیا جو مجھے بہا کے لے گیا۔ میں نے اسے بار بار چوما اور اس سے بار بار پوچھا "تم سچ کہہ رہی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا' میں پاگل ہوجاؤں گا۔"

وہ مسکرائی "پاگل تو تم ہو۔"

"مجھے پاگل کرنے والا کون ہے؟" میں نے کہا "سچ بتاؤ تم پھر وہی کھیل تو نہیں کھیل رہی ہو میرے ساتھ۔"

بات جب ہونٹوں سے نکلی تو مجھے احساس ہوا کہ یہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جملہ سچ کی ساری کڑواہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ میں اس کا دل دُکھانا نہیں چاہتا تھا لیکن جو بات میرے دل میں تھی وہ بے اختیار زبان پر آگئی۔

ایک لمحے کے لیے شادو کا رنگ اڑ گیا "پرانی باتوں کو یاد کر کے خود دکھی ہونے اور مجھے دکھی کرنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "مجھے معاف کردو پلیز۔ تصور میرا نہیں' جذبات کا ہے جن پر میرا کنٹرول نہیں۔ تم نے اچانک ایسی بات کہہ دی ہے کہ مجھے یقین نہیں آتا۔ ایک خوف بیٹھا ہوا ہے میرے دل میں کہ کہیں تمہیں پا کے پھر نہ کھودوں میں۔"

"نہیں۔۔۔ اس بار وہی ہوگا جو میں نے پہلے کہا۔ صرف موت ہمیں جدا کرپائے گی۔ جو پہلے ہوا۔۔۔ اب بھول جاؤ۔ تمہاری خاطر میں مان لیتی ہوں۔۔۔ کہ وہ میری غلطی تھی۔ کیونکہ بہت سی باتیں ہیں جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ کچھ سچائیاں ایسی ہی ہوتی ہیں کہ جھوٹ لگتی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اُس وقت کا کبھی کوئی حوالہ نہیں دوں گا جو گزر گیا۔ اب یہ بتاؤ کہ ہماری شادی کیسے ہوگی؟"

وہ مسکرانے لگی "بھئی جیسے سب کی ہوتی ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ دھوم دھام سے' سادگی سے؟"

اس نے کہا "دھوم دھام تو دنیا کے سامنے دکھاوا ہوتی ہے۔ ساری بات تو اس خوشی کی ہے جو رفاقت سے ملتی ہے۔ وہ بیسہ خرچ کر کے اور بینڈ باجے بجا کے یا پلاؤ زردے کھلا کے خریدی نہیں جاسکتی۔"

میں نے خود کو یہ کہنے سے روک لیا کہ جیسے ہاشمی صاحب نہیں خرید سکے تھے۔ ان کی شادی بڑی دھوم دھام سے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ہوئی تھی اور دعوتِ ولیمہ میں شہر کے سارے معززین شریک تھے۔ ہنی مون انہوں نے لندن میں منایا تھا مگر ان کی خوشی میری خوشی کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

"چلو ٹھیک ہے۔ ہم کسی کو بھی نہیں بلائیں گے شادی میں۔ بس ہم دونوں ہوں گے اور ہاں' ایک قاضی۔"

"وکیل اور گواہ ہوں گے۔"

میں نے سر کھجایا "دراصل تجربہ نہیں ہے شادی کا اور اپنا یار رئیس تو ضرور ہوگا۔"

"ماسی ہیر بھی ہوگی۔ ڈاکٹر رانجھا ہوگا' کہاں ہیں وہ آج کل؟"

میں نے کہا "پتا نہیں۔ آج کل وہ ناراض ہیں مجھ سے۔ روٹھ کے کہیں چلے گئے ہیں میری حرکتوں کی وجہ سے مگر جاکہاں سکتے ہیں' کل ہی فون آیا تھا ان کا نیلم کے پاس۔"

"مجھے پوچھ رہے ہوں گے؟"

میں نے ایک بے ضرر جھوٹ میں حرج نہ سمجھا "ہاں۔ ہوسکتا ہے آکے دیکھ جائیں تمہیں کسی بہانے سے۔ ان کی شرکت کے بغیر یہ شادی نہیں ہوسکتی۔"

میں نے آخری جملہ بالکل ایسے بولا جیسے غلموں میں ولن بولتا ہے۔

"نیلم بھی ضرور ہوگی" شادو نے کہا۔

"ہاں اور یہ جو ڈاکٹر نوید ہیں۔ ان کی دونوں بیویاں' ڈاکٹر انجم اور رخسانہ۔ رخسانہ نرس ہے۔ اس سے اولاد کے لیے شادی کی تھی مگر اولاد نصیب میں نہ ہو تو ایک چھوڑ دس شادیاں کرلے آدمی' ہمارے کتنے بچے ہوں گے؟"

وہ شرما کے ہنسی "جتنے تم چاہو۔"

"صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر نوید بھی چاہتے ہوں گے کہ ان کے ایک درجن بچے ہوں" میں نے کہا۔

"صرف ایک درجن۔۔۔"

"کم ہیں تو بڑھالو۔ دو درجن کرلو۔ تین درجن ہوجائیں۔"

وہ ہنسنے لگی "اتنے تو نام بھی نہیں ملیں گے۔"

میں نے کہا "ٹیلی فون ڈائریکٹری آخر کس دن کام آئے گی۔"

"اچھا یہ بتاؤ' پہلا لڑکا ہونا چاہیے یا لڑکی؟"

"لڑکی۔ تم جیسی۔۔۔ بیس سال بعد ایک اور شادو ہو دنیا کے سامنے۔"

"او کے سر۔۔۔ جیسی آپ کی مرضی۔"

اس کی باتوں نے مجھے کچھ حیران کیا۔ وہ اپنی اور میری شادی کی بات میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کررہی تھی۔ اس کا اقرار ہی میرے لیے بہت تھا۔ باقی باتوں کا یہ موقع نہیں تھا اور عام طور پر لڑکیاں ایسے معاملات میں خود بڑھ چڑھ کے نہیں بولتیں۔ اس کا ایک بچہ ابھی ضائع ہوا تھا جس کے جذباتی صدمے نے اسے بے حال کردیا تھا اور صرف چوبیس گھنٹے بعد وہ مجھ سے تین درجن بچوں کی اور ان کے ناموں کی بات ہنس ہنس کے کررہی تھی۔

میں نے موضوع بدل دینا مناسب سمجھا "یہ بتاؤ کہ کیا کھاؤ گی۔۔۔ ویسے ابھی تمہیں صرف پینے کی اجازت ہے۔"

دوپہر تک اس کی طبیعت اتنی بحال ہوچکی تھی کہ وہ تکیوں کے سہارے پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر انجم نے اسے سوپ یا دودھ کے ساتھ ڈبل روٹی کھانے کی اجازت دے دی اور یہ بھی کہا کہ شام کو وہ سب کچھ کھا سکے گی۔

میں نے اسے بتایا کہ میں نے نیا مکان کہاں خریدا تھا اور کس کے لیے خریدا تھا "ہیر کلینک" ڈاکٹر رانجھا کا خواب تھا مگر جب اس کے پورا ہونے کا وقت آیا تو ان کی بدقسمتی آڑے آگئی۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہی۔ یہ صرف میری زندگی کی کہانی تھی۔ اس وقت کا ماجرا تھا جو میں نے شادو سے دور رہ کے گزارا۔ اتنا ہی وقت اس نے بھی گزارا تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا مگر اپنے وعدے کے مطابق میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ ہاشمی صاحب سے شادی کا فیصلہ اس نے کیوں کیا تھا۔ شادی کے بعد اس کے روز و شب کیسے گزرے؟ کیا وہ واقعی خوش تھی؟ لندن میں اس کا ہنی مون کیسا تھا اور اس کے فوراً بعد ہاشمی صاحب کی موت پر اس کے جذبات کیا تھے؟

خود شادو نے ہمارے درمیان حائل اس اجنبی وقت کو یوں نظرانداز کیا جیسے اس کا وجود ہی نہیں تھا حالانکہ وہ اس کی زندگی میں شامل تھا۔ اس وقت کا ذکر نہ کرنے کے لیے اس نے بڑی شعوری کوشش سے کام لیا ہوگا۔ یہ ایک مشکل کوشش تھی' یہ اداکاری تھی۔ چوبیس گھنٹے میں کوئی اپنے ذہن سے خیالات اور جذبات کو ایک دم کیسے بدل سکتا ہے۔ شاید وہ میرے ساتھ ہونے والے ظلم اور زیادتی کی تلافی کی کوشش تھی۔

اس نے مجھے جتنے دکھ دیے تھے' اب مجھے اتنی ہی خوشی فوراً دینا چاہتی تھی۔ یہ بڑی غیر فطری سی بات تھی۔ وہ وقت اتنا پرانا اور دور کے ماضی کا حصہ نہیں تھا کہ اس کی خلش کا احساس بھی باقی نہ ہو۔ زخم اپنے ہاتھوں سے آئے ہوں تب بھی مندمل ہونے میں اتنا ہی وقت لگتا ہے لیکن یہ سب کچھ میں شادو سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ میری خوشی کے لیے اپنے غم پر یہ پردہ کیوں ڈال رہی ہے۔

"تو جناب نے گاڑی بھی خرید لی ہے؟" اس نے شام کے وقت کہا "بڑے دولت مند ہوگئے ہو۔"

"مذاق اڑا رہی ہو میرا" میں نے کہا۔

وہ یقیناً سمجھ گئی ہوگی کہ اس سوال کا مطلب کیا ہے۔ اس کی دولت مندی کے مقابلے میں آج بھی میری کوئی ایسی حیثیت نہیں تھی کہ وہ مجھے دولت مند کہتے لیکن اس نے انجان بن کے کہا "شاید تم کہنا چاہتے تھے کہ تمہاری شاندار کاروں کے مقابلے میں یہ پرانی معمولی سی گاڑی کیا ہے۔"

میں نے کہا "حقیقت تو یہی ہے۔"

"مگر اب جو میرا ہے وہ تمہارا ہے اور جو تمہارا ہے وہ میرا ہے" وہ بولی۔

میں نے کہا "میں مانتا ہوں مگر جو تمہارا نہیں ہے' وہ میرا نہیں ہوگا۔"

وہ بولی "تم ہاشمی صاحب کی بات کررہے ہو نا۔۔۔ جو کچھ انہوں نے میرے لیے چھوڑا وہ کس کا ہے پھر" میں نے ان سے کچھ مانگا تھا' نہ انہوں نے مجھے کچھ تحفے میں دیا تھا۔ ان کی موت ایک سانحہ تھی۔ قدرت کا ایک فیصلہ جس پر کسی کا اختیار نہیں تھا۔ جس میں کسی کی خواہش یا کوشش کو دخل نہیں تھا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ میں نے کب کہا۔۔۔؟"

"قدرت کے اس فیصلے کے نتیجے میں خود بخود مجھے وہ سب مل گیا جو اب میرے پاس ہے ورنہ انہی کا رہتا۔ وہ زندہ رہتے تو بہت کچھ نہ ہوتا جو بعد میں ہوا۔ مثلاً میں تم سے پھر کبھی نہ ملتی۔ میں ان کے بچوں کی ماں بنتی لیکن خدا کی کچھ اور مرضی تھی۔ تقدیر کے کچھ فیصلے بڑے عجیب ہوتے ہیں اور سمجھ میں نہیں آتے مگر ان کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ تم سے ملنا تو بعد میں ہوا اور وہ بھی ایک اتفاق تھا۔ اس سے پہلے میں کیا کرتی؟ کیا میں اس لیگل فرم کی ملکیت قبول کرنے سے انکار کردیتی؟ ان کی دولت جائداد۔ سب قانونی طور پر میرا ہوگیا تو میں کیسے کہتی اور کس سے کہتی کہ مجھے یہ سب نہیں چاہیے۔ ہاشمی صاحب دنیا میں نہیں رہے تو سب کچھ میرا ہوگیا اور میرا ہی رہے گا۔ ایسا ہی ہوتا ہے دنیا میں۔"

میں اسے دیکھتا رہا۔ معلوم نہیں کیوں وہ اتنی شدومد سے دلائل دے کر مجھے قائل کررہی تھی۔ ابھی یہ سب بہت قبل از وقت تھا۔ میں خاموش رہا کیونکہ میں اس کی کسی بات کو غلط نہیں کہہ سکتا تھا اور جھٹلا نہیں سکتا تھا۔

اگلے دن شادو کی حالت میں مزید بہتری آئی۔ اس دن سب سے پہلے رئیس آیا۔ وہ شادو کو صوفے پر بیٹھا دیکھ کے خوش ہوا۔

"آپا جی۔ قسم اللہ کی دل خوش ہوگیا اس وقت آپ کو دیکھ کے۔ اپن کو پرانا وقت نہیں بھولتا" وہ بولا۔

شادو نے اسے اپنے ساتھ بٹھالیا "تم میرے سب سے اچھے دوست تھے۔ سب سے زیادہ بھروسے کے قابل۔"

"کیا آج نہیں ہوں آپا جی!"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آج تو مجھے تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔"

"ہم تو حاضر ہیں جی جان سے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ اللہ میاں بھی مہربان ہیں۔ سب بچھڑے ہوئے ملا دیے ہیں ورنہ جی کون سوچ سکتا تھا کہ۔۔۔ خیر' جو وقت گزر گیا اس کو کیا فائدہ یاد کرنے سے۔ آگے کی چیز مانگتے ہیں ہم تو۔۔۔ ہمارا یار نا صر ہو' ہم ہوں۔۔۔ آپ ہو۔۔۔" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"ایسا ہی ہوگا رئیس۔ ایک خوش خبری ہے تمہارے لیے' بتاؤں میں سناؤں یا اپنے دوست سے سنو گے؟"

رئیس نے اسے غور سے دیکھا پھر میری صورت کو دیکھا اور سر کھجانے لگا۔ "اپنے لیے تو اچھی خبر بس اچھی خبر ہے۔ کسی کے منہ سے بھی سنیں۔ دونوں منہ اچھے ہیں۔"

شاد و ہنسنے لگی "ہم شادی کر رہے ہیں' میں اور نا صر"

رئیس کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع انکشاف تھا۔ وہ اتنا حیران ہوا کہ پتھر کے بُت کی طرح پلکیں جھپکانا تک بھول گیا۔ اس کے چہرے پر پھوٹنے والی حقیقی مسرت کی روشنی ماند پڑ گئی۔ اس کی مسکراہٹ کا سچائی رکھنے والا اُجالا غائب ہو گیا۔ یہ بالکل فطری ردِ عمل تھا۔ جسے شاد و نے خوش خبری قرار دیا وہ اس کے لیے خوش ہونے والی خبر نہیں تھی۔

مگر چند سیکنڈ میں اس نے اپنے دلی جذبات پر قابو پا لیا اور اس کی صورت پر ایک ریاکار مسرت کا نور پھیل گیا اور اس کی مسکراہٹ میں مصنوعی خوشی شامل ہو گئی۔ اس جذباتی تغیر کو شاد و کی نگاہ نہ دیکھ سکی کیونکہ وہ مجھے دیکھ رہی تھی لیکن میں نے ایک لمحے میں بدل جانے والی اصلی اور نقلی خوشی کے فرق کو واضح طور پر نوٹ کر لیا۔

رئیس نے چلّا کے کہا "لے پیارے' مولا نے سن لی تیری۔ قسم اللہ کی آپا جی' اپنا یار پیدا ہی آپ کے لیے ہوا تھا۔ آپ پر مرمٹا اور آپ کے نام کی مالا جپتے مرجاتا سالا۔ محبتوں کا بھی ریکارڈ گراموفون سب توڑ دیا تھا اس نے۔ ہم تو جانتے تھے کہ اندر سے اس کا دل مر گیا ہے۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ کیا دل الگ مرتا ہے۔ آدمی الگ مرتا ہے۔"

"ایسا ہوتا ہے۔۔۔ پوچھ لو آپا جی سے۔۔۔ انہوں نے تو خود اپنے دل کو مار دیا تھا۔۔۔ چلو وہ کیا ہے۔۔۔ دل سے ملے دل نئی زندگی ملی۔"

میں نے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ ابھی تک میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ شاد و کو اتنی جلدی کیا تھی۔ رئیس کو اپنا فیصلہ سنانے کی۔ "رئیس' تو آخر ہے کہاں کل سے؟"

"پیارے' اپن بس اسی دنیا میں ہیں۔ اتنا کافی ہے۔ ہر حال میں خوش۔ ہر جگہ خوش' یاروں کی خوشی میں خوش۔ کل ذرا دل بوجھل تھا تو ایک سوٹا لگا لیا۔"

"چرس پی تو نے' مجھے بو آ رہی تھی۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "لگے دم تو مٹے غم۔ چنڈال چوکڑی کا یہی طریقہ ہے۔"

"تو چرسی ہو جائے گا۔ عادت پڑ گئی تو سب نشے کرنے لگے گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا "اب سب کرتے ہیں نشہ۔ کسی کو دولت کا نشہ ہے تو کسی کو طاقت کا۔ کسی کو حسن اور جوانی کا تو کسی کو محبت کا۔"

"بکواس مت کر فلسفی کی اولاد۔ ایک جھانپڑ مار کے سارا نشہ اتار دوں گا۔"

"اپن چلتے ہیں آپا جی۔ سوری' بھابی جی! مٹھائی کی جگہ جھانپڑ کھانے سے کیا فائدہ۔" وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

"یہ ذرا نہیں بدلا۔ ویسے ہی پاگل ہے" شاد و کے اندر سے پھوٹنے والی خوشی اس کی ہنسی میں کھنک رہی تھی۔

میں رئیس کے ساتھ باہر نہیں گیا حالانکہ کچھ دیر پہلے میرا خیال تھا کہ ہم باہر جا کے کہیں بیٹھیں گے اور کچھ دیر گپ شپ کریں گے۔ میرے ذہن میں بہت سی ایسی باتیں تھیں جو میں رئیس کے سوا کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ تھانے دار بشیر چوہدری نے اپنے بہنوئی کے قتل پر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ ملک برادران کے خلاف کچھ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے مگر اس نے مشتعل ہو کے انہیں گالیاں دینے اور اپنے ارادوں کا اعلان میرے سامنے کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں رئیس کو خود اپنے ارادوں سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اور اس کی رائے سننا چاہتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میں اپنی اور شاد و کی دائمی رفاقت کے فیصلے پر رئیس کو اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس بار فیصلہ کرنے والی شاد و تھی۔ میں نے اس سے نہ درخواست کی تھی اور نہ التجا۔ نہ میں اس کے سامنے رویا یا گڑگڑایا تھا اور نہ اس پر دھمکی سے دباؤ ڈالا تھا کہ اس نے انکار کیا تو میں راوی کے پل پر سے دریا میں کود جاؤں گا یا اس کے سامنے کنپٹی پر گولی مار لوں گا۔

رئیس کے ناپسندیدگی کے جذبات کا اندازہ ہوا تو میں نے اس کے ساتھ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے شاد و کے سامنے اپنے جذبات کو چھپا لیا تھا مگر اکیلے میں وہ ضرور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مجھے گالیاں دیتا اور برا بھلا کہتا کہ بالآخر میں نے ثابت کردیا کہ میں وہی نالی کا کیڑا ہوں جو گندگی میں ہی خوش رہتا ہے۔ شاید وہ اس سے بھی زیادہ برے الفاظ میں کہتا کہ تو نے گوبھکانے کا فیصلہ کرلیا تھا اور گوبھکا کے رہا۔ تیری ذہنیت وہی رہے گی خواہ تو سچ مچ کسی دن وزیراعظم بن جائے۔

میں اسے یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ عشق کا ذہنیت سے یا مرتبے سے کوئی تعلق نہ کبھی تھا اور نہ ہوگا۔ جذبات کے فیصلوں کو عقل کی کسوٹی پر کوئی نہیں پرکھ سکتا اور جو پرکھتا ہے وہ پاگل ہے۔ عشق تو خیر ہے ہی پاگل پن اور عاشقی میں جو پاگل نہ ہو اس کا عشق ایک تہمت۔

دوسرے سے کچھ پہلے نیلم آئی۔ وہ بہت فریش اور خوش و خرم لگ رہی تھی۔

میرے پوچھنے پر اس نے کہا "ملک برادران کو دن میں تارے دکھادیے میں نے۔"

میں نے کہا "کون سے تارے۔ فلمی ستاروں پر تو ان کی نظر دن رات رہتی ہے۔"

"مذاق کی بات نہیں۔ ہوش ٹھکانے آگئے ان کے۔"

میں نے کہا "ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ کون سی توپ چلادی ہے تم نے جس سے ان کی طاقت کے قلعے کی دیواریں ہل گئی ہیں۔"

"بھئی وہ مسلسل فون کررہے تھے مجھے۔ پہلے چھوٹے ملک نے کہا کہ وہ اپنی بے عزتی کو آسانی سے بھولنے والا نہیں۔ میں نے بات کو لمبا کرنے کے لیے اور اسے زیادہ بولنے پر اکسانے کے لیے کہا کہ آپ کے خیال میں عزت کی اجارہ داری صرف آپ کے خاندان تک اور آپ کی ذات تک محدود ہے۔ جو کچھ آپ نے شادو کے ساتھ کیا' اسے آپ کیا کہیں گے؟ آپ کی شان اور عزت میں بہت اضافہ ہوا اس سے۔ میری بات پر اس نے غصے میں کہا کہ آخر وہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔ ہم اس جیسی کو منہ لگانا بھی اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ جیسے تمہارے یار ناصر کو ہم نے کتوں کے آگے ڈال دیا تھا ایسے ہی شادو کے لیے بھی ہمارے کتے ہی کافی تھے۔"

شادو کے چہرے پر اذیت کے آثار دیکھ کے میں نے کہا "چھوڑو اس کی باتوں کو۔"

شادو نے مجھے ٹوک دیا "نہیں۔ ذرا تفصیل سے بتاؤ۔ سب بتاؤ تم نے کیا کہا اور اس نے کیا بکواس کی۔"

میں نے کہا "شادو۔ اب بیتی باتوں کو یاد کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔"

نیلم سمجھ گئی کہ ان تکلیف دہ واقعات کا ذکر کرنا اس کی غلطی تھی۔ اس نے کچھ خفت محسوس کی "بس اور کیا' وہ بھونکتا رہا اور میں نے سب ریکارڈ کرلیا۔"

شادو اڑ گئی "دیکھو' میں سننا چاہتی ہوں۔ ایک ایک لفظ بتاؤ مجھے جو تم نے ریکارڈ کیا۔"

نیلم نے جیسے میری طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا "ایک ایک لفظ۔ یہ تو بڑی لمبی بات ہوجائے گی۔ اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے جانا ہے۔"

"کتنا وقت لگ جائے گا اس میں؟ دس منٹ۔ بیس منٹ۔ آدھا گھنٹا اور آدھا گھنٹا دیر سے چلی جاؤ گی تو کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا" شادو نے خفگی سے کہا۔

نیلم مجبور ہوگئی "چھوٹے ملک نے کہا کہ اس حرام زادی کو بڑے بھائی صاحب نے نوکروں کے حوالے کردیا تھا۔ ایک مراثی ہے جو ہمارے کتوں کو نہلاتا ہے۔ ایک آدمی پاگل ہے جس کے ذمے ایک ہی کام ہے کہ سب کے جوتے پالش کرتا رہے اور صاف کرے۔ انہوں نے سب کے سامنے سارا غرور نکال دیا اس کا۔"

میرے لیے یہ تفصیلات صرف شرمناک ہی نہیں باعثِ اذیت تھیں "نیلم کیا یہ ضروری ہے؟"

شادو نے میری بات کاٹ دی "تم چپ رہو اور سننا نہیں چاہتے تو چلے جاؤ یہاں سے۔ میں جاننا چاہتی ہوں کہ اپنے جرم کا کس حد تک اعتراف کیا تھا انہوں نے۔"

میں خاموش ہوگیا اور نیلم نے بات جاری رکھی۔ "میں نے کہا کہ چھوٹے ملک صاحب' اگر اس نے کیس کروایا آپ پر تو خاک میں مل جائے گا آپ کی عزت کا یہ سارا غرور۔ وہ ہنسنے لگا کہ پاگل ہو تم۔ ایک بار غلطی کی تھی اس نے ہمیں قانونی نوٹس بھیج کے۔ اب اس کا خواب میں بھی سوچے گی تو یاد آجائے گا وہ مراثی اور وہ پاگل جو انسان نہیں حیوان ہے۔ ہمارے اشاروں پر چلنے والا۔ میں نے کہا کہ اگر اس نے رپورٹ لکھوادی یا میڈیکل رپورٹ حاصل کرلی۔۔۔ کہ اس کے ساتھ کس نے زیادتی کی تھی۔ اس پر چھوٹا ملک ہنسنے لگا کہ ایک بار نہیں سو بار جائے اور ڈاکٹروں سے رپورٹ حاصل کرے۔ اس میں کون سا ہمارا نام آئے گا۔ وہ جن کا نام لے گی وہ بندے ہم تفتیش کے لیے پولیس کے حوالے کردیں گے کہ یہ مجرم ہیں تو ان کو قانون کے مطابق سزا ملنی چاہیے۔ جو اس کو آفس سے اٹھا کے لائے تھے' ان کو بھی شناخت کرسکتی ہے وہ مگر نیلم جان' اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ اس میں ہم ملوث ہیں۔ ہمارا کوئی نمک خوار ہمارا نام نہیں لے

سکتا خواہ اسے سولی پر چڑھادیا جائے۔ ان کے خاندان کی جانیں اور عزتیں گروی ہیں ہمارے پاس۔ انہیں معلوم ہے کہ ایک لفظ غلط بولا اور شامت آئی ان کی ماں بہن کی۔۔۔ میں نے کہا کہ جس طرح آپ نے اس بے گناہ ناصر عظیم کو اغوا کرایا اور پھر جیسے سب کے سامنے اس کے جسم پر دہی اور مسالے ڈال کے اس پر اپنے بھوکے شکاری کتے چھوڑنے والے تھے' اس سارے شرمناک تماشے کی چشم دید گواہ تو میں بھی ہوں۔ چھوٹا ملک مجھے گالیاں دینے لگا کہ تمہارا حشر تو اس شادو سے بھی برا ہوگا۔ سب ٹیپ کرکے میں نے فون بند کردیا۔ شام کو بڑے ملک صاحب نے مجھے گفتگو کی عزت بخشی۔ انہوں نے رہی سہی کسر پوری کردی۔"

شادو نے پھر اصرار کیا "پوری بات بتاؤ۔"

"اس نے زیادہ لمبی بات نہیں کی۔ میں خاموشی سے سنتی رہتی تو وہ کتنی دیر بولتا؟ پانچ منٹ میں گالیاں دے کے فارغ ہوجاتا مگر میں نے اسے اپنے سوالوں اور مشتعل کرنے والی باتوں میں الجھالیا۔ اس کا الگ ٹیپ ہے۔ اس میں آدھی تو گندی گالیاں ہیں جس میں سے آدھی مجھے براہِ راست دی گئی ہیں۔ باقی آدھی میں تم دونوں کا حصہ ہے۔ میں نے کسی نہ کسی طرح بڑے ملک سے بھی وہ سب کہلوالیا جو چھوٹے ملک نے کہا تھا۔"

"وہ سمجھا نہیں۔۔۔ کہ تم اسے باتوں کے جال میں پھانس رہی ہو۔"

"سمجھتا کیسے۔ غصے میں عقل ویسے ہی خراب ہوجاتی ہے۔ اس کے علاوہ ملک جیسے لوگ یہ نہیں سوچتے کہ ہم جیسے لوگ۔ جن کو وہ اپنی خاندانی زبان میں بہت گھٹیا الفاظ سے یاد کرتے ہیں' وہ بھی اتنی جرأت کرسکتے ہیں کہ ان کے خلاف سازش کا جال پھیلائیں۔ ان کا مقابلہ کرسکتے ہیں' انہی کے مرتبے اور ان جیسی طاقت اور دولت رکھنے والے۔ اس نے بھی بہت کچھ بک دیا جس سے چھوٹے ملک صاحب کی باتوں کی مزید تصدیق ہوگئی۔ بڑے بھائی کی گواہی ہوگئی چھوٹے ملک کے خلاف اور چھوٹے ملک صاحب نے پھنسادیا بڑے بھائی کو۔ انہوں نے اپنی زبان سے خود کہہ دیا یا اعتراف کرلیا اپنی ساری بدمعاشی کا۔۔۔ اس کا بھی جو میرے اور تمہارے ساتھ کی اور اس کے علاوہ بھی میری معلومات میں اضافہ کیا کہ فلاں نے ایسا سوچا تھا یا کیا تھا تو ہم نے اس کے ساتھ یوں کیا۔ بہت غلیظ زبان استعمال کی ہے دونوں نے۔ میں نے تو سن لی مجبوراً مگر تم نہ سنو تو اچھا ہے۔ میں نے کیسٹ کی کاپیاں بنوالی ہیں۔"

"انہیں کیسے استعمال کروگی۔ تب تو تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے مگر اسے چلاؤ گی کیسے؟" میں نے کہا۔

"ابھی تک تو صرف اپنے میزبان کو بتایا تھا میں نے۔ دو کیسٹ میں نے ان کے حوالے کردیے تھے۔"

میں نے کہا "ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تم تو سلطان راہی صاحب کے ساتھ ہو۔ کیا انہیں معلوم ہے' فون انہوں نے کہاں کیا تھا؟"

"فون آیا تھا میرے گھر۔ بابا جی نے ریسیو کیا اور کہا کہ وہ باتھ روم میں ہیں۔ دس منٹ بعد خود آپ کو فون کرلیں گی۔ اس کے بعد میں نے فون کیا۔ ساری بات چیت ریکارڈ کرنے کا بندوبست میں نے وہاں بھی ایک فون پر کرلیا تھا اور سلطان راہی صاحب کو بتا بھی دیا تھا۔ جب انہوں نے کیسٹ سنے تو مجھ پر بہت خفا ہوئے کہ میں نے اتنی بکواس سنی لیکن وہ غصے میں تھے' ورنہ وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ میں سوال جواب نہ کرتی تو وہ میرے جال میں کب پھنستے۔ سلطان راہی ذاتی زندگی میں انتہائی نیک اور شریف آدمی ہیں لیکن ان کا اثر رسوخ بھی بہت ہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ بس اب تم بیٹھو آرام سے۔ میں نمٹ لوں گا ان ملکوں سے۔"

"ہمارے بارے میں نہیں پوچھا؟" میں نے کہا۔

"پوچھا تھا' میں نے بتادیا" نیلم بولی۔

"سب بتادیا؟" شادو نے سوال کیا۔

"ہاں سب بتادیا" نیلم اس کا مطلب سمجھ کے مسکرائی "سلطان راہی صاحب نے بڑے غور سے سنا اور پھر کہا کہ سب ٹھیک ہوجائے گا انشاء اللہ۔ دماغ درست کردوں گا میں ان کا۔ تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں اور اپنے دوستوں کو بھی کہہ دینا کہ پریشان نہ ہوں۔"

"پھر تمہیں کیسے پتا چلا کہ انہوں نے کیا قدم اٹھایا؟"

نیلم نے کہا "انہوں نے آج صبح مجھے بتایا کہ انہوں نے بہت سے لوگوں سے بات کی ہے۔ ڈی آئی جی کو کیسٹ سنوادیا ہے۔ کاپی نہیں دی۔ ڈپٹی کمشنر کو بھی بتایا تھا۔ بڑے ملک کو فون کیا ہوگا انہوں نے کہ تمہارے خلاف کیا کیس بن سکتا ہے۔ ایک بڑے نامی گرامی بیرسٹر ہیں۔ انہوں نے بھی بات کی ہوگی۔ آج صبح سلطان راہی صاحب نے دونوں بھائیوں کو کیسٹ کی ایک ایک کاپی بھیج دی۔ انتخابات کا زمانہ ہے۔ وہ کسی قسم کی بدنامی اور کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کرسکتے۔ یہ کیسٹ ان کے سیاسی مخالفوں کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ الیکشن ہار جائیں۔ باپ دادا کے زمانے کی سیٹ ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ دن میں تارے تو نظر آنے ہی تھے ان کو لیکن اس کے بعد وہ فون پر بات کرنے کا رسک نہیں لے سکتے تھے۔ وہ پہنچے میرے گھر۔ بابا جی نے کہا کہ وہ سلطان راہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب کے گھر ملیں گی۔ کہہ گئی ہیں کہ آپ کو بات کرنی ہے تو فوراً وہاں جاکے کرلیں دیر نہ کریں۔ وہ اس وارننگ کو سمجھ گئے کہ دیر کی صورت میں بات بگڑ جائے گی۔ وہ بھاگم بھاگ سلطان راہی صاحب کے پاس پہنچے۔ وہاں طے شدہ پروگرام کے مطابق میں بیرسٹر صاحب سے بات کررہی تھی۔ وہ اکیلے میں بات کرنے آئے تھے۔ میں نے انکار کردیا کہ جو بات ہوگی میرے وکیل کے سامنے ہوگی۔ یہی وکیل نے کہا۔ انہوں نے گول مول الفاظ میں کہا کہ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ وہ معافی تلافی کے لیے تیار ہیں۔"

"کیا یہ سب بھی ٹیپ کرلیا تم نے؟"

نیلم ہنسی "ظاہر ہے۔ وہ اپنی طرف سے بہت محتاط تھے۔ انہوں نے کہا کہ باہر بات کریں گے۔ کسی کھلی جگہ پر یا کہیں بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ سانپ کا کاٹا رسی سے کیسے ڈرتا ہے۔ وکیل نے مجھے سمجھادیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا کہنا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ جہاں کہیں' چلتے ہیں۔ میں نے ان کے اطمینان کے لیے اپنا ہینڈ بیگ بھی ساتھ نہیں لیا۔ ہم ان کی گاڑی میں گئے اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ بس وکیل نے میز کا انتخاب کیا۔ اندر والا ریسٹورنٹ سینٹرلی ائرکنڈیشننگ کے نظام کی وجہ سے ہر طرف شیشے لگے ہونے کے باوجود بالکل بند تھا۔ ہم اوپن ٹیرس گارڈن میں بیٹھ گئے۔ ملک برادرز کو کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ یہاں وہ کھلی آنکھوں سے غور فرمانے کے باوجود اس جال کو نہیں دیکھ سکتے جس میں وہ قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔ وکیل نے ٹائی پن کی جگہ چھوٹا سا ایف ایم مائیکروفون لگا رکھا تھا۔ جیسا کہ ٹی وی پر انٹرویو دینے والے قمیص کے کالر کے نیچے یا بٹن کی جگہ لگا لیتے ہیں۔ ادھر ادھر کی میزوں پر اور لوگ بھی اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ ہم سے کچھ فاصلے پر دو خواتین بظاہر باتیں کررہی تھیں مگر ان کے پاس ایف ایم ریڈیو والا ٹیپ ریکارڈر تھا جو ہماری گفتگو کو بہ آسانی صاف ریکارڈ کرسکتا تھا۔ اس گفتگو میں زیادہ شور بھی نہیں تھا کیونکہ دوسری میزوں پر بیٹھنے والے اپنی کیٹس کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلا پھاڑ کے نہ باتیں کررہے تھے اور نہ ہنس رہے تھے۔ قصہ مختصر ملک برادران نے ایک بار پھر وکیل کی موجودگی میں اعتراف کرلیا کہ انہوں نے کیا شرمناک جرائم کیے تھے۔ وہ معافی مانگنے پر تیار نہیں ہوئے مگر انہوں نے تلافی کے لیے ناصر عظیم اور نیلم کو پانچ پانچ لاکھ روپے اور شادو کو دس لاکھ دینا قبول کرلیا اور چیک دے دیا اور آئندہ کے لیے بلاواسطہ اور بالواسطہ کسی کے خلاف کوئی غلط بات تک نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ وہ آنے والے انتخابات میں رسوائی اور ہار سے ڈرتے تھے اور جواب میں صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کی ریکارڈ شدہ گفتگو کو ان کے خلاف کہیں بھی استعمال نہ کیا جائے بلکہ انہیں ضائع کردیا جائے۔"

میں نے کہا "اور تم نے اس درخواست کو شرفِ قبولیت عطا کیا؟"

"میں نے نہیں' وکیل نے" نیلم ہولی "اس وکیل کا نام اتنا بڑا ہے کہ اسے دیکھ کر ہی دونوں ملک بے حد محتاط باادب باملاحظہ ہوشیار ہوگئے تھے۔ ان کی زبان' لہجہ اور رویہ سب انتہائی شریفانہ اور مہذب ہوگیا تھا۔ جب ہم چلنے لگے تو وکیل معذرت کرکے واش روم تک گیا۔ گفتگو ریکارڈ کرنے والی خواتین رخصت ہوگئی تھیں۔ ٹیپ ریکارڈ ہونے والی بات چیت کا ایک کیسٹ وہ ٹائلٹ میں کہیں رکھ گئی تھیں۔ وکیل واپس آیا تو ہم سب ایک ساتھ باہر آئے۔ ملکوں نے وکیل سے مصافحہ کیا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے گئے اور میں وکیل کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مجھے یہ سوچ کے ہنسی آتی ہے کہ بعد میں کیا ہوا ہوگا؟"

شادو نے کہا "بعد میں؟"

"ہاں۔ وہ گاڑی کے پاس پہنچے ہوں گے تو ان کے ڈرائیور نے انہیں ایک کیسٹ دیا ہوگا کہ یہ کوئی ویڈیو ہے گیا تھا۔ اس میں سے برآمد ہونے والے کیسٹ کو دیکھ کر ہی ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ہوں گے۔ انہوں نے خود کو دنیا کا سب سے بڑا احمق نمرود اور احمق نمبر دو تسلیم کیا ہوگا۔ انہوں نے اتنے بڑے وکیل کے سامنے پھر سب بک دیا تھا اور اس کی گواہی کے بعد گویا ان کے اعترافِ جرم پر مہرِ تصدیق لگ گئی تھی۔"

"تم نے واقعی کمال کردیا۔ بڑا پکا بندوبست کیا ہے کہ وہ آئندہ ہوتے ہوئے ڈریں گے" میں نے کہا۔

نیلم نے اپنی گھڑی دیکھی "تم نے پوچھا نہیں کہ وہ چیک کہاں ہیں؟"

"میں پوچھنا چاہتی تھی کہ تم نے وہ چیک لینا کیوں منظور کیا؟" شادو بولی۔

نیلم نے کہا "بس ابھی چند منٹ کے بعد وکیل ملک برادران کو فون کرے گا۔ وہ اب گالیاں نہیں دیں گے اور غصے کا اظہار بھی نہیں کریں گے۔ وکیل انہیں بتائے گا کہ وہ اپنے خلاف ایک دستاویزی ثبوت بھی فراہم کرچکے ہیں۔ انہوں نے جو چیک دیے تھے' وہ کیش نہیں کرائے جائیں گے بلکہ ریکارڈ میں محفوظ رہیں گے۔ ٹیپ کیے ہوئے کیسٹس کے ساتھ۔ امید ہے کہ ملک صاحب اپنے ذہن میں کوئی غلط فہمی ہے تو اسے فوراً خارج کردیں گے۔ معاہدے کے دونوں فریق

اپنی اپنی حد میں رہیں گے تو کسی کو نقصان نہیں ہوگا ورنہ دونوں کا بیڑا غرق ہوگا۔ غریب اور بدنام آدمی کی عزت کا سفینہ ہی کیا۔ ایک کشتی کے مقابلے میں ان کا شاہی بیڑا غرق ہوگا تو نقصان بھی انہی کا زیادہ ہوگا۔"

میں نے کہا "یعنی تم ملک برادران سے ملاقات کے بعد سیدھی یہاں آگئی ہو؟"

"ہاں۔ اور اب جارہی ہوں اسٹوڈیو۔ میرا شوٹنگ شیڈول بالکل درہم برہم ہوگیا ہے" وہ کھڑی ہوگئی۔

"دیکھو۔ ضرورت سے زیادہ پُراعتمادی بھی اچھی نہیں ہوتی۔ تم بے خوفی سے اکیلے پھرنا مت شروع کردینا۔ گھر سے یا اسٹوڈیوز سے نکلو گی اور غائب ہوجاؤ گی۔ ملکوں پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

وہ بولی "ایک مسلح باڈی گارڈ ہے میرے ساتھ۔ وہ پولیس کا آدمی ہے اور بہت تجربہ کار کمانڈو ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ میرا پرانا پرستار ہے۔ سچ مچ میری خاطر جان دے سکتا ہے۔" وہ ہنسی اور پھر آنے کا کہہ کے رخصت ہوگئی۔

"ناصر' یہ بہت اچھی لڑکی ہے" شادو نے کچھ دیر بعد کہا۔

"ہاں۔ بہت بہادر ہے' بہت ذہین ہے۔"

شادو نے کہا "اور بہت خوب صورت ہے۔ صورت اور سیرت میں۔ ہر طرح سے تمہارے لائق ہے۔"

میں ہنس پڑا "تم بھی ماسی ہیر ہوگئی ہو۔ اسے بھی یہی سوجھی تھی کہ نیلم کے لیے میرا پیغام لے جائے۔"

"تم نے بڑی بے وقوفی کی جو اسے رد کیا۔"

"تم پاگل ہو۔ نیلم جیسی لڑکیاں کسی سے شادی نہیں کرتیں۔ یہ ایک اتفاق تھا جس نے اسے مجھ سے ملوادیا۔ لاکھوں مارے مارے پھرتے ہیں اس کی ایک نظر کے لیے اور میں مانتا ہوں اس میں سب خوبیاں ہیں جو تم نے گنائیں مگر اس کے باوجود وہ شادو تو نہیں ہے نا۔"

"ایکٹریس بھی عورت ہوتی ہے۔ دیکھ لو سب ہیروئنوں نے موقع ملتے ہی شادی کرلی اور گھر میں بیٹھ گئیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے۔ کتنی اچھی بیویاں ثابت ہوئیں سائرہ بانو' نرگس اور مدھو بالا۔ صبیحہ خانم اور مسرت نذیر۔ بہت مثالیں ہیں" وہ بولی۔

میں نے چڑ کے کہا "مثالیں ہیں تو میں کیا کروں۔ تم سے بھی کرلوں اس سے بھی کرلوں۔ دو اور دیکھ لوں گا کہ چار پوری ہوجائیں۔"

وہ چیخنے لگی "میرا مطلب تھا۔ اگر میں نہ رہوں۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ کیسی فضول باتیں سوجھتی ہیں تمہیں بھی۔ تم کیوں نہ رہو آخر؟ اور رہنے کو میں نہ رہوں پھر؟ تمہارے لیے نامزد کرجاؤں کوئی۔"

"اس میں خفا ہونے کی کون سی بات ہے۔ ایک بات آئی میرے ذہن میں' میں نے کہہ دی۔ اسے فضول کیسے کہہ سکتے ہو تم۔"

شام کو پھر کسی نے ناک کیا اور میں نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے ڈاکٹر مشہود کو دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ بیگم صاحبہ ان کے پیچھے تھیں۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو سلام کیا اور پھر میری نظر بیگم صاحبہ کی نظر سے ملی۔ انہیں دیکھ کے مجھ پر عجیب سی گھبراہٹ سوار ہوجاتی تھی۔ کسی وجہ کے بغیر میرے لاشعور میں چھپ کر بیٹھا ہوا چور پناہ کے لیے ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا۔ ان کے وجود کی ایک مقناطیسی کشش آج بھی دعوتِ تسخیر دیتی محسوس ہوتی تھی۔ میں نے کہا "آپ یہاں۔۔۔"

"بھئی یہ کیا راستے میں ہیرو بنے کھڑے ہو" ڈاکٹر مشہود نے کہا۔

میں شرمندہ ہوکے پیچھے ہٹ گیا "میرا مطلب تھا آپ کو کس نے بتایا۔"

"ٹی وی پر قومی خبرنامے میں دیکھا تھا۔" وہ بولے "بڑی چیز ہوگئے ہو تم۔ پہلے ڈی آئی جی نے تمہارے ساتھ تصویر بنوانے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ وہ تو بی بی سی' وائس آف امریکا اور دنیا بھر کے ہر چینل سے دکھایا گیا تھا۔ اتنے اعزازات ہیں کہ تمہیں تو پرائڈ آف پرفارمنس فوراً دے دینا چاہیے۔ صدر کو چاہیے کہ یہاں آکے دے" وہ صوفے پر بیٹھ کے بولے۔

"چھوڑیں جی۔ کیا آتے ہی اس کے پیچھے پڑ گئے" بیگم صاحبہ نے میری حمایت میں کہا "خیر خیریت پوچھی نہیں۔"

"اس کی کیا خیر خیریت پوچھیں۔۔۔ پوچھنا تو یہ چاہیے کہ تمہاری وجہ سے باقی سب خیر خیریت سے ہیں یا نہیں۔۔۔ ماشاء اللہ بڑی بابرکت ذات ہے ان کی' بڑے سبز قدم ہیں۔"

میں نے کہا "پہلے آپ ڈانٹ لیں اچھی طرح پھر میں بتاؤں گا۔"

انہوں نے کہا "تم کیا خاک بتاؤ گے۔ آج تک کبھی بتایا ہے کہ باہر کیا طرم خانی کرتے پھر رہے ہو۔ وہ تو ہمیں خود ہی پتا چل جاتا ہے۔ سب بتادیا ہے مجھے ڈاکٹر نوید نے اور ڈاکٹر انجم نے۔ دونوں کلاس فیلوز تھے میرے۔۔۔ میں نے کہا کہ نکال باہر کرو اس بدمعاش کو اپنے گھر سے ورنہ پچھتاؤ گے۔ روتے پھرو گے ہماری طرح۔"

ان کا غصہ فرو ہوا تو میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب' یہ شادو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

انہوں نے اس کی طرف دیکھا تو شادو نے سلام کیا۔ انہوں نے سرہلا کے جواب دیا "وعلیکم السلام بھئی' یعنی تم ہو وہ ذات شریف جن کی وجہ سے بیسویں صدی کے یہ مجنوں مسٹر ناصر عظیم نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ میں کہتا ہوں آخر تم یہ جھگڑا ختم کیوں نہیں کرتے۔ خود بھی خوار ہم بھی پریشان۔"

میں نے کہا "جی۔۔۔ کیسا جھگڑا؟"

"بھئی یہی۔۔۔ افلاطونی محبت کا ڈراما۔ یار شادی کرو اور بس اللہ اللہ خیر صلا۔ نہ درمیان میں ظالم سماج ہے نہ کوئی قلی ولن ہے اور نہ ہیروئن کا قاتل باپ جو روکے۔۔۔ میاں بیوی راضی تو بھاڑ میں جائے قاضی۔"

مجھے ہنسی آئی "آپ آج بہت غصے میں ہیں۔"

شادو نے نظر جھکا کے کہا "ہم اب یہی کر رہے ہیں۔۔۔ جو آپ چاہتے ہیں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ آخر شادو کو کیا ہو گیا ہے۔۔۔ وہ کیوں ہر ایک کو یہ بتانے کے لیے بے قرار ہے کہ ہم شادی کر رہے ہیں؟ کیوں اس کی تشہیر چاہتی ہے۔ کیا اس کے لاشعور میں بھی کوئی خوف ہے کہ اب میں اسے ایک انتقامی ردِعمل کے طور پر ٹھکرا نہ دوں۔ کیونکہ میرے دل کا گھاؤ بہت گہرا تھا اور اگرچہ وہ وقت گزر گیا تھا جب میں شادو سے واقعی نفرت کرنے کے جنون کا شکار تھا مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ کل اچانک میرے جذبات وہ نہ رہیں جو آج ہیں۔ چنانچہ وہ سب کے سامنے اعلان کر رہی ہے۔ تاکہ بعد میں میرے لیے انکار کی گنجائش نہ ہو۔ کیا وہ میرے لیے فرار کے راستے بند کر رہی ہے۔

ڈاکٹر مشہود نے اسے غور سے دیکھا اور کہا۔ "ہوں۔۔۔ اچھا ہے۔۔۔ بہت اچھا ہے۔ آدمی تجربہ کر کے ہی کچھ سیکھتا ہے۔۔۔ بے وقوف ہم تھے جو سمجھاتے تھے۔"

بیگم صاحبہ کی نظر شادو پر جم کے رہ گئی تھی۔ ان کا چہرہ احساسِ خفت کی تصویر بن گیا تھا۔ کسی وجہ کے بغیر انہوں نے شاید اس کو اپنی شکست سے تعبیر کیا تھا۔ سب سے پہلے سرایڈمنڈ ہیلری اور شرپاتن سنگ نے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا تھا۔ برسوں وہ اولین ہونے کے اعزاز کی خوشی اور غرور کے ساتھ سرفراز رہے پھر ان کے نقشِ قدم پر چل کے کوئی اور اس چوٹی کو تسخیر کرنے آیا اور کامیاب ہو گیا اور تب وہ غرور اور وہ خوشی کسی اور کی ملکیت بھی ہو گئی جس پر ان کی اجارہ داری تھی۔

شاید میرے معاملے میں بیگم صاحبہ کے جذبات ایسے ہی تھے۔ اپنے اولین ہونے کا احساس تفاخر ایک معمولی شکل و صورت والی' ایک فقیر زادی اور سیکنڈ ہینڈ عورت نے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا قبضہ غاصبانہ تھا۔ یہ عورت محبت کی ناقابلِ شکست طاقت کے ساتھ مالکانہ حقوق حاصل کر چکی تھی اور ساری دنیا کی مخالفت اور مزاحمت کے باوجود جیت گئی تھی۔

ڈاکٹر مشہود نے اپنے جذبات پر قابو پا لیا تھا۔ ان کے جذبات میرے جذبات کے برعکس تھے۔ وہ اس شادی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کر سکتے تھے مگر انہوں نے سمجھ لیا کہ ان کے کچھ کہنے سے کوئی فرق پہلے نہیں پڑا تو اب کیسے پڑ سکتا ہے۔ میں وہی کرتا ہوں جو میرا اپنا فیصلہ ہوتا ہے۔ خواہ وہ عقل کا ہو یا جذبات کا اور ایسا ہر شخص کو اختیار ہے۔

وہ اٹھ کھڑے ہوئے "اچھا بھئی۔ تم سے کہنا بے کار ہے کہ ملنے آتے رہا کرو۔ ہم ہی آتے ہیں ہر بار شگن مار کے۔۔۔ بھئی بیگم' انہیں مبارک باد تو دے دو پیشگی۔۔۔ ہم تو شاید نہیں آسکیں گے۔۔۔ اور پتا نہیں بلائے بھی جائیں گے یا نہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی دعاؤں کی ضرورت مجھے ہمیشہ رہے گی۔"

"دعائیں؟ وہ بھی ہم جیسے گنہگاروں کی" وہ تلخی سے ہنسے۔ "ہم جا رہے ہیں لندن۔۔۔ کل یا پرسوں' ایم بی بی ایس۔۔۔ میاں بیوی بچے ساتھ۔"

بیگم صاحبہ نے اپنا ہاتھ بڑھایا "بہت مبارک ہو ناصر۔ انتخاب تو بہت پہلے کر لیا تھا تم نے۔ باری اب آئی تمہاری۔۔۔ خیر' دیر آید درست آید۔"

ان کے لہجے کی تلخی اور زہر بھری طنز کی کاٹ نے مجھے اکسایا کہ میں پلٹ کر ان سے کوئی زیادہ کڑوا سچ اگل دوں مگر پھر میں نے ان کے احسانات کو یاد کیا اور دل کی بات کو زبان تک نہیں آنے دیا۔

"ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے بیگم صاحب۔ ہوس ایک کام ہے' محبت دوسرا کام ہے" میں نے کہا "میں آپ کو کیا سمجھاؤں۔"

شادو کا بجھ جانے والا چہرہ پھر روشن ہو گیا۔ میں نے اس کے دفاع کا فرض نبھا دیا تھا۔ بیگم صاحبہ کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے فق ہوا۔

"نصیب میں جو ہو وہی ملتا ہے آدمی کو۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

"جی۔۔۔ جیسے آپ کی اور ڈاکٹر صاحب کی جوڑی" میں نے کہا اور وہ ایک دم پلٹ کے باہر نکل گئیں۔ شاید تڑپ

کے کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔

میرا موڈ خراب ہو گیا تھا "یہ تم نے کیا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے ہر ایک کے سامنے۔"

شادو کا چہرہ اتر گیا "مگر یہ تو۔۔۔ پرانے محسن ہیں تمہارے۔۔۔ ابھی انہوں نے بھی بہت کوشش کی تھی' تم کہتے ہو ہر ایک۔۔۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔"

"اور کیا اپنوں کو بتانا ڈھنڈورا پیٹنا ہے؟ نیلم اور رئیس سے بھی چھپانا چاہتے تھے تم؟" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"آئی ایم سوری۔ تم نے غلط مطلب لیا میری بات کا۔ دراصل یہ موقع نہیں تھا۔۔۔ وہ بیمار پرسی کے لیے آئے تھے۔ بیگم صاحبہ کو تم جانتی ہو۔ وہ ذہنی طور پر تمہارے خلاف ہیں اور خود ڈاکٹر صاحب کہاں خوش ہوں گے مگر وہ کون ہوتے ہیں میری زندگی کے فیصلے کرنے والے۔ میں جانتا ہوں کہ میرے لیے خوشی کس بات میں ہے۔ ان کی تو وہی روایتی سوچ ہے کہ میں کسی بڑے گھر کی چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی پسند کرتا۔ خواہ اس کے ساتھ میری زندگی جہنم بن جاتی۔"

اس نے میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا "میں سب سمجھتی ہوں۔۔۔ تم اپنا دل چھوٹا مت کرو۔ دنیا کا رویہ کیسا بھی ہو۔"

اگلے دن ہم ڈاکٹر نوید اور انجم کے گھر شفٹ ہو گئے۔ ان کا گیسٹ بیڈ پوری طرح آراستہ تھا اور ہمارے لیے اس کی صفائی بھی کرا دی گئی تھی۔ ہم سب نے کھانا ایک ساتھ ہی کھایا۔

رات گئے نیلم آئی۔ وہ سیدھی شوٹنگ سے آئی تھی اور بہت تھکی ہوئی تھی اس لیے زیادہ دیر نہیں رکی۔ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا۔

میں نے پوچھا "نیلم۔ یہ ڈاکٹر مشہود کو کیسے پتا چلا کہ میں یہاں ہوں؟"

"میں نے بتایا تھا" وہ بولی "ان کا فون آیا تھا۔ تمہیں پوچھ رہے تھے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ ڈاکٹر نوید اور انجم تو ایک دوسرے کے ساتھ پڑھتے ہی تھے' ڈاکٹر مشہود بھی ان کے کلاس فیلو نکل آئے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"خاک اچھی بات ہے۔ انہوں نے ساری تفصیل ان کے گوش گزار کر دی۔ شادو کے ABORTION کا سب کیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا۔۔۔ زیادتی کی گئی تھی۔"

"اس میں خرابی کیا ہو گئی۔ ان کو پتا چل گیا ہو گا کہ ملک برادرز کتنے بڑے شیطان ہیں" نیلم بولی۔

"افوہ۔ وہ شادو کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ جب میں ان کے گھر میں تھا اور شادو کا ٹھکانا شاہ جی کا ڈیرا تھا۔ انہیں شادو کے لیے میری چاہت بالکل ناپسند تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے رئیس کی دوستی۔۔۔ بعد میں شادو نے جو کیا۔۔۔ اس سے ان کی رائے مزید خراب ہوئی۔ آج اچانک شادو نے ان سے کہہ دیا۔"

وہ میری صورت دیکھنے لگی "کیا کہہ دیا؟"

"یہی۔۔۔ کہ ہم شادی کر رہے ہیں۔"

نیلم گاڑی کا دروازہ کھولتے کھولتے رک گئی۔ "تم۔۔۔ شادی کر رہے ہو؟ شادو سے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ کیا تمہیں بھی اعتراض ہے کوئی؟" میں نے برہمی سے کہا "وہ ڈاکٹر مشہود۔ وہ صاف کہہ گئے کہ ہم نہیں آئیں گے شادی میں۔۔۔ بہانہ ہے کہ آج کل میں ہم لندن چلے جائیں گے۔ جو کچھ شادو کے ساتھ ہوا۔۔۔ اس کے بعد تو ان کے لیے میرا یہ فیصلہ بالکل ہی ناقابلِ قبول ہو گیا ہے۔ باپ ہوتے میرے تو عاق کر دیتے شاید۔ ان کی بیگم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی کڑوی کسیلی سنانے میں۔ ایسا رویہ تھا ان کا جیسے میں کسی طوائف زادی۔۔۔ کوٹھ زدہ یا پاگل خانے سے بھاگ کرنے والی سے شادی کر رہا ہوں۔ جو ہرگز میرے قابل نہیں ہے۔"

وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتی رہی۔ "تمہاری محبت کو نہ میں بُرا کہتی ہوں اور نہ الزام دے سکتی ہوں مگر برا مت ماننا۔۔۔ میری اپنی رائے۔ اگر تم ایمانداری سے پوچھو۔۔۔ تو یہی ہو گی۔"

"جہنم میں جاؤ تم سب لوگ" میں نے بھنّا کے کہا اور اسے خدا حافظ کہے بغیر پیر پٹختا واپس آ گیا۔

بہت دیر بعد جب شادو کی باتوں سے میرا موڈ ٹھیک ہو گیا تھا اور ہم ایک دوسرے کے قریب لیٹے مستقبل کے خوابوں کے تانے بانے میں الجھے ہوئے تھے' شادو نے پوچھا "ہم اور کتنے دن رہیں گے یہاں؟"

میں نے کہا "ظاہر ہے جب تک ڈاکٹر تمہیں بالکل فٹ قرار نہیں دیتا۔ ہم کون سے اپنی خوشی سے یہاں رکے ہیں۔"

"اور اس کے بعد ہم جائیں گے کہاں؟ اگر تم اپنے گھر نہیں جا سکتے اور میں اپنے گھر میں نہیں رہ سکتی۔"

میں نے کہا "تم فکر کیوں کرتی ہو۔ اب خطرے کی کوئی ایسی بات نہیں رہی۔ نیلم نے سب ٹھیک کر لیا ہے۔ مگر تم کہیں اور جا کے رہ سکتے ہیں۔ کرائے پر مکان مل جاتے ہیں یہ بندوبست کرنا میرا کام ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"لیکن۔۔۔ میں ایسے تو نہیں رہ سکتی تمہارے ساتھ" وہ ...

"ایسے سے کیا مراد ہے تمہاری؟ ہم کل بھی ایسے ہی تھے تھے۔"

اس نے کہا "کل کی بات اور تھی۔ تمہاری اور میری زیشن وہ نہیں تھی جو آج ہے۔ ہم چھپ چھپ کے نہیں سکتے اور کسی رشتے کے بغیر ساتھ رہیں گے تو الزام آجائے ہم پر۔"

"میں سمجھ گیا۔ تم کس رشتے کی بات کر رہی ہو۔"

"میں ایک بات کہوں؟ مانو گے؟"

میں نے کہا "میں ہر بات ماننے کا پابند ہوں تم کہو۔"

"میں اپنے گھر چلی جاؤں گی۔ ڈاکٹر صاحب کی اجازت ...ے ہی۔ میں چوری چھپے شادی کرنا نہیں چاہتی۔ تم برات ...لے کر وہاں آؤ۔"

میں نے کہا "برات۔۔۔ میں کسے ساتھ لاؤں؟ یہاں ...ن ہے میرا؟"

"دیکھو۔ رئیس ہے اور اس کے سب دوست ہیں۔ ...م سے کہو کہ کچھ لوگوں کو بلا لے جن سے یہ تقریب معتبر ...جائے۔ ڈاکٹر نوید اور انجم میری طرف سے ہوں گے۔ ماسی ...اور ڈاکٹر رانجھا تمہاری طرف سے ہوتے مگر ان کا پتا ہی ...ں۔ میں اپنے آفس کے سب لوگوں کو بلاؤں گی۔ رخصتی ...ب کے سامنے ہوگی۔ سارا انتظام میں بھی کرا سکتی ہوں۔ ...سانوں کی خاطر یہ دارات اور دعوت کا۔ تم چاہو تو رئیس کے ...و کر دو۔ میں تمہاری گاڑی میں بیٹھ کے تمہارے گھر جاؤں ...جیسے سب دلہنیں جاتی ہیں۔ جیسے میں بھی جاتی۔۔۔ تم سن ...ہے ہو نا۔"

میں نے اسے اپنے قریب کر لیا "سن رہا ہوں۔۔۔ تم ...رے اسی گھر میں جا کے رہو گی۔۔۔ جہاں کوئی نہیں رہتا۔"

"ہاں۔ ہم رہیں گے وہاں۔ تم نے ابھی کہا کہ خطرے کی ...ب کوئی بات نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"تم نے دیکھا ہے وہ گھر؟"

"دیکھ لوں گی جب جاؤں گی" وہ بولی۔

"میرا مطلب ہے۔ تمہاری اس عالی شان کوٹھی کے ...نا لے میں۔"

"پھر وہ عالی شان کوٹھی میری نہیں رہے گی۔ میں وہ ...ب چھوڑ دوں گی۔ تم جہاں رکھو گے، رہوں گی۔ میں نہیں ...اہتی کہ کوئی باتیں بنائے۔ میرے آفس کے لوگوں کے ...امنے مجھے کوئی شرمندگی نہ ہو اپنے فیصلے پر۔ میں اعتماد کے ...ساتھ تمہارے ساتھ جاؤں۔ پیٹھ پیچھے پہلے بھی بہت کہا گیا اس کی تھی لوگوں نے۔ اب بھی کریں گے۔ اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا جان۔ اگر تم ایسا چاہتی ہو؟" میں نے اسے چوم کے کہا۔

رئیس صبح ہی آگیا۔ وہ اسپتال گیا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ شاد وہاں نہیں ہے "ابے یار، خواہ مخواہ منہ ماری ہوگئی صبح صبح۔ ہم گھس گئے سیدھے اندر اور وہاں پڑا تھا ایک ہاتھی کا بچہ۔ میرے تیرے جیسے چار کے برابر۔ اس کا ابا اتنا ہی پتلا بانس۔ بکرے جیسی داڑھی والا۔ ہاں ہاں کرنے لگا بکرے جیسی آواز میں۔ کہ آجاتے ہیں منہ اٹھائے بیل کی طرح۔"

میں نے ہنس کے کہا "اگر ہم ہوتے وہاں تب بھی تجھے دستک دے کے اندر جانا چاہیے تھا۔"

"ابے رہنے دے۔ ہم تو پیارے سدا کے بے شرم ہیں۔ تیرے تو جمعرات میں بھی ایسے ہی آئیں گے۔"

"جمعرات؟ مجھے عورتوں جاہل کی اولاد۔"

"ابے ہاں وہی۔ یار، اپن کو رات بھر نیند نہیں آئی ٹھیک سے۔ قسم اللہ کی تیرے بارے میں ہی سوچتے رہے۔ کیا تو واقعی اس سے شادی کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "اچھا کیا تو نے کہ خود آگیا۔ تجھے شادی کے بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔"

وہ ناراض ہونے لگا "اپن کیا فرمارہے ہیں اس پر بھی غور کر۔"

"غور کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ اب تو فیصلہ ہو چکا اور جب معاملہ ہے میری زندگی اور میری خوشی کا تو پھر تو کیوں پریشان ہے؟"

"یار، ہمیں کچھ بات کھٹک رہی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتی۔ تیری خوشی پر اپنی جان بھی قربان پیارے مگر کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر روتا نظر آئے۔ یہ لڑکی اپنی سمجھ میں آئی نہیں۔"

"میری سمجھ میں آگئی ہے۔ چل ذرا نیلم کی طرف چلتے ہیں۔ باقی بات وہیں ہوگی۔ پہلے مجھے بتاؤں، پھر اس کے سامنے دوبارہ سب کہوں۔"

وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ نیلم ابھی سو کے نہیں اٹھی تھی۔ ہمارے آنے کی خبر ملی تو پریشان ہو کے باہر آئی "تم صبح صبح۔ خیریت ہے نا؟"

میں نے کہا "ابھی تک تو ہے۔ تم کہو گی کہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت مول لے لی۔ کچھ زیادہ ہی فری ہو گئے ہیں ہم۔"

"ارے نہیں۔ ایسی خیریت کی بات مت کرو۔ آؤ اندر آؤ" وہ ہمیں اپنے ساتھ ڈرائنگ روم میں لے گئی "تم بیٹھو،

میں آتی ہوں ذرا ہاتھ منہ دھو کے۔"

رئیس نے اِدھر اُدھر دیکھا "ابے یار، کیا قسمت ہے اپنی بھی۔ یہاں پتا نہیں کتنے دروازے سے دھتکار دیے جاتے ہیں۔ ڈنڈے مار کے بھگا دیے جاتے ہیں اور ہم کیا ٹھاٹ سے بیٹھے ہیں نیلم کے گھر میں۔ میں کسی کو بتاتا ہوں تو لوگ یقین نہیں کرتے، ہنسنے لگتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم بے غرض ملتے ہیں۔ باقی سب آتے ہیں اس نیلم کو چاہنے والے جو سنیما کے اسکرین پر نظر آتی ہے۔ اس کے حسن اور اس کی اداؤں پر مرنے والے۔ یہ جب پہلی بار آئی تھی تو میں نہیں پہچانتا تھا اور صاف کہہ دیا تھا میں نے کہ میں کسی نیلم کو نہیں جانتا کیونکہ میں فلمیں دیکھتا ہی نہیں۔ اسپتال میں سب دیوانے تھے اس کے۔ مجمع لگ جاتا تھا۔"

"یار قسم اللہ کی۔ اپنی بڑی خراب رائے تھی کہ یہ سالی بے حیا اور بس پیسے کی پیار ہوتی ہیں۔ پھانستی رہتی ہیں پیسے والوں کو اور ذرا اوپری قسم کی طوائف ہوتی ہیں۔۔۔ یہ تو بالکل ہی مختلف ہے یار۔"

میں نے کہا "خدا نے پانچوں انگلیاں برابر نہیں بنائیں اور پھر فلم میں جو ہوتا ہے اس کا حقیقی زندگی سے کیا تعلق۔ وہاں اداکاری ہوتی ہے رول کے مطابق۔"

نیلم پھر آگئی "اب بتاؤ کیا بات ہے۔ میں نے ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے ابھی پندرہ منٹ لگیں گے۔"

میں نے اسے بتایا کہ شاد کیا چاہتی ہے۔ وہ ساری بات سن کے بھی خاموش رہی۔ رئیس اس کی صورت دیکھتا رہا پھر بولا "کیوں جی۔ آپ اپنے ایمان سے کہو، یہ جو کر رہا ہے ٹھیک ہے؟"

"تم بھی دوست ہو اس کے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟" وہ بولی۔

"اپن تو سمجھا چکے ہیں اس کو۔ قسم اللہ کی اپنی لائف اس نے ایک لڑکی کے پیچھے خراب کی۔ پہلے بھی بہت خوار ہوا۔ اور پھر ہوگا۔"

"یہ اچھی دوستی ہے کہ تو بد دعائیں دے رہا ہے۔"

"ابے میں ہاتھ ماردوں گا اگر ایسا کہا۔ ہم بددعا دیں گے تجھے سالے۔ یہ تو ہمارا دل کہتا ہے ہم سے کہ تو اچھا نہیں کر رہا ہے۔ ہم جھوٹ نہیں بول سکتے تجھ سے کہ ہم بہت خوش ہیں۔ آپ بتاؤ جی آپ خوش ہو؟"

نیلم نے نفی میں سر ہلایا "میں نے کل ہی بتا دیا تھا مگر رئیس خان، یہ معاملہ عقل کا نہیں دل کا ہے۔ ہم تم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"دیکھو جی۔ ہم اس کے بھلے کی سوچتے ہیں۔۔۔ مجھے کوئی چکر نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "اس لیے کہ تو خود چکرباز ہے۔ جس دن محبت ہوگی کسی سے اس دن عقل چکر میں آجائے گی تیری۔ میں تم دونوں کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن تم بھی میرے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

نیلم نے کہا "کل رات پھر فون آیا تھا ڈاکٹر رانجھا صاحب کا۔"

"اچھا! تم نے پتا پوچھا ان کا؟"

"پوچھا تھا مگر وہ بتاتے کہاں ہیں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "میں چاہتا تھا کہ وہ بھی آئے۔ وہی ہیں میرے ماں باپ کی جگہ۔ اس خوشی میں وہ بھی شریک ہوتے۔"

"خود بات کر کے دیکھ لینا۔" نیلم بولی "وہ آنے والے ہیں۔"

"یہاں آنے والے ہیں؟" میرا دل خوشی سے بے چین ہو گیا۔

"ہاں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا کہ ناصر کی طبیعت بہت خراب ہے۔ نوید کلینک میں پڑا ہے۔ چار نمبر کمرے میں ہے۔ وہ اسپتال جانا چاہتے تھے مگر میں نے کہا کہ آئی سی یو میں کوئی نہیں جانے دے گا۔ تم میرے پاس آجاؤ، ڈاکٹر نوید اور ان کی بیوی ڈاکٹر انجم دونوں میرے جاننے والے ہیں، میں تمہیں دور سے دکھا دوں گی۔"

"تم ہر بار کوئی نیا کمال کرتی ہو۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ وہ یہاں آئیں گے پھر میں دیکھتا ہوں وہ واپس کیسے جاتے ہیں مجھے چھوڑ کے لیکن یہ بات تم نے مجھے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

نیلم نے کہا "میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ اچانک ان کے ساتھ وہاں آجاتی۔"

ہم ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ ملازم نے مہمانوں کے آنے کی اطلاع دی۔ شاید نیلم نے پہلے ہی انہیں بتا دیا تھا کہ مہمان کون ہوں گے۔ نیلم نے مجھ سے کہا "ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے تم جا کے انہیں مناؤ۔ وہ بیٹھے ہیں ڈرائنگ روم میں۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر گیا۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کے ماسی ہیر کی حالت ایسی ہو گئی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ڈاکٹر رانجھا بھی ایک دم اٹھا اور پھر بیٹھ گیا۔ میں ان کے سامنے جا کے کھڑا ہوا تو ماسی نے منہ پھیر لیا۔

میں نے کہا "ماسی۔ اتنی ناراض ہو مجھ سے؟"

اس نے آنسو روک کے کہا "چل دفع ہو حرامی۔ میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھر یہاں کیا میرا مرا ہوا چہرہ دیکھنے آئی تھی۔" میں اس
یروں سے لپٹ گیا۔
ماسی نے چلا کے کہا "خانہ خراب۔ تیری زبان جل
ئے۔ بیڑا غرق ہو تیرا۔ مجھے جھوٹ بول کے بلایا تھا
ب۔ ایسی بات منہ سے نکالنے سے اچھا ہے زہر دے۔
ے مجھے" وہ رو رو کے مجھے دونوں ہاتھوں سے کوٹتی رہی اور
ہنستا رہا۔
خود ڈاکٹر رانجھا اس جذباتی منظر پر آبدیدہ ہوگئے۔ میں
انہیں اپنے رومال سے آنسو صاف کرتے دیکھا "اللہ کا
ہے تم بھلے چنگے ہو۔"
"بھلا چنگا ہے تو ہمیں کیا" ماسی ہیرا اسی طرح روتی رہی
ے کوسنے دیتی رہی اور دوہتڑ مارتی رہی "ہمارا بڑھاپا تو
اب کرادیا اس نامراد نے۔ میرے سفید بالوں میں سوا ڈال
۔ اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی میں تو۔ اس حرامی
ے بہانے سے بلالیا مجھے۔"
ڈاکٹر رانجھا نے کھنکھار کے کہا "اب تو بھی زیادہ
وٹ مت بول نیک بختے۔ اسے یاد کرکے روتی بھی رہتی
ی۔"
"روتی تھی میں اپنے نصیبوں کو اور اب جارہی ہوں
ں۔ آجائے گاڑی کے نیچے تب بھی نہیں آؤں گی۔"
میں نے اس کے پاؤں نہیں چھوڑے۔ "گاڑی کے
نیچے نہیں اوپر بیٹھ کے آؤں گا تجھے لینے۔"
"میں تو اپنے جنازے میں نہ آنے دوں تجھے۔ پاؤں
چھوڑ میرے نامراد۔"
میں نے کہا "پہلے کہو معاف کیا پھر چھوڑوں گا ورنہ چھرا
منگوا کے ہاتھ کاٹ دو میرے۔ پاؤں چھوٹ جائیں گے۔"
اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے "ہائے او میرا
ربا۔ کس مصیبت میں ڈال دیا ہے تو نے مجھے۔ میں کیا
کروں؟"
ڈاکٹر رانجھا مسکرائے "اوئے پاگل منہ سے اتنا بول رہی
ہے فاتو۔ ایک لفظ نہیں بول سکتی کہ معاف کیا۔ بس ساری
نصیب کی خرابی تھی ورنہ یہ تو اچھا ہی سوچتا تھا ہمارے
لیے۔"
اس مرحلے پر رئیس نے اور نیلم نے اندر قدم رنجہ
فرمایا۔ رئیس نے کہا "ماسی بہت ڈراما ہوگیا۔"
ماسی نے نیچے سے اپنا جوتا اٹھایا اور اسے کھینچ مارا۔
"سو حرامیوں کا ایک حرامی تو ہے۔ تو نے ہی خراب کیا اسے۔
تجھے تو میں چھوڑوں گی نہیں" نشانہ خطا ہوگیا۔
رئیس نے جوتا پھر اسے پیش کیا "تو کیا اپنے رانجھے کو
چھوڑو گی؟"
ماسی نے اپنا سر پکڑ لیا "او بے غیرت ڈھیٹ۔ کھڑا دانت
نکال رہا ہے میرے سامنے' اتنا نہیں ہوتا کہ پاؤں پکڑ کے
معافی مانگ لے۔"
"میری باری آئے تو پاؤں پکڑوں تمہارے۔ فریادی نمبر
ایک کا کیس کب سے چل رہا ہے" رئیس بولا "اور ذرا پاؤں
دیکھو اپنے' کتنے گندے ہو رہے ہیں۔ خیر میں چمٹے سے پکڑ لیتا
ہوں۔"
ماسی نے نیلم سے کہا "ذرا مجھے چمٹا گرم کرکے لادے۔
میں اس کی زبان پکڑوں پہلے تو۔"
نیلم نے کہا "ماسی۔ بچے ہیں تمہارے' غلطی پر شرمندہ
ہیں۔ تمہیں یاد کرتے رہتے تھے۔ آج بھی تم سے ہی ملنے
آئے ہیں۔ چلو اب معاف کردو۔"
بالآخر بہت رونے دھونے کے بعد ماسی نے مجھے گلے لگایا
اور پھر آنسو بہاتے' میں نے کہا "بس اب چلو اپنے گھر۔"
"کون سے اپنے گھر۔ وہ میرا گھر نہیں ہے۔ میں نہیں
جاؤں گی۔"
"تمہارا تو یہ حصہ بھی جائے گا۔" رئیس نے میرے
پیچھے سے کہا "پولیس سے انھواوں گا قسم اللہ کی۔ اتنے
لمبے مت دکھاؤ خواہ مخواہ۔"
"ادھر چپ کے بکواس کررہا ہے حرامی' سامنے آکے
بات کر۔ جوتے مار مار کے گنجا کردوں گی۔"
"جیسے رانجھے کو کردیا۔ کیا گبھرو سوہنا جوان ہوگا شادی
سے پہلے۔" رئیس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
غصے کے باوجود ماسی ہنسنے لگی پھر رانجھا ہنسنے لگا۔ رئیس
فوراً ماسی کے پاؤں سے لپٹ گیا "قسم اللہ کی تم میری ماں ہو۔
میری دادی ہو' دادا گیر ہو۔"
کچھ دیر بعد حالات معمول پر آئے تو مجھے شادو کا خیال
آیا۔ وہ ضرور پریشان ہوگی کہ میں صبح اسے سوتا چھوڑ کے
کہاں غائب ہوگیا۔
"میں نے اسے بتادیا ہے فون کرکے۔ کہ ہم یہاں
شادی کے انتظامات پر اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔"
"شادی۔ کس کی شادی ہورہی ہے خیر سے" ڈاکٹر رانجھا
نے چونک کے کہا۔
ماسی کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا۔ "رانجھے عقل کی بات
بھی کیا کر کبھی اور کس کی شادی ہوگی یہاں۔ اس ہڈحرام
چرسی نام کے رئیس کی شادی تو ہونے سے رہی اور ہوگی تو
کسی چڑیل سے ہوگی۔"
"تم کیا کم ہو کسی چڑیل سے۔ اپنے خاندان میں دیکھو

میرے لیے کوئی چاند سی چڑیل" رئیس بولا اور ماسی نے اس
کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔
"اف قسم اللہ کی۔ کیا پہلوانوں والا ہاتھ ہے۔ کمر کے
سب مہرے کھسک گئے۔"
"چل پٹڑ دیر سے سہی۔ لیکن تو نے اچھا کیا۔ میں نے تو
بہت پہلے کہا تھا تجھ سے۔ نیلم جیسی لڑکی کہاں ملے گی تجھے
سارے جہان میں۔"
نیلم کا چہرہ خفت اور حیا سے لال پڑ گیا۔
میں نے کہا "میں شادو سے شادی کررہا ہوں ماسی۔"
میرے الفاظ کا اثر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ڈاکٹر
رانجھا کی روشن مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ماسی ہیر پر جیسے سکتہ
طاری ہوگیا۔ چند منٹ پہلے کا خوشگوار ماحول پھر غم زدہ ہوگیا۔
رئیس کی شوخی بھی ختم ہوگئی۔
"تم۔ شادو سے شادی کررہا ہے" بے یقینی کے یہ الفاظ
ماسی ہیر نے بڑی مشکل سے ادا کیے۔
"ہاں اور اس میں میری ماں کی جگہ تم جاؤ گی برات لے
کر' دلہن کے گھر۔ اسے اپنی بہو بنا کے لاؤ گی اپنے گھر۔"
ایک طویل خاموشی کے بوجھل سکوت کے بعد ماسی نے
گہری ٹھنڈی سانس لی "اچھا۔ تو کہتا ہے۔ تو یہ بھی کروں
گی۔ اور کیا کروں میں آخر۔ یہ تیری خوشی ہے تو سمجھ لے
میری بھی خوشی ہے۔" اس نے آنکھوں میں آنے والے
مایوسی اور نئے دکھ کے آنسوؤں کو آنکھوں تک آنے سے
پہلے ہی روک لیا۔
ڈاکٹر رانجھا نے بھی ایک آہ بھری "وہ کیا ہے پتر جی۔ کہ
فیصلہ کرلیا ہے تم نے تو ٹھیک ہے ورنہ پھر سوچ لو۔"
نیلم نے کہا "بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے ناصر نے
اور میں سمجھتی ہوں کہ یہی اس مسئلے کا حل ہے۔"
ڈاکٹر رانجھا نے سر ہلایا "سچ کہا تم نے' سارے مسئلے
اسی سے پیدا ہوئے تھے۔ شادو کی ناصر کے ساتھ شادی نہ
ہونے سے۔"
مجھے ان سب کی مایوسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ان میں سے
کوئی دل سے خوش نہیں تھا۔ بس وہ میرا دل رکھنے کے لیے
خوشی کا اظہار کرنے پر مجبور تھے۔ ان کے رویے نے مجھے
ایک افسوس ناک احساسِ جرم سے دوچار کردیا تھا لیکن میں
نے خود کو تسلی دی کہ ہر بار جب ایک لڑکا اور لڑکی ماں باپ کی
مرضی کے خلاف اپنی پسند کی شادی کرتے ہیں تو دوست
احباب اور سارے خاندان کا ردِعمل ایسا ہی ہوتا ہے مگر پھر
وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔ روٹھے
ہوئے من جاتے ہیں۔ زبردستی بہو بن جانے والی لڑکی کو
خاندان کی عزت تسلیم کرلیا جاتا ہے اور جب پوتا آتا ہے تو
اس کی خوشیوں میں ماضی ہمیشہ کے لیے گم ہوجاتا ہے۔
اگلے چند روز میں سب ویسے ہی ہوا جیسے شادو چاہتی
تھی اور جیسا میں نے کہا۔ بھاگ دوڑ رئیس نے کی۔
احکامات ماسی ہیر صادر کرتی رہی اور سارے اخراجات نیلم
نے برداشت کیے۔ نیلم نے اپنے بابا جی کے سپرد بہت سے کام
کردیے اور دیکھتے ہی دیکھتے کارڈ چھپ کر آگئے۔ تقسیم
ہوگئے۔ ماسی ہیر جس گھر سے ناراض ہوکے چلی گئی تھی
اسے دلہن کے استقبال کے شایانِ شان بنادیا گیا۔
شادو کو اس کی کوٹھی میں پہنچادیا گیا تھا جہاں باہر مسلح
گارڈ پہلے کی طرح موجود تھے۔ ماسی ایک طرف معروف
تھی۔ ڈاکٹر رانجھا نے شادو کے گھر کو اپنا ٹھکانا بنالیا۔ ایک
گاڑی میری تھی جسے میں لیے پھرتا تھا۔ دوسری نیلم کی تھی
جسے شوفر چلاتا تھا۔ تیسری شادو کی تھی۔ اس کا شوفر
ڈرائیو کرتا تھا۔
مجھے نہیں معلوم کہ حاسدوں' بدخواہوں اور کمینے لوگوں
نے اس شادی پر کیا بھبرے کسے اور کیا حاشیہ آرائی کی۔ میں
نے اپنے کان بند کرلیے تھے اور سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی
بری بات کا جواب دینا تو درکنار نوٹس تک نہ لیں۔
شادی ایک شاندار تقریب تھی۔ اس میں مہمان تو
سو سوا سو ہی تھے اور ان میں بھی اکثریت نیلم کے مہمانوں کی
تھی۔ چیدہ چیدہ فلمی ستاروں کی آمد نے پریس کو کھینچ لیا تھا۔
ہاشمی اینڈ کمپنی کے تمام لوگ شادو کے مہمان تھے۔ وہ سب
ہاشمی صاحب کے ساتھ ان کی پہلی شادی اور پھر ان کی آخری
رسوم میں بھی ایسے ہی پیشہ ورانہ خوش اخلاقی اور وضع
داری کے ساتھ شریک ہوئے تھے۔
میں نے زندگی کی ساری تلخ یادوں کو ماضی کے نہاں
خانوں میں ہمیشہ کے لیے دفن کردیا۔ ایک پُرامید مستقبل کی
خوشیوں کے ساتھ میں نے شادو کو اپنا شریکِ حیات بنالیا اور
اس رات جب میں نے حجلہ عروسی میں اسے دلہن کے روپ
میں بیٹھی بنا دیکھا تو میرا دل خوشی سے دیوانہ وار رقص کررہا
تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں چلا چلا کے سارے زمانے سے
کہوں' پالیا۔ میں نے پالیا۔ بالآخر میں نے شادو کو پالیا۔ وہ
میری تھی' وہ میری ہے۔ وہ میری رہے گی۔
میری زندگی کی سب سے خوب صورت رات بڑے
انتظار کے بعد آئی تھی۔ اس کے لیے میں بڑی آزمائشوں
سے گزرا تھا اور بہت خوار ہوا تھا مگر مشکل سے ملنے والی
خوشی زیادہ بیش قیمت اور انمول ہوتی ہے۔
صبح میں جاگا تو شادو آنکھیں بند کیے نہ جانے خواب میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا دیکھ رہی تھی کہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر یوں اتر آئی تھی جیسے برگِ گل پر سورج کی پہلی کرن۔ ایک دلہن کے روپ میں وہ کسی مصور کے کمالِ فن کا شاہکار لگتی تھی جس نے ایک پیکرِ حسن کی تخلیق کے بعد موقلم توڑ دیے ہوں۔ میں نے ایک انگلی سے اس کے ہونٹوں کو چھوا تو اس نے خوابناک نظروں سے مجھے دیکھا۔ مسکرائی اور کروٹ بدل کے پھر سو گئی۔

غسل سے فارغ ہو کے میں نے کپڑے بدلے۔ میرا پرس شیروانی کی جیب میں ہی تھا جو بطور خاص شادی کے لیے ریڈی میڈ خریدی گئی تھی۔ پرس کے ساتھ ہی میرے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ آگیا اور نیچے گر گیا۔

میں نے پرزہ اٹھا کے دیکھا۔ اس پر ٹائپ کے حروف میں ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ "شاہد کو TERMINAL بلڈ کینسر ہے۔ یہ بات نیلم جانتی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میری نظروں کے سامنے رات پھیل گئی۔ میں نے خود کو سنبھالا اور آہستہ آہستہ دن کا اجالا واپس آنے لگا۔ یہ کسی بدخواہ کی حرکت ہے۔ یہ ایک ظالمانہ جھوٹ ہے۔ سنگدلانہ مذاق ہے۔ آخر میری جیب میں یہ پرچا کیسے آگیا۔ نکاح کے بعد بہت سے لوگ مجھے مبارک باد دینے کے لیے مجھ سے گلے ملے تھے۔ انہی میں سے کسی نے موقع پا کے بڑی صفائی سے یہ پرزہ شیروانی کی جیب میں ڈال دیا۔ آخر ایسا کون تھا اس مجمع میں۔ جہاں خاص خاص لوگ ہی بلائے گئے تھے۔ اور یہ بات نیلم جانتی ہے۔

میں باتھ روم سے نکلا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا۔ شادو اسی طرح آسودگی اور سکون کی گہری نیند میں تھی۔

ماسی ہیر جاگ رہی تھی۔ نماز سے فارغ ہو کے وہ کچن میں اپنے لیے چائے بنا رہی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی۔ "ناصر کیا بات ہے؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی "اب کیا بات ہو سکتی ہے ماسی!"

"اتنی جلدی اٹھ گیا تو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا تیری؟"

میں نے کہا "طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔"

میں نے فون کا ریسیور اٹھا کے نیلم کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس وقت میرا ذہن امید اور ناامیدی کی کشمکش کا شکار تھا۔

○☆○

میرا ذہن امید اور ناامیدی کی کشمکش کا شکار تھا۔ یہاں کھڑے رہنے یا چوکیدار سے بحث کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔

میں نے موبائل فون پر ڈاکٹر کمال سے رابطہ کیا مگر وہ اسپتال میں کہیں راؤنڈ پر تھا۔ یہ پرانا کلینک نہیں تھا جہاں کا سارا عملہ دو ہی افراد پر مشتمل تھا۔ ایک خود ڈاکٹر صاحب اور دوسری اس کی فرشتہ سیرت معاون کون۔ یہاں مجھ سے بات کرنے والی کوئی اجنبی آپریٹر تھی۔

میں نے کہا "کیا میں کوئن سے بات کر سکتا ہوں؟"

"کوئن؟ کون ہیں وہ سر؟"

میں نے کہا "بھئی وہ ڈاکٹر کمال کی اسسٹنٹ تھیں۔ جب وہ ایک کلینک چلاتے تھے۔ ڈسپنسر اور نرس سب کچھ تھیں۔"

"آئی ایم سوری سر۔ میں انہیں نہیں جانتی۔"

میں نے مایوسی سے کہا "اچھا۔ کیا ڈاکٹر کمال کے گھر کا نمبر مل سکتا ہے' وہ پرانے گھر میں نہیں ہیں۔"

"وہ PREMISE میں رہتے ہیں سر۔ آپ کون ہیں؟"

"میں ان کا ایک دوست ہوں۔ قمر۔ میرا مطلب ہے مسز قمر ہوں تو انہیں میرا نام بتانا۔ ناصر عظیم۔"

"پلیز ہولڈ کریں" وہ بولی۔

میں چند لمحے بے سُری موسیقی سنتا رہا پھر آپریٹر نے کہا۔ کہ "ان کے گھر سے جواب نہیں مل رہا ہے سر۔"

ظاہر ہے اس کے بعد میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں خود اسپتال پہنچ جاؤں مگر رئیس نے مجھ سے اختلاف کیا۔

"ابے یار' کچھ دیر بعد پتا چل جائے گا ڈاکٹر صاحب سے۔ تیرا وہاں ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ شاہ عالم کو پہچان لیا کسی نے تو مشکل پیدا ہو گی ڈاکٹر صاحب کے لیے۔ خواہ مخواہ اسپتال میں تیری سیاست پہنچ جائے گی۔"

اس کی بات سے رخشی نے بھی اتفاق کیا "تم بلاوجہ پریشان ہو۔ ممکن ہے انہوں نے یہ پرانا آسیب زدہ بنگلا بیچ دیا ہو۔"

"جسے تم آسیب زدہ اور پرانا کہہ رہی ہو' وہ کرنل خان کے لیے روایت پسندی کی مثال تھا۔ یہ قدیم طرز کے بنگلے پرانے ریٹائرڈ فوجی بہت پسند کرتے ہیں۔ اسے چھوڑ کے وہ کسی ماڈرن کوٹھی میں جا ہی نہیں سکتے تھے۔"

"لیکن وہ جا چکے ہیں" رخشی نے کہا "چوکیدار نے صاف الفاظ میں بتا دیا ہے تمہیں کہ مکان کسی سیٹھ نے خرید لیا ہے۔"

میں خاموش ہو گیا۔ ہم نے شاہ عالم ہاؤس کا رخ کیا۔ وہ جگہ جہاں زندگی کے سارے ہنگامے تھے اور کہا کہی تھی' جو محلاتی سیاست کا مرکز تھی اور شاہ عالم کی بلند خواہشات اور

ہوس جاہ کی آئینہ دار تھی' اب جائے عبرت سرائے فانی کا نمونہ ہو گئی تھی۔ اس کی خانہ ویرانی سے خوف آتا تھا۔

دروازے پر ہمیں چیک کرنے والا کوئی سیکیورٹی گارڈ نہیں تھا۔ رخشی نے مجھے چابی دی تو میں نے بھاری بھرکم فولادی گیٹ کے لاک کو کھولا۔ تب میں مارخان گاڑی کو اندر لے گیا تو میں نے پھر گیٹ بند کر دیا۔

اندر ہر چیز پر گرد و غبار کی تہ کا خاکستری رنگ غالب تھا۔ پرانے ملازم گلاب اور چنبیلی نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ شاہ عالم کی سیکریٹری کا آفس اور ٹیلی فون ایکس چینج مقفل تھے۔ رخشی نے مجھے تہ خانے کی چابی دی اور خود رئیس کی مدد سے سوٹ کیس نکالنے لگی۔ میں تب مارخان کے ساتھ گیراج میں پہنچا اور وہاں سے تہ خانے میں اتر گیا۔

تہ خانے کا ایک حصہ پارٹی کے ریکارڈز سے بھرا ہوا تھا۔ نیچے ڈائریکٹ آنے والی ٹیلی فون لائن ابھی تک کاٹی نہیں گئی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے کس کا نمبر ملایا۔ وہ اب شاہ عالم کی جگہ پی جے ایف کا چیئرمین ہو گیا تھا مگر اس کی چیئرمینی کو قریشی نے تسلیم نہیں کیا تھا چنانچہ پی جے ایف (قریشی گروپ) الگ ہو گیا تھا اور اس کا سربراہ وہ خود تھا۔ دونوں گروپ خود کو شاہ عالم کی پی جے ایف کا حقیقی وارث قرار دیتے تھے اور سرعام ایک دوسرے کی پگڑی اچھالتے تھے۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس ملک کی سیاسی روایت میں یہ شامل تھا۔

کس کی طرف سے کسی نرم و شیریں اور بڑی لچک دار آواز والی لڑکی نے "السلام علیکم سر!" کہا۔ اس نے مجھ سے نام پوچھا اور پھر ہولڈ کرنے کو کہا۔

کچھ دیر بعد کس کی آواز سنائی دی "کون ہو تم؟ کہاں سے بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "ابھی تو اسی دنیا سے بات کر رہا ہوں۔ آواز سے پہچان سکتے ہو تم۔"

"شاہ جی۔ تم واقعی۔ شاہ عالم ہو" وہ بولا "کہاں غائب ہو تم؟"

میں نے کہا "میں صرف اپنی جان کے دشمنوں کو نظر نہیں آتا۔ اپنوں کی آنکھ مجھے دیکھ سکتی ہے۔"

"مجھ سے کوئی کام ہے؟" اس نے بے رخی سے کہا۔

"کام ہے تمہارے مطلب کا۔ سنا ہے تم چیئرمین بن گئے ہو۔ ادھر وہ قریشی بھی ایسے ہی دعوے کرتا ہے۔"

کس نے اسے گالی دی "دو چار بے وقوف بنانے والے مل گئے ہیں اسے تو غلط فہمی ہو گئی ہے اسے۔"

میں نے کہا "اگر پارٹی کا ریکارڈ اسے مل جائے تو تم کیا کرو گے؟"

"پارٹی کا ریکارڈ! وہ تو تمہارے قبضے میں تھا" وہ بولا۔

"اس نے مجھے آفر کر دی ہے۔ بہت اچھی TERMS پر۔"

"تم کو وہ کیا قیمت دے رہا ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں اس سے زیادہ دے سکتا ہوں تمہیں۔"

"وہ دس لاکھ دے رہا ہے مگر ہم بات کر سکتے ہیں۔ خاموشی اور مکمل رازداری کی شرط ہے ورنہ یہ سمجھ لو کہ تمہاری چیرمینی گئی۔ میں ریکارڈ سرپرائز کے اپنے ساتھ نہیں لاؤں گا۔ ہمارے درمیان شریفانہ معاہدہ ہو گیا تو ریکارڈ تمہیں مل جائے گا بعد میں۔ یہ ون ٹو ون میٹنگ ہو گی۔ میرے اور تمہارے درمیان۔"

"مجھے منظور ہے۔ میں کہاں آؤں؟"

"فورٹریس اسٹیڈیم آجاؤ۔ یہ سودا نقد ہو گا' اگر منظور ہے تو شیزان میں انتظار کرو میرا۔ ٹھیک آٹھ بجے۔"

پھر میں نے قریشی کو فون کیا۔ اس سے بھی میری گفتگو ایسی ہی رہی اور میں نے اسے بھی شیزان میں بلایا مگر تھوڑے سے فرق سے' میں نے اسے ساڑھے آٹھ کا ٹائم دیا اور صاف بتا دیا کہ کیش ڈیل ہو گی ورنہ کس نو بجے اوپن کر کے ریکارڈ حاصل کر لے گا اور ظاہر ہے اس کے بعد قانونی طور پر چیئرمین وہی بن جائے گا۔ یہ ایک پُرلطف کھیل تھا جو میں ان دونوں کو سبق سکھانے کے لیے کھیلنا چاہتا تھا۔ سیاست کے میدان میں شاہ عالم جیسے مداری کا آخری کھیل۔

اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں اچھل پڑا۔ اس وقت اس نمبر پر کس کا فون آسکتا ہے آخر؟ میں نے سوچا۔

میں نے تب مارخان کو اشارہ کیا کہ ریسیور اٹھائے۔ اس نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو۔ ہم تب مارخان بولتی۔ کیا۔۔۔ خانہ خراب کا بچہ۔۔۔ ہم کو چوہا بولتی۔۔۔ تمہارا باپ چوہا ہوتی۔ تمہارا اماں چوہیا ہوتی۔"

اس نے غصے میں فون بند کر دیا اور میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا۔

"کون تھا یہ بدتمیز؟" میں نے کہا۔

"پتا نہیں صاب۔ ہم کو بولتی کہ تم چوہے دان میں پھنس گئی ہے ابھی۔۔۔ شاہ عالم۔"

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ آخر کسی نے میرا نام لیا تھا تو یہ خطرناک بات تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس ٹیلی فون کال نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ شاہ عالم کو یہاں فون کرنے والا وہی ہوسکتا تھا جس نے اسے یہاں آتے دیکھا ہو اور شناخت کرلیا ہو۔

میرا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ ایک نظر میں کوئی مجھے آسانی سے نہیں پہچان سکتا تھا لیکن میرے ساتھ رخشی تھی جسے شاہ عالم کی بیوی کے طور پر پہچاننے والے بہت ہوں گے۔ ان میں ایسے بھی کم نہ ہوں گے جو اس حسین اور مال دار عورت کی تنہائی کے غمگسار بننے کی حسرت دل میں لیے پھر رہے ہوں گے اور کچھ فطری بدنظر اس تاک میں رہتے ہوں گے کہ رخشی کس کے ساتھ ہنستی کھیلتی یا گھومتی پھرتی دکھائی دے تو وہ افسانے مشہور کریں۔

رخشی کا حسن یوں بھی نگاہوں کے لیے پرکشش تھا۔ کسی نے اسے دیکھا اور پھر یہ دیکھا کہ وہ کس کے ساتھ ہے۔ وہ اجنبی ہوتا تو میری خوش قسمتی پر رشک کرتا اور گزر جاتا مگر دیکھنے والے نے میری صورت پر بھی غور فرمایا اور میری بدقسمتی کہ مجھے پہچان لیا۔ میں نے صرف اپنا لباس اور حلیہ بدلا تھا' میرا چہرہ ابھی تک وہی تھا۔

وہ صرف جاننے والا ہوتا تو صرف حیران ہوتا کہ شاہ عالم نے روپوشی کے لیے کیسا مضحکہ خیز حلیہ بنا رکھا ہے۔ ممکن ہے رخشی کو میرے ساتھ دیکھ کے اسے یہ صدمہ الگ ہوتا کہ شاہ عالم کا سب کے سامنے اپنی بیوی کو طلاق دینے کا اعلان بھی ایک سیاسی مداری کے کھیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ اپنے حلقۂ احباب میں یا گھر میں بڑے افسوس کے ساتھ یہ سنسنی خیز انکشاف کرتا تو سننے والے دم بخود رہ جاتے اور کانوں کو ہاتھ لگاتے کہ توبہ توبہ' کیسی بے شرمی ہے اور بدمعاشی ہے۔ یعنی طلاق کے بعد بھی اکٹھے رنگ رلیاں مناتے پھر رہے ہیں دونوں۔ قربِ قیامت کی نشانی ہے بھائی لیکن مجھے پہچاننے والے نے جو کچھ فون پر کہا اس سے کچھ اور ظاہر ہوتا تھا۔

شاہ عالم چوہے کی طرح چوہے دان میں پھنس گیا ہے۔ یہ الفاظ شاہ عالم کے کسی دشمن کے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔

خیر سے میرے دشمن بھی کم نہ تھے اور ان سب کے پاس دشمنی کا تعلق نبھانے کے اپنے اپنے اسباب تھے۔ قدرِ مشترک صرف ان کا مقصد تھا جو صرف ایک تھا۔ ایک بار تو دوسروں کی غلطی یا اپنی خوش قسمتی سے شاہ عالم بچ گیا۔ مارا گیا کوئی اور اس کا ہم شکل مگر دوسری بار ایسا پکا کام ہونا چاہیے کہ وہ سو فیصد اللہ کو پیارا ہوجائے اور پھر کسی بہانے قبر سے نکل کے واویلا نہ مچائے کہ میں تو سو فیصد زندہ ہوں۔

اس کی جگہ مرنے والا کوئی تیسرا ہم شکل تو آنے سے رہا۔

تاہم میرے یعنی شاہ عالم کے دشمن اتنے بے وقوف بھی نہ تھے کہ پہلے فون کرکے مجھے اطلاع دیتے کہ جناب آپ چوہے کی طرح پھنس گئے ہیں۔ اتنی نادان تو ملی بھی نہیں ہوتی۔ وہ کسی نوٹس کے بغیر چوہے کو شکار کرلیتی ہے اور بس۔ مجھے فون کرنا تو مجھے ہوشیار کرنے کے مترادف تھا کہ ابھی وقت ہے۔ بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ یا پھر مقابلے کے لیے تیار ہوجاؤ' ہم آرہے ہیں۔

پھر ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ زیرِ زمین اس تہ خانے کے فون نمبر کا علم پہلے صرف شاہ عالم کو تھا یا اس کی خلوت کے رازداروں کو۔ ان میں ایک اس کی باضابطہ منکوحہ رخشندہ تھی اور دوسری دروغ برگردن راوی۔ اس کی بے ضابطہ غیر منکوحہ شبنم۔ تیسرا میں ہوگیا تھا جس کو حالات کے جبر نے شاہ عالم کی بیوی کے شوہر کا مقام دے دیا تھا۔ چنانچہ اب چوتھا شخص وہ بھی ہوسکتا تھا جسے خود رخشی یہ مقام دینے پر آمادہ نظر آتی تھی۔

میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی تو میں نے تمیں مارخان کو حکم دیا "دیکھو کون ہے؟"

تمیں مارخان ابھی تک غصے میں تھا۔ "نئیں صاب۔ وہ ٹلی کا بچہ آپ کو چوہا بولتی۔"

میں نے کہا "بک بک مت کرو' فون اٹھاؤ۔"

اس نے فریادی انداز میں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔ "خدایا۔ کیسا ناانصافی ہوئی دنیا میں۔ بک بک وہ کرتی' ناپاک جانور کا بیٹا' الزام ہم پر آتی' ہیلو۔"

میں غور سے تمیں مارخان کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم پٹاخے کی طرح اچھلا "کیا۔ تم ایسا بولتی' قسم پہ خدا' تم سامنے آتی تو ہم بتاتی۔"

میں نے کہا "اب کیا کہہ دیا اس نے۔ غصے میں تم سے زیادہ تمہاری مونچھیں کانپ رہی ہیں۔"

اس نے ریسیور مجھے تھمادیا "صاب وہ پوچھتی۔ تمہارا مونچھ بڑا ہے یا گدھے کا کان؟"

میں نے ہیلو کہا تو دوسری طرف سے فرید کا قہقہہ سنائی دیا۔ "بس۔ حالت خراب ہوگئی دونوں کی۔ طرم خان کی اور تمیں مارخان کی۔"

میں نے کہا "میں واقعی ڈر گیا تھا پہلے کہ شاید کسی نے دیکھ لیا ہے ہمیں۔"

"جیسی روح ویسے فرشتے۔ محافظ بھی خوب چن کے رکھا ہے آپ نے۔ آدھا وہ آدھے تم۔ دونوں مل کے پورے

ل۔"

میں نے کہا "اس کے قدیما موچھوں کو چھوٹا سمجھا جائے ر واقعی پاگل ہوجاتا ہے۔"

"فون یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ میں نہیں آسکتا۔ کام میں پھنس گیا ہوں۔"

میں نے کہا "یعنی امپریس کرنا چاہتے ہو مجھے کہ وکالت شروع کرتے ہی تم کتنے مصروف ہوگئے ہو۔ مقدمات کی بھرمار ہوئی ہے اور مؤکل قطاریں بنائے کھڑے ہیں۔"

"یہی نہیں۔ چوری ڈکیتی اور جرائم کی وارداتوں میں تعریف اضافہ ہوا ہے۔ دراصل سب کو معلوم ہوگیا ہے فرید عباسی کتنا قابل وکیل ہے۔ ایک پیشی میں ضمانت سری میں ساعت' تیسری میں رہائی۔"

"رہائی قیدِ حیات سے۔ سارے دکھوں سے نجات۔"

وہ ہنسنے لگا "آزمائش شرط ہے۔ تم کچھ کرکے دکھاؤ اور دیکھو میرا کمال۔ ایک خبر بھی ہے تمہارے لیے۔ تمہارا دشمن کم ہوگیا ہے۔"

میں نے کہا "دشمن تو بہت ہیں۔ تم کس کی بات کررہے ہو؟"

وہ بولا "خبر کے مطابق مسٹر عثمان نے' جسے تم ایک بار اغوا کرکے قتل کرچکے تھے' خودکشی کرلی ہے۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں پنکھے سے لٹک کر پھانسی لگالی۔"

"کیا یہ اخبار کی اطلاع ہے؟"

"ہاں۔ شام کے ایک اخبار نے اسے خبر سمجھا اور سیاق سباق کے حوالے سے شائع کیا ہے کہ یہ وہی عثمان ہیں جن کے اغوا اور قتل کے الزام میں شاہ عالم چیئرمین پی جے ایف بھی حراست میں لیا گیا تھا۔ ان کے ساتھ ایک اور درباری شخصیت خالد صاحب بھی اغوا ہوئے تھے مگر کچھ عرصہ پُراسرار طور پر روپوش رہنے کے بعد انہیں بازیاب کرلیا گیا تھا۔"

میں نے کہا "خودکشی کی کوئی وجہ؟"

"ہاں۔ وجہ مرحوم خود تحریر فرما گئے تھے جس کے مطابق مسلسل بیماریوں' ناکامیوں اور مالی نقصانات نے انہیں مسلسل مایوس کردیا ہے اور وہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں پاتے کہ اس زندگی کا خود ہی خاتمہ کرلیں۔ اپنے قتل کے وہ خود ہی ذمے دار ہیں اور اس سلسلے میں کسی دوسرے شخص پر کوئی الزام نہیں۔"

میں نے کہا "رسماً تو مجھے کہنا چاہیے کہ اللہ مغفرت کرے مرحوم کی اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے مگر میں کہوں گا کہ خس کم جہاں پاک۔ ایسی زندگی کا انجام یہ حرام موت نہایت مناسب ہے۔"

"یار تبصرہ شروع کردیا۔ پوری خبر تو سن لو پہلے۔ جن لواحقین کے حق میں تم نے دعا کی ہے' انہوں نے اسے خودکشی تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے۔"

میری دلچسپی بڑھ گئی "اچھا؟ کیا تحریر جعلی تھی؟"

"نہیں۔ تحریر خود عثمان کی تھی لیکن خودکشی کے جو اسباب لکھے گئے ہیں' ان سے لواحقین اتفاق نہیں کرتے۔ یہ پرسوں کا واقعہ ہے۔ کل صبح تک خبر کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اخباروں میں جرائم کی اور وارداتوں کی رپورٹ میں صرف اتنا ذکر تھا کہ شہر میں ایک شخص نے پنکھے سے لٹک کے خودکشی کرلی۔ شوہر کے ہاتھوں بیوی اور آشنا کا قتل۔ تیل کا چولھا پھٹنے سے ایک عورت ہلاک۔ مرنے والوں کے نام بھی تھے مگر ایسی خبروں کا اب کون نوٹس لیتا ہے۔"

"ہاں یار۔ قتل' اغوا' خودکشی اور ڈکیتی ایک معمول بن گئے ہیں۔ لوگوں کی بے حسی بھی فطری ہے" میں نے کہا۔

وہ بولا "کل عثمان کی بیوہ نے اس اخبار کے نمائندے کو بلایا۔"

"خاص طور پر اس ایک نمائندے کو۔؟"

"ممکن ہے اس سے کوئی رشتہ ہو یا کسی حوالے سے کوئی تعلق ہو۔ اسی لیے آج یہ خبر اتنی تفصیل سے شائع ہوئی ہے لیکن صرف ایک اخبار میں۔ عثمان کی بیوہ نے ان سب باتوں کو جھوٹ قرار دیا جو خودکشی کے نوٹ میں لکھی گئی ہیں۔ اس نے کہا کہ عثمان کو کسی قسم کی کوئی بیماری نہیں تھی۔ عام قسم کی بیماریاں تو سب کو ہوتی رہتی ہیں مگر ایسی بیماری جو لاعلاج ہو مثلاً کینسر یا جس کی وجہ سے کوئی شدید عذاب میں مبتلا ہو اور تکلیف ناقابلِ برداشت ہو۔ بیماری بہت لمبی ہوجائے جس سے کھانا پینا چھوٹ جائے' آدمی ڈیپریشن کا شکار ہوجائے' ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اسے بی پی ہوتی' جو اب تقریباً ناپید ہے یا نچلے طبقے تک محدود ہے اور سو فیصد قابلِ علاج بھی ہے۔ معدے کا السر' آدھے سر کا درد' مرگی۔ ایسے پریشان کرنے والے امراض بہت ہیں مگر عثمان بالکل صحت مند تھا۔ اسے تو بلڈ پریشر یا شوگر جیسی عام بیماری تک نہیں تھی۔"

میں نے کہا "کیا معلوم کوئی ایسی بیماری ہو جس کا علم اس کی بیوی کو بھی نہ ہو۔ خود عثمان کو اچانک پتا چلا ہو کہ اس کی زندگی بہت مختصر ہوگئی ہے اور شدید ڈیپریشن کے دورے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے خود کو پُرعذاب موت سے بچانے کے لیے خودکشی کرلی۔"

"یار یہ تجزیہ اور تبصرہ بعد میں نہیں ہوسکتا" وہ جھلا کے بولا۔

میں نے کہا "سوری۔ میں سمجھا خبر ختم ہوگئی' آگے فرمائو۔"

"بیماری والی بات میں آپ کے نقطۂ نظر کو تسلیم کیا جاسکتا تھا اور وہ اخباری نمائندہ بھی اتنی عقل ضرور رکھتا تھا کہ اس نے بھی یہ سوال کیا مگر عثمان کی بیوہ نے کہا کہ باقی سب بھی جھوٹ ہے تو یہ بات کیسے سچ ہوسکتی ہے۔ اسے کوئی ناکامی نہیں ہوئی تھی۔ مسلسل ناکامی کا کیا سوال۔ وہ خوش، خرم اور پُراعتماد تھا۔ اس کی بیوی کا دعویٰ ہے کہ عثمان مجھ سے بہت محبت کرتا تھا اور مجھ سے کوئی بات چھپاتا نہیں تھا۔ اگر اسے ناکامی سے مالی نقصان ہوتا تو یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ کبھی کبھار تو بزنس میں سب کو نقصان ہوجاتا ہے لیکن عثمان کی آمدنی میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کا کوئی الگ بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔ وہ سب کچھ اپنی بیوی کے حوالے کردیتا تھا کیونکہ ان کا ایک مشترکہ بینک اکاؤنٹ برسوں سے ایک ہی بینک کی برانچ میں چل رہا تھا۔ وہ دونوں ضرورت کے مطابق اس میں سے رقم نکلواتے رہتے تھے۔ وہ مالی طور پر آسودہ اور خوشحال تھے اور عثمان کو مالی پریشانی لاحق نہیں تھی۔ اس کا ثبوت ان کا بینک اکاؤنٹ ہے جس میں ہر ماہ معقول رقم کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ گزشتہ ایک سال کے اعداد و شمار سے اس بات کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ عثمان کو نہ کسی ناکامی کا سامنا تھا اور نہ مالی نقصان کا۔"

"کیا وہ اپنے شوہر کی خودکشی کو قتل کہتی ہے؟"

"ہاں۔ شدتِ جذبات میں اس نے مصلحت کے تقاضوں کو سمجھے بغیر یہ بات صاف کہہ دی ہے کہ اس کے شوہر سے خودکشی کا نوٹ زبردستی لکھوایا گیا ہوگا تاکہ قاتل محفوظ رہیں۔ وہ خودکشی کرہی نہیں سکتا تھا۔ وہ مضبوط اعصاب کا مالک اور کبھی مایوس نہ ہونے والا شخص تھا۔ دو سال کی رفاقت کے بعد یہ بات ایک بیوی سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا۔"

میں نے کہا "یار فرید۔ اس عورت کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر یہ سب کچھ اس نے ایک اخباری نمائندے کو کیوں بتایا؟ اس نے پولیس سے کیوں نہیں کہا۔ آخر پولیس سے اس کا بیان تو لیا ہوگا۔ ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے۔"

"رائٹ۔ پولیس نے بیان لیا تھا اور بیوی کا کہنا ہے کہ اس نے ایک تھانے دار کے سامنے بھی یہی کہا تھا مگر اس تھانے دار نے جانتے بوجھتے اس کے بیان کو اہمیت نہیں دی اور اپنی بات پر اڑا رہا کہ یہ صاف خودکشی کا کیس ہے۔ عثمان کی تحریر ملی ہے تو اسے دبانا ناممکن ہوگا۔ اب تک دوسرے اخبار والے بھی پہنچ گئے ہوں گے۔ ان کے پاس تھی اور وہ کسی لمبے جھنجٹ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ قتل کا مقدمہ بناتے تو پھر تفتیش بھی ضروری ہوجاتی۔ انہوں نے خودکشی کے کیس کو داخل دفتر کردینا بہتر سمجھا۔ بیوہ کا نظریں بلا سکتی تھی وہ۔ یا پریس کلب پہنچ جاتی مگر اس نے تو یہ الزام بھی لگایا ہے کہ پولیس نے کچھ واقعاتی شہادتوں کو نظرانداز کیا جن سے یہ قتل ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی اخباری زبان میں۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

"بالکل اسی جملے پر خبر کا اختتام ہوا ہے۔"

"اس نے شک نہیں ظاہر کیا کسی پر؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "نہیں۔ ممکن ہے وہ دشمنوں کو جانتی ہو مگر ان کا نام لیتے ہوئے ڈرتی ہو۔"

"تیرا کیا خیال ہے بھائی۔ اسے معلوم ہوگا کہ عثمان کے دوست اور دشمن کون لوگ تھے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا کس کے ساتھ تھا اور کاروبار کیا تھا۔"

"کہتی تو یہی ہے وہ۔"

"سب خوش فہمی ہے اس کی" میں نے کہا "عثمان جیسے لوگ ایسی غلطی نہیں کرسکتے کہ اپنے کاروباری راز بھی اپنی بیوی کو بتادیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے بہت محبت ہوگی بیوی سے۔ وہ ڈرائے باز آدمی تھا۔ گھر کے پُرسکون ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے صرف بیوی سے پیار کا ناٹک بھی رچاتا ہوگا۔ روپیہ پیسہ سب لا کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوگا۔"

"یار یہ حقیقت بھی تو ہوسکتی ہے۔ کیا ایک چور ڈاکو یا اسمگلر اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں کرسکتا؟"

میں نے کہا "وہ ساری دنیا گھومنے والا عیاش مزاج شخص تھا۔"

فرید نے کہا "بالکل تھا مگر ایک عیاش مزاج اور بدکردار شخص بھی بیوی سے محبت کرسکتا ہے۔ خواہ باہر اس کے تعلقات سیکڑوں سے ہوں۔"

"اچھا وکیل صاحب۔ میں مان لیتا ہوں کہ وہ لیلیٰ بھوں تھے مگر یہ نہیں مان سکتا کہ اس کی بیوی کو شوہر کے اصل کاروبار کا علم بھی ہوگا۔"

"اگر ہوا۔ بفرضِ محال۔ تو یہ بڑی خطرناک بات ہوئی۔"

"ہاں۔ وہ خود بھی ماری جائے گی" میں نے کہا "معلوم کرنے والے سب معلوم کرلیں گے۔ ایک بات اخبار میں آئی ہے تو اسے دبانا ناممکن ہوگا۔ اب تک دوسرے اخبار والے بھی پہنچ گئے ہوں گے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور سے بات نہ کرے۔ ورنہ ہوجاتی۔ انہوں نے خودکشی کے کیس کو داخل دفتر کردینا بہتر سمجھا۔ بیوہ کا نظریں بلا سکتی تھی وہ۔ یا پریس کلب پہنچ جاتی مگر اس نے تو یہ الزام بھی لگایا ہے کہ پولیس نے کچھ واقعاتی شہادتوں کو نظرانداز کیا جن سے یہ قتل ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی اخباری زبان میں۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

"بالکل اسی جملے پر خبر کا اختتام ہوا ہے۔"

"اس نے شک نہیں ظاہر کیا کسی پر؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "نہیں۔ ممکن ہے وہ دشمنوں کو جانتی ہو مگر ان کا نام لیتے ہوئے ڈرتی ہو۔"

"تیرا کیا خیال ہے بھائی۔ اسے معلوم ہوگا کہ عثمان کے دوست اور دشمن کون لوگ تھے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا کس کے ساتھ تھا اور کاروبار کیا تھا۔"

"کہتی تو یہی ہے وہ۔"

"سب خوش فہمی ہے اس کی" میں نے کہا "عثمان جیسے لوگ ایسی غلطی نہیں کرسکتے کہ اپنے کاروباری راز بھی اپنی بیوی کو بتادیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے بہت محبت ہوگی بیوی سے۔ وہ ڈرائے باز آدمی تھا۔ گھر کے پُرسکون ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے صرف بیوی سے پیار کا ناٹک بھی رچاتا ہوگا۔ روپیہ پیسہ سب لا کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوگا۔"

"یار یہ حقیقت بھی تو ہوسکتی ہے۔ کیا ایک چور ڈاکو یا اسمگلر اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں کرسکتا؟"

میں نے کہا "وہ ساری دنیا گھومنے والا عیاش مزاج شخص تھا۔"

فرید نے کہا "بالکل تھا مگر ایک عیاش مزاج اور بدکردار شخص بھی بیوی سے محبت کرسکتا ہے۔ خواہ باہر اس کے تعلقات سیکڑوں سے ہوں۔"

"اچھا وکیل صاحب۔ میں مان لیتا ہوں کہ وہ لیلیٰ بھوں تھے مگر یہ نہیں مان سکتا کہ اس کی بیوی کو شوہر کے اصل کاروبار کا علم بھی ہوگا۔"

"اگر ہوا۔ بفرضِ محال۔ تو یہ بڑی خطرناک بات ہوئی۔"

"ہاں۔ وہ خود بھی ماری جائے گی" میں نے کہا "معلوم کرنے والے سب معلوم کرلیں گے۔ ایک بات اخبار میں آئی ہے تو اسے دبانا ناممکن ہوگا۔ اب تک دوسرے اخبار والے بھی پہنچ گئے ہوں گے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور سے بات نہ کرے۔ ورنہ ہوجاتی۔ انہوں نے خودکشی کے کیس کو داخل دفتر کردینا بہتر سمجھا۔ بیوہ کا نظریں بلا سکتی تھی وہ۔ یا پریس کلب پہنچ جاتی مگر اس نے تو یہ الزام بھی لگایا ہے کہ پولیس نے کچھ واقعاتی شہادتوں کو نظرانداز کیا جن سے یہ قتل ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی اخباری زبان میں۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

"بالکل اسی جملے پر خبر کا اختتام ہوا ہے۔"

"اس نے شک نہیں ظاہر کیا کسی پر؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "نہیں۔ ممکن ہے وہ دشمنوں کو جانتی ہو مگر ان کا نام لیتے ہوئے ڈرتی ہو۔"

"تیرا کیا خیال ہے بھائی۔ اسے معلوم ہوگا کہ عثمان کے دوست اور دشمن کون لوگ تھے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا کس کے ساتھ تھا اور کاروبار کیا تھا۔"

"کہتی تو یہی ہے وہ۔"

"سب خوش فہمی ہے اس کی" میں نے کہا "عثمان جیسے لوگ ایسی غلطی نہیں کرسکتے کہ اپنے کاروباری راز بھی اپنی بیوی کو بتادیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے بہت محبت ہوگی بیوی سے۔ وہ ڈرائے باز آدمی تھا۔ گھر کے پُرسکون ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے صرف بیوی سے پیار کا ناٹک بھی رچاتا ہوگا۔ روپیہ پیسہ سب لا کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوگا۔"

"یار یہ حقیقت بھی تو ہوسکتی ہے۔ کیا ایک چور ڈاکو یا اسمگلر اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں کرسکتا؟"

میں نے کہا "وہ ساری دنیا گھومنے والا عیاش مزاج شخص تھا۔"

فرید نے کہا "بالکل تھا مگر ایک عیاش مزاج اور بدکردار شخص بھی بیوی سے محبت کرسکتا ہے۔ خواہ باہر اس کے تعلقات سیکڑوں سے ہوں۔"

"اچھا وکیل صاحب۔ میں مان لیتا ہوں کہ وہ لیلیٰ بھوں تھے مگر یہ نہیں مان سکتا کہ اس کی بیوی کو شوہر کے اصل کاروبار کا علم بھی ہوگا۔"

"اگر ہوا۔ بفرضِ محال۔ تو یہ بڑی خطرناک بات ہوئی۔"

"ہاں۔ وہ خود بھی ماری جائے گی" میں نے کہا "معلوم کرنے والے سب معلوم کرلیں گے۔ ایک بات اخبار میں آئی ہے تو اسے دبانا ناممکن ہوگا۔ اب تک دوسرے اخبار والے بھی پہنچ گئے ہوں گے۔"

"یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کسی اور سے بات نہ کرے۔ ورنہ ہوجاتی۔ انہوں نے خودکشی کے کیس کو داخل دفتر کردینا بہتر سمجھا۔ بیوہ کا نظریں بلا سکتی تھی وہ۔ یا پریس کلب پہنچ جاتی مگر اس نے تو یہ الزام بھی لگایا ہے کہ پولیس نے کچھ واقعاتی شہادتوں کو نظرانداز کیا جن سے یہ قتل ثابت ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "یعنی اخباری زبان میں۔ مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔"

"بالکل اسی جملے پر خبر کا اختتام ہوا ہے۔"

"اس نے شک نہیں ظاہر کیا کسی پر؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "نہیں۔ ممکن ہے وہ دشمنوں کو جانتی ہو مگر ان کا نام لیتے ہوئے ڈرتی ہو۔"

"تیرا کیا خیال ہے بھائی۔ اسے معلوم ہوگا کہ عثمان کے دوست اور دشمن کون لوگ تھے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا کس کے ساتھ تھا اور کاروبار کیا تھا۔"

"کہتی تو یہی ہے وہ۔"

"سب خوش فہمی ہے اس کی" میں نے کہا "عثمان جیسے لوگ ایسی غلطی نہیں کرسکتے کہ اپنے کاروباری راز بھی اپنی بیوی کو بتادیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے بہت محبت ہوگی بیوی سے۔ وہ ڈرائے باز آدمی تھا۔ گھر کے پُرسکون ماحول کو برقرار رکھنے کے لیے صرف بیوی سے پیار کا ناٹک بھی رچاتا ہوگا۔ روپیہ پیسہ سب لا کے اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوگا۔"

"یار یہ حقیقت بھی تو ہوسکتی ہے۔ کیا ایک چور ڈاکو یا اسمگلر اپنی بیوی سے اتنی محبت نہیں کرسکتا؟"

میں نے کہا "وہ ساری دنیا گھومنے والا عیاش مزاج شخص تھا۔"

فرید نے کہا "بالکل تھا مگر ایک عیاش مزاج اور بدکردار شخص بھی بیوی سے محبت کرسکتا ہے۔ خواہ باہر اس کے تعلقات سیکڑوں سے ہوں۔"

"اچھا وکیل صاحب۔ میں مان لیتا ہوں کہ وہ لیلیٰ بھوں تھے مگر یہ نہیں مان سکتا کہ اس کی بیوی کو شوہر کے اصل کاروبار کا علم بھی ہوگا۔"

"اگر ہوا۔ بفرضِ محال۔ تو یہ بڑی خطرناک بات ہوئی۔"

ایک دہشتناک واقعہ ہے۔ حوصلہ نہیں پڑتا تمہیں بتانے کا۔ جو باتیں اس نے کیں وہ فون پر نہیں بتا سکتا لیکن ہوا یہ کہ انہوں نے مجھے راستے میں ہی اتار دیا گاڑی سے اور تمہاری رخشی بھاگ گئی تیمی مارخان کے ساتھ۔"

وہ ہنسنے لگا "کیوں۔ تمہارے ساتھ کیوں نہیں بھاگی؟"

میں نے کہا "میری رفتار بہت زیادہ ہے۔ وہ میرے ساتھ نہیں بھاگ سکتی تھی اور ویسے بھی بقول فلمی شاعر۔ دل آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں۔"

"اتنی دیر تک میں تم سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے دخل درمعقولات نہیں کیا۔ آواز تک نہیں سنائی دی اس کی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی۔"

"بہت خوب۔ یہ حالت ہوگئی ہے گویا کہ کچھ دیر آواز کا نغمہ سنائی نہ دے تو اختلاجِ قلب ہونے لگتا ہے۔ ایک بات تو بتاؤ یار کہ کیا۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی؟"

"آگ لگانے والے تم ہو۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ بولا۔

"مجھ سے کیوں اس سے پوچھ لو نا۔ میں اسے عالم بالا سے بلا لیتا ہوں۔" میں نے کہا "وہ اوپر اپنی رخصتی کی تیاری کررہی ہے۔"

"چلو رہنے دو یار۔ ایسی کوئی خاص بات نہیں۔" فرید نے پھر فون بند کردیا۔

مجھے اس کی بات پر ہنسی آئی۔ خود ہی کہہ رہا تھا کہ مجھے تشویش لاحق ہو رہی تھی اور اب کہہ رہا ہے کوئی خاص بات نہیں۔ دراز میں سے سامان نکالتے ہوئے میری نظر تیمی مارخان پر گئی تو میں بھونچکا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے رقت زدہ لہجے میں کہا "صاب' آپ ایسا شرمناک بات... بولتی' ہم تو شرم سے مرجاتی۔ آپ ام کو گالی دیتی۔"

میں نے حیرانی سے کہا "یہ کیا فضول بات ہے۔ میں نے تمہیں کب گالی دی؟"

"ا۔ ابی۔ ابی آپ بولتی... توبہ خدایا توبہ۔" اس نے اپنے دونوں گالوں پر تھپڑ مارے۔ "آپ بیگم صاب کے واسطے کیا بولتی۔ ام ایسا سوچتی تو زمین پھٹ جاتی۔ ام سمندر میں گھس جاتی۔ ام پر پہاڑ گرتی۔"

میں نے کہا "ارے یار' وہ تو مذاق کی بات تھی۔"

"پتا نہیں مگر تم کیا اخبار والی تمہارے پاس بھی ہے۔"

میں نے کہا "میرے پاس؟ یہاں رخشندہ عرف رخشی نام ایک چیز ضرور ہے جو پہلے شاہ عالم کی امانت تھی اور اب ہماری امانت ہے۔"

اس نے میری بات کو گول کردیا "شبنم چاہے تو عثمان کی بیوی تک رسائی حاصل کرسکتی ہے۔"

"مگر ایسا میں نہیں چاہوں گا سر!" میں نے کہا۔

"آپ کے چاہنے نہ چاہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس کی کوئی وجہ بھی ہونی چاہیے آخر۔"

میں نے کہا "یار وجہ کیا تمہاری عقل شریف میں نہیں آئی۔ فی الحال اس کا کسی پرائے پھڈے میں پڑنا مناسب نہیں۔ خود آزاد صاحب نے اسے سختی سے روک دیا ورنہ وہ رخشندہ کے اصل قاتلوں کو بے نقاب کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ذہنی طور پر اسے کچھ عرصہ پُرسکون رہنا چاہیے۔"

"میں ایک بات بتاؤں آپ کو۔ جو میں نے بڑی ریسرچ کے بعد معلوم کی ہے۔"

"فرمایئے۔"

"آپ احمق ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی ریسرچ ضائع گئی۔ یہ بات میں جانتا ہوں۔"

"شبنم وہاں پہنچ چکی ہوگی' شرط لگالو۔"

میں نے کہا "شرط لگانا حرام ہے۔"

وہ ہنسا "یہ کہو کہ ہارنے کا ڈر ہے۔" اور فون بند کردیا۔

میں پھر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ گھنٹی دوبارہ بجی۔ اپنی باتوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ جس لیے فون کیا تھا۔

"جس لیے یا جس کے لیے۔؟"

"رخشی کہاں ہے۔ شرافت سے بتادو۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "بھائی شرافت۔ وہ میں کیا عرض کروں۔ ہوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ایک دم آنسو پونچھ کے مسکرانے لگی "اچھا جی۔ آپ مذاق کرتی۔ ا بی آپ سمجھاتی تو ام سمجھتی۔ یہ بات لطیفہ ہوتی۔"

میں نے کہا "ویسے یار۔ رخشی تمہیں کیسی لگتی ہے۔ فرض کرو وہ سچی مچ کے تم سے کہ میرے ساتھ بھاگ چلو۔"

تیس مار خان کی مونچھیں دس بج کر دس منٹ بجانے لگیں جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ "ا بی ام لطیفہ سمجھتی۔ آپ مذاق فرماتی۔"

اوپر سے رخشی اتر کے نیچے آئی۔ "کیا ہو رہا ہے یہاں۔ تیس مار خان تم کیوں فارغ کھڑے دانت نکال رہے ہو۔"

میں نے کہا "یہ مجھ سے کچھ کہہ رہا تھا۔ تمہارے بارے میں۔"

"میرے بارے میں؟" رخشی نے اسے غور سے دیکھا۔

"ہاں۔ اسے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپ بات کریں میں رخشی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

تیس مار خان کی حالت غیر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو کے دھڑام سے سر کے بل گر جائے گا۔ جب رخشی نے ہنسا شروع کیا تو وہ بھاگا۔ اس کے حلق سے جو آوازیں نکل رہی تھیں ان کا مطلب سمجھنا مشکل تھا۔ وہ ہکلا رہا تھا اور اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

رخشی نے پیچھے سے اسے آواز دی "ارے تیس مار خان۔ کہاں جا رہے ہو بھاگ کے۔ میں تیار ہوں تم سے شادی کے لیے۔ مجھے منظور ہے۔"

تیس مار خان نے اوپر والا دروازہ کھولا اور گھبراہٹ میں کچھ بولتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہنستے ہنستے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اب یہ جا کے فریاد کرے گا رئیس سے۔ شاید استعفیٰ پیش کر دے گا اپنا۔" میں نے کہا۔

"تم نے بھی بہت زیادتی کی اس کے ساتھ۔" رخشی بولی "اگر وہ سچ مچ بُرا مان کے چلا گیا تو۔"

میں نے کہا "فکر مت کرو۔ رئیس سمجھا دے گا اسے اپنی زبان میں۔ اس کے جانے کا تو خیر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم نے اپنا سامان پیک کر لیا۔"

"ہاں۔ تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

میں نے کہا "مجھے ڈسٹرب کر دیا تمہارے فرید صاحب نے۔ بڑی تشویش میں مبتلا تھے۔"

"تشویش۔ وہ کس لیے۔"

"تمہارے لیے اور کس کے لیے۔ کہہ رہا تھا کہ رخشی کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ میں نے قسم کھا کے کہا کہ وہ اوپر کام میں مصروف ہے۔ تو بڑی مشکل سے مانا۔"

"میں بھی یہی پوچھنے آئی تھی۔ وہ آیا کیوں نہیں۔" وہ بولی "ہر وقت فضول باتیں مت کیا کرو۔"

میں نے کہا "اس نے جو بات کہی اسے ہرگز فضول نہیں سمجھا جا سکتا۔"

وہ اپنے ضروری کاغذات الگ کرتے ہوئے غور سے سنتی رہی پھر بولی "عثمان کے ساتھ ایک اور کا نام بھی آیا تھا۔"

"دوسرا خادم تھا۔ ایک ہی فیملی کے پلے بڑھے تھے دونوں۔"

"کیا اب اس کی باری ہو گی" رخشی نے کہا۔

"عین ممکن ہے۔ ابھی تو کچھ پتا نہیں کہ وہ ہے کہاں۔ اخبار والے اسے تلاش ضرور کریں گے۔"

"کیا یہ ممکن ہے کہ عثمان کے قتل میں خود خادم کا ہاتھ ہو؟"

میں نے کہا "یہ تم نے بڑا جاسوسانہ نکتہ اٹھایا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ قتل کا سبب ان کے آپس کے اختلافات ہو سکتے ہیں۔ کاروباری اختلافات اور یہ بھی ناممکن نہیں اوپر والوں کے حکم پر خادم نے ایسا کیا ہو یا اوپر سے دونوں کے لیے ایک ہی حکم ہو۔ وہ جس مافیا کے ادنیٰ سے کارکن تھے کی نظر میں ساری خرابی انہی کی بے وقوفی سے ہوئی۔ وہ کے بعد ایک غلطی کرتے رہے۔"

"تم خود بھی اسی مافیا کا ایک حصہ تھے۔"

میں نے کہا "شاید۔ لیکن یہ خود شاہ عالم کو بھی علم نہ ہو گا کہ پورے سیٹ اپ میں اس کی اپنی پوزیشن کیا ہے۔ اس کے اوپر کتنے لوگ ہیں جو کاروباری اور تنظیمی معاملات کو کنٹرول کرتے ہیں اور احکامات جاری کرتے ہیں۔ کچھ اس کے ماتحت بھی ہوں گے جن کو وہ احکامات دیتا ہو گا۔"

رخشی نے سر ہلایا "وہ بہرحال ایک دی آئی پی تھا۔ فائدہ وہ خود اپنی سیاسی اور سماجی حیثیت سے اٹھاتا ہو گا۔ دوسرے بھی حاصل کرتے ہوں گے۔"

"اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں مگر میری حالت اس شخص کی طرح ہے جس نے صرف لندن کا نام سنا اسے لندن شہر کے کسی مصروف چوک پر چھوڑ دیا جائے

یقین کے ساتھ کہ اسے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہو سکتی۔ وہ لندن شہر کے راستوں سے واقف ہے۔ زمین دوز ریلوے کے ٹائم شیڈول سے بسوں کے روٹ تک جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ وہ خود کہاں رہتا ہے اور اس شہر میں اس کے کتنے دوست آشنا ہیں جن کے گھروں کے دروازے اس کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ تم بھی جانتی ہو۔"

وہ مسکرائی "تم ہو چک جھمرا یا پنڈ دادن خان میں پیدا ہونے والے کی طرح جس نے ساری عمر اپنی تحصیل کی حدود سے باہر قدم نہ نکالا ہو۔"

"یہ صورتِ حال بیک وقت مزاحیہ بھی ہے اور المیہ بھی۔ معلوم نہیں اس کا انجام کیا ہو گا۔ عثمان کی طرح کسی دن۔"

رخشی نے میری بات کاٹ دی "مایوسی کی باتیں مت کرو۔ تم اکیلے تو نہیں ہو۔ رئیس ہے تمہارے ساتھ۔ فرید ہے اور میں ہوں۔ آزاد صاحب ہیں اور سب سے بڑھ کے شبنم ہے۔"

"نہیں، سب سے بڑھ کے شبنم نہیں ہے، تم ہو۔"

"میں۔! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" وہ بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔ بہت کچھ کر سکتی تھیں تم مگر تم نے میری شناخت کے جھوٹ کا بھرم رکھا۔ کچھ نہ کر کے بھی تم نے مجھے وہ تحفظ فراہم کیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ جو مجھے کوئی اور فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں شاہ عالم نہیں ہوں لیکن تم نے میری مجبوری کو سمجھا اور یہ صرف تمہاری گواہی تھی جس نے میرا اعتبار قائم کیا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "تمہارے حق میں گواہی دینا میرے لیے بھی مجبوری تھی۔ یہ بات تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنی زندگی پر اپنا اختیار حاصل کرنے کے لیے تمہیں شاہ عالم مان لیا۔ اگر تم اس اعتماد کا مستحق ثابت نہ کرتے خود کو، تو میں چیخ چیخ کے ساری دنیا کو بتا دیتی کہ یہ شخص فریبی ہے۔ یہ مجھ پر غاصبانہ قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ شاہ عالم کی دولت جائداد ہتھیانا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو۔ وہ وقت گزر گیا۔ اب تم بھی آزاد ہو اور میں بھی آزاد ہوں۔"

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا "آزاد صاحب۔ آئندہ کبھی یہ ذکر نہیں چھیڑیں گے آپ۔ وعدہ کیجئے۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میں وعدہ کرتا ہوں۔ ہم اس راز کی حفاظت مرتے دم تک کریں گے۔"

"اور ہمیشہ دوست رہیں گے۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "ہاں۔ مخلص اور اچھے دوست۔ یہ بتاؤ تمہارا کام ختم ہو گیا؟"

"ہاں۔ رئیس اب گھر کے اسباب کی فہرست بنا رہا ہے۔ کتنے اے سی لگے ہوئے ہیں۔ فریج اور ڈیپ فریزر۔ الیکٹرونکس کا دوسرا سامان۔ گھر کا فرنیچر قالین اور پردے۔ کچن کا سامان۔ ان سب کو ساتھ نہیں لے جایا جا سکتا۔ جب کوئی خریدار آئے گا تو اس کی کچھ نہ کچھ اضافی قیمت مل ہی جائے گی۔"

"شاہ عالم ہاؤس خریدنے والا کوئی عام آدمی نہیں ہو گا۔ میرا مشورہ ہے کہ تم اسے رنگ و روغن کرا کے اور پوری طرح فرنش کر کے سیل کر دو۔"

اس نے سر ہلایا "کاروباری اعتبار سے تمہارا مشورہ یقیناً فائدہ مند ہے مگر یہ سب کام کون کرائے گا؟ کس کے پاس وقت ہے اور کون پھر آنا چاہے گا یہاں۔ کم سے کم میں لوٹ کے دوبارہ اس گھر میں نہیں آؤں گی۔"

میں نے کہا "کیوں، بہت دکھ ہو گا تمہیں۔"

"جب میں شادی کے بعد یہاں آئی تو انیس سال کی بے وقوف لڑکی تھی" اس نے افسردگی سے کہا۔

"تم اب بھی وہی ہو۔ بس عمر کا تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔" میں نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے کہا۔

مگر وہ اسی لہجے میں بولتی رہی "آج یہ کتنی پرانی بات لگتی ہے۔ گزشتہ مہینے میری شادی کی سالگرہ آئی اور گزر گئی۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا۔ دو تین دن بعد خیال آیا تو میں نے حساب لگایا۔ چار سال کی ازدواجی زندگی تھی جو شاہ عالم کے ساتھ گزری۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار دن۔ شروع کے چند مہینے ایسے گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا مگر اس کے بعد جیسے وہ خواب ختم ہو گیا اور آہستہ آہستہ حقیقت کا وہ روپ سامنے آنے لگا۔ جو بہت مختلف تھا اور پُر آزار تھا۔ ڈرانے والا تھا۔ عذاب کے ایک ہزار دن تھے جو میری سزا بن گئے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے کہا "تمہاری نظر صرف جذباتی محرومی اور ذہنی ناآسودگی کے تاریک گوشوں تک محدود ہے۔ تمہیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ ننانوے فیصد عورتوں کے لیے تمہاری یہ پُرتعیش زندگی حسرتوں کا ایسا خواب ہے جس کی تعبیر کا سواں یا ہزارواں حصہ بھی مل جائے تو وہ خوش نصیب کہلاتی ہیں۔ ٹین کے جھونپڑے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سچی محبت کی خوشی ملے تو عورت کے لیے وہی جنت ہے۔ یہ ڈائیلاگ اب زنانہ رومانی ناولوں اور فلموں کی ہیروئن بھی نہیں بولتی۔"

"مگر کسی شاہانہ محل میں سونے کی زنجیریں پہن کے اور غلامی سے بدتر ذلت اٹھا کے بھی کوئی عورت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا خوش رہنا تو دور کی بات ہے" رخشی کے اختلاف میں جھنجلاہٹ آگئی۔

"میں مانتا ہوں اس دلیل کو لیکن مکمل خوشی تو فقط ایک تصور ہے۔ دیوانے کے خواب سے زیادہ مبہم' لاحاصل خواہشات کا وہ پہاڑ جس کی چوٹی تک کوئی انسان کبھی پہنچ ہی نہیں سکتا۔ جس کو خدا نے دنیا کی ہر نعمت سے نوازا ہو۔ اس کے لیے بھی دکھ کا کوئی قصہ کسی نہ کسی پہلو سے زندگی میں شامل ہے۔"

وہ مجھے سامان پیک کرتا دیکھتی رہی "اس اعتبار سے میں خود کو خوش نصیب سمجھ سکتی ہوں کہ میرا عذاب اس حد سے آگے نہیں بڑھا۔ جہاں یہ ناقابلِ برداشت ہوجاتا۔ میں اعصابی مریض تو کسی حد تک ہوگئی تھی لیکن بالکل پاگل نہیں ہوئی تھی اور ابھی میں نے خودکشی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا نہیں شروع کیا تھا۔"

"یعنی خیال ضرور آتا تھا خودکشی کا؟"

"ہاں مگر موت کے تصور میں اپنی لاش' کفن اور قبر میں دبائے جانے کا خیال مجھ پر خوف سے لرزہ طاری کردیتا تھا۔"

میں نے کہا "کبھی یہ نہیں سوچا کہ۔۔۔ یہ سب کچھ چھوڑ کے نکل جانا چاہیے کہیں۔ ایک آزاد زندگی کا کوئی راستہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔"

"اگر میں ایسا کرتی تو میرا انجام گمنامی کی موت ہوتا۔ شاہ عالم ضرور مجھے تلاش کرلیتا اور پھر خاموشی سے مروادیتا۔ اس ملک میں اکیلی عورت کہیں بھی چھپ کے محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جرم و سزا کی کہانیاں پڑھ کے اور فلمیں دیکھ کے مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ کوئی طریقہ ایسا ضرور ہوگا جس پر عمل کرکے میں شاہ عالم کو قتل کردوں اور خود نہ پکڑی جاؤں لیکن سیکڑوں امکانات میں بھی امید کا کوئی پہلو نہ تھا کیونکہ ہر کہانی لکھنے والا آخر میں یہی ثابت کرتا تھا کہ چالاک سے چالاک مجرم بھی اپنی ہی کسی غلطی سے پکڑا جاتا ہے۔"

"بات یہ ہے مائی ڈیئر رخشی۔" میں نے کہا "کہ جینے والے ہمارے ملک کی جیلوں میں بھی زندہ رہتے ہیں جو بدترین عقوبت خانے میں جہاں انسان کے ساتھ وہ سلوک ہوتا ہے جو قرونِ وسطیٰ میں غلاموں کے ساتھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ جینے والوں نے کالے پانی جاکے ایک عمر گزار دی۔ اتنی دور کی مثال چھوڑو۔ ہمارے اپنے ملک میں جو لوگ غربت کی انتہائی نچلی سطح پر جیتے ہیں۔ ان کی زندگی تمہیں جینی پڑے پھر کیا ہوگا۔ اسے بھی چھوڑو' تمہارے سامنے میں کھڑا ہوں۔ میرے ماضی کی کتاب کے ہر ورق کی تحریر دیکھی ہے تم نے۔ رئیس کو دیکھو' اپنے فرید عباسی کے حالات کو دیکھو۔"

"تم سب حالات کا مقابلہ کرسکتے تھے۔"

میں نے کہا "حالات کا مقابلہ تم بھی کرسکتی تھیں۔ اپنے انداز میں۔ تم خوش رہنے کے لیے بہانے تلاش کرسکتی تھیں۔ ایجاد کرسکتی تھیں۔ خواہ ایسا تمہیں ایک انتقامی ردِعمل کے طور پر کرنا پڑتا۔"

"یعنی کیا کرتی میں۔ شراب پینے لگتی۔ اس کے مراسم تھے غیر عورتوں سے تو میں بھی غیر مردوں کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرلیتی۔ تم سمجھتے ہو کہ ایسا کرنا ممکن تھا میرے لیے؟" اس نے برہمی سے کہا۔

"چلو چھوڑو۔ مٹی پاؤ' بھول جاؤ اس وقت کو۔ کیا ہوا اگر تمہاری زندگی کے چار سال اور چار سالوں کے ڈیڑھ ہزار دن آزمائش کی نذر ہوگئے۔ تمہارے اپنے حساب کو سچ مان لوں تو ابھی تمہاری عمر ہے تیس سال۔ اس عمر میں زیادہ تر لڑکیاں شادی کرتی ہیں۔ ان کی زندگی کا سب سے اہم موڑ یہیں آتا ہے جہاں تم آج کھڑی ہو پھر گزرے وقت کو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ سمجھو کہ وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ اسے بھول جاؤ۔ آگے دیکھو کہ تمہاری کتنی زندگی باقی ہے اور اس میں تم اپنے لیے کتنی خوشیوں کے خزانے تلاش کرسکتی ہو۔ اب تو کوئی مجبوری نہیں۔ آزاد ہو تم ہر فیصلے کے لیے۔ اب چلو۔"

میں نے دو موٹ کیس اٹھالیے۔ ان میں سے ایک اہم دستاویزات اور فائلوں سے بھر گیا تھا۔ زمین روز نہ خانے اور اس کی دیواروں کے خفیہ خانوں' مدفون تجوریوں اور ناقابلِ شکست لاکرز میں سے جو کچھ برآمد ہوا تھا' وہ شاہ عالم کی دولت اس کی جائداد' سرمایہ کاری' بینک اکاؤنٹس' بیرونِ ملک اثاثوں اور کاروبار کی تفصیلات پر مشتمل تھا۔ دوسرے میں نقد زر تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ایک لاکھ امریکن ڈالر تھے۔ شاید اتنی ہی مالیت کے پاؤنڈ ہوں گے۔ کچھ جرمن مارک اور جاپانی ین بھی تھے مگر سب سے بڑھ کر اس خزانے میں ہیرے جواہرات کے سیٹ تھے۔ اصولاً ان کو رخشی کی تحویل میں ہونا چاہیے تھا یا اس کے لاکر میں لیکن کسی وجہ سے شاہ عالم کو اپنے تہ خانے کے حفاظتی نظام پر زیادہ بھروسا

تھا یا پھر یہ بلیک منی تھی۔ ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی جس کا کہیں حساب نہ تھا اور کوئی سراغ نہیں لگا سکتا تھا۔

ہیرے جواہرات میں نے دیکھے تھے اور نہ کبھی ان کی قدر و قیمت کو قابلِ غور سمجھا تھا۔ ان سب کی صحیح مالیت کا اندازہ کرنا میرے بس کی بات ہی نہیں تھی پھر بھی میں نے اپنی ناقص عقل کی مدد سے یہ فرض کرلیا کہ میرے بائیں ہاتھ میں جو سوٹ کیس تھا وہ ایک کروڑ روپے سے زیادہ کا ہوگا۔ میرا یہ اندازہ بعد میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ اس میں دو کروڑ سے زیادہ کا مال تھا۔

جائداد اور ناقابلِ منتقل کہلانے والے اثاثوں کا اندازہ کرنا بالکل ہی ناممکن تھا۔ اس کے لیے کسی مالیاتی مشیروں کی فرم کی خدمات حاصل کرنا ضروری تھا جو تمام کوائف اور تفصیلات جمع کرنے کے بعد تخمینہ مرتب کرے اور پھر رخشی کی صحیح سمت میں راہنمائی کرے۔ یہ کام کسی عام آدمی کے بس کا بالکل نہیں تھا۔

سیاست کے ایک انتہائی منافع بخش پیشہ ہونے کے بارے میں۔ (محاورے کے مطابق) جو شک کرے وہ کافر۔ سیاست دانوں کی لوٹ کھسوٹ کی زبان زدِ عام داستانوں میں کروڑوں کا نہیں اربوں کھربوں کے اثاثوں کا ذکر آئے تو کسی کو اس میں مبالغہ محسوس نہیں ہوتا اور صرف سیاست دانوں پر کیا موقوف' اوپر سے نیچے تک سرکاری عہدیداروں کی بیراپھیری اور غبن میں کروڑوں کی بات کوڑیوں کے مول کے حوالے کی طرح غیر اہم ہوگئی ہے۔

شاہ عالم کا سارا ماضی میرے لیے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ اس نے بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھنے کے لیے سیاسی نصاب کے اصولوں کے مطابق خدمتِ خلق کا پلیٹ فارم استعمال کیا تھا اور سوشل ورک سے نام بھی کمایا تھا اور پھر مال بھی سمیٹا تھا۔ اس کے بعد تقدیر کی یاوری سے راستے خود بخود کھلتے چلے گئے تھے۔ شہرت کی اگلی منزل نے اسے ایک پارٹی کا چیئرمین بنادیا اور سیاست اس کے گھر کی لونڈی ہوگئی۔

اس کے باوجود قوم کی امانت میں خیانت سے لوٹی ہوئی اس دولت کے خیال سے میرا دماغ چکرا گیا اور میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ اگر ایک معمولی حیثیت رکھنے والے دوسرے درجے کے سیاست داں کی لوٹ مار کا یہ حال ہے تو پھر جو بڑے تھے اور بڑا نام رکھتے تھے' ان کے خزانے میں کتنا مال ہوگا۔ شاہ عالم ایک لاوارث اور بے حیثیت شخص تھا جسے اپنے خاندانی ورثے میں صرف غربت اور بے مائیگی ملی تھی۔ اس نے محنت اور صلاحیت کی بنیاد پر خوشحالی کا ایماندارانہ راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ اس نے بددیانتی اور منفی ذہانت سے دولت مندی کا شارٹ کٹ اپنایا تھا جس میں جائز و ناجائز کے معیار' حرام و حلال کی تمیز اور مذہب یا معاشرے کی اخلاقی قدروں کی رکاوٹ کہیں نہ تھی۔ چنانچہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کا محاورہ استعمال کرنے والے بھی شرمندگی سے سر جھکاتے اور منہ دیکھتے رہ گئے تھے۔ وہ کامیابی کی ہر چھلانگ میں دس گنا اور سوگنا ترقی کرتا ہوا اس سے کم وقت میں لکھ پتی اور کروڑ پتی ہوگیا تھا جتنے وقت میں کوئی کلرک ہیڈ کلرک بنتا ہے یا ریڑھی پر مرغ چھولے بیچنے والا کہیں کوئی چھوٹی موٹی دکان لیتا ہے۔

دونوں سوٹ کیس ایک ساتھ اوپر لے جاتے ہوئے میں ہانپ گیا۔ رخشی کی مسکراہٹ سے میرا پارا چڑھ گیا "کیا کرو گی آخر تم اتنی دولت کا؟"

"میں عیش کروں گی' تم کیوں جلتے ہو؟"

"وہ کیا کہتے ہیں۔ جلتی ہے میری جوتی۔ یہ سب مالِ حرام ہے۔" میں نے کہا۔

"ہوگا اور ہے تو مجھے کیا۔" وہ بولی "میں نے نہیں کمایا جو تم مجھے الزام دو۔ مجھے حالات نے وارث بنادیا اس کا۔"

میں نے ایک گہری سانس لی "مگر تم جانتی ہو کہ یہ کہاں سے آیا اور کیسے؟"

"پھر میں کیا کروں۔ اخبار میں اشتہار دوں کہ میرے مرحوم شوہر کے پاس اتنا مال تھا جو اس نے بے ایمانی سے جمع کیا تھا۔ اب یہ مال میں ان سب کو واپس کرنا چاہتی ہوں جن سے حاصل کیا گیا تھا۔ مستحق اور حق دار اپنی درخواست کے ساتھ آئیں اور اصل مع سود واپس لے جائیں یا سب حکومت کے خزانے میں جمع کرا کے عدالت سے کہوں کہ مجھے میرے شوہر کے جرائم کی سزا کاٹنے کے لیے جیل میں ڈال دے۔ ساری عمر کے لیے۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تم اتنا تلخ کیوں ہو رہی ہو؟"

"میں نے صرف تمہارے سوال کا جواب دیا ہے" وہ رکھائی سے بولی۔

"او کے۔ آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ رئیس کہاں ہے آخر؟"

وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی "وہ گیا ہے گاڑی میں سامان بھر کے فرید کے گھر۔"

میں نے کہا "مگر وہ گاڑی تو باہر کھڑی ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے سہلایا "کیا تم بھول گئے کہ یہاں دو گاڑیاں ہر وقت موجود رہتی تھیں۔ ایک بڑی لینڈ کروزر اور دوسری شیراز۔ سامان زیادہ تھا۔ وہ بڑی گاڑی لے گیا ہے۔"

"تمہارا ذاتی سامان اتنا تھا۔"

"کپڑے بہت تھے' کچھ بالکل نئے۔ ایک بار بھی پہننے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک دو بار کے استعمال کیے ہوئے کافی تھے اور وہ جو میرے نقطۂ نظر سے استعمال کے قابل ہی نہیں رہے تھے' انہیں میں کیا کرتی۔ یہاں چھوڑنا بھی مشکل تھا۔ دے دوں گی کسی ادارے کو جو غریب لڑکیوں کی شادیاں کرتے ہیں۔ یہی حال جوتوں کا تھا۔ ان سے بیچ کرتے ہوئے پرس اور ہینڈ بیگ تھے۔"

میں نے کہا "یعنی تم بھی کم نہیں ہو کسی امیلڈا مارکوس سے۔"

"میں نے شوق سے کچھ جمع نہیں کیا تھا۔ یہ چیزیں خود آجاتی ہیں۔ تحفے تحائف میں' رشوت میں۔ خود شاہ عالم باہر جاتا رہتا تھا اور اپنی مرضی سے لے آتا تھا۔ میرا تو باہر آنا جانا ہی بہت کم تھا۔ میں کہاں استعمال کرتی۔ یہ بھی میں سب بانٹ دوں گی۔ مجھے زیورات کا بھی کوئی شوق نہیں۔"

"لیکن کروڑوں کے زیورات ہیں تمہارے پاس۔"

"میک اپ کے سامان اور پرفیومز کا ڈھیر نہیں دیکھا تھا تم نے۔ ایک بڑا سوٹ کیس ان سے بھر گیا تھا۔ جب میں شاہ عالم ہاؤس میں رہتی تھی تو انہیں اٹھا کے پھینک نہیں سکتی تھی مگر اب کچھ نہیں رکھوں گی اپنے پاس۔ بس ضرورت کے لیے تھوڑا بہت کافی ہے۔"

میں نے کہا "کیسے اچانک سب کچھ بدل گیا ہے۔ میری اور تمہاری زندگی میں آنے والی اس تبدیلی کا عمل کتنا غیر متوقع اور کتنا عجیب ہے کہ ہم آنے والے دن کے بارے میں کچھ بھی طے نہیں کر سکتے۔"

"تمہارا یہ ہے کہ تم آج وہ نہیں ہو جو کل تھے" وہ بولی۔ "تم ناصر عظیم تھے اور پھر تمہیں حالات کی مجبوری نے شاہ عالم بنا دیا۔ تم نے اس کی شخصیت اور نام' رشتے اور حوالے سب اپنا لیے۔"

"میں نے ایسا شوق یا تجربے اور ایڈونچر کے لیے نہیں کیا تھا۔"

"وجہ کچھ بھی رہی ہو۔ ان سب کے لیے جو شاہ عالم کے قریب تھے اور اسے سمجھتے تھے' تمہارے مزاج اور فطرت' عادات واطوار اور تمہاری سوچ میں رونما ہونے والی تبدیلی حیران کن تھی۔"

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ شاہ عالم کے کردار میں مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں بہت برا اداکار ثابت ہوا۔"

وہ مسکرانے لگی "ایکٹر تم بہت لاجواب ہو مگر یہ تین گھنٹے کی فلم نہیں تھی جس کے مکالمے کوئی اور لکھتا ہے۔ ڈائریکشن کوئی اور دیتا ہے۔ ایکٹر ریہرسل کے بعد مہینوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اپنا کردار پورا کرتا ہے۔ ایک فلم میں بادشاہ بننے والا دوسری فلم میں فقیر کا رول کر کے ایوارڈ لے سکتا ہے مگر یہ حقیقی زندگی تھی۔ کوئی بادشاہ ایک دن کے لیے فقیر بن کے دکھائے یا فقیر بادشاہ کی جگہ لے سکے۔ اس طرح کہ کسی کو فرق محسوس نہ ہو' ناممکن۔"

"شبنم کے سامنے مجھے بار بار اپنی پوزیشن کلیئر کرنی پڑتی تھی کہ میں اب وہ پہلے والا شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں بالکل بدل گیا ہوں۔ اس کے باوجود وہ شک اور تذبذب کا شکار رہی کہ آخر ایسا ہوا تو کیوں اور یہ انقلاب آیا تو کیسے اور مجھے اس کے لیے بھی منطقی دلائل اور قائل کرنے والی مثالیں دینی پڑیں۔ وہ بے حد ذہین لڑکی ہے۔ اس کی عقل کوئی بات تسلیم نہیں کرتی تھی مگر پھر جذباتی دباؤ اتنا بڑھ گیا کہ اس کی عقل نے مزاحمت ختم کر دی۔ اب اس نے سوچنا اور سوال کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ اگر میں کہوں کہ ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔ اگر میں کہوں کہ ایسا نہیں ہے تب بھی ٹھیک ہے۔ یہ لاشعوری خود فریبی ہے مگر اسی میں پناہ ہے۔"

"یہ سلسلہ کبھی ختم بھی ہوگا؟"

"ہاں مگر کب اور کیسے؟ اور پھر کیا ہوگا؟ اس کے بارے میں قبل از وقت سوچنا وقت اور دماغ خراب کرنے والی بات ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ ایک نہ ایک دن میں خود اسے وہ سب بتا دوں گا جو تم جانتی ہو۔ آگے اس کی مرضی۔ وہ شاہ عالم کی جگہ ناصر عظیم کو قبول کرے نہ کرے۔"

"اگر اس نے تمہیں قبول کر لیا۔ پھر؟"

"مجھے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا" میں نے کہا۔

"ایک لمحے کے لیے فرض کر لو۔"

میں نے کہا "بہت مشکل ہو جائے گی میرے لیے۔ مجھے اس کو سمجھانا پڑے گا کہ ناصر عظیم کے جذبات کی دنیا میں شبنم نام کی کوئی بھی لڑکی نہیں ہے۔ وہ پھر بھی اس اجنبی دنیا سے نہ نکلنا چاہے تو کوئی زبردستی نہیں۔ تم اس معاملے میں خوش قسمت ہو۔ تمہارے لیے اپنی ذات کی شناخت کا مرحلہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تم شاہ عالم کی بیوی سے اس کی بیوہ ہونے کے بعد بھی رخشندہ ہو۔"

"لیکن نہ جانے کیوں' مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ میں آج

وہ نہیں ہوں جو کل تھی۔ میرے اندر بھی بڑی تبدیلی آگئی ہے جس کا احساس صرف مجھے ہوتا ہے۔ میری سوچ ایسی کبھی نہ تھی' جیسی اب ہے۔ شاہ عالم کی موت کے بعد میں کچھ اور سوچتی تھی۔ میرے پلان کچھ اور تھے۔ وہ سب بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔"

میں نے سوچا کہ اس کے مقابل وہ آئینہ رکھ دوں جس پر جذبات کی دھند نہ ہو تاکہ وہ حقیقت کو دیکھ اور سمجھ سکے۔ اس کے وجود میں نئے پن کا احساس ایک نیا تجربہ تھا۔ اس نے پہلے کسی سے یوں محبت نہ کی تھی اور شاید ایسا بھی کبھی نہ ہوا تھا کہ کسی نے یوں اس سے محبت کی ہو چنانچہ فرید سے ملنے کے بعد اور اس کے گھر میں رہ کے شاہ عالم کی بیوی رخشندہ کا ایک نئی لڑکی بن جانا کوئی غیر فطری واقعہ نہیں تھا۔ بالآخر وہ جان لے گی کہ یہ تو وہی شادی سے پہلے والی رخشی ہے۔

پھر میں نے اپنا خیال بدل دیا۔ بالآخر وہ خود ہی جان لے گی اور مان بھی لے گی کہ ہم سفر بدل جائیں تو زندگی کے پرانے راستے بھی نئے لگتے ہیں۔ جذبات کے نئے رنگ شامل ہونے سے ہر منظر حسین محسوس ہوتا ہے۔

باہر سے گاڑی کے رکنے کی اور پھر ہارن کی آواز آئی تو میں نے کہا "رئیس آگیا۔ تم اس کے ساتھ جاؤ۔"

"اور تم؟"

میں نے کہا "میں آج سارے ضروری کام نمٹانا چاہتا ہوں۔"

رخشی متفکر نظر آنے لگی "رئیس۔ تم خیال رکھنا کہ یہ کسی خواہ مخواہ کے چکر میں نہ پڑیں۔ اکیلا مت چھوڑنا۔"

"اس نے تو بتا دیا ہے مجھے کہ وہ مجلۂ عروسی میں بھی اکیلا نہیں جانے دے گا مجھے" میں نے کہا۔

رخشی ہنسنے لگی "حق ہے اس کا۔ دوست کم اور شریکِ حیات زیادہ ہو تم ایک دوسرے کے۔"

"قسم اللہ کی۔ قیامت والے دن یہ جائے گا دوزخ میں تو اپن خود چل پڑیں گے اس کے ساتھ۔ کہہ دیں گے فرشتوں سے کہ بس رہنے دو جی ہمارا حساب کتاب۔"

تیس مار خان اکڑا ہوا گاڑی میں ہی بیٹھا تھا اور سیدھا اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس طرح وہ مجھ سے ناراضی کا اظہار کرنا چاہتا تھا اور شاید رئیس خان سے بھی۔ اس نے میری شکایت کی ہوگی تو رئیس نے بھی اسے ہی جھاڑا ہوگا کہ مذاق کا برا ماننے کی ضرورت نہیں۔ ایک لینڈ کروزر اس کے ساڑھے چار فٹ قد سے کوئی تناسب نہیں رکھتی تھی مگر اس نے سیٹ کو آگے کر لیا تھا۔ اس بارے میں شک کی بات کوئی نہیں تھی کہ وہ ایک ماہر ڈرائیور تھا۔

رخشی اس کے ساتھ بیٹھ گئی تو میں نے پاس جا کے کہا۔ "یار' تیس مار خان۔ دیکھو' شرافت سے اسے واپس گھر لے جانا۔ یہ نہ ہو رخشی کو بھگا لے جاؤ۔"

ایک بار پھر فرطِ رنج و غم سے اس کی مونچھیں تھرتھرانے لگیں۔ وہ ایک دم نیچے اتر آیا اور اس نے چابیاں رئیس کی طرف پھینک دیں۔ "صاب' ا بی ام آپ سے اجازت مانگتی۔ ام ایسا بات نہیں سنتی۔ ہمارا دل غصے میں غبارہ بن کے پھٹ جاتی۔"

رئیس نے چابی اٹھا کے کہا "ابے مردِ بن سالے۔ کہہ دے کہ ہاں لے جا رہا ہوں اور کل تمہاری گھر والی کو بھی لے جاؤں گا۔"

"ایسا شرمناک بات کرتی آپ۔ توبہ توبہ' ام سب کو اپنا ماں سمجھتی' ہمشیرہ سمجھتی۔"

"اس کو بھی۔ وہ جو ساڑھے تین فٹ کی چیز ہے۔ الو بناتی ہے تجھے۔"

تیس مار خان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "الو وہ نہیں بناتی صاب۔ ام الو ہوتی۔ اس کا بات نہیں کرتی ام۔ ابھی ام کو یاد آتی۔ وہ بولتی کہ تم واپس آتی تو تمہارا سو روپیہ واپس کرتی اور تم کو سفید بھینس کا کالا دودھ کا کھیر کھلاتی' ام جاتی۔"

رخشی ہنسنے لگی "سفید بھینس کا کالا دودھ۔"

تیس مار خان چابی لے کر پھر بیٹھ گیا "کیا کالا بھینس کا سفید دودھ نہیں ہوتی بیگم صاب۔"

رخشی مجھے ڈبلی کیٹ چابیوں کا ایک سیٹ دے گئی تھی۔ رئیس کے ساتھ گھر کے دروازوں کو مقفل کرتے ہوئے' تمام روشنیاں بجھاتے ہوئے اور کھڑکیاں بند کر کے پردے ڈالتے ہوئے مجھے یوں لگا جیسے اس گھر کے در و دیوار اپنی نحوست کے احساس سے دکھی ہیں اور اپنی پُر آسیب ویرانی پر سوگوار ہیں۔ اس قصرِ عالی شان سے خوشیاں روٹھ گئی تھیں۔ اس کی رونقیں ماضی کی داستانِ عبرت ہو گئی تھیں۔ ایک ایک کر کے مکین رخصت ہو چکے تھے اور اب پھر کسی کے آنے تک گھر صرف ایک مکان تھا۔ مال و اسباب اور سامان کی فراوانی وہی تھی مگر وہ لوگ نہ تھے جو اس پر ناز کرتے تھے۔ جن کی ہر ضرورت یا آسائش ان کی قوتِ خرید میں تھی چنانچہ انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خود مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں نے اس محل کی ایک خواب گاہ ناز میں آنکھیں کھول کے دیکھا تھا تو مجھے اپنے ساتھ ہی رخشندہ نظر آئی تھی۔ اپنے حسن و شباب کی ساری حشر سامانیوں کے ساتھ۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں شاہ عالم اس کا شوہر ہوں۔ اس کے جسم و جاں پر تمام اختیار رکھنے والا اور اس کا مجازی خدا۔

خدا نے مجھے ہر آزمائش میں سرخرو کیا تھا۔ میں نے تمام مواقع دستیاب ہونے کے باوجود اپنے دامن کو ہر الزام سے بچالیا تھا۔ کسی ضرورت مجبوری یا ترغیب بہانہ بنا کے نہ میں نے کبھی یہ فراموش کیا تھا کہ میں ساری دنیا کے سامنے شاہ عالم ہونے کے باوجود رخشندہ نام کی اس عورت کا شوہر نہیں ہوں۔ یہ کبھی نہیں بھولا تھا کہ وہ اصل شاہ عالم کی بیوہ ہے اور میں درحقیقت ناصر عظیم ہوں۔ ایک اجنبی' ایک نامحرم۔ حالانکہ میں اس کے برعکس سوچتا تو مجھے خود رخشی کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ ہوتا۔ الٹا وہ پہلے سے زیادہ طمانیت اور مسرت کے ساتھ خدا کی شکرگزار ہوتی کہ اس کے ساتھ شوہر کی بے رخی اور عدم دلچسپی کا رویہ بدل گیا۔ اس نے بالآخر شوہر کا دل جیت لیا۔

آج میں مطمئن تھا کہ میں ایک دلدل سے نکل آیا اور میرے احساس پر شرمندگی کا کوئی داغ نہیں۔ میں نے حالات پر قابو پالیا تھا۔ رخشی کے دل کا حال خدا جانتا ہے مگر میں نے اس کی طرف کبھی بُری نظر سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ بات میرے اطمینان کے لیے کافی تھی۔ اپنی نیک نیتی کا ثبوت مجھے کسی اور کے سامنے پیش نہیں کرنا تھا۔

شاہ عالم کی عزت کے ساتھ اس کی دنیاوی دولت کو بھی میں نے للچائی ہوئی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے کبھی موازنہ نہیں کیا تھا کہ دولت مندی میں شاہ عالم کس حد تک مجھ پر فوقیت رکھتا تھا۔ دنیا میں ہزاروں لاکھوں ہوں گے جو مجھ سے سوگنا یا ہزار گنا دولت کے مالک ہوں گے۔ خود میرے لیے یہ اطمینان کافی تھا کہ میں ہزاروں لاکھوں نہیں کروڑوں اور اربوں انسانوں کے مقابلے میں دولت مند تھا۔

جو کچھ شاہ عالم کا تھا وہ میں نے رخشی کے حوالے کردیا تو میرے سر کا بوجھ کچھ اور کم ہوگیا۔ یہ اندر سے دل کو سکون دینے والی خوشی تھی اور اپنے ایمان اور اعتماد کی سلامتی کا اطمینان تھا جسے میں نے اپنی کامیابی کا انعام شمار کیا۔ میں کسی امانت میں خیانت مجرمانہ کا مرتکب نہیں ہوا تھا۔ میں نے نہ شاہ عالم کی بیوی کے جسم کو چھوا تھا نہ اس کے پیسے کو۔ یہ اللہ کا احسان تھا جس نے مجھے نیت کی استقامت دی۔ آدمی خود پارسائی کے جتنے دعوے چاہے کرے' وہ نہیں جانتا کہ شیطان کے مقابلے میں وہ کتنا کمزور ہے۔

باہر کے گیٹ کا تالا بند کرکے میں نے شاہ عالم ہاؤس پر آخری الوداعی نظر ڈالی تو مجھے دنیا حیرت انگیز طور پر اچھی لگی۔ بالکل اس شخص کی طرح جس نے برسوں جیل خانے کے حصار سے آسمان کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہ دیکھا ہو اور باہر اپنی پرانی دنیا میں اسے زمین اور آسمان سب بہت نئے اور بہت مہربان اور بہت خوب صورت نظر آئیں۔

میرے پیروں کی وہ آخری زنجیر بھی کٹ گئی تھی جس نے ناصر عظیم کو شاہ عالم کی زندگی میں قید کر رکھا تھا۔ اس وقت میں نے یہ سوچنا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ مجبوری حالات کی اس زنجیر کو قبول کرنا کس حد تک میری غلطی تھی اور کس حد تک یہ نوشتۂ تقدیر تھا جسے بدلا نہیں جاسکتا تھا۔

میرے لیے یہ خوشی کافی تھی کہ بالآخر شاہ عالم مرگیا اور اس کے نام سے پکارے اور پہچانے جانے کی ندامتوں کا آزار تمام ہوا۔ یہ عجیب تماشائے عبرت تھا کہ شاہ عالم کے نام کی تختی اس کے مدفن پر بھی لگی ہوئی تھی مگر کوئی بھی اس کی تحریر کو سچ تسلیم نہیں کرتا تھا اور جسے دنیا شاہ عالم تسلیم کرتی تھی وہ شاہ عالم نہیں تھا۔

گاڑی رئیس چلا رہا تھا مگر شاید اس کا ذہن بھی ایسے ہی خیالات کے گرداب میں تھا۔ میں نے کہا "رئیس۔ تو نے مبارک باد نہیں دی مجھے۔ الو کے پٹھے۔"

وہ چونکا اور مسکرانے لگا "ابے اس میں کون سا خرچہ ہوتا ہے اپنا مگر کوئی بات بھی ہو۔"

"بات یہ ہے پیارے کہ آج شاہ عالم کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ میں پھر وہی پرانا اصلی ناصر عظیم ہوں۔ تیرا بچپن کا یار۔"

"اچھا۔ تو پھر آج کیا کریں۔" وہ خوش ہوکے بولا "چلیں وہیں' جہاں ہم اکٹھے جاتے تھے۔ چائے پینے' کھانا کھانے' آوارہ گردی کرنے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ وہ وقت تو اپنا ہے۔ اپنی یادوں کا ہے مگر کوئی اور بھی ہے جس کا میں ہوں۔ مجھے ان سے ملنا ہے جو میرے اپنے ہیں۔ مجھے لوٹ کے اپنے گھر جانا ہے۔"

"کون سے گھر سالے۔ وہاں اب کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا "جہاں چندا ہے۔ خان اعظم ہیں اور قمر ہے' میری بہن۔ چل اس سے اسپتال جاکے ملتے ہیں۔ وہ سٹور کا بچہ ڈاکٹر کمال فاروقی اب بہنوئی بن گیا ہے میرا۔ معلوم

ہوجائے گا کہ خان جی کہاں ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ تو پوچھے گا مگر تُو نے دیکھا ہی نہیں کہ ہم کدھر جارہے ہیں" رئیس بولا "یہ سڑک سیدھی وہیں جاتی ہے۔ کمال میموریل اسپتال مگر پیارے' اپن تجھے وہاں چھوڑیں گے دروازے پر۔"

"کیوں۔ اندر کیوں نہیں جائے گا تُو؟"

"مجھے کہیں اور جانا ہے یار۔"

میں نے کہا "پھر وہی چنڈال چوکڑی۔"

"ابے نہیں۔ تجھے بعد میں بتاؤں گا۔" وہ بولا "ویسے میں وہیں ہوں۔ ملنا ہو تو آجانا رئیس خانے۔ کوئی نہیں ہوگا تو اپنا تیس مار خان ضرور ہوگا مگر راستہ وہی پیچھے والا۔"

ملتان روڈ پر شہر کے مضافات میں کمال میموریل اسپتال کی وسیع سرسبز اور خوب صورت عمارت کو دیکھ کر مجھے حیرانی سے زیادہ خوشی ہوئی۔ ابھی ایک سال پہلے کمال فاروقی کا "کمال کلینک" ایک غریبانہ بستی میں صرف تین کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک میں ڈاکٹر صاحب مریضوں کو دیکھتے تھے۔ دوسرا مریضوں کا ویٹنگ روم تھا جس کے درمیان میں پارٹیشن لگا کے اس کے دو حصے کردیے گئے تھے۔ ایک میں مرد بھرے رہتے تھے' دوسرے میں عورتوں بچوں کا ہجوم نظر آتا تھا۔ وہ سب غریب لوگ ہوتے تھے جن کو کمال کلینک سے دوائیں بھی بلامعاوضہ دی جاتی تھیں۔ تیسرے کمرے میں ایک کھڑکی کے پیچھے فرشتہ سیرت اور فرشتوں جیسی معصوم صورت والی کوئن بیٹھی پرچیاں کٹتی رہتی تھی اور دوائیں دیتی رہتی تھی۔ اس کمرے میں پیچھے بس اتنی ہی جگہ تھی کہ وہ ایک کرسی رکھ سکے۔ باقی کمرے میں دواؤں کے باکس اور کارٹن۔ ڈبے اور بوتلیں بھری نظر آتی تھیں۔

کمال کے ڈاکٹر باپ اس کے لیے کروڑوں کی جائداد چھوڑ کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے۔ کمال نے اس جائداد اور اپنے سارے اثاثوں سے والدین کی یاد میں ایک چھوٹا سا فری کلینک بنادیا تھا۔ اس کی آمدنی میں سے وہ اور کوئن بس اپنی کم سے کم ضروریات کے مطابق تنخواہ لیتے تھے' باقی رقم سے جتنی دوائیں خریدی جاسکتی تھیں' وہ مفت تقسیم ہوجاتی تھیں۔ کمال خود ہی ڈاکٹر تھا اور کوئن ایک کوالیفائڈ نرس تھی مگر انہوں نے خود کو حقیقی معنوں میں خدمتِ خلق کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ ان کے پاس ایک ہی ایمبولینس تھی۔ ایک سوزوکی ہائی روف جسے ضرورت پڑنے پر ان دونوں میں سے کوئی بھی چلالیتا تھا۔ خود مریضوں کے گھر جانے سے' کسی مریض کو سرکاری اسپتال پہنچانے تک وہ کسی کام کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔

آہستہ آہستہ ان کی نیک نامی کی شہرت کا دائرہ پھیلا تو انہیں عطیات موصول ہونے لگے۔ شفایاب ہونے والوں نے خود ان کے لیے وہی کام کیا جو کمیشن ایجنٹ یا پبلسٹی کے لیے میڈیا کا سہارا لینے والے نہیں کرسکتے تھے۔ خدمتِ خلق کا ڈھول پیٹنے والوں نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔ خاموشی سے کام کرنے والوں کی مدد خدا کرتا ہے۔ کمال کلینک کے لیے ڈاکٹر فاروقی نے کبھی نقد عطیات نہیں لیے۔ وہ صرف ادویات قبول کرتا تھا اور عطیہ کرنے والوں کو بتادیتا تھا کہ زیادہ ضرورت کون سی دواؤں کی ہے۔

اس وقت میں جس اسپتال کے سامنے کھڑا ہوا تھا وہ کم سے کم بیس کنال پر پھیلا ہوا تھا۔ سڑک اس جگہ سے کافی دور تھی لیکن مین روڈ سے اسپتال کے گیٹ تک پختہ سڑک موجود تھی۔ اس جگہ کے انتخاب کی ایک وجہ یہ ہوسکتی تھی کہ اسپتال ٹریفک کے شور و غل سے محفوظ ہو۔ دوسری وجہ زمین کی قیمت تھی جو روڈ سائڈ کے مقابلے میں پیچھے سستی ہوگی۔ اس کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کمال نے اتنا بڑا اسپتال کیسے قائم کرلیا۔ ٹرسٹ کی آمدنی اور خرچ برابر رہتے تھے۔ اس میں سے اتنی بچت ممکن ہی نہیں تھی کہ اسپتال کی عمارت کے احاطے کی دیوار بھی بن جائے۔ میرے اندازے کے مطابق عمارت کی تعمیر پر بھی پچاس لاکھ ضرور خرچ ہوئے تھے۔ اس میں ظاہری خوب صورتی پر اخراجات سے گریز کیا گیا تھا۔ مین گیٹ کے بالکل سامنے اور دائیں بائیں سیمنٹ کی بیرک جیسی عمارات تھیں۔ یہ عمارت شاید دو سو فٹ لمبی ہوگی۔ ان کے سامنے برآمدے تھے اور کھڑکیوں' دروازوں کی طویل قطار۔ ابھی ہر بیرک یا ہال کی ایک ہی منزل مکمل ہوئی تھی۔ چھت پر دوسری منزل کے لیے سریئے نکلے ہوئے چھوڑ دیے گئے تھے۔ باہر کی طرف پلاستر بھی سادہ تھا مگر اس پر اُجلا سفید رنگ تھا۔ درمیان میں پھولوں پودوں اور گھاس کی ہریالی تھی۔ لان چار حصوں میں تقسیم تھا جس کے وسط میں مختصر سے حوض میں فوارہ نظر آرہا تھا۔ فوارے سے سیمنٹ کے ٹائل والے چار راستے نکلتے تھے۔ ایک مین گیٹ کی طرف جاتا تھا۔ باقی تین ہر دروازے تک جانے کے لیے تھے۔ لان پر چاروں طرف سیمنٹ کی نشستیں تھیں جن پر سفید سوتی کپڑوں کے ڈھیلے ڈھالے لباس میں صرف مریض بیٹھے تھے۔ یہ ملاقات کا وقت نہیں تھا ورنہ اور لوگ بھی نظر آتے۔

مین گیٹ سے کوئی گاڑی سوائے ایمبولینس کے اندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں جاسکتی تھی۔ مجھے احاطے کے باہر بھی تین گاڑیاں کھڑی نظر آئیں جن پر چاند ستارے والے اسٹیکر کے نیچے "ڈاکٹر" کے الفاظ یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس وقت بھی کم سے کم تین ڈاکٹر اسپتال میں موجود ہوں گے۔ ان میں سے کوئی گاڑی ڈاکٹر فاروقی کی نہیں تھی۔ وہ پہلے بھی ایمبولینس کو ہی ذاتی گاڑی کے طور پر استعمال کرتا تھا مگر وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔

فولادی گیٹ آدھا کھلا ہوا تھا۔ جو پٹ بند تھا اس پر اسپتال میں مریضوں سے ملاقات کے اوقات درج تھے۔ او پی ڈی کا ٹائم لکھا ہوا تھا اور یہ لکھا ہوا تھا کہ اسپتال کے قواعد کی رو سے کیا منع ہے۔

خاکی وردی میں چوکیداری کرنے والے ایک شخص نے میرے مضحکہ خیز حلیے کی پروا کیے بغیر کہا "کہاں جانا ہے آپ کو سر۔ ابھی ملاقات کا وقت نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "میں کسی مریض سے ملنے نہیں آیا۔"

"پھر آپ صبح آنا۔ نو بجے سے دو بجے تک دوائی ملتی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے ڈاکٹر فاروقی سے ملنا ہے جو اسپتال کے مالک ہیں۔ ناصر عظیم ہے میرا نام۔"

اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کے ایک بٹن دبایا اور رکھ دیا "وہ اس وقت کسی وارڈ کے راؤنڈ پر ہیں۔"

میں نے کہا "ان کی بیوی قمر میری بہن ہے۔"

وہ ایک دم مستعد ہوگیا "آپ کی بہن ہیں بیگم صاحب۔ اچھا جی پھر آپ چلے جائیں۔ وہ ابھی ادھر ہیں۔ ٹی بی وارڈ میں۔"

میں نے کہا "وہ رہتے کہاں ہیں؟"

"گھر تو جناب پیچھے ہے لیکن وہاں کوئی نہیں ملے گا اس وقت۔"

میں چوکیدار کا شکریہ ادا کرکے چل پڑا۔ دائیں ہاتھ کے وارڈ کو اس نے ٹی بی وارڈ بتایا تھا۔ میں فوارے کے پاس پہنچ کے دائیں جانب مڑگیا۔ میری ذہنی اور جذباتی کیفیت اس وقت عجیب سی تھی۔ اس حلیے میں مجھے اچانک اپنے سامنے دیکھ کے فاروقی کتنا حیران ہوگا اور اگر اس کے ساتھ قمر ہوئی تو اس کا کیا ری ایکشن ہوگا۔ کیا وہ اپنے جذبات پر قابو رکھ پائے گی۔

پھر اچانک ایک خیال نے میرے قدم روک لیے۔ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی تھی۔ اچھا ہوا کہ ابھی تک فاروقی یا قمر نے مجھے دیکھا نہیں۔ سفید لباس والے مریضوں کے درمیان میں بہت نمایاں تھا اور وہ کسی کمرے سے باہر دیکھتے تو گڑبڑ ہوجاتی۔ وہ ایک نظر میں مجھے پہچان جاتے۔

میں الٹے پاؤں واپس ہوا۔ چوکیدار نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ شاید مجھ سے ملاقات کیے بغیر واپس جانے کا سبب پوچھنا چاہا مگر پھر خاموش رہنا بہتر سمجھا۔ میں نے خود ہی کہا۔ "وہ دراصل۔ ایک ضروری چیز بھول آیا میں" اور اس نے مسکرا کے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

وہاں قریب کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مجھے مطلوبہ چیز مل جاتی۔ مجھے ایک رکشا میں بیٹھ کے چوبرجی تک جانا پڑا۔ دو تین اسٹورز زیر مجھے مایوسی ہوئی۔ ان کے پاس عام چاقو قینچیاں تھیں پھر ایک بیکری پر مجھے اچھی امپورٹیڈ چاکلیٹ کاٹن مل گیا۔ یہ قمر کا پسندیدہ برانڈ نہیں تھا مگر اس سے کام چل سکتا تھا۔ دکان دار نے میری صورت سے زیادہ میرے حلیے کو تعجب سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ پیسہ ہو تو گدھا بھی امپورٹیڈ گھاس کھا سکتا ہے۔ ایک گھنٹے بعد میں پھر اسپتال پہنچا تو چوکیدار نے میری طرف نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا کیونکہ یہ ملاقات کا وقت تھا اور میرے علاوہ بھی بہت لوگ اندر جارہے تھے۔ دروازے کے باہر کاروں اور رکشاؤں کی تعداد سے بھی یہی اندازہ ہوتا تھا۔ لان میں بھی بہت لوگ تھے اور وارڈز کے برآمدوں میں بھی چہل پہل تھی۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور سیدھا چلتا گیا۔ فاروقی ایک گھنٹے بعد ٹی بی وارڈ میں نہیں ہوسکتا تھا۔ میں سامنے والے وارڈ کے برآمدے سے گزرتے ہوئے اندر دیکھتا رہا۔ یہ بچوں کا وارڈ تھا۔ ہر کمرے میں چار بیڈ تھے جن پر ہر عمر کے بیمار بچے لیٹے ہوئے تھے اور ان کے گرد والدین کے علاوہ بھی متفکر و غمزدہ چہرے نظر آرہے تھے۔ میری نظر کو فاروقی یا قمر کی تلاش تھی۔

اچانک ایک کمرے سے ٹرے اٹھائے نکلنے والی نرس مجھ سے ٹکرا گئی۔ ٹرے میں دواؤں کی شیشی تھی اور تھرمامیٹر تھا۔ وہ عام نرسوں والے بے داغ سفید لباس اور جوتوں میں تھی اور اس کے سر پر بھی سفید اسکارف تھا۔ کچھ نرسنگ کے پیشے کا اثر ہے کچھ ان کے سفید لباس کا پُرتقدس تاثر کہ انہیں مسٹریا مدر کہا جاتا ہے اور کوئی ان کی صورت بھی نہیں دیکھتا۔ وہی نرس عام لباس میں عورت نظر آتی ہے تو ہر نظر انہیں بہ انداز دگر دیکھتی ہے۔

غلطی میری نہیں تھی مگر میں نے سخت شرمندگی محسوس کی اور سوری کہہ کے ٹرے اٹھانے کے لیے جھکا۔ نرس اور کچھ نہ سہی اتنا ضرور کہہ سکتی تھی کہ دیکھ کے کیوں نہیں چلتے

مگر اس نے بھی عادت کے مطابق سوری کہا اور وہ بھی جھکی تو اس کا سر میرے سر سے ٹکرایا۔ چوٹ اچھی خاصی تھی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے سر کی طرف گیا اور میں نے گھبرا کے اسے دیکھا۔ یہ منظر اور لوگ بھی دیکھ رہے تھے۔ یہ کوئی فلمی اتفاق کا سین نہیں تھا۔ ایک عام سا حادثہ تھا جو کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا تھا۔ میں نے پھر معافی مانگی۔

جب اس نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا تو چند لمحوں کے لیے میرے اردگرد کا سارا منظر جیسے تاریکی میں ڈوب گیا اور ایک چہرہ میری نگاہوں میں روشن ہوگیا۔ یہ چندا کا چہرہ تھا جو مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔

مجھے پہچانتے ہی وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ "تم۔ آپ شاہ عالم صاحب!"

میں نے ٹرے کا سامان اٹھا کے چندا کے حوالے کیا۔ "جانتے بوجھتے انجان مت بنو چندا۔ میں ناصر ہوں۔"

وہ ٹرے ہاتھ میں تھامے برآمدے میں چلنے لگی "میں یہاں کوئی بحث نہیں کرسکتی۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چلنے لگا "اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تم نے یہی رویہ رکھا تو دیکھنے والے بہت کچھ دیکھیں گے۔ بعد میں شکایت مت کرنا۔ میں ثابت کردوں گا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔ ابھی سب کے سامنے۔"

اس نے گھبرا کے کہا "اس کا انجام جانتے ہو۔"

"ہاں۔ ناصر عظیم کچھ بھولا نہیں ہے۔ بس تمہیں یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ میرا تم کو منانے کا طریقہ کیا تھا۔"

اس کا رنگ اڑ گیا "خدا کے لیے۔ مجھے معاف کردو۔ جاؤ یہاں سے۔ میں ایک نرس ہوں یہاں۔"

"میں دیکھ رہا ہوں مگر میرے لیے تم صرف چندا ہو اور اس سے زیادہ تمہاری ناراضی برداشت نہیں کرسکتا میں۔ یہ ناراضی بھی نہیں' صرف ایکٹنگ ہے تمہاری۔"

ہماری طرف کوئی متوجہ نہیں تھا اور نہ ہمارے رویے سے یہ اندازہ ہوسکتا تھا کہ ریشمی کرتے کا لمبے اور قراقلی ٹوپی والا اس نرس سے کیا باتیں کررہا ہے۔ اگر وہ اپنی غلطی پر نادم ہے اور معافی کا خواستگار ہے تو نرس اسے معاف کیوں نہیں کردیتی۔

چندا کی صورت سے لگتا تھا کہ وہ اب روپڑے گی۔ "آخر کیا چاہتے ہو تم؟"

میں نے کہا "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں تمہیں چاہتا ہوں اور جتنی بے عزتی تم۔ تو تم تمہارے اس کرنل باپ نے کی ہے میری۔"

وہ ایک دم پلٹ کے بیرک کے آخری حصے میں مڑگئی۔ اس نے تیزی سے ایک کھلے دروازے کا رخ کیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ بند کرتی' میں نے اندر داخل ہوکے دروازہ بند کردیا۔ یہ مختصر سا کمرا کسی ڈاکٹر کا تھا جہاں صبح سے دوپہر تک مریضوں کو دیکھا جاتا ہوگا۔ چندا نے ٹرے میز پر رکھی اور دیوار کی طرف منہ کرکے رونے لگی۔ اس کا ایک ہاتھ دیوار پر سر کے نیچے تھا۔

میں اس سے دو قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ "چندا۔ پلیز!"

اس نے روتے روتے کہا "کیوں آئے ہو یہاں۔ چلے جاؤ' ورنہ میں شور مچا کے سب کو بلالوں گی۔"

"بلالو۔ جسے چاہو بلالو مگر میں ایسے جانے والا نہیں ہوں کیونکہ میں واپس آگیا ہوں۔ ہمیشہ کے لیے۔ اب میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ میں صرف ناصر عظیم ہوں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ کیوں اس کرتے ہو ذلیل آدمی!" وہ چیخ کے بولی۔

ایک دم دروازہ کھلا اور فاروقی اندر آگیا۔ کسی نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ وہاں سے گزر رہا تھا کہ اس نے چندا کے چلانے کی آواز سن لی۔ اندر کا منظر اس کے لیے اتنا ناقابل یقین تھا کہ وہ بُری طرح چونکا اور پھر اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔

میں نے امداد طلب فریادی نظروں سے فاروقی کی طرف دیکھا "یار' تو سمجھا اس پاگل لڑکی کو۔"

فاروقی بالکل سنجیدہ رہا "یہ کیوں رو رہی ہے؟"

چندا پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی "کمال۔ ان سے کہو کہ چلے جائیں یہاں سے' میں ان سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔"

میں نے خفت سے کہا "میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ صرف یہ بتا رہا تھا میں کہ۔"

فاروقی نے میری بات کاٹ دی "یار' یہ اسپتال ہے۔ میرا یا تیرا گھر نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں یہاں اور یہ نرس ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "ابے الو کے پٹھے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں ایک نرس صرف ڈاکٹر سے بات کرسکتی ہے۔ میرا چندا سے بات کرنا جرم ہے۔"

فاروقی نے سمجھ لیا کہ ایسے صورت حال مزید خراب ہوگی۔ اس نے پلٹ کے کہا "باہر نکل سور کے بچے۔ تماشا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مت کریساں۔ پیچھے گھر ہے میرا۔ یہ لے چابی۔ وہاں بیٹھ کے انتظار کر۔ میں آتا ہوں۔"

میں نے چابی لے لی اور کسی بے وقوف بنائے جانے والے بچے کی طرح' جو یہ سمجھتا ہو کہ اسے بے وقوف بنا کے ٹال دیا گیا ہے' باہر نکل آیا۔ میرا موڈ خراب ہو گیا تھا مگر میں کسی بھی ردِعمل کو غیر متوقع نہیں سمجھ سکتا تھا اور یہ سب برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

برآمدے میں چلتے ہوئے میں نے خود کو قائل کیا کہ زندگی کوئی فلمی کہانی نہیں ہو سکتی جسے مصنف یا ہدایت کار جب اور جہاں چاہے اپنی مرضی کے مطابق ڈرامائی انداز میں موڑ لے۔ سب کچھ پہلے کی طرح ہو جائے گا مگر پلک جھپکتے میں نہیں ہو گا اور عین میری توقعات کے مطابق نہیں ہو گا۔ یہ ایک مشکل' صبر آزما اور غیر یقینی حالات کا سلسلہ ہو گا جس میں بہرحال مجھے ہی ندامتوں کا سارا بوجھ اٹھانا پڑے گا لیکن طے شدہ طور پر اس میں مایوسی کا کوئی پہلو نہیں۔

فاروقی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں ہوا۔ اسپتال کے عقبی حصے میں ایک وسیع قطعۂ اراضی ابھی خالی پڑا تھا۔ احاطے کی دیوار تک اس کا رقبہ بھی اتنا یا اس سے زیادہ ہی ہو گا جس پر اسپتال اپنی موجودہ شکل میں نظر آتا تھا۔ خالی حصہ یقیناً مستقبل کے توسیعی منصوبے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے تھا۔ ابھی میں نے نقشہ نہیں دیکھا تھا مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ مستقبل میں یہ کتنا بڑا اسپتال ہو گا۔ ابھی اس کے ایک حصے میں صرف ایک فلور کی تعمیر مکمل ہوئی تھی۔ شاید یہ پانچ یا دس منزلہ عمارت ہو گی اور ایک دن پورے رقبے پر پھیل جائے گی تو اس کا شمار بھی بڑے اسپتالوں میں ہو گا۔ اس کا مقابلہ کسی طرح بھی عمران خان کے اسپتال سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مکمل ہو جانے کے بعد بھی یہ عمران خان کے شوکت خانم میموریل اسپتال جیسے بڑے پروجیکٹ کا سواں حصہ بھی نہ ہو گا۔

فاروقی بہت محدود وسائل رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کے خواب بھی محدود تھے اور وہ بہت زیادہ AMBITIOUS بھی نہیں تھا۔ ابھی تو میری عقل یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس نے اتنا بڑا قطعۂ زمین کیسے حاصل کیا اور اس پر یہ اسپتال کیسے بنا لیا۔ کم سے کم قیمت پر بھی خالی زمین کی مالیت ہی پچاس لاکھ سے کم نہیں ہو سکتی تھی پھر اسپتال صرف ایک عمارت اور چند بیڈز کا نام نہیں' اس میں آپریشن تھیٹرز' مشینیں' آلات اور دیگر لوازمات کا خرچ کم نہیں ہوتا۔ خواہ ڈاکٹروں کی خدمات اور دوائیں بلامعاوضہ حاصل ہوں۔

آخری حصے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک فٹ بال جیسے گراؤنڈ کو عبور کرنا پڑا۔ وہاں اسٹاف کے لیے کچھ کوارٹر بنا دیے گئے تھے۔ وہ سب ایک جیسے گھر کسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر لگتے تھے مگر ان میں سے دو پر نام کی تختی کے ساتھ ڈاکٹر لکھا ہوا تھا۔ ایک نام ڈاکٹر فاروقی کا تھا۔

بلا تکلف تالا کھول کے میں اندر داخل ہو گیا۔ اس کوارٹر میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک بیڈ روم اور دوسرا ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا ورنہ دونوں بیڈ روم بنائے جا سکتے تھے۔ کسی ڈاکٹر کے لیے اتنے چھوٹے گھر میں رہنے کا اس معاشرے میں کوئی تصور نہیں جب تک وہ فاروقی کی طرح دولت مندی میں درویشی کا انداز نہ رکھتا ہو اور اس کا ساتھ نبھانے والی قمر جیسی شریکِ حیات نہ ہو۔

ان کی شادی کو ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے تھے چنانچہ ان کے بیڈ روم میں ابھی تک مجلۂ عروسی کی مہک اور تازگی کا احساس ہوتا تھا۔ بیڈ سائڈ پر سنہرے فریم میں قمر کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ اس کی حیا آمیز نظروں میں بھی وہی پرانا شوخ اور معصوم شکایت کا انداز تھا جیسے وہ کہنا چاہتی ہو کہ جب میں دلہن بنی تھی تو آئے نہیں' اب تصویر دیکھ کے رو رہے ہو۔

میں نے فرطِ جذبات سے آنکھوں میں اتر آنے والے آنسو صاف کر دیے اور تصویر کو چوم لیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ تیرا بھائی تیری خوشی میں شریک نہ ہوتا۔ پگلی' یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی اسے ناصرِ عظیم نہ سمجھا اور شاہ عالم خان کے ایک اجنبی کی طرح دھتکار دیا۔

فاروقی کے پاس اس وقت بھی زیادہ سامان نہیں تھا جب وہ کلینک میں اکیلا رہتا تھا۔ قمر بھی روایتی انداز میں اپنے ساتھ بھاری جہیز نہیں لائی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر کو کم سے کم ضروریات کی حد تک پُر آسائش بنا لیا تھا۔ بیڈ روم میں قمر کا ایک ٹی وی تھا۔ کچن میں ایک چھوٹا سا فریج وہی تھا جو کمال کے زیرِ استعمال رہا تھا۔ ڈرائنگ روم کے فرنیچر میں بھی ایک صوفہ سیٹ قمر کا تھا تو دوسرا کمال کا مگر یہاں قناعت پسندی کا سلیقہ تھا۔ رفاقت کا پُرطمانیت اعتماد تھا اور زندگی کے عظیم تر مقاصد سے حاصل ہونے والی خوشی تھی جس کے لیے وہ خود کو وقف کر چکے تھے۔ وہ ایک عالی شان محل جیسی کوٹھی میں رہ سکتے تھے۔ لاکھوں کما سکتے تھے اور اڑا سکتے تھے مگر جو ایسا کر رہے تھے ان کے لیے اپنی معصومیت میں سکون اور طمانیتِ قلب کا کوئی پہلو نہ تھا۔ وقت کے ہر لمحے کو کیش کرانے کی دیوانگی نے ان کو زندگی کی ساری نعمتوں سے بھی

محروم کر دیا تھا۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے قمر کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ میں نے اس کی تصویر کو اپنی جگہ رکھا اور چاکلیٹس کا ٹن اس کے سامنے رکھ کے پلٹا تو وہ دروازے کے فریم میں تصویر کی طرح نظر آئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہے؟" میں آگے بڑھا "میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ ناصر عظیم ہوں' تیرا بھائی!"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"یقین نہیں آتا مجھے؟ یہ سمجھتی ہے تو کہ میں واپس جانے کے لیے آیا ہوں؟ نہیں' میں ہمیشہ کے لیے واپس آ گیا ہوں تیرے پاس۔"

اس نے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے روک رکھا تھا "کھاؤ میری قسم بھائی!"

"تیری جان کی قسم۔ میں وہی ہوں جو تھا اور وہی رہوں گا ہمیشہ۔ پھر کبھی تجھے چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔"

اس نے ایک چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی پھر وہ بے ہوش ہو گئی اور مجھے اس کو بیڈ پر لٹا کے ہوش میں لانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑے۔ بے ہوشی میں بھی آنسو اس کی آنکھوں سے مسلسل رواں رہے۔ وہ جذباتی طور پر بھی بہت کمزور لڑکی تھی اور حالات نے اسے بہت زیادہ حساس بنا دیا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اس کے ٹھنڈے ہو جانے والے ہاتھوں کو اور پاؤں کے تلوؤں کو رگڑا۔ دس منٹ بعد آہستہ آہستہ وہ پھر سسکیاں لینے لگی "تمہیں میری قسم بھائی' اب کہیں مت جانا ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

میں نے کہا "پاگل۔ ہوش میں آ۔ جب قسم کھائی ہے تو اعتبار کیوں نہیں کرتی میرا؟"

آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ اسے یقین آنے لگا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں اور غم پر اس خوشی کا احساس غالب آنے لگا تو اس کے آنسو بھی تھم گئے۔ وہ جھینپی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے باتیں کرنے لگی اور اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ اس کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا جو وہ ایک ہی سانس میں رکے بغیر کہہ دینا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "لڑکی۔ کہیں فل اسٹاپ لگا۔ خود بولتی جا رہی ہے' مجھے بھی بولنے دے۔"

وہ سیدھی بیٹھ گئی "اچھا بولو۔ پہلے بتاؤ یہ کیا جوکروں والا حلیہ بنا رکھا ہے۔ سیاست چھوڑ کے کسی سرکس میں کام کر رہے ہو بھائی!"

میں نے کہا "سرکس کی بچی۔ بھائی پہلی بار آیا ہے تیرے گھر۔ ابھی تک چائے کو نہیں پوچھا تو نے۔"

اس نے چاکلیٹ کا ٹن کھول کے ایک پیس نکالا اور بولی "اچھا کیا کہ رشوت پہلے سامنے رکھ دی ورنہ میں تو کبھی نہ مانتی تمہیں اپنا بھائی۔ میں تو ترس گئی تھی چاکلیٹ کے لیے۔ تمہارے سوا کسی نے آج تک ایک ٹافی تک نہیں لا کے دی۔"

میں نے ہنس کے کہا "کیوں۔ تیرا میاں بھی نہیں منتا تیری؟"

"انہیں کہاں فرصت ہے۔ ایک بار کہا تھا تو بولے کہ یہ وٹامن سی کی گولی ہے اور رنج فلیور میں۔ یہ کھالو۔ اچھا چلو' تمہیں اپنا کچن دکھاؤں۔ میں چائے بناتی ہوں۔ وہ بھی آتے ہی ہوں گے' ایک ساتھ پئیں گے۔"

میں کچن میں ایک اسٹول رکھ کے بیٹھ گیا "قمر تو خوش ہے نا؟"

وہ ہنسی "آں ہاں بہت خوش ہوں۔"

"میرا مطلب تھا اس الو کے پٹھے کے ساتھ؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے بھائی!" وہ بولی "دوست تمہارے تھے وہ۔"

"دوست تو خیر اچھا تھا' شوہر کیسا ہے؟ یہ مجھے کیا معلوم۔"

"بھائی۔ آپ نے چندا کے بارے میں نہیں پوچھا" اس نے پلٹ کے مجھے دیکھا۔

"کیا پوچھوں' میں مل چکا ہوں اس سے۔" میں نے افسردگی سے کہا۔

"آپ نے خان جی کو دیکھا؟"

"نہیں۔ میں گھر گیا تھا مگر وہاں اب کوئی اور رہتا ہے۔ اپنا گھر کیوں بیچ دیا انہوں نے آخر؟"

وہ مجھے پھر افسوس اور ملامت نظروں سے دیکھتی رہی۔ "اپنا سب کچھ انہوں نے اس اسپتال میں لگا دیا اور اب خود بھی یہیں لیٹے ہوئے ہیں۔"

"وہ۔ بیمار ہیں۔؟ کیا ہوا ہے انہیں؟" میں کھڑا ہو گیا۔

"آپ چائے پی لو بھائی!" وہ آہستہ سے بولی۔

"قمر۔ بتاتی کیوں نہیں' کیا بیماری ہے انہیں؟" میں نے اس کا بازو پکڑ کے اس کا رخ اپنی طرف کر لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمر کی آنکھوں میں آنسو تھے "وہ مفلوج اور بے ہوش پڑے ہیں بھائی۔ تین مہینے سے زیادہ ہو گئے۔"

صدمے سے میرا ذہن سُن ہو گیا "آخر ہوا کیا تھا انیس؟"

"کچھ بھی نہیں" قمر نے آنسو صاف کر لیے "بس بخار ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ ٹانگوں میں جیسے دم نہیں رہا۔ اس کے بعد جو لیٹے تو اب تک نہیں اٹھے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ کمال نے ہر ڈاکٹر کو بُلا کے دکھایا۔ نہ جانے کتنے ٹیسٹ ہو گئے۔ آغا خان اسپتال کراچی سے ایک ڈاکٹر آیا تھا' نجم شیخ یا کچھ ایسا ہی نام تھا' اس نے شبہ ظاہر کیا کہ فلاں بیماری کا اثر ہے۔ بڑا مشکل سا نام تھا بھائی' کوئی وائرس ہے جو اعصاب کو متاثر کرتا ہے۔ دس لاکھ میں سے کسی ایک پر حملہ ہوتا ہے۔ عام ڈاکٹروں کی سمجھ میں بھی نہیں آسکتی یہ بیماری۔"

"اور اس کا علاج۔؟"

"بھائی وائرس کا کیا علاج۔ ختم ہونے میں کتنا وقت لے گا۔ میو اسپتال میں ایک دفعہ خون صاف ہوا تھا۔ پلازما الگ کر کے سرخ اور سفید ذرات کو خاص طریقے سے اسکرین کیا تھا۔ بس اس کے بعد کچھ نہیں' کچھ علاج چل رہا ہے مگر وہ انفیکشن سے بچانے کے لیے ہے۔"

"انیس بالکل ہوش نہیں آیا؟" اس نے مجھے چائے تھمادی۔

"نہیں۔ دو بار اچانک کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا۔ خاموشی سے دیکھتے رہے سب کو۔ بول نہیں سکتے تھے مگر ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ ان کا دماغ پوری طرح مستعد ہے اور وہ سن سکتے ہیں۔"

میرا دل بار غم سے بوجھل ہوتا جا رہا تھا "اور کب تک رہے گی ان کی ایسی حالت؟"

"اس بارے میں کچھ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ تم جانتے ہو بھائی کہ کمال کے مراسم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جو کام انہوں نے اکیلے شروع کیا تھا چند برس پہلے' آہستہ آہستہ اس کی شہرت ہو گئی ہے۔ پبلک بھی جانتی ہے اور حکومت کے اعلیٰ سرکاری حکام کو بھی خبر ہے۔ کمال نے سب سے رابطہ کیا' بہت سے ڈاکٹر آئے جو دماغی اور اعصابی امراض کے ماہر تھے لیکن سب نے یہی کہا کہ اگر خان جی۔" وہ بات کرتے کرتے منہ چھپا کے رونے لگی۔

میں نے چائے کی پیالی نیچے رکھ دی "قمر کیا بات ہے۔؟"

قمر نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے "کچھ نہیں بھائی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اگر وہ اس کیفیت سے نکل آئے تو بچ جائیں گے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اسی طرح پڑے رہیں۔ مہینوں یا برسوں۔ بیماری کا دائرس تو ختم ہو جائے گا لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سارے اعصابی نظام کو تباہ کر دے۔"

"کیا انیس علاج کے لیے بیرونِ ملک لے جانے سے فائدہ ہونے کی امید کی جا سکتی ہے؟ برطانیہ' دبئی یا امریکا۔"

"بھائی' وہ جو کراچی سے ڈاکٹر آیا تھا' نجم الدین شیخ۔ اس نے تو کہا تھا کہ کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بلاوجہ انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے آپ کی مرضی۔ کمال نے لندن کے کرامویل اسپتال کے کسی ڈاکٹر سے فون پر بات کی تھی اور اس نے رپورٹیں منگوائی تھیں۔ ہم نے D.H.L. سے ارسال کر دیں۔ تیسرے دن اس نے فون کر کے وہی کہا جو یہاں کے ڈاکٹرز کی رائے تھی اور رپورٹیں واپس بھیج دیں۔ علاج کوئی نہیں۔ امید ہے دعا ہم سب کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ ٹھیک ہو جائیں گے قمر۔ ان کی قوتِ ارادی ہر مرض کو شکست دے سکتی ہے۔ میں نے انہیں کبھی بیمار نہیں دیکھا۔ میں جاتا ہوں انہیں دیکھنے کے لیے۔"

"پتا نہیں کمال کیوں نہیں آئے۔ مجھے بھیج دیا بہانے سے گھر۔ کچھ بتایا نہیں کہ بات کیا ہے۔ کہنے لگے کہ ہمارے بیڈ سائڈ ٹیبل کی دراز میں میری ٹیلی فون ڈائری ہے۔ وہ لے آؤ۔"

میں نے کہا "اگر وہ بتا دیتا کہ تمہارا بھائی گھر پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔؟"

وہ اُداسی سے مسکرائی "سچ بتاؤں بھائی! میں انکار کر دیتی۔ بہت ناراض تھی میں تم سے۔ یہ فیصلہ کیا تھا میں نے کہ تم سامنے آئے تو بات نہیں کروں گی تم سے۔ تمہاری طرف دیکھوں گی بھی نہیں۔ تم لاکھ مناؤ میں مانوں گی نہیں۔"

میں نے محبت سے اس کے گال پر چپت لگائی "پاگل۔ کسی اور کی بات نہیں کرتا لیکن یہ تیرے لیے ناممکن تھا۔"

"چلو' میں بھی چلتی ہوں" وہ دروازہ بند کر کے میرے ساتھ نکل آئی۔

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ مریضوں سے ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ یہاں آنے والے بیشتر مریضوں کے ملاقاتی یہ بات جانتے تھے کہ اسپتال کا ڈسپلن بہت سخت ہے۔ کسی کو چھ بجے کے بعد ایک منٹ بھی ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے باوجود کچھ لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ پہلے ان

سے اسپتال کے لاؤڈ اسپیکرز پر درخواست کی جاتی تھی پھر بھی رخصت نہ ہونے والوں کو اسٹاف نکالتا تھا اور سوا چھ بجے تک ہر صورت میں باہر کا گیٹ بند کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسپتال کی صفائی شروع ہوتی تھی۔ ڈاکٹر آخری راؤنڈ لگا کے مریضوں کی حالت دیکھتے تھے۔ آٹھ بجے رات کا اسٹاف ڈیوٹی پر آجاتا تھا تو کمال کو فراغت ہوتی تھی۔ اسپتال کے احاطے میں تین ڈاکٹرز کو رہائش فراہم کی گئی تھی جو باری باری رات کے وقت ڈیوٹی دیتے تھے۔ ان میں خود ڈاکٹر کمال فاروقی بھی شامل تھا۔

ملاقاتی جا چکے تھے اور نرسوں نے معمول کے مطابق اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ایک جیسے لباس میں کسی کو بھی آسانی سے شناخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں ان کی صورتیں غور سے دیکھتا رہا لیکن چندا مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں یہ فرض نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ابھی تک کہیں چھپ کر بیٹھی رو رہی ہو گی۔ اس نے یقیناً اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

اسپتال میں سب عام وارڈ تھے۔ یہاں کسی کے لیے پرائیویٹ یا اسپیشل وارڈ رکھے ہی نہیں گئے تھے مگر خان جی کو مخصوص حالات کے پیشِ نظر ایک کمرا دے دیا گیا تھا جہاں ان کی دیکھ بھال I.C.U. کی طرح کی جاتی تھی۔ ان کے لیے اے سی ضروری تھا۔ ایمرجنسی میں استعمال کی جانے والی سب مشینیں وہاں موجود تھیں مگر وہ ان کے لیے مخصوص نہیں تھیں۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ خان جی نے بہت پہلے سے تمام انتظامات کر لیے تھے۔ انہوں نے بہت زیادہ دولت جمع نہیں کی تھی۔ جائداد بھی صرف وہ پرانی کوٹھی تھی جو انہوں نے چندا کے نام کر دی تھی۔ کوٹھی کی قدامت اور طرزِ تعمیر کا قدرداں اب کون تھا۔ ساری قیمت اس جگہ کی تھی۔ نئے زمانے کے ایک رئیس نے اس کے لیے پچاس لاکھ بخوشی ادا کر دیے۔ وہ پرانے ڈھانچے کو گرا کر وہاں جدید ترین انداز کی کوٹھی بنوانا چاہتا تھا۔ چندا نے یہ ساری رقم کمال کے حوالے کر دی۔ رہائش کے لیے انہوں نے کمال کے ساتھ والا دو کمروں کا کوارٹر لے لیا مگر انہیں وہاں رہنا نصیب نہ ہوا۔ اب خان جی اسپتال کے ایک بیڈ پر دنیا و مافیہا سے بے خبر لیٹے ہوئے تھے اور چندا انہی کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کا کوارٹر بند ہی رہتا تھا۔ نہانے دھونے یا کپڑے بدلنے کے لیے چند دن میں ایک بار جاتی تھی اور کم سے کم وقت میں لوٹ آتی تھی۔ دن میں اس کی ڈیوٹی عام نرسوں کی طرح کسی بھی وارڈ میں ہو' وہ خان جی کو آتے جاتے دیکھ جاتی تھی۔ رات کو وہ انہی کے کمرے میں [illegible] جاتی تھی۔ اس نے اپنے لیے کھانے پینے کا سلسلہ الگ رکھنے کی کوشش ضرور کی تھی مگر قمر کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن تھا۔ قمر اب گھر کو بھی سنبھالتی تھی اور فرصت کا سارا وقت اسپتال کے کاموں میں کمال کے ساتھ رہ کے صرف کرتی تھی۔

کرنل خان کی گزر اوقات کا ایک ذریعہ ان کی پنشن تھی۔ انہوں نے پس انداز کی ہوئی رقم بھی فوجی فاؤنڈیشن کے منافع بخش حصص میں لگا رکھی تھی مگر کمال کے اسپتال کی تعمیر کا آغاز ہوا تو انہوں نے وہ حصص بھی چندا کے اصرار پر فروخت کر دیے۔ یہ رقم بھی لاکھوں میں تھی جو اسپتال کے فنڈ میں شامل ہو گئی مگر کمال کی یہ خواہش کرنل خان نے مسترد کر دی کہ اسپتال کے ایک وارڈ کو ان کے نام سے موسوم کر دیا جائے۔

انہیں ذاتی رہائش کے لیے کوارٹر کافی تھا اور خان جی کو یہ فکر بھی نہیں تھی کہ کل کو چندا اکیلی کیسے رہے گی۔ وہ جانتے تھے کہ ناصر کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ خدا کے بعد دنیا میں چندا کے لیے قمر اور ڈاکٹر فاروقی کا آسرا ہے۔ اپنی زندگی میں گزارے کے لیے ان کی پنشن ہی کافی تھی مگر چندا اپنی خدمات کا معاوضہ ایک عام نرس کی تنخواہ کے مساوی لینے پر راضی ہو گئی تھی۔ فاروقی نے صاف کہہ دیا تھا کہ تنخواہ تو میں بھی لیتا ہوں۔ اتنی ہی جتنی دوسرے ڈاکٹروں کو دیتا ہوں۔ یہ تنخواہ بہت کم بھی نہیں تھی اور بہت زیادہ بھی نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔ ایک ڈاکٹر کو اس معاشرے میں عزت کے ساتھ پُر آسائش زندگی گزارنے کا پورا حق حاصل ہے۔ کام کے بعد آرام کے لیے اس کے پاس ایک آرام دہ گھر ہونا چاہیے۔ اس سے یہ توقع رکھنا بھی زیادتی ہو گی کہ وہ بسوں اور ٹانگوں میں جائے۔ پیدل پھرے یا سائیکل چلاتا نظر آئے۔ ایک گاڑی اس کے لیے ضرورت کی چیز ہے۔ یہ سب کچھ انہیں حاصل نہ ہو تو اثر ان کی کارکردگی پر بھی پڑ سکتا ہے اور ان کے جذبۂ خدمتِ خلق پر بھی۔ چنانچہ چندا نے نرسنگ سیکھ لی تھی اور اب ایک نرس کی حیثیت سے اس اسپتال میں ملازم تھی جس کے نصف حصے کی وہ مالک ضرور سمجھی جا سکتی تھی۔

قمر کے ساتھ میں خان جی کے کمرے میں پہنچا تو انہیں اجلے سفید چادر والے بستر پر آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت دیکھ کے مجھے بڑا عجیب لگا۔ وہ زندگی کی مثبت توانائیوں سے بھرپور، ہر لحظہ متحرک اور فعال نظر آنے والے اور ذہنی و جسمانی طور پر مستعد جسم کا مالک شخص۔ فوج کا سابق کرنل جو زندگی کی جدوجہد میں بھی ڈسپلن کی خلاف ورزی کو جرم سمجھتا تھا۔ جو اصول پرستی' اخلاقی قدروں اور وضع داری کی شرافت کا قائل تھا۔ وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنا پڑا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ خوردبین کے بغیر نظر نہ آنے والے ایک حقیر ترین اور نامعلوم وائرس نے ایک جیتے جاگتے آدمی کو زندہ لاش میں تبدیل کردیا تھا۔

خان جی کے سرہانے کی طرف ایک الیکٹرونک مانیٹر لگا ہوا تھا جس کے بدلتے روشن ہندسے ان کے معذور اور مفلوج جسم کے زندہ ہونے کا ثبوت فراہم کررہے تھے۔ دورانِ خون کا دباؤ' نبض کی رفتار اور دل کی حرکت کے گراف میں کوئی بھی تشویشناک بات نہ تھی۔ ظاہر کی ساری علامات کی رو سے وہ نارمل تھے اور زندہ تھے مگر یہ زندگی حیاتیاتی سائنس کے معیار پر VEGETABLE لائف تھی۔ سننے' بولنے' دیکھنے' قوتِ فیصلہ اور قوتِ عمل کی صلاحیت کے بغیر وہ اسی حد تک زندہ تھے جس حد تک ایک پودے یا درخت کو زندہ سمجھا جاسکتا ہے۔

خان جی کے ایک بازو سے وہ نلکی پیوست تھی جس سے قطرہ قطرہ گلوکوز کی صورت میں ان کے جسم کو خوراک کے متبادل توانائی فراہم ہورہی تھی۔ اعصابی نظام پر اختیار ختم ہوجانے کے باعث جیسے وہ اپنی مرضی سے نہ آنکھیں کھول سکتے تھے اور نہ لب ہلا سکتے تھے ایسے ہی جسم کے نظامِ اخراج کو کنٹرول کرنے سے قاصر تھے۔ اس کے لیے ان کے زیریں جسم سے تھیلیاں منسلک کردی گئی تھیں۔ اس معاملے میں اچانک وہ ایک نومولود بچے کی طرح بے اختیار ہوگئے تھے۔

کمرے میں کچھ فاصلے پر دوسرا بیڈ تھا۔ یہاں چندا سوتی تھی۔ وہ بیک وقت ایک بیٹی' ایک نرس اور ایک ATTENDENT کی ذمے داریاں پوری کررہی تھی اور اس کے لیے یقیناً ایک بیٹی کے جذبات کو ایک نرس کے فرائض سے الگ رکھنا آسان نہ تھا۔

میں خاموشی سے بیڈ پر بیٹھ گیا "قمر یہ سن سکتے ہیں نا؟"

"کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا بھائی" وہ بولی "کوئی ردِعمل نہ ہو تو پتا کیسے چلے؟"

"کاش میں ان سے اپنے کیے کی معافی مانگ سکتا" میں نے مایوسی اور حسرت سے کہا "میں نے بہت دکھ پہنچایا انہیں۔ وہ بہت ناراض تھے۔"

قمر نے آہستہ سے کہا "ہاں بھائی۔ وہ بہت دکھی تھے۔"

"یاد کرتے تھے مجھے؟"

"سب کے سامنے تو نہیں مگر چندا کو معلوم ہے کہ انہیں تمہاری کمی کا شدت سے احساس ہوتا تھا۔ وہ افسردہ ہوجاتے تھے۔ کچھ سوچنے لگتے تھے۔ جب بھی تمہاری پسند کی کوئی چیز دسترخوان پر نظر آتی تھی' تمہاری ذاتی استعمال کی چیزیں دیکھ کر۔ تمہاری سالگرہ پر وہ سارا دن چپ رہے۔ شام کو چندا نے کہیں کہہ دیا کہ مت سوچیں ناصر کے بارے میں تو پھٹ پڑے۔ چندا پر بگڑنے لگے کہ اس کے بارے میں مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ میرا اس سے کیا تعلق۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ کبھی بات بھی مت کرنا اس کی۔۔۔ پھر خاموش ہوگئے اور کچھ دیر بعد بولے کہ پتا نہیں کہاں ہوگا وہ نالائق۔ اسے یاد ہی نہیں ہوگا کہ آج اس کی سالگرہ تھی۔ ایسے چندا کی سالگرہ آئی اور گزر گئی۔ چندا نے مجھے تو کچھ بھی نہیں بتایا لیکن بھائی' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اس نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔ وہ روتی نہ ہو چھپ کے۔ تم ہی کرتے تھے سارا اہتمام۔ تمہارے بغیر وہ اکیلی کہاں سالگرہ مناتی اور دکھی ہوتے خان جی۔"

"مت کر ایسی باتیں قمر۔ خود بھی روتی ہے اور مجھے بھی رلاتی ہے۔" میں نے پھر چھلک آنے والے آنسو رومال سے صاف کرلیے "اسے اپنی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہوں میں۔ اپنا سب کچھ گنوا دیا میں نے۔ نہ ادھر کا رہا نہ ادھر کا۔ واپس آکے بھی پچھتا رہا ہوں مگر اور کہاں جاسکتا تھا میں۔"

"اللہ سب ٹھیک کرے گا بھائی۔ خان جی ٹھیک ہوجائیں گے۔ چندا کی ناراضی بھی ایسے ہی ہے۔ تم جانتے ہو اور خان جی کا غصہ بھی صرف ان کے دکھ کا اظہار ہے۔ اچھا میں چلتی ہوں۔ مجھے اب رات کا کھانا بنانا ہے۔ سب کے لیے' آج تین سے چار ہوگئے ہیں۔"

میں اٹھ کے خان جی کے بیڈ تک گیا اور انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ وہ پہلے کے مقابلے میں کمزور نظر آرہے تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ نہ جانے کب سے ان کے جسم کو قدرتی خوراک کے بجائے مصنوعی ذریعے سے گلوکوز کی توانائی کے سہارے زندہ رکھا جارہا تھا۔ ان کی داڑھی بڑھ کے بے ترتیب ہوگئی تھی اور اس کے سارے بال سفید نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی حلقوں میں اتری ہوئی محسوس ہوتی تھیں اور ان کے چہرے پر ایک پژمردگی تھی۔

میں نے ان پر جھک کے آہستہ سے کہا "خان جی۔ میں ناصر ہوں۔ آپ کا ناصر عظیم۔ دیکھیے' آنکھیں کھول کر دیکھیے۔ آپ میری آواز سن رہے ہیں نا؟"

خان جی اسی طرح ساکت وجامد اور بے حس وحرکت لیٹے رہے۔

میں نے ان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا "خان جی۔ میں واپس آگیا ہوں۔ میری طرف دیکھیے' ایک بار۔۔۔ میں شاہ عالم نہیں ہوں۔ شاہ عالم مرگیا۔ میں زندہ ہوں۔ میں ناصر عظیم تھا' ناصر عظیم ہوں اور ناصر عظیم ہی رہوں گا۔ وہ میری غلطی تھی۔ میری بے وقوفی تھی۔ میں کسی مجبوری کی بات نہیں کرتا' وہ میری بزدلی تھی۔ میں انکار کرتا تو کیا ہوتا؟ وہ قتل کردیتے مجھے' مار دیتے' میں نے کیوں مان لی ان کی بات۔ کیوں شاہ عالم

بننا قبول کرلیا۔ یہ ناممکن تھا' میرا دماغ خراب ہوگیا تھا کہ میں نے اسے چیلنج سمجھا اور یہ سوچا کہ میں کسی اور کی زندگی جی سکتا ہوں۔ بہت ذلت اٹھائی میں نے۔ بہت پریشانی جھیلی۔ بہت عذاب برداشت کیا اور پھر مجھے لوٹ کے آنا پڑا۔ جان بچانے کے لیے میں کہیں بھی جاسکتا تھا۔ ملک سے باہر رہ سکتا تھا مگر میں واپس آگیا' آپ کے پاس۔ آپ ہی سب کچھ ہیں میرے لیے۔ میں نے بہت دکھ دیے آپ کو۔ میں مستحق ہوں آپ کی ناراضی کا۔ آپ مجھے جوتے بھی ماریں تو یہ سزا میرے لیے سکون کا سبب ہوگی۔ میرا احساسِ جرم وگناہ کم ہوجائے گا۔ میں معافی مانگتا ہوں آپ سے خان جی۔"

جو کچھ میں ان سے کہہ رہا تھا اس یقین کی بنا پر کہہ رہا تھا کہ وہ میری آواز سن رہے ہوں گے۔ وہ جواب دینے کے قابل نہ سہی' اگر ان تک میری بات پہنچ جائے۔ وہ جان لیں کہ میں کون ہوں اور چاہے اس کا اظہار نہ کریں مگر مجھے معاف کردیں۔ مجھے دل کی بات کہنی ضرور چاہیے۔

میری زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ دل کی گہرائی سے نکلا تھا۔ یہ میرے حقیقی جذبات تھے جن پر میرا کنٹرول نہ تھا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے نکل آنے والے آنسوؤں کا ایک قطرہ خان جی کے ماتھے پر ٹپکا۔

اور اس کے ساتھ ہی جو کچھ ہوا' اسے اب میں ایک معجزہ ہی کہوں گا۔ اچانک خان جی نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔

میرا دل خوشی سے بے قابو ہوگیا۔ میں نے کہا "خان جی۔ خان جی میں ناصر ہوں۔ آپ کا ناصر۔۔۔ میں واپس آگیا ہوں آپ کے پاس۔"

ان کی کھلی آنکھیں مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہیں۔

میں نے روتے روتے کہا "خان جی۔ ایک بار کہہ دیں کہ آپ نے مجھے معاف کیا۔ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں' گنہگار ہوں۔ یہ میری غلطی نہیں بدبختی تھی کہ میں آپ کو چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ کہاں جاسکتا تھا میں آخر۔ آپ کے سوا کون تھا میرا اس دنیا میں۔ سب جھوٹے سارے تھے' جھوٹے رشتے تھے' مجھے لوٹ کے آنا ہی تھا' میں آگیا ہوں۔"

پھر اچانک مجھے یوں لگا جیسے خان جی کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی ہے۔ یہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی مسکراہٹ بہت واضح ہوگئی۔ ان کی آنکھوں میں محبت اور شفقت کا اُجالا یوں پھیلا جیسے صبحِ کاذب کے بعد نورِ سحر محسوس ہوتا ہے اور جیسے اندھیرے سے اجالا الگ۔ مختلف اور واضح طور پر متضاد [illegible]

میں دیکھ سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں میں غصہ نہیں ہے' شفقت ہے۔ بے گانگی نہیں ہے' اپنائیت ہے۔ نفرت نہیں ہے' پیار ہے۔

میں نے چلّا کے کہا "خان جی۔ آپ نے مجھے معاف کردیا۔۔۔ اپنے ناصر عظیم کو معاف کردیا۔"

بہت واضح انداز میں ان کے سر نے اثبات میں جنبش کی۔ آہستہ سے انہوں نے گردن کو اوپر سے نیچے ہلا کے کہا۔ "ہاں۔" ان کی زبان نے یہ لفظ نہیں کہا مگر میرے لیے شک وشبے کی کوئی بات نہیں رہی۔ انہوں نے اقرار کرلیا تھا کہ اب وہ مجھ سے خفا نہیں ہیں۔ انہوں نے پھر مجھے ناصر عظیم کی جگہ قبول کرلیا ہے۔

اسی وقت فاروقی مجھے دروازے میں نظر آیا۔ اس کے پیچھے چندا تھی۔

میں نے چلّا کے اس سے کہا "کمال۔ دیکھ خان جی کو ہوش آگیا ہے۔"

"ہوش آگیا ہے؟" وہ تیزی سے آگے آیا۔

"ہاں۔ ابھی ابھی انہوں نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا پھر میں نے ان سے معافی مانگی تو یہ مسکرانے لگے اور انہوں نے سر ہلا کے مجھ سے کہا کہ وہ اب مجھ سے ناراض نہیں ہیں" میں نے اسے بڑے جوش کے ساتھ بتایا۔

فاروقی نے شک آمیز سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا تو میری نگاہ پھر خان جی کے چہرے پر گئی۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔

"میں۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔ ابھی ایسا ہی ہوا تھا۔ خدا کی قسم' میں سچ کہہ رہا ہوں۔ چندا' میری طرف ایسے مت دیکھو۔ میں کسی کے سامنے کوئی ڈراما کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں تجھ پر شک نہیں کرتا۔۔۔ ایسا ہوسکتا ہے" فاروقی نے کہا۔

"ہوسکتا ہے نہیں' ایسا ہوا تھا یار!" میں نے اصرار کے ساتھ کہا اور چندا کی طرف دیکھا۔

"ماں ہاں ان کی بات ڈاکٹر صاحب!" چندا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"چندا۔ اس کا مطلب ہے تم نے یقین نہیں کیا میری بات کا؟"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے" وہ بولی اور پلٹ کے باہر نکل گئی۔

فاروقی نے خان جی کی طرف اشارہ کیا اور ہم باہر آکے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برآمدے میں کھڑے ہوگئے۔ میں نے کہا "یہ چندا کی زیادتی ہے۔ میری بے عزتی کی ہے اس نے۔"

فاروقی نے کہا "اس کا ردِعمل فطری ہے۔ اس کا دل صاف نہیں ہے تیری طرف سے۔"

"تو سمجھا اسے۔"

"میں نے کوشش کی تھی لیکن اس وقت ہسٹریا غالب تھا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا مگر ایک دم نہیں۔ ہم سب مل کے بیٹھیں گے۔ بات کرلیں گے۔"

میں نے گھڑی دیکھی "دیکھ کمال۔ میرا دل مطمئن ہے۔ چندا یقین نہیں کرتی تو نہ کرے۔"

"تجھے جلدی کیا ہے' کہیں جانا ہے؟"

"ہاں مگر میں پھر آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"بکواس مت کر۔ قمر نے کھانا پکایا ہوگا۔"

میں نے کہا "یار کھانا کیا ضروری ہے۔ جب دل چاہے گا آ کے کھالوں گا۔"

"مت کھا کھانا مگر یہ کیا بے وقوفی ہے۔ اتنی سی دیر کے لیے آیا تھا تو؟ ابھی تو ہم نے بیٹھ کے کوئی بات بھی نہیں کی" فاروقی نے خفگی سے کہا۔

"یار کیا فائدہ بات کرنے کا جب اعتبار ہی نہیں رہا۔"

"تو خود نفی کررہا ہے اعتبار کی۔ تو نے ابھی کیا کہا تھا؟ خان جی نے تیری بات پر اعتبار کیا یا نہیں۔ کیا قمر نے بھی کچھ کہا ہے جو تجھے برا لگا؟ یا میرے رویے سے شکایت ہے تجھے؟"

میں ٹھنڈا ہو کے بیٹھ گیا "نہیں مگر چندا۔۔۔!"

"جی چاہتا ہے ایک جھانپڑ ماروں تیرے سؤر کے بچے۔ کیا تو جانتا نہیں کہ وہ کتنی جذباتی لڑکی ہے۔ انتہائی حساس مزاج ہے اس کا۔ آٹھ سال ساتھ رہ کے اتنا بھی نہیں سمجھا تو نے کہ تیرے لیے اس کے جذبات کیا ہیں۔ کتنی شدت تھی اس کی جذباتی وابستگی میں اور اس کے بعد تو نے جو کیا' وہ بہت بڑا سانحہ تھا اس کے لیے۔ تیرے پاس کوئی بھی عذر ہو' مجبوری کا یا مصلحت کا' اس کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع دھچکا تھا۔ ایک سال میں تو نے جو کچھ کیا' وہ سب اخباروں میں دیکھتی رہی' خود سوچ کہ اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ سب برداشت کیا اس نے اور اب تو چاہتا ہے کہ بس تو کہے کہ بھول جاؤ وہ سب اور چندا بھول جائے؟ تو کہے کہ سمجھو' وہ کھیل ختم ہوا اور چندا کہے جو حکم آپ کا حضور۔ زندگی کو کیا سمجھتا ہے تو مداری کے بچے۔ آٹھ سال یہاں ایک تماشا کرتا رہا۔ پھر سال بھر کے لیے شاہ عالم کی زندگی کا کھیل دکھایا اور پھر آگیا لوٹ کے یہاں پر انا کھیل دکھانے۔"

میں نے کہا "ایسا مت کہہ یار۔ تو گالی دے مجھے' تھپڑ مار میرے منہ پر لیکن ایسا مت کہہ۔"

"کیوں نہ کہوں آخر' جو سچ ہے وہ گالی سے اور تھپڑ سے زیادہ لگتا ہے تجھے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سچ تو سچ ہے۔ ایک سال تک قمر روتی رہی۔ ایک سال تک خان جی اندر ہی اندر سارے دکھ کا عذاب جھیلتے رہے اور اپنا خون جلاتے رہے۔ چندا سب دیکھتی رہی تو اتنا بہرحال سمجھ سکتا ہے کہ جس کا رشتہ جتنا زیادہ مضبوط ہوتا ہے' اس کو صدمہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی کنوئیں میں گر جائے تو کنواں جتنا گہرا ہوگا اسے باہر نکالنا بھی اتنا ہی مشکل ہوگا۔"

میں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یار فاروقی' کہیں خان جی کی اس حالت کا ذمے دار بھی وہ مجھے تو نہیں سمجھتی؟"

"پہلے سمجھتی تھی مگر بیماری کی نوعیت کا علم ہوا اور رپورٹیں آئیں تو ظاہر ہے اس نے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کیا۔ دیکھا جائے تو سب سے زیادہ ظلم اسی کے ساتھ ہوا۔ پہلے آپ نکل گئے ایک احمقانہ سیاسی ایڈونچر کرنے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ نا صر اتنا کم ہمت۔۔۔ اور کم ظرف ثابت ہوگا۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ کم ہمتی اور کم ظرفی کی کون سی بات تھی اس میں۔"

"پھر اور کیا بات تھی۔ مجبوری والے عذر کو میں نہیں مانتا۔ کم ہمت نہ ہوتا تو صاف کہتا کہ گولی مارو مجھے مگر میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں اس گھر کو اور اس گھر کے رشتوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ کم ظرفی یہ ہے تیری کہ تو نے شاہ عالم کی سیاسی ساکھ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی کیونکہ تیرے دماغ میں کہیں وہ کیڑا ابھی تک کلبلا رہا تھا کہ تجھے اس ملک کا وزیرِاعظم بننا ہے۔"

میں بھڑک اٹھا "فاروقی۔ میں ہاتھ مار دوں گا تیرے۔ ہزار بار یہ بتا چکا ہوں میں کہ وہ بچپن کی بات تھی۔"

"لاشعور کے نقوش میں بچپن کا عکس باقی رہتا ہے۔ جو آدمی کی شخصیت اور اس کے خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے۔" وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

"میں اس کتابی فلسفے سے اتفاق نہیں کرتا۔"

"تیرے اتفاق نہ کرنے سے کششِ ثقل کا نظریہ بدل جائے گا؟ زمین کی گردش رک جائے گی اور بھائی' مجھے جانا ہے تو شوق سے جا۔ ہم پہلے بھی جی رہے تھے تیرے بغیر۔ آئندہ بھی جی لیں گے۔ اگر تیری نظر میں رشتوں کی جذباتی اہمیت وہی ہے جو پہلے تھی' تو پھر سوچ لے۔ زندگی تیری اپنی ہے" وہ اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا دروازے کی طرف

چلا گیا۔

چندا کے اور پھر فاروقی کے رویے نے میرا حوصلہ پست کردیا تھا اور میں مایوسی کی فرسٹریشن کا شکار ہونے لگا تھا لیکن فاروقی نے جو بھی کہا' تلخ ہونے کے باوجود سچ تھا۔ مجھے کسی اور کی زندگی کو تماشا بنانے کا اختیار نہیں تھا۔ میرے لیے لوٹ کے اپنی پرانی زندگی کی طرف آنا بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ میرا یہ توقع رکھنا ہی غلط تھا کہ میرا خوشی کے جذبات سے بہتے آنسوؤں کے ساتھ استقبال ہوگا اور میری نظر اتاری جائے گی۔ شکرانے کے نفل ادا کیے جائیں گے اور مٹھائی بانٹی جائے گی۔

اگر ان سب کی زندگی میں کوئی خلا میرے جانے سے پیدا ہوا تھا تو اسے وقت نے بھر دیا تھا۔ جیسے وقت کا مرہم ہر زخم کو بھر دیتا ہے۔ لوگ مرنے والوں کو روکے صبر کرلیتے ہیں لیکن بچھڑ جانے والوں کے لیے بھی ہر وقت آنسو نہیں بہاتے رہتے۔ گھر کے دروازے کھولے راستہ نہیں تکتے رہتے۔

ان سب نے بھی مجبوراً خود کو زندگی کے معمولات میں الجھا کے احساسِ زیاں کی اذیت کو دبا دیا تھا۔ وہ مجھے بھول کے جینے کے عادی ہوچکے تھے۔ اب مجھے ان کی ضرورت زیادہ تھی کیونکہ میں الگ اور اکیلا تھا۔ وہ سب پہلے کی طرح تھے۔ اکٹھے اور جذبات کے پرانے رشتوں سے مربوط۔ مجھے پھر ان کے درمیان اور ان کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے سب برداشت کرنا ہوگا۔ خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اعتماد کا رشتہ بحال کرنے کی اہمیت کو تسلیم کرانا ہوگا اور امید کے ساتھ انتظار کرنا ہوگا۔

مگر کیا میں یہ سب کرسکوں گا؟ میں نے بینچ پر اکیلے بیٹھ کر سوچا۔ میرے چاروں طرف رات کا پھیلتا ہوا اندھیرا میرے احساسِ تنہائی میں اضافہ کررہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے تقدیر میرے ارادوں اور میری خواہشات پر خندہ زن ہے۔ خان جی نے تمہیں معاف کردیا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ بالآخر چندا بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہوجائے مگر تمہاری زندگی کے راستے بدل گئے ہیں۔ اب تم شاہ عالم نہیں ہو تو وہ پرانے ناصر عظیم بھی نہیں بن سکتے کیونکہ تمہارے عزائم اور مقاصد بدل گئے ہیں۔ یہ ضروری تو نہیں کہ چندا بھی تمہاری زندگی کی نئی منزلوں کے لیے رفیقِ سفر ہو۔ وہ تمہارے عزائم کا ساتھ نہ دے پائے یا ان مقاصد سے اتفاق نہ کرے جو آج تمہارے لیے اہم ہوگئے ہیں۔ وہ بہرحال رخشی یا شبنم نہیں ہے۔ وہ ذہین ہے اور باہمت ہے۔ اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ سب پر فوقیت رکھتی ہے لیکن اس کی خواہشات کا افق محدود ہے۔ وہ سکون اور عافیت کے ساتھ اپنی دنیا میں خوش رہنے کو ترجیح دیتی ہے۔ باہر کی دنیا میں سہم جولی کے خطرات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اسے اپنی قوتِ تسخیر آزما کے فتوحات حاصل کرنے کا کوئی شوق نہیں اور شہرت و ناموری کے حصول کی آرزو اس کی فطرت اور مزاج کے خلاف ہے۔

صرف ایک سال پہلے میں بھی وہی چاہتا تھا جو چندا چاہتی تھی کیونکہ میں چندا کو چاہتا تھا۔ میری زندگی کے روز و شب کی مصروفیات کا دائرہ محدود تھا اور ایک عام آدمی کی طرح میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھا جسے دستِ قدرت نے غربت اور گمنامی کے فرش سے اٹھا کے اس عرش تک پہنچا دیا جہاں مجھے دنیاوی دولت کی کمی نہ تھی اور میں چندا کی محبت پا کے کچھ اور پانے کا خواہش مند نہ تھا۔ میرا مستقبل بہت واضح اور میری دسترس میں تھا۔ اپنا گھر' چندا اور اپنے بچوں کے ساتھ ایک خوش حال کامیاب اور پُرمسرت زندگی۔

لیکن آج ایسا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں شاعروں نے بہت کچھ کہا ہے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ سیاست کی روٹین مجھے راس نہیں آئی تھی لیکن وہاں کے تجربات بڑے چشم کشا ثابت ہوئے تھے۔ اب میں ان معاملات سے لاتعلق نہیں رہ سکتا تھا جن کا تعلق بے ضمیر وطن فروشوں کے ایک لٹیرے گروہ سے تھا۔ اگر میں خود غرضانہ بے حسی کے ساتھ پیچھے ہٹ جاتا تو میرا یہ فعل خود اپنی نظر میں ایک ناقابلِ معافی جرم بن جاتا۔ ایسا تو ایک عام آدمی بھی نہیں کرتا کہ چوروں کو اپنے گھر کا اسباب سمیٹتا دیکھے تو آنکھیں بند کرکے اور منہ پھیر کے سو جائے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے شاہ عالم سے ورثے میں ملنے والے سیاسی کوڑا کرکٹ یعنی پارٹی کے آفس ریکارڈ کو بیک وقت شمس اور قریشی کے حوالے کرنے کا سودا کیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک تماشا تھا کہ دونوں خریدار اس اقتدار کی سیڑھی پر قبضے کے لیے کس طرح نبرد آزما ہوتے ہیں۔ ایک ہڈی کے لیے دو کتے کیسے لڑتے ہیں۔

اب ان سے کیے ہوئے وعدے کے مطابق ملاقات کے لیے پہنچنا ممکن ہی نہیں تھا۔ میں نے ایک کو آٹھ بجے کا اور دوسرے کو ساڑھے آٹھ کا وقت دیا تھا۔ میری گھڑی میں آٹھ بجے تھے۔ شمس اس وقت فورٹریس اسٹیڈیم پہنچ چکا ہوگا اور اس کے پاس دس لاکھ سے زائد نقد رقم ہوگی مگر وہ کمینہ آدمی تھا۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کسی کرائے کے قاتل کو میری تصویر دکھا دے کہ جب یہ شخص مجھ سے ہاتھ ملا کے رخصت ہوجائے تو اس سے بریف کیس چھین کے میرے پاس لے آنا۔ اس کے تو لاکھ بچ جائیں گے اور قاتل کی صرف ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گولی خرچ ہوگی۔

میرے پاس رئیس کا موبائل فون تھا اور اسے بھی یہ مرحوم خدا بخش مندرانی نے دیا تھا چنانچہ میرے لیے اس کے استعمال میں خطرے کی کوئی بات نہیں تھی مگر میں نے اسے بھی آف کر رکھا تھا۔ اگر رئیس نے کسی ضرورت کے تحت مجھ سے رابطہ کیا ہوگا تو جواب میں اسے وہی نپ کیا ہوا پیغام سننے کو ملا ہوگا کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ قریشی سے میری براہِ راست گھر پر بات ہوگئی۔ وہ نکلنے ہی والا تھا۔ میں نے اس سے معذرت کرلی کہ ناگزیر مصروفیت کے باعث آج کی اپائنٹ منٹ منسوخ سمجھی جائے۔ آئندہ ملاقات کے لئے میں وقت اور جگہ پھر بتاؤں گا۔ اس کے بعد میں نے شمس کے گھر کا نمبر ملایا۔

"پاپا تو کہیں گئے ہوئے ہیں" ریسیور اس کے بیٹے نے اٹھایا۔

"میرا نام ہے شاہ عالم۔ انہیں ایک پیغام دے سکتے ہو" میں نے کہا۔

"آپ موبائل فون پر خود ان سے بات کرلیں سر۔"

"نہیں۔ پیغام سن لو۔ ان سے کہنا کہ شاہ عالم نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں ایک موقع اور دوں گا لیکن پھر چالاکی دکھائی تو سودا دوسری پارٹی سے ہوجائے گا۔ بات سمجھ میں آگئی ہے نا؟ کیا کہو گے پاپا سے۔"

اس نے میری بات دہرادی۔ میں نے فون بند کردیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ شمس کے برخوردار نے یہ پیغام اپنے پاپا تک پہنچانے میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کیا ہوگا۔ اگر شمس نے واقعی سازش کا جال پھیلایا ہوگا تو اس کی مایوسی خود اس کے لیے ایک سزا بن گئی ہوگی۔ اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ سپر ہے تو شاہ عالم سوا سپر اور اسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ اگلی بار وہ ایسا رسک نہیں لے گا جس میں دس لاکھ تو بچ جائیں مگر پی جے ایف پر مکمل قبضے کا خواب ادھورا رہ جائے۔ اگر شمس نے ایسا نہیں کیا ہوگا تو اسے وہ شاہ عالم کی احتیاط پسندی سمجھے گا اور اگلی ملاقات کا بے چینی سے انتظار کرے گا۔

اسپتال کے کمروں اور برآمدوں میں ٹیوب لائٹس جل رہی تھیں۔ باہر کے حصے میں گیٹ لائٹس روشن تھیں اور درمیان میں صرف ایک لائٹ نصب تھی جس کی روشنی چاروں سمتوں میں اتنی ہی روشنی فراہم کررہی تھی جتنی ضروری تھی۔ غیر ضروری طور پر آرائشی لائٹس نہ لگانے کا مقصد ایک بامقصد کفایت شعاری کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی بھی اسپتال میں ظاہری نمود و نمائش سے زیادہ اہم اچھے اور سستے علاج کی سہولت ہونی چاہیے اور یہاں پیسہ پیسہ بچا کے یہ مقصد حاصل کیا جارہا تھا۔

جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ چندا سے اور خان جی سے مل کے کسی نہ کسی طرح انہیں قائل کرلوں گا کہ میرا قصور قابلِ معافی ہے اور جو ہوا سو ہوا۔ میں اب بھی ناصر عظیم ہوں اور ہمیشہ کی طرح ان کی راہنمائی، مدد اور شفقت کا طلب گار ہوں۔ میں چندا کو منالوں گا اور قمر کا خیر کوئی مسئلہ ہی نہیں لیکن یہاں آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ صورتِ حال میری توقعات کے برعکس اتنی آسان بھی نہیں۔ کم سے کم آج کی رات بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور ان معاملات کو سلجھانے کے لیے ضروری تھی جو ایک سال کی دوری نے پیدا کئے تھے۔ اگر میں صرف رسمی اظہارِ ندامت کو کافی سمجھ کے اپنے حالات کے قابلِ قبول وضاحت کے بغیر چلا جاتا تو بدگمانی کی خلیج اور بڑھ جاتی۔

مجھے اندازہ تھا کہ رئیس مجھے کیوں اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ اس کی اور میری دوستی کبھی کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ ایک اَن پڑھ اور غیر مہذب سمجھا جانے والا شخص تھا جس کی زندگی کے اطوار انتہائی ناپسندیدہ اور غیر شریفانہ تھے۔ اس وقت کے علاوہ جو ہم نے ایک ساتھ گزارا تھا ہمارے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ میں نے زندگی میں کامیابی کے لیے محنت اور ذہانت کو بنیاد بنایا تھا تو اس نے ہمیشہ ہیرا پھیری کی تھی اور بالآخر ایک بدمعاش کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اس کی آمدنی کے سارے ذرائع ناجائز تھے اور اس کے حلقۂ یاراں میں بھی ہمیشہ وہی بدقماش اور بدکردار لوگ شامل رہے تھے جن کو وہ چنڈال چوکڑی کہتا تھا۔

میرے لیے وہ صرف ایک جاں نثار اور مخلص دوست تھا جس پر میں خدا کے بعد سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا۔ اس میں مبالغے کی کوئی بات نہیں کہ اگر کبھی میں اس سے کہتا کہ یار رئیس، آج رات کی صبح ہونے سے پہلے میرے فلاں دشمن کا کام تمام کرنا ہے تو وہ صبح کا سورج نکلنے سے پہلے مجھے مطلع کرتا پیارے۔ این اس کو فلاں جگہ گاڑ آئے۔ یا میں کہتا کہ شام سے پہلے مجھے ایک کروڑ روپے درکار ہیں تو بینک بند ہونے کے اوقات سے پہلے وہ نوٹ میرے سامنے ڈھیر کردیتا کہ قسم اللہ کی۔ تین بینک لوٹنے پڑے تب کہیں جا کے رقم پوری ہوئی۔

ہمارے لیے ایک دوسرے کا ظاہر باطن ایک تھا چنانچہ میں رئیس کی رفاقت کو اپنا سہارا اور اثاثہ سمجھتا تھا مگر مجھ سے تعلق رکھنے والے دوسرے سب لوگ اس تعلق کو میرے دماغ کا فتور اور میرا DISCREDIT سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر

مشہود کے گھر میں تو خیر اس کا ذکر ہی شیطان لعین کی طرح ہوتا تھا اور اس میں کسی کو شک نہیں تھا کہ بالآخر دنیا و عقبیٰ میں میری بربادی و روسیاہی کا سبب رئیس کی دوستی ہوگی جو درحقیقت بدترین دشمنی ہے۔ اس کے بعد خان اعظم تک جب اسے ناپسندیدگی کے ساتھ برداشت کرتے تھے اور چندا کو تو اس کے نام سے چڑ تھی۔ یہی حال قمر کا تھا۔ صرف کمال فاروقی وسیع القلبی کے ساتھ تسلیم کرتا تھا کہ رئیس ہو یا فقیر۔ شریف ہو یا بدمعاش، دوست تو بس دوست ہی ہوتا ہے۔

رئیس کا میرے ساتھ آنا کسی طرح بھی حالات کو سنوارنے میں معاون ثابت نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ وہ ضروری کام کا بہانہ کرکے خود ہی کھسک لیا۔ مجھے اس کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ اس کا مطلب یہ نکالے گا کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے تو اسے خوش آمدید کہا گیا۔ جوتے مار کے بھگایا نہیں گیا۔

میں دور سے کئی بار چندا کو ایک وارڈ سے نکل کر دوسرے میں جاتا دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک بار خان جی کے کمرے میں بھی جھانک چکی تھی۔ ڈاکٹر کمال بھی مصروف اور شاید رات کی ڈیوٹی والے ڈاکٹر کو چارج دے رہا تھا۔ اس نے ایک بار میری طرف دیکھ کے ہاتھ بھی ہلایا تھا جس کا مطلب میں نے یہ نکالا تھا کہ بس کچھ دیر اور لیکن چندا نے آتے جاتے مجھ پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

یہاں انتظار میں وقت ضائع کرنے سے بہتر تھا کہ میں گھر جا کے قمر سے باتیں کروں۔ اس نے یقیناً رات کے کھانے پر میری آمد کی خوشی میں خصوصی اہتمام کیا ہوگا۔ بہت سی باتیں ایک عورت اپنے شوہر کو بھی نہیں بتاتی مگر دوسری عورت کو بتادیتی ہے۔ کچھ باتیں مرد بتانے کے باوجود سمجھ نہیں پاتے جو عورت بن بتائے سمجھ لیتی ہے۔ چندا بھی ایک عورت تھی اور وہ عورت تھی جو اس کے انتہائی قریب تھی۔ شاید چندا کے دل کا حال اور اس کی جذباتی کیفیت پر قمر کی رپورٹ پر سب سے زیادہ بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ وہ اپنی زنانہ عقل اور مشاہدے کی روشنی میں اپنے بھائی کو صحیح مشورہ دے سکتی تھی کہ اسے بگڑی بات بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ مجھے دیکھ کر خوش ہوئی۔ وہ کچن میں مصروف تھی اور ابھی تک اس کے دونوں ہاتھ مصروف تھے۔ اب زبان بھی چلنے لگی۔ "بھائی کہاں تھے تم اتنی دیر سے۔ اسپتال میں مریضوں کو تو دیکھنے سے رہے۔"

"میں باغ میں تھا اور چاند کو دیکھ رہا تھا۔"

وہ ہنسی "چاند کو یا چاندنی کو۔ آج تو چوبیس پچیس تاریخ ہوگی چاند کی۔ آسمان پر چاند کہاں ہوگا۔"

میں نے کہا "یہ تو کس جھمیلے میں پڑ گئی۔"

"پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو نا۔ اتنا خیال رہا تمہیں کہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ پھر میں کیا دال روٹی رکھ دیتی تمہارے سامنے۔ تمہاری پسند کی سب چیزیں بنائی ہیں۔ خود اپنے ہاتھ سے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کھانی تو مجھے پڑیں گی اور تعریف بھی کرنی پڑے گی۔"

"بھائی اتنا بُرا بھی نہیں پکاتی میں۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"اچھے بُرے کی بات نہیں، یہ بتا پکانا آتا ہے تجھے؟ پہلے تو نہیں آتا تھا۔"

وہ شرمانے لگی "اب آگیا ہے۔ وہ بھی بہت تعریف کرتے ہیں بھائی۔"

میں نے کہا "وہ بے چارے تو شوہر ہیں۔ مجبور ہیں جھوٹ بولنے پر۔ کھونٹے سے بندھے بیل کے سامنے جو ڈال دو۔ خوش ہو کے نہیں کھائے گا تو کیا کرے گا۔"

"ایک جیسے ہوتے ہو تم سب۔ شادی سے پہلے کچھ اور شادی کے بعد کچھ اور۔ پہلے ہر بات اچھی لگتی ہے پھر بھول کے بھی کسی بات کی تعریف نہیں کرتے۔ آج چندا تمہارے سامنے کڑوے کریلے ابال کے رکھ دے تو کھا لو گے۔"

میں نے کہا "یہ تو کس جھمیلے میں پڑ گئی۔"

"پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو نا۔ اتنا خیال رہا تمہیں کہ خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ پھر میں کیا دال روٹی رکھ دیتی تمہارے سامنے۔ تمہاری پسند کی سب چیزیں بنائی ہیں۔ خود اپنے ہاتھ سے۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کھانی تو مجھے پڑیں گی اور تعریف بھی کرنی پڑے گی۔"

"بھائی اتنا بُرا بھی نہیں پکاتی میں۔" وہ خفا ہونے لگی۔

"اچھے بُرے کی بات نہیں، یہ بتا پکانا آتا ہے تجھے؟ پہلے تو نہیں آتا تھا۔"

وہ شرمانے لگی "اب آگیا ہے۔ وہ بھی بہت تعریف کرتے ہیں بھائی۔"

میں نے کہا "وہ بے چارے تو شوہر ہیں۔ مجبور ہیں جھوٹ بولنے پر۔ کھونٹے سے بندھے بیل کے سامنے جو ڈال دو۔ خوش ہو کے نہیں کھائے گا تو کیا کرے گا۔"

"ایک جیسے ہوتے ہو تم سب۔ شادی سے پہلے کچھ اور شادی کے بعد کچھ اور۔ پہلے ہر بات اچھی لگتی ہے پھر بھول کے بھی کسی بات کی تعریف نہیں کرتے۔ آج چندا تمہارے سامنے کڑوے کریلے ابال کے رکھ دے تو کھا لو گے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے تپتے فرش پر ناک سے ایک سو ایک لکیریں نکالتا۔ جلتے توے پر بیٹھ کے قسم کھاتا۔"

"بس کرو بھائی۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔ تمہیں کیا معلوم اس کے دل پر کیا گزری۔ اب کوئی ڈرامے بازی نہیں چلے گی۔ تمہیں اس کو یقین دلانا ہوگا کہ وہ تم پر اعتبار کر سکتی ہے۔ ایک بار یہ اعتبار کھو چکے ہو تم۔"

"غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم یہ غلطی پھر نہیں کرو گے؟ پورا ایک سال گزر گیا بھائی اور اس ایک سال میں تم کیا کرتے رہے۔ سب جانتے ہیں میری بات چھوڑو۔ اگر تم کسی اور کو بہن بنا لیتے تو میں ساری عمر تم سے نہ بولتی۔ کہتی جاؤ اپنی اس بہن کے پاس۔" قمر نے کہا۔

"تو یہ بات ہے" میں نے کہا۔

"جی یہی بات ہے۔ کون ہے آخر یہ شبنم تمہاری؟ کیوں آتا تھا اس کا نام تمہارے نام کے ساتھ ہر جگہ۔"

"قمر۔ اس کا نام شاہ عالم کے ساتھ آتا تھا۔"

"اور شاہ عالم تم تھے۔ تھے یا نہیں۔۔۔ تم اس کی زندگی جی رہے تھے' وہی کر رہے تھے جو شاہ عالم کر رہا تھا۔ رخشی تمہاری بیوی کہلاتی تھی۔ ایک بات پوچھوں' ہے تو بڑی بے شرمی کی بات۔"

میں نے اس کا سوال سمجھ لیا "رخشی بیوی تھی شاہ عالم کی اور میں دن رات کے ہر لمحے میں یہ بات یاد رکھتا تھا کہ میں ناصر عظیم ہوں۔"

"ایک ہی گھر میں رہتے تھے تم۔"

"ایک ہی بیڈ روم بھی تھا ہمارا۔" میں نے برہمی سے کہا "اسے دنیا کے سامنے طلاق دینے سے پہلے میں نے ہمیشہ شاہ عالم کی بیوی سمجھا۔ اس نے عدت کے چار ماہ دس دن گزارے اور یہ بات اسے میں نے اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہیں اور ہمیشہ رہیں گے کیونکہ میں دنیا کی نہیں اپنے ضمیر کی لعنت ملامت برداشت نہیں کر سکتا۔ اس معاشرے کا مجھے ڈر نہیں' قانون کیا بگاڑ سکتا ہے میرا اور کرنے والے اخلاقی قدروں کی پامالی میں بھی حالات کی مجبوری کا عذر تلاش کر لیتے ہیں لیکن۔"

قمر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "بھائی۔ میں کیا جانتی نہیں تمہیں؟"

"کیا چندا مجھے نہیں جانتی؟" میں نے کہا۔

"دیکھو' یہ مسئلہ جذبات کا ہے۔ عقل سے سلجھایا جا سکتا ہے۔ ابھی اس کا ذہن صرف ایک طرف لگا ہوا ہے۔ اسے خان جی کی بیماری کے سوا کسی کا خیال نہیں۔ اس کے لیے وہی دنیا میں سب کچھ ہیں۔"

میں نے کہا "وہ کیا میرے لیے کچھ نہیں ہیں؟ چندا یہ کیوں سمجھتی ہے کہ مجھے ان کا خیال نہیں۔ میں تو چاہتا ہوں' کہ چندا کے ساتھ مل کے اس ذمے داری کا بوجھ اٹھاؤں۔ وہ خود کو اکیلا نہ سمجھے۔ اپنا دکھ شیئر کرے میرے ساتھ۔"

"وہ ہم سب شیئر کر رہے ہیں بھائی۔"

میں نے کہا "میں مانتا ہوں۔۔۔ مگر میرا مطلب کچھ اور تھا۔ دیکھو قمر' کتنے برس بیت گئے۔ اس ایک سال کو چھوڑ کے۔ میں نے کبھی چندا کو اپنی ذات سے الگ نہیں سمجھا۔ یہ کوئی کہنے سننے کی بات نہیں تھی۔ ایک تسلیم شدہ حقیقت تھی کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بنے تھے اور دل سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ زندگی بھر ساتھ نبھانے کے لیے۔ رسم دنیا کے مطابق ایک شادی کی تقریب رہ گئی تھی۔ تو اس کے لیے بس مناسب وقت کا انتظار تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بھائی۔۔۔ مگر۔"

"مگر کیا۔۔۔ میرے کہیں چلے جانے سے یا کسی اور کام میں مصروف ہو جانے سے وہ بنیادی حقیقت تبدیل نہیں ہوئی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ خان جی کی زندگی میں یہ کام بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔"

قمر نے بے یقینی سے کہا "یعنی۔۔۔ تم شادی کے لیے کہو گے اس سے؟"

"ہاں۔ خدا خان جی کو صحت دے۔ ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے لیکن قمر۔ جو کام وقت پر ہو جائے وہی اچھا ہوتا ہے۔ کل کو خدانخواستہ ایسی ویسی کوئی بات ہو گئی۔ تو کیا میں یا چندا ساری عمر اس دکھ کی کسک سے نجات پا سکیں گے کہ ہماری اس خوشی میں خان جی کی دعائیں شامل نہ ہوئیں کیونکہ ہم نے دیر کر دی۔ آج ان کی زندگی میں ان کے سامنے ہم ایک ہو جائیں۔"

قمر نیچے دیکھتی رہی "تم بات کر کے دیکھ لو بھائی۔۔۔ مگر بہت مشکل ہے۔"

"کیا مشکل ہے؟"

"چندا کا فیصلہ بدلنا۔۔۔ ہم نے سمجھایا تھا اسے کہ رہبانیت اسلام میں منع ہے مگر وہ نہیں مانتی کہ یہ رہبانیت ہے۔ اس نے اپنا سب کچھ اسپتال کو دے دیا ہے۔ خود نرس بن گئی ہے۔ کہتی ہے کہ دنیا کو نہیں چھوڑا میں نے۔ دنیا کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیا ہے۔ ساری عمر شادی نہیں کروں گی میں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا "کیا وہ پاگل ہو گئی ہے۔"

"ایسا تو کوئی بھی نہیں سمجھتا بھائی۔ خیالات بدل گئے ہیں اس کے۔ اس میں کسی کا قصور نہیں۔"

"وہ مجھے قصوروار سمجھتی ہوگی اور تم بھی۔۔۔ فاروقی بھی۔۔۔ سب سمجھتے ہوں گے کہ ایسا میری وجہ سے ہوا" میرا پارا چڑھ گیا "مگر یہ غلط ہے۔"

"غصہ کرنے سے کیا ہوگا بھائی" قمر نے کہا۔

اسی وقت فاروقی آ گیا۔ "کون کس پر غصہ کر رہا ہے اور کیوں؟"

قمر نے بات ٹال دی "غصہ آپ کے دوست کو آ رہا تھا آپ کی وجہ سے۔۔۔ اتنی دیر کر دی۔"

کمال نے معذرت کی "وہ یار۔ یہ کام ہی ایسا ہے۔ وقت پر اپنا کوئی کنٹرول نہیں۔ روز آٹھ بجے آنا چاہتا ہوں مگر دیکھ لو' آج بھی دس بج گئے۔" اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "تم لگاؤ کھانا۔ میں آیا دو منٹ میں کپڑے بدل کے۔۔۔ آج تو سالا آیا ہے۔ بڑی خاطریں ہوں گی۔ بھیا کی وجہ سے کھانا ہمیں بھی مل جائے گا۔"

قمر نے مصنوعی غصے کا اظہار کیا "اور روز کیا بھوکے رہتے ہو؟ کھانا نہیں ملتا۔"

"وہ کوئی کھانا ہوتا ہے؟ شوہروں کا راتب رکھ دیا جاتا ہے سامنے۔" وہ باتھ روم میں گھس گیا "کدو کر لیے' نینڈے۔"

"دیکھا آپ نے بھائی۔ کتنا ناشکرا پن ہے۔ انہیں چاہئیں روز مزے مزے کی چٹپٹی مسالے دار چیزیں۔ بھنا گوشت' قورمہ' بریانی اور کباب۔ کڑھائی گوشت اور پکن۔ پہلے بازار سے کھا کھا کے صحت کا بیڑا غرق کر لیا۔ فورٹی ہو جاتی ہے ACIDITY پھر دوائیں کھاتے ہیں۔ میں خیال رکھتی ہوں تو دیکھو' کیسی باتیں کرتے ہیں" قمر کھانا لگاتے ہوئے بھی بولتی رہی۔

"کیا چندا نہیں آئے گی؟" میں نے کہا۔

"یہاں کھانے کے لیے کب آتی ہے وہ۔ رات کا کھانا میں بھیج دیتی ہوں اور وہ خان جی کے کمرے میں کھا لیتی ہے۔ دن میں ہم سب وہیں کھاتے ہیں' اسپتال میں۔ آج کہہ رہی تھی کہ میرا کھانا مت بھیجنا۔ مجھے بھوک نہیں ہے اور کچھ ہاضمہ خراب ہے مگر مجھے پتا ہے کہ ہاضمہ نہیں' موڈ خراب ہے۔"

"دماغ خراب ہے اس کا۔ میں بلا کے لاتا ہوں اسے۔"

"رہنے دو بھائی۔ جسے معلوم ہے وہ نہیں آئے گی۔" قمر نے مجھے روک لیا "تم کو ابھی اندازہ نہیں' وہ کتنی بدل گئی ہے۔ وہ پہلے والی چندا نہیں ہے۔ سب شوق چھوڑ دیے ہیں اس نے۔ بہت تنہائی پسند اور خاموش ہو گئی ہے۔"

قمر کا دل رکھنے کے لیے میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھایا۔ کمال مجھے اسپتال کے بارے میں بتاتا رہا کہ اس میں کتنا کام ہو چکا ہے اور کتنا باقی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک چھوٹے سے اسپتال کا خاکہ تھا جو اس کے محدود وسائل میں پورا ہو جائے اور چلتا رہے لیکن کام شروع ہوا تو جیسے دست غیب نے سارے انتظامات کی ذمے داری سنبھال لی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے عطیات موصول ہونے لگے۔ اخبار میں صرف ایک اشتہار شائع ہوا تھا کہ کمال کلینک کو باقاعدہ اسپتال کا درجہ دینے کے لیے عطیات کی ضرورت ہے لیکن یہ عطیات نقد کی صورت میں قبول نہیں کیے جائیں گے۔

"میں نے یہ طے کیا تھا کہ زمین خود حاصل کروں گا۔ ٹرسٹ کی آمدنی پہلے محدود تھی۔ جو دولت میرے والدین نے ترکے میں چھوڑی تھی' بس وہی کام آ رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد مجھے پتا چلا کہ اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ نامعلوم لوگ کلینک کے اکاؤنٹ میں رقوم جمع کرا جاتے تھے۔ کچھ لوگ براہ راست مجھے بھی دینے لگے۔ میں کسی سے مانگتا نہیں تھا اور نہ فنڈز کے لیے اپیل کرتا تھا مگر بہت لوگ ہیں میرے جاننے والے اور میرے مرحوم والد کے تعلقات کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا پھر یہ ہوا بھائی کہ ایک شخص بیمار پڑ گیا اور مرتے وقت کچھ جائداد کمال کلینک کے لیے چھوڑ گیا۔ اس کے بعد تو جیسے سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے اب کہ قدرت کی طرف سے میرے فیصلے کو تائید حاصل ہو گئی تھی چنانچہ انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ میں جائداد کیسے سنبھالتا' سب پیسہ کے رقم ٹرسٹ کے اکاؤنٹ میں ڈال دی۔ خان جی سے بھی بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ تم اللہ کا نام لے کر پہلے تو زمین پکڑو کہیں اور زمین شہر سے بہت زیادہ دور بھی نہ ہو کہ عام لوگوں کے لیے پہنچنا مشکل ہو جائے لیکن زمین شہر میں سونے کے مول ملے گی اس لیے کچھ دور تو جانا پڑے گا۔ مضافات میں کہیں زرعی زمین ہو کسی کی تو ایکڑ کے حساب سے مل سکتی ہے لیکن لاہور شہر کے مضافات بھی اب شہر کا حصہ ہیں اور کسی بھی سمت میں دس پندرہ میل تک چلے جاؤ' نئی آبادیاں پھیل رہی ہیں۔ خیر' اس میں بھی کچھ خدا کی مدد شامل حال رہی۔ یہ پلاٹ ایک سوسائٹی کا تھا۔ ایک پارٹنر پیسہ لے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر بھاگ گیا۔ باقی دو تھے۔ ان میں سے ایک قتل ہوگیا۔ تیسرے کو عدالت نے دیوالیا قرار دے دیا اور زمین قرق ہوگئی۔ اس کا نیلام ہوا اور مجھے تو خیر کچھ پتا ہی نہیں چلا' خان جی نے بولی لگائی اور زمین لے لی۔ دس فیصد وہیں ادا کردیا۔ باقی کے لیے انہوں نے اپنی انشورنس پالیسی گیش کرالی۔ سارا فنڈ نکلوایا اور کوٹھی بیچ دی۔ میں سمجھتا ہوں ان کو چندا نے بھی مجبور کیا یہ سب کچھ بہرحال اسی کو ملتا۔ کوٹھی اس کے نام پر تھی۔ اگر وہ انتظار کرتے تو اس کی اور اچھی قیمت مل جاتی مگر انہوں نے جلدی میں جو قیمت ملی لے لی۔ خان جی کو نیلامی کی باقی رقم مقررہ وقت میں ادا کرنی تھی۔ جب زمین کی ملکیت کے کاغذات بھی بن گئے تو انہوں نے فائل میرے حوالے کردی۔ چالیس کنال کا پلاٹ ہے یہ جو ٹرسٹ کی ملکیت ہے۔ میرا تو دماغ ماؤف ہوگیا یار۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ خان جی ایسا کریں گے اور معلوم ہے' ہماری شادی کے اگلے دن ہی انہوں نے وہ کوٹھی خالی کردی۔ مالک قبضہ مانگتا تھا۔ انہوں نے قمر کی شادی تک مہلت لی تھی۔ دوسرے دن چندا اور وہ کرائے کے گھر میں شفٹ ہوگئے۔"

"کرائے کے گھر میں؟" میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں یار۔ اس وقت تک اسپتال کی عمارت تقریباً مکمل ہوچکی تھی۔ میں اور قمر بہت اصرار کے ساتھ انہیں اپنے گھر لے آئے۔ باقاعدہ بلیک میل کرنا پڑا انہیں۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ حد ہوتی ہے ہر بات کی۔ آپ ایسا کریں گے تو پھر میں کمال اسپتال کا پراجیکٹ ہی چھوڑ دوں گا۔ کسی اور کے حوالے کردوں گا۔ خیر وہ مجبور ہوکے ہمارے ساتھ آگئے۔ میں نے ساتھ ساتھ اسٹاف کوارٹر مکمل کرائے۔ ابھی ایک مہینے پہلے ہی ہم شفٹ ہوئے ہیں۔ اسپتال کا کام چل رہا ہے مگر جو تو دیکھ رہا ہے' وہ ابتدا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہ سو بیڈ کا اسپتال ہوگا۔ اس وقت دو سو بیڈ ہیں اور نقشہ ہے وہ ایک ہزار بیڈ کے اسپتال کا ہے۔ میں نے خواہش کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اسباب خود بخود غیب سے پیدا ہوتے چلے گئے۔ جیسے زمین مجھے تحفے میں مل گئی' اس کو میں عطیہ نہیں کہوں گا کیونکہ یہ کسی غیر کی عنایت نہیں ہے' یہ گھر والوں کی محبت ہے۔"

"خان اعظم واقعی عظیم ہیں" میں نے کہا۔

"ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اصرار کرتا کہ اسپتال کا نام خان میموریل اسپتال رکھا جائے۔ ممکن ہے اسی شرط پر زمین دیتا۔ خدانخواستہ یہ نام نہاد سماجی کارکن اور سیاسی راہنما ہوتے تو خبروں کی شہ سرخیاں بنواتے۔ خوب ڈھول پیٹتے اور تصویریں شائع کراتے۔ زمین ٹرسٹ کے حوالے کرنے کے لیے وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کو بلاتے اور تقریب کی رپورٹ خبرنامے میں چلتی۔ انہوں نے سختی سے منع کردیا کہ یہ گھر کی بات ہے۔ گھر میں ہی رہنی چاہیے۔ یہی چندا نے بھی کہا کہ اخبار والوں کو بالکل معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے اسپتال کا سنگِ بنیاد خان جی سے رکھوانا چاہا تھا کہ یہ تو اچھی کی بات ہے۔ ایک فیملی تقریب ہے۔ جیسے سالگرہ پر کیک کاٹتے ہیں ایسے ہی آپ کام کا آغاز اپنے مبارک ہاتھوں سے کریں۔ وہ الٹا میرے پیچھے پڑگئے کہ خیال تمہارا ہے' جذبہ تمہارا ہے' محنت تمہاری ہے' ہمارا کیا ہے۔۔۔ جو تھا وہ اٹھا کے تمہیں دے دیا۔ تم ہی بناؤ گے' سنبھالو گے' تم سنگِ بنیاد رکھو۔ انجام یہ ہوا کہ ہم نے ایک بہت غریب آدمی سے کہا جس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا اور جو دنیا میں چند روز کا مہمان تھا۔ تیسرے دن وہ مرگیا۔ بس یار' خدا کی مدد شاملِ حال رہی۔ لوگوں نے سریا سیمنٹ فراہم کردیا۔ راج مزدور آگئے۔ کسی نے ان کی اُجرت ادا کردی۔ لکڑی آگئی' دروازے کھڑکیاں بن گئے۔ جب اتنا ہوگیا تو پبلسٹی کے موقع سے فائدہ اٹھانے والے بھی آگئے آئے مگر ہم نے شرط رکھی کہ نہ اخبار والے آئیں گے' نہ تصویر بنے گی اور نہ خبر شائع ہوگی۔"

میں نے کہا "کیا حرج تھا' کام تو ہوجاتا۔"

"کام تو ہوگیا یار مگر ایسے لوگ کام خراب کرتے ہیں بعد میں۔ ہر جگہ ذکر کرتے اور احسان جتاتے۔ یہ سمجھتے کہ اسپتال ان کا ہے۔ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جائے۔ ان کے سارے خاندان کو وی آئی پی ٹریٹ منٹ ملے۔ ممکن ہے وہ اسپیشل وارڈ بھی مانگنے بعد میں۔ سیاسی پبلسٹی کا ذریعہ بنالیتے۔ ہم کسی کا احسان لینا نہیں چاہتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ اللہ کا احسان ہے جس نے وسیلے پیدا کیے۔ اسپتال میں دوائیں پہلے کی طرح بطور عطیہ آرہی ہیں۔ عطیات دینے والے بہت زیادہ ہوگئے ہیں۔ کچھ مشینیں مل گئی ہیں۔ باقی ہم خرید لیں گے۔ ایکسرے کی ایک ہی مشین ہے۔ خراب ہوجائے تو دوسری نہیں ہے۔ ہم تو سب چاہتے ہیں لیکن سی ٹی اسکین مشین بہت مہنگی ہے۔ ایم آر آئی ہم افورڈ نہیں کرسکتے۔ ای سی جی اور الٹراساؤنڈ کی پورٹیبل مشینیں آگئی ہیں لیکن ابھی ہم نے اپنا دائرۂ کار محدود رکھا ہے۔ ایک وارڈ ٹی بی کا ہے۔ اس مرض کا شکار ہوتے ہیں غریب لوگ۔ علاج سستا ہے لیکن باقاعدگی سے ہونا چاہیے پھر حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ مریض کا علاج اس کے گھر پر ہو۔ داخلے

کی گنجائش محدود ہے۔ بچوں کے وارڈ میں بھی عام بیماریوں کا علاج ہوتا ہے۔ مسئلہ ہو اسپیشلسٹ کا یا سرجری کا تو ہم سرکاری اسپتال بھیج دیتے ہیں۔ کم سے کم خرچ اور وقت میں زیادہ سے زیادہ غریبوں کی زندگی بچانا ہمارا مقصد ہے۔ ہم دل کا بائی پاس' کینسر' گردے کی سرجری' ٹرانس پلانٹ وغیرہ نہیں کرسکتے۔ ڈائی لیس اور تھیلیسیمیا کی ہمارے بس کی بات نہیں۔ ویسے یہ ہمارے پلان میں شامل ہے۔ جب اسپتال مکمل ہوجائے گا تو ہم ایک وارڈ رکھیں گے گردوں کے لیے اور دل کے لیے مگر کینسر کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی ہم اتنے اسپیشلسٹ بھی نہیں رکھ سکتے۔ جو کام کررہے ہیں وہ رضاکارانہ بنیاد پر صرف آنے جانے کا خرچ لیتے ہیں۔ وقت کی قیمت نہیں لیتے۔ کچھ ڈاکٹر مکمل طور پر اپنی خدمات ہمارے سپرد کرچکے ہیں۔ یہ ان کا جذبہ ہے۔ کچھ ابھی دولت کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ دو لڑکے اچھے خاصے کھاتے پیتے گھروں کے ہیں۔ دراصل ایک کلینک چلانا ذاتی دکان چلانے کی طرح تھا۔ ایک اسپتال تو کسی فیکٹری کی طرح ہے۔ ہر شعبہ الگ ہے اور خصوصی انتظامی توجہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر نرسنگ میڈیکل سپلائی' اسٹورز۔"

میں نے کہا "تیرے پاس وہ لڑکی تھی۔ کون۔"

"یار' وہ لڑکی نہیں' فرشتہ تھی۔ اکیلی سب کرلیتی تھی کمال کلینک میں۔ یہاں میں نے اسے کہا کہ وہ ایک شعبہ سنبھال لے۔ نرسنگ کی نگراں بن جائے یا میڈیکل سپلائی اور اسٹورز کی مگر اس نے انکار کردیا۔"

"انکار کیوں کردیا؟"

"اس کا کہنا تھا کہ وہ کسی چھوٹے علاقے کے چھوٹے اسپتال میں ہی کام کرے گی۔ بڑے اسپتالوں کے بڑے مسائل ہوتے ہیں جن کو وہ نہیں سنبھال سکتی۔ اس کے لیے بہت لوگ مل جائیں گے۔ میں نے بہت سمجھایا۔ بہت منت سماجت کی مگر وہ کہتی رہی کہ مجھے معاف کریں مسٹر فاروقی لیکن اس کے بعد چندا نے نرسنگ کا شعبہ سنبھالا۔ میں نے اور قمر نے اسے زبردستی منالیا کہ وہ بس دو سری نرسوں کے کام کی نگرانی کرے کہ کوئی کاہلی نہ برتے۔ پوری توجہ دے مریضوں کو۔ جب وہ مان گئی تو ہم سب نے پھر کوثر سے درخواست کی۔ ہم اپنے ساتھ خان جی کو بھی لے گئے اور بالآخر اسے سپلائی اور اسٹور کے شعبے کی نگرانی پر راضی کرلیا۔ اس میں کھپنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ اس نے شرطیں دو رکھیں۔ ایک یہ کہ وہ تنخواہ اتنی ہی لے گی جتنی کمال کلینک میں لیتی تھی۔ دوسری یہ کہ اپنے معاملات میں خودمختار ہوگی۔ سپلائی والوں سے خود نمٹے گی کہ بیچ میں ڈنڈی نہ ماریں۔ ظاہر ہے ہم نے شکرگزاری کے ساتھ اس کی بات مان لی۔ اگلے ہفتے وہ بھی آجائے گی۔ ابھی اس کی ماں بیمار ہے۔ باپ کسی افریقی ملک میں پادری ہے۔ وہ ڈاکٹر بھی ہے۔ ماں اس کے پاس جانا چاہتی تھی اور کوثر کو بھی لے جارہی تھی۔ کوثر کی شادی کی عمر ہے۔ بہت لوگ اس سے شادی کے خواستگار ہیں۔ ماں چاہتی تھی کہ کوثر اس کا شوہر اور وہ سب اسی افریقی ملک میں ایک ہی جگہ رہیں۔ غالباً زائر میں مگر اب کوثر نے انکار کردیا ہے۔ مجھے کچھ افسوس ہوا تھا کہ میری وجہ سے ان کی فیملی ایک جگہ ہونے سے رہ گئی۔ میں نے کوثر سے کہا کہ دیکھو' یہ تمہاری زندگی ہے اور زندگی آدمی کو ایک ہی بار ملتی ہے۔ سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو تاکہ تم خوش رہ سکو۔ اس نے جواب دیا کہ زندگی تو خدا کی امانت ہے اور پھر خدا کی خوشی ہے جو مقدم ہے۔ میں اسی میں خوش ہوں۔ قسم خدا کی' عجیب چیز ہے۔ اس دنیا کی مخلوق تو ہم خطاکار اور گنہگار لوگ ہیں۔ کہیں نہ کہیں' کبھی نہ کبھی ہماری سوچ میں لالچ' خودنمائی یا خودغرضی اور ریاکاری آجاتی ہے۔"

وہ رات گئے تک اسپتال کی باتیں کرتا رہا۔ اس کے مستقبل کے پلان اور اپنے ارادے بتاتا رہا۔ قمر تھکی ہوئی تھی۔ وہ بیک وقت اسپتال اور گھر کی ذمے داریاں سنبھال رہی تھی اور ایک مثالی بیوی کی طرح فاروقی کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس کے لیے اسپتال کے موضوع میں نئی بات کوئی نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی پھر اس پر نیند غالب آگئی۔

آدھی رات کے بعد فاروقی نے کہا "چلو ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ تجھے نیند تو نہیں آرہی ہے نا؟"

"نہیں۔ اپنا حالِ زار تو چچا غالب بیان کرگئے ہیں۔

نیند اس کی ہے' دماغ اس کا ہے' راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں"

فاروقی ہنسا "بدقسمتی ہے تیری بیٹا ورنہ رات بھی ہے۔ شانہ بھی ہے اور زلفیں بھی دستیاب ہیں۔"

میں اس کے ساتھ باہر آگیا "اب کہاں ہیں۔ قمر نے بتایا ہے کہ اس نے تارک الدنیا ہوکے اکیلے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

وہ ہنسا "سب وقتی مایوسی اور فرسٹریشن کی باتیں ہیں۔ اکیلا کون رہ سکتا ہے اس دنیا میں خدا کے سوا۔ یہ انگریز کہتے ہیں۔ ابھی خان جی کا ایک REASON ہے۔ جب یہ وجہ نہیں رہے گی تو خیالات بھی یہ نہیں رہیں گے اور حالات کو سازگار بنانا تیرا کام ہے۔ جذبات پر بے حسی کی گرد انہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھندلا دیتی ہے۔ جذبات ختم کہاں ہوتے ہیں۔"

"پھر کیا کرنا چاہیے مجھے استاد محترم۔ آپ تو ماشاء اللہ سے شادی فرما چکے ہیں۔ اپنے تجربات کی روشنی سے میری راہنمائی فرمایئے۔"

وہ ہنسا "پہلے یہ بتا کہ تو نے سچ مچ چھوڑ دیا! سیاست کو' شاہ عالم کی لائف اور وائف کو۔"

"ہاں مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میری حیثیت دھوبی کے کتے جیسی ہو گئی ہے۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔"

"خدا تو ملتا ہے مگر پہچان رکھنے والوں کو یہاں وصالِ صنم ضرور ہو گا بشرطیکہ تو دل سے چاہے۔"

میں نے کہا "الو کے پٹھے۔ اس میں بھی کوئی شک کی بات ہے۔"

"نہیں ہے تو پھر آجا۔ جگہ بدلی ہے' لوگ نہیں بدلے ہیں۔ ہمارے ساتھ رہ اور دیکھ اس کا دل موم ہوتا ہے کہ نہیں۔"

میں نے کہا "آنا تو ہے مجھے یہیں۔"

"یعنی ابھی تو آیا نہیں ہے۔" فاروقی نے مایوسی سے کہا "تجھے جانا ہے۔"

"دیکھ یار۔ سیاست سے اور بقول آپ کے 'شاہ عالم کی لائف اور وائف سے تو میرا کوئی تعلق نہیں رہا مگر اور کچھ معاملات ہیں ایسے۔"

"جو دل کے معاملات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں" وہ طنز سے بولا۔

"ہاں' ابھی ایسا ہی ہے۔" میں نے اعتراف کر لیا۔

"تو پھر بات مت کر چندا کی۔ جب دنیا کے کاموں سے فرصت ملے تب آنا اور اگر اس وقت تک چندا اتنی دور چلی جائے کہ تو اسے ہمیشہ کے لیے کھو دے تو گلہ مت کرنا۔ رونا مت میرے سامنے۔ وقت کی یہ خلیج بڑھتی جائے گی اور پھر تو اسے پاٹ نہیں سکے گا۔"

"مجھے پورا بھروسا ہے اس پر۔"

"ڈائیلاگ بازی مت کر۔ وہ بھی ایک عورت ہے۔ ایک مرد کی محبت کے تصور کو گلے لگا کر ساری عمر نہیں گزار سکتی۔ ہم ڈاکٹر لوگ جذباتی بات نہیں کرتے۔ یہ BIOLOGICAL حقائق ہیں۔ اسے کوئی اور مرد پسند آجائے گا۔ تو نے اپنے مرد ہونے کا پورا فائدہ اٹھایا۔"

"یہ الزام لگا رہا ہے تو مجھ پر۔"

"سٹور کے بچے۔ اپنے ماضی کو دیکھ۔ تو ایک شادی کر چکا تھا' ذرا یاد کر اس وقت کو' کیا جذبات تھے تیرے شادو کے لیے۔ اس سے پہلے کی بات میں نہیں کروں گا مگر اس ایک سال میں۔"

"اس ایک سال میں کچھ بھی نہیں کیا میں نے یار!" میں نے فریادی لہجے میں کہا۔

"یہ بات میں مان سکتا ہوں مگر جس عورت نے تیری محبت کو ایمان کی طرح سمجھا ہو۔ کیا اس کے ساتھ ظلم نہیں ہوا؟ تیرے ساتھ ساتھ نظر آتی تھی۔ تیرے ساتھ رہتی تھی اور تیری بیوی کہلاتی تھی رخشی اور اس کے علاوہ۔ کیا نام ہے اس صحافی کا۔ شبنم۔ کیا کچھ نہیں کہا جاتا اس کے بارے میں۔ کسی داشتہ کی طرح رہی وہ تیرے ساتھ۔"

"یار' میں کیا کروں۔ کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے ہر ترغیب کو مسترد کر دیا۔"

"ویسے تو یہ انسانی فطرت کے تقاضوں کے اس حد تک خلاف ہے کہ ناممکن سمجھا جا سکتا ہے لیکن میں تجھے جھوٹا نہیں سمجھتا۔ کیونکہ میرے سامنے تو نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور نہ بولے گا۔ مجھے یقین ہے مگر میں چندا نہیں ہوں بیٹے۔ بدگمانی کا جو بال محبت کے آئینے میں آگیا ہے' کیا وہ دور ہو سکتا ہے؟ اور پھر تو سنجیدگی سے کوشش بھی کہاں کر رہا ہے۔ نہ جانے وہ کون سے معاملات ہیں جو تیرے لیے اس محبت سے زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔"

"کیا ایسے معاملات ہوتے نہیں؟"

"ہوتے ہیں۔ یقیناً ہوتے ہیں مگر پھر ان کے لیے محبت کو قربان کر دینا چاہیے اور رونا نہیں چاہیے۔" فاروقی بولا "یہ بددیانتی اور خود غرضی ہو گی اگر تو چندا سے توقع رکھے کہ جب تک تیرے سارے معاملات تیری مرضی کے مطابق طے نہ ہو جائیں' وہ تیرے انتظار میں دروازہ کھلا رکھے پھر اسے بھی آزادی دے کہ اپنے لیے اس نے جو فیصلہ کیا ہے' اس پر سکون کے ساتھ قائم رہے۔ اپنی اپنی زندگی کے معاملات اگر اہم ہیں تو اپنے اپنے فیصلے۔ کسی پابندی نہیں' نہ ادھر سے نہ ادھر سے۔"

"تو پوچھے گا نہیں کہ وہ کون سے معاملات ہیں جو اہم ہیں؟"

"ہوں گے۔ ہر شخص کی اپنی ترجیحات ہیں۔"

میں نے کہا "مجھے چندا سے بات تو کر لینی چاہیے۔"

"ضرور' میں چلتا ہوں" وہ عین خان جی کے کمرے کے دروازے تک پہنچ کے لوٹ گیا "صبح ملاقات ہو گی۔"

چندا اپنے بیڈ پر نیم دراز انگریزی کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں خان جی کے پاس گیا تو اس نے کتاب رکھ دی۔

خان جی اسی طرح خوابیدہ نظر آتے تھے۔ پر سکون اور مطمئن۔ میں چندا کے قریب جا بیٹھا۔

وہ گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اپنے پاؤں کے ایک انگوٹھے کو مسلتی رہی اور میری طرف دیکھنے سے گریز کرتی رہی پھر اس نے کہا "آئی ایم سوری ناصر!"

میں نے کہا "چلو تم نے مجھے ناصر تو مانا۔"

"کیا فرق پڑتا ہے اس سے؟"

میں نے کہا "اگر تم برا نہ مانو تو باہر چلو۔ مجھے کچھ کہنا ہے تم سے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم کیا کہو گے لیکن چلو۔" وہ کھڑی ہو گئی۔

ہم باہر بینچ پر آبیٹھے تو میں نے کہا "چندا' تم خفا ہو مجھ سے؟"

"میں کسی سے بھی خفا نہیں ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "لیکن میں تم کو مغالطے میں رکھنا نہیں چاہتی۔ جو تم چاہتے ہو وہ اب ممکن نہیں رہا۔"

"میں تمہیں چاہتا ہوں چندا۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"جواب میں پہلے دے چکی ہوں۔"

"اب ایسی کیا بات ہو گئی ہے چندا؟"

چندا نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

میں نے کہا "ہم آج بھی وہی ہیں۔"

"لیکن حالات بدل گئے ہیں۔ کوئی بھی گزرے ہوئے وقت کے حوالے سے آج کیسے کہہ سکتا ہے کہ سب کچھ وہی ہے۔ خان جی کو دیکھو' کیا وہ ایسے تھے؟ قمر کو اور فاروقی کو دیکھو' پہلے والی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ کیا تم دل پر ہاتھ رکھ کے ایمانداری سے کہہ سکتے ہو کہ تم بالکل وہی ہو جو تھے ایک سال پہلے۔"

میں نے خود کو لاجواب محسوس کیا "مگر تمہارے لیے میرے جذبات۔"

"جذبات کی نہیں' عقل کی بات کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ شادی نہیں کروں گی۔"

میں نے تلخی سے کہا "مدر ٹریسا بن کے زندگی گزارو گی؟"

"میں اتنی بڑی بات نہیں کر سکتی۔ تم کر سکتے ہو پاکستان کا وزیر اعظم بننے کی بات" اس نے کہا۔

"اگر تمہارا خیال نہ ہوتا تو میں کبھی لوٹ کے نہ آتا۔"

"کیا فائدہ اس خود فریبی کے حصار میں رہنے کا۔ تم اپنے آپ سے کیوں جھوٹ بولتے ہو" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "جیسے جانا تمہارے لیے مجبوری بن گیا تھا' ایسے ہی واپس آنا ایک مجبوری تھا۔"

"یہ غلط ہے" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں ہر روز اخبار پڑھتی رہی ہوں۔ تم اور کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے اور یہاں بھی تم کیسے آئے ہو' ذرا اپنا حلیہ دیکھو۔ تم چھپ کر آئے ہو۔ پناہ کے لیے' اپنے ہی گھر میں پناہ۔"

غصے سے میرا چہرہ تپ گیا "جی چاہتا ہے ایک تھپڑ مار کے دماغ درست کر دوں تمہارا۔"

وہ ہنسی "میں اس کے لیے تیار ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے تمہارے پاس اور کوئی جواب جو نہیں۔ آج دن میں تم نے دعویٰ کیا کہ خان جی تم کو معاف کر چکے ہیں۔ میں اسے جھوٹ نہیں سمجھتی۔ اس حالت میں وہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں لیکن جب وہ مجبور اور معذور نہیں تھے تو تم نے دیکھا تھا' قمر کی شادی میں ان کا رویہ کیسا تھا۔ میں تمہیں اس سے بھی بہت پہلے کی بات بتاتی ہوں۔ ایک بار تم رخشی کے ساتھ تھے۔ وہ شاہ عالم کی بیوی تھی جو مر چکا ہے مگر اس کے ساتھ تمہیں دیکھ کے کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ تمہاری بیوی نہیں۔"

"ایک ضرورت کے تحت ہم دنیا کے سامنے یہ کردار نبھاتے تھے۔"

"لیکن تمہاری۔ تم دونوں کی اداکاری دیکھنے والا کوئی نہیں تھا وہاں۔ صرف میرے اور خان جی کے سوا اور جو ہم نے دیکھا اس کو ایکٹنگ سمجھنا دشوار تھا۔ تمہارے انداز و اطوار سے تمہارے جذبات واضح تھے۔ تمہاری صورتوں کے تاثرات واضح تھے اور اس وقت خان جی نے مجھ سے ایک بات کہی تھی۔"

میں نے قدرے توقف کے بعد کہا "بتا دو وہ بات بھی۔"

"انہوں نے کہا تھا کہ چندا' اس شخص پر کبھی اعتبار نہ کرنا کیونکہ یہ خود غرض بھی ہے اور بزدل بھی۔ یہ مرنے سے ڈرتا ہے۔ یہ زندگی سے اتنا پیار کرتا ہے کہ زندہ رہنے کے لیے ہر مجبوری سے سمجھوتا کر سکتا ہے۔ یہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مردوں کی طرح نہیں کہہ سکتا کہ مار دو مجھے۔ کیونکہ مرنا مجھے ایک ہی بار ہے لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتا جو غلط ہے' غیر اخلاقی ہے یا خلاف اصول ہے۔ ایسا شخص کہیں بھی تمہارا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ وہ تمہارے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جان دینے کی بات تو کرسکتا ہے' جان دے نہیں سکتا۔ جو تم سے زیادہ اپنی زندگی کو اہم سمجھتا ہو۔"

چندا کے لبوں سے اپنے بارے میں ایسے الفاظ میرے منہ پر کسی طمانچے سے کم نہیں تھے۔ اس سے میں خود اپنی نظر میں گر گیا۔ بے شک یہ چندا کی اپنی رائے نہیں تھی مگر خان جی اس کے لیے صرف باپ ہی نہیں ایک ایسی ہستی تھے جن کے قول و فعل کو وہ شریعت کی طرح سمجھتی تھی۔ یقین کامل کے ساتھ تسلیم کرتی تھی۔ اسے جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا اور یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ غلط ہے۔ چندا نے یہ بات ایک دلیل کے طور پر کہی تھی اور خود اس کے نزدیک اس سے بڑی دلیل ممکن نہ تھی۔ اگر وہ اسے غلط سمجھتی تو میرے سامنے میری دل آزاری کا خیال کرتے ہوئے دہرانے سے گریز کرتی مگر اس نے ضروری سمجھا کہ مجھے میرے بارے میں اپنی اور خان جی کی رائے کا آئینہ دکھائے تاکہ اپنے بارے میں میری خوش فہمی رفع ہوجائے۔

میں چندا سے بحث کرسکتا تھا کہ خان جی نے مجھے غلط سمجھا۔ انہوں نے اصل حقائق کو مدِنظر رکھے بغیر فیصلہ کیا اور وہ بھی یک طرفہ۔ انہوں نے میری نہیں سنی اور ویسے تو خان جی مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں' گالی دے سکتے ہیں۔ مار سکتے ہیں کیونکہ وہ بڑے ہیں اور واجب الاحترام ہیں مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان پر عمر کا اثر ہونے لگا ہے۔ وہ سٹھیا گئے ہیں۔

لیکن یہ سب لاحاصل تھا۔ چندا کی رائے میرے بارے میں پھر پہلے جیسی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں اس کے دل سے شک اور بدگمانی کا وہ کانٹا نہیں نکال سکتا تھا جس کی خلش محض احساس کا سراب تھی۔ بے بنیاد شک اور حسد کے جذبات نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور اس کی عقل کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کردیا تھا۔ اس نے سنا تھا' خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اخباروں میں پڑھا تھا کہ شاہ عالم کی بیوی رخشندہ تھی اور طے شدہ طور پر اس کے مراسم شبنم سے بھی تھے چونکہ میں شاہ عالم تھا اس لیے وہ سب سچ تھا جو چندا نے زبانِ خلق سے سنا تھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور خبروں میں آیا تھا۔

اسے میں رات بھر بحث کرکے بھی قائل نہیں کرسکتا تھا کہ وہ سب ڈراما تھا۔ یہ اتنا ہی مشکل اور ناممکن ہوتا جتنا اپنے آپ کو فرشتہ ثابت کرنا۔ خود میں چندا کے رویے سے مایوس ہوگیا تھا اور اس نے مجھے احساسِ ذلت میں فیصلہ کرکے مشتعل کردیا تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اگر تمہاری بھی یہی رائے ہے میرے بارے میں۔ جو خان جی کی تھی تو میرا صفائی میں کچھ کہنا ہی لاحاصل ہوگا۔" میں نے کہا "میں اپنا اعتبار کھو چکا ہوں۔ تم نے حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلی ہیں اور تم میری بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہو تو یہ محض میری بدقسمتی ہے۔"

"حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی اور بالآخر سامنے آجاتی ہے۔"

"آجائے گی۔ ایک دن تم کو معلوم ہوجائے گا کہ مجھے سمجھنے میں تم سے غلطی کیوں ہوئی تھی۔ خدا نے عقل دی ہے تمہیں مگر اس وقت تم جذبات سے مغلوب ہو۔ اس کے علاوہ۔ یہ ایک سال کی خلیج ہے۔ اسے ایک رات میں پاٹا نہیں جاسکتا۔"

"تم جارہے ہو؟" چندا کے لہجے میں مجھے کچھ مایوسی اور کچھ احساسِ ندامت کے جذبات کی جھلک محسوس ہوئی۔

"ابھی میرا یہاں سے چلا جانا ہی بہتر ہے۔ ہم سب کے مفاد میں ہے لیکن میں آتا رہوں گا' میں مایوس اور ناامید نہیں ہوں۔"

وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی "تم یہاں رک بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ لوگوں کو تمہاری واپسی کا انتظار ہوگا۔"

"ہاں۔ میں بہت سے کام ادھورے چھوڑ آیا تھا" میں نے چندا کے طنز کی کاٹ کو برداشت کیا "اور جیسے تمہارے لیے تمہارے مقاصد اہم ہیں' ایسے ہی کچھ عزائم میرے ہیں جن کا انتخاب میں نے اپنی ترجیح پر کیا ہے۔۔۔ جو کسی قیمت پر یا کسی کے لیے چھوڑے نہیں جاسکتے۔"

وہ واپس جانے لگی۔ میری بات نے اسے مکدر کیا تھا لیکن میں نے اس پر تھوڑی سی بے رحمانہ خوشی محسوس کی۔ آخر وہ کیا سمجھتی ہے۔ صرف اس کی زندگی اس کے مقاصد اور اس کے نظریات ہی اہم اور مقدس ہیں۔ کسی اور کی زندگی پر اس کا اختیار لامحدود ہے۔

میں پلٹ کے قمر کے گھر کی طرف چل پڑا۔ چند قدم چل کے میں نے کہا "چندا۔ ایک بات اور۔۔۔"

"وہ کیا؟" میں نے دیکھا تو وہ رکی ہوئی تھی اور مجھے جاتے ہوئے یوں دیکھ رہی تھی جیسے تذبذب کا شکار ہے کہ اخلاقاً یا رسماً ہی سہی مجھ سے سوری کہے یا نہیں۔

میں نے کہا "آئینے ٹوٹ جاتے ہیں' بلا ارادہ۔ حادثاتی طور پر۔ ان میں بال آجاتا ہے۔ وہ کبھی جاتا نہیں مگر آئینے عزیز ہوں تو انہی کے ساتھ گزارا کیا جاسکتا ہے۔ ایک بال کو قبول کرنا ضرورت بن جاتا ہے ورنہ آئینوں کی دنیا میں کیا کمی۔"

"ہاں۔ چہرے تو سب ہی ایک سے نظر آتے ہیں۔"

"یہ موقع تو نہیں مگر ایک شعر تھا جو تم نے کبھی میری کتاب میں انڈر لائن کیا تھا۔

دیکھیے تو آئینہ خانہ ہے دہر۔ منہ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ۔"

وہ یقیناً سمجھ گئی ہوگی۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر پلٹ کے چل پڑا۔ قمر کے گھر تک جاتے جاتے میرا ارادہ بدل گیا۔ ان کے گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک کمرے میں لائٹ بھی جل رہی تھی۔ سونے سے پہلے یقیناً قمر نے میرا بستر ڈرائنگ روم میں بچھادیا ہوگا مگر اچانک میں نے واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں اپنی ہی دنیا میں اجنبی ہوگیا تھا۔ صرف ایک سال میں لوگوں کے چہرے بدل گئے تھے۔ خلوص کی جگہ ظاہری مروت آگئی تھی۔ محبت کا درجہ شناسائی کا ہوگیا تھا۔ اس میں قصوروار کون تھا؟ یہ کبھی طے نہیں ہوسکتا تھا۔ آدمی اپنے حالات خود نہیں بناتا نہ زندگی ٹھہراؤ کا نام ہے اور نہ جذبات کوئی منجمد حقیقت۔ کل پھر انہی خواہشات کے دائرے مشترک ہوسکتے ہیں۔ قمر میری بہن ہے' فاروقی میرا دوست ہے اور چندا۔۔۔ وہ چندا ہے۔ ممکن ہے وہ پھر مجھے پہچان لے۔

دل گرفتہ اور افسوردہ اپنے آپ سے اور زمانے سے خفا۔ بے یقینی اور انتشار کی کیفیت کا شکار میں اسپتال سے نکلا اور سڑک پر چلنے لگا۔ اس وقت بھی ملتان روڈ پر ٹریفک تھی۔ میں بائیں کنارے پر پیدل چلتا گیا۔ اگر میں تلاش کرتا تو مجھے کوئی خالی رکشا مل جاتا لیکن میرے دماغ میں غصے اور جھنجلاہٹ کا غبار بھرا ہوا تھا اور میں اس کی منفی توانائی کو زائل کردینا چاہتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے غصہ نکالنے کے لیے کوئی دیواروں کو مکے مارے اور ٹھنڈا ہوجائے۔ کچھ دوسری طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو اس احساس کو جامِ شراب سے ملنے والی خود فراموشی سے مناتے ہیں۔

ایک جگہ میں یہ سوچنے کے لیے رکا کہ اس وقت مجھے کہاں جانا چاہیے اور اس وقت مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں ایک بے گھر شخص ہوں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ کھڑے کھڑے میں کسی بھی مکان کا مالک بن سکتا ہوں خواہ وہ اندرونِ لوہاری گیٹ ہو یا ڈیفنس اور کیولری کے علاقے میں۔ میں یتیم خانے سے شاہ عالم ہاؤس جیسے قصرِ عالی شان تک ہر جگہ رہا مگر کوئی جگہ بھی میرا گھر نہیں تھی۔ ویسا ہی گھر جیسا قمر کا ہے۔ فرید عباسی کا ہے۔ رہنے کا کیا ہے' میں رئیس خانے میں رئیس کے ساتھ بھی رہ سکتا ہوں اور کسی ہوٹل میں بھی ساری عمر گزار سکتا ہوں مگر میرا اپنا گھر نہیں ہے کیوں کہ گھر جن رشتوں سے بنتا ہے وہ مجھے میسر نہیں آئے۔

رئیس کا اپنے رئیس خانے میں ملنا یقینی نہیں تھا اور وہاں پہنچنے کے بعد بھی گھر میں داخل ہونے کی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ ویسے ہی فرید عباسی کا گھر نزدیک تھا چنانچہ سیدھا جانے کے بجائے میں الٹے ہاتھ کی سڑک پر چل پڑا۔ سیدھی جانے والی مین روڈ بھی اور زیادہ آباد تھی۔ بائیں طرف کی ذیلی سڑک پر تاریکی اور ویرانی کا راج تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کیسے اچانک مجھے اپنے پیچھے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ میں نے قدموں کی چاپ یا آہٹ بالکل نہیں سنی۔ سڑک پر اکا دکا لوگ نظر آرہے تھے مگر وہ پیدل نہیں تھے۔ ایک شخص سائیکل پر سامنے سے آیا تھا اور مجھے پہچانے بغیر سلام کرکے گزر گیا تھا۔ وہ غالباً چوکیدار تھا۔ میرے پاس سے ایک موٹر سائیکل گزری تھی اور ایک خالی تانگا جس کے کوچبان نے مجھے بڑی فراخ دلانہ پیشکش کی تھی کہ میں تانگے میں سوار ہوجاؤں کیوں کہ وہ بھی ادھر ہی جارہا ہے۔ میں نے دوستانہ لہجے میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میں تو بس پہنچ گیا اپنے گھر ورنہ ضرور بیٹھ جاتا۔

آدمی کی چھٹی حس کے بارے میں بہت سے لوگ واضح اعتقاد والے ہیں۔ وہ بھی جو کہتے ہیں کہ چھٹی حس تو جانوروں میں بھی ہوتی ہے اور وہ بھی جو اسے اتفاق سے منسوب کرتے ہیں کہ کسی کو قبل از وقت خطرے کے وجود سے آگاہی ہوجائے ورنہ غیب کا علم بندے کو کیسے ہوسکتا ہے۔ میرا اعتقاد نہ ادھر تھا نہ ادھر۔ زندگی میں سیکڑوں بار ایسا ہوا کہ میں نے خطرے کی خاموش گھنٹی سن لی اور کسی نقصان یا حادثے سے بچ گیا مگر ہزاروں بار اس کے برعکس بھی ہوا۔

اس وقت میرے خیالات کا مرکز کہیں اور تھا۔ جب مجھے جیسے کسی نے کندھے سے ہلا کے کہا کہ۔۔۔ ناصر صاحب' ہوشیار۔۔۔ کوئی آپ کا تعاقب کررہا ہے اور میں نے پلٹ کے دیکھا تو میرے پیچھے آنے والے نے فوراً ایک سائے کی پناہ میں غائب ہونے کی کوشش کی۔ ایسا وہ پہلے بھی کرچکا ہوگا۔ کسی موڑ پر جہاں اسے یہ محسوس ہوا ہوگا کہ میں نے گھوم کر دیکھا تو مجھے شک ہوجائے گا۔

میں نے اچانک اور کسی وجہ کے بغیر پیچھے مڑ کے دیکھا تو اس کو موقع نہیں ملا اور جب اس نے چھپنے کی کوشش کی تو بہت دیر ہوچکی تھی۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میری اس غیر ارادی حرکت سے کوئی فرق نہیں پڑا اور میں سیدھا چلتا گیا۔ عباسی کا گھر ابھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک کلومیٹر یا اس سے کچھ کم فاصلے پر تھا۔ اپنے شک کی تصدیق کے لیے میں نے زمین پر سے ایک کاغذ کا پرزہ یوں اٹھایا جیسے وہ سو کا نوٹ ہو پھر اس شخص کی طرح جو حیران ہو کہ یہ نوٹ کس کا ہو سکتا ہے۔ میں نے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھا۔ چند سیکنڈ ایسے ہی کھڑا رہا پھر کاغذ کو نوٹ کی طرح جیب میں رکھا اور آگے چل پڑا۔

دوسری بار بھی تعاقب کرنے والا پکڑا گیا۔ وہ مجھ سے سو ڈیڑھ سو گز کا فاصلہ رکھ کے چل رہا تھا اور ظاہر ہے اپنی رفتار کو میری رفتار کے مطابق رکھنا اس کی ضرورت تھی۔ خود کو چھپانے کے لیے کسی سڑک پر کوئی درخت کوئی کھمبا، کسی عمارت کا سایہ اور تاریک گوشہ کچھ بھی نہ ملے تو کوئی غائب کیسے ہو سکتا ہے مگر وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے ایک دم کسی گھر کے دروازے پر دستک دی یا اس کی کال بیل بجا کے یوں کھڑا رہا جیسے وہ اسی گھر میں رہتا ہے یا کسی سے ملنے آیا تھا۔

اس ہوشیاری کا بھی مجھے فائدہ ہوا۔ اگر گھر میں سے کوئی برآمد نہ ہوتا تو میرے روانہ ہوتے ہی وہ بھی چل پڑتا مگر اندر سے کوئی نکل آیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے بات کیسے بنھائی مگر جب وہ ایک منٹ یا اس سے بھی کم وقت میں فارغ ہوا تو میں ایک خالی پلاٹ کے اندھیرے میں روپوش ہو چکا تھا اور اب دیوار کی اوٹ سے اس کو آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا۔ اب اس کے قدم تیز تھے، اسے یہ اندیشہ لاحق ہوا ہوگا کہ چند سیکنڈ کی غفلت سے اس نے مجھے کھو دیا۔

سڑک کے اس حصے میں اندھیرا تھا۔ اسٹریٹ لائٹ کا وجود ان آنکھوں کی طرح تھا جن کی بینائی چلی گئی ہو۔ بلب فیوز ہو گئے تھے یا ٹوٹ چکے تھے اور انہیں کوئی تبدیل کرنے نہیں آیا تھا۔ شاید اسی طرح شہر کے ہزاروں بلبوں کو محض کاغذات میں تبدیل کیا جاتا ہوگا اور وہ کاغذ ذمے داروں کی جیب میں چلے جاتے ہوں گے جن کو کرنسی نوٹ کہا جاتا ہے۔

وہ میرے نزدیک پہنچ چکا تھا جب سڑک کی طرف سے ایک گاڑی اندر آئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس نے سڑک کو روشن کر دیا مگر پیچھے سے پڑنے والی روشنی میں اس شخص کا چہرہ تاریک ہی رہا۔ گاڑی تھوڑا سا آگے آئی پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ پیدل چلنے والے شخص نے ایک دہشت ناک چیخ ماری اور منہ کے بل سڑک پر گر گیا۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ کار سے اس شخص پر فائر کیا گیا تھا اور فائر کسی سائلنسر لگے ریوالور کا ہوگا کہ رات کی خاموشی میں بھی میرے کانوں نے کوئی دھماکا نہیں سنا۔ وہ شخص سڑک پر تڑپ رہا تھا اور بری طرح کراہ رہا تھا۔ میں نے یہ سوچنے میں چند سیکنڈ صرف کر دیے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوڑ کے اس شخص کی مدد کے لیے پہنچنا چاہیے جس کو گولی لگی ہے اور کار سواروں کی پروا نہیں کرنا چاہیے یا کار کو گزر جانے کا موقع دینا چاہیے۔

بدقسمتی سے اس وقت میں خالی ہاتھ تھا ورنہ اپنی محفوظ پوزیشن سے میں کار میں سوار قاتلوں کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتا تھا۔ میں گاڑی کا ایک ٹائر برسٹ کر کے انہیں پیدل کر سکتا تھا اور پھر زیادہ آسانی سے ایک ایک کو للکار کے روک سکتا تھا لیکن فوری طور پر میرا چشم دید گواہ کی حیثیت سے سامنے آنا خودکشی کے مترادف تھا پھر دوسری گولی یقیناً مجھے لگتی جو زیادہ نزدیک سے ماری جاتی۔

آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں گاڑی وہاں پہنچ گئی جہاں وہ شخص سڑک پر دم توڑ رہا تھا۔ اگرچہ میں اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھا مگر میرے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ اس شخص کا خون سڑک کی سیاہی کو سرخی میں بدل رہا ہوگا۔

کار سوار قاتل اچھے نشانہ باز تھے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اب ان کے کرنے کو کچھ باقی نہیں تھا اور انہیں جائے واردات سے فرار ہو جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ شاید وہ قریب سے دیکھنا چاہتے تھے کہ ایک گولی کافی رہی یا نہیں۔ آخر کوئی رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک اور گولی پکا کام کرنے کے لیے قریب سے سر میں بھی ماری جا سکتی ہے ورنہ گاڑی بھی آلۂ قتل ہے۔ وہ اس کے اوپر سے گزر کے جا سکتے ہیں۔

قاتل زخم خوردہ شخص کے قریب پہنچ گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ کار نہیں، ایک جیپ تھی۔ دور سے ہیڈ لائٹس کی خیرہ کن روشنی میں یہ فرق نظر نہیں آ سکتا تھا۔ سڑک پر پڑے ہوئے شخص کی صورت اب بھی مجھے نظر نہیں آئی۔ جیپ کی رفتار ذرا سی دیر کے لیے کم ہوئی پھر جیپ میں سے کوئی چیز پھینکی گئی بلکہ اس شخص پر گرائی گئی۔ وہ کوئی بھاری پتھر جیسی چیز تھی۔ سڑک پر پڑا ہوا شخص بری طرح چلایا اور وہ پتھر گرنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے گالی دے کے کہا "لے۔۔۔ یہ تحفہ بھی اپنے ساتھ لے جا دوسری دنیا میں" پھر گاڑی چلانے والا ہنسا۔ اس جیپ میں دو ہی آدمی تھے۔

جیپ میرے سامنے سے گزری تو میں نے دونوں کی صورت دیکھنے کی کوشش کی مگر صورت کے نقوش واضح نہیں تھے۔ میں ان کا سائڈ پوز دیکھ رہا تھا اور وہاں روشنی نہیں تھی۔ جیپ کی رفتار ایک دم بڑھ گئی تھی۔ قاتل اپنا کام کر کے

فرار ہو رہے تھے۔ میں اپنی پناہ گاہ سے نکل کے دوڑتا ہوا وہاں پہنچا جہاں وہ شخص ابھی تک موت سے لڑ رہا تھا۔

میری نظر پہلے اس چیز پر گئی جو سڑک پر کسی سفید رنگ کی گیند کی طرح چمک رہی تھی۔ یہ مہاتما بدھ کے کسی مجسمے کا سر تھا جو سائز میں کسی تربوز کے برابر تھا مگر نیچے گرائے جانے سے اس کا کچھ حصہ ٹوٹ کے سڑک پر بکھر گیا تھا۔

میں اس شخص کے پاس بیٹھ گیا۔ مورتی کا سر اس پر چلتی گاڑی سے پھینکا گیا تھا۔ یہ اس کے سر پر گرتی تو اس کا چہرہ کچل کے شناخت کے قابل نہ رہتا مگر جیپ کی حرکت کے باعث وہ بھاری سر اس کے سینے پر بیس کلو کی چٹان کی طرح گرا تھا۔ اس کو گولی پہلے سے نہ لگی ہوتی تب بھی اس کی پسلیاں ٹوٹ کے اندر دل، جگر اور پھیپھڑوں میں گھس جاتیں اور کسی طبی امداد کے ملنے سے پہلے ہی وہ مر جاتا۔

اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ چند لمحوں کا مہمان تھا اور اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا جب میں نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ اس چہرے پر موت کی اذیت کا رنگ لہو کی سرخی سے زیادہ بھیانک ہو گیا تھا۔ اس کا خون سڑک پر بھی کیچڑ کی طرح پھیل گیا تھا اور میں اسی خون میں اپنے جوتوں سمیت بیٹھنے پر مجبور تھا۔ یہ انسانی لہو کی شرمناک بے حرمتی تھی کہ وہ سڑک پر ایسے بہہ رہا تھا جیسے گٹر کی غلاظت بہتی ہے اور یہ لہو میرے جوتوں کے تلوؤں سے چپک گیا تھا۔

بہت کم روشنی کے باوجود میں نے خادم کو پہچان لیا۔ خوف سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے۔ خون کی مہک سے میرا جی بُری طرح متلانے لگا اور میں نے ایک ابکائی پر قابو پا کے کہا "خادم!"

خادم نے ادھ کھلی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور اپنے سر کو خفیف سی جنبش دے کر "ہاں" کہا۔

میں نے دیکھا تو اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بھی خون ابل رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ کون لوگ تھے خادم؟" میں نے دور سڑک پر غائب ہوتی جیپ کی ٹیل لائٹس کو دیکھا۔

خالد نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر یہ اس کی آخری سانس تھی جو رائگاں گئی۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ابھی تک سڑک پر کسی کا نمودار نہ ہونا ایک اتفاق تھا جس سے میں فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ خادم کچھ بتائے بغیر مر گیا تھا اور اب جائے واردات پر میری موجودگی میرے لیے زیادہ سنگین مسائل پیدا کر سکتی تھی۔

میں ایک دم اٹھا، میرے پاؤں خون کی چپکناہٹ کو محسوس کر رہے تھے اور میرے پیٹ میں موڑ سا اٹھ رہا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے اندر کا سب کچھ باہر آ جائے گا۔ اس مسخ شدہ لاش سے زیادہ خون نے اور اس کی مہک نے مجھے وحشت میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں نے جوتوں کو صاف سڑک پر رگڑ کے صاف کیا اور پھر مہاتما بدھ کی مورتی کا وہ شکستہ سر اٹھا لیا۔ اسے میں نے خالی پلاٹ پر دیوار کے ساتھ رکھ دیا اور جلدی جلدی اس کے اوپر مٹی ڈال کے ایک ڈھیر کی صورت بنا دی۔ اس وقت تک سڑک کی جانب سے ایک موٹر سائیکل نمودار ہو چکی تھی۔

موٹر سائیکل پر دو نوجوان تھے۔ قریب آ کے انہوں نے موٹر سائیکل روکی تو میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

ان میں سے ایک نے غور سے مجھے دیکھا "یہ حادثہ تمہارے سامنے ہوا تھا؟"

میں نے کہا "ہاں۔ وہ ایک جیپ تھی۔ میں نے خود کو بڑی مشکل سے بچایا۔"

دوسرے نے کہا "اوئے پاگل، یہ حادثہ نہیں ہے۔"

"یہ بندہ بتا رہا ہے۔ یہ یہیں تھا۔"

"یہ بکواس کر رہا ہے۔ گولی ماری ہے کسی نے اسے۔۔۔ دیکھو مت۔ چل نکل یہاں سے ورنہ کوئی آ گیا تو ہم بھی پھنس جائیں گے خواہ مخواہ" دوسرے نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔

"دیکھو۔۔۔ میری بات سنو۔ تم جا کے جیپ کو۔۔۔ وہ سیدھے گئے ہیں۔ تم انہیں پکڑ سکتے ہو۔۔۔ کم سے کم نمبر دیکھ لینا اس کا۔"

مگر پہلے نوجوان نے جو موٹر سائیکل چلا رہا تھا اور اپنے پاؤں زمین پر ٹکائے کھڑا تھا کلچ چھوڑ دیا "اوئے چل پھٹ ادھر سے۔ ورنہ تو بھی پکڑا گیا تو مارا جائے گا۔"

دوسرے نے سر ہلایا "تو چل یار۔ مجھے تو یہی بندہ لگتا ہے قاتل!"

موٹر سائیکل والے ہوا ہو گئے تو میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ بھاگ جاؤں۔ جائے واردات پر کسی غیر متعلقہ شخص کی موجودگی پولیس کے لیے بڑی خوشی کی بات ہوتی ہے۔ وہ اسے قاتل ثابت کر سکتے ہیں اور اسے قتل کے الزام سے باعزت طور پر بری بھی کر سکتے ہیں۔ پہلی صورت میں ان کی مستعدی اور فرض شناسی کی تعریف ہوتی ہے اور دوسری صورت میں مبینہ ملزم اپنی استطاعت سے بڑھ کر اپنی جاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بخشی کی قیمت ادا کرتا ہے۔

میں کسی طرح بھی غیر متعلقہ شخص نہیں تھا۔ مجھ پر ایک بار پہلے بھی خادم اور اس کے ساتھی عثمان کے قتل کی فرد جرم تقریباً عائد کردی گئی تھی۔ یہ میری قسمت تھی کہ متوکین سو فیصد زندہ سلامت برآمد کرلیے گئے مگر اب میری نظروں کے سامنے خادم کا قتل ہوچکا تھا۔ میرے پاؤں کے جوتوں پر اس کا خون تھا۔ میرے ہاتھ بھی بالکل صاف نہ تھے اور ممکن ہے میرے دامن پر بھی لہو کے داغ ہوں۔ عثمان کے قتل کی اطلاع مجھے پہلے ہی مل چکی تھی۔ ایسے میں یہ کون تسلیم کرتا کہ جائے واردات پر میری موجودگی محض ایک اتفاق تھا اور خادم کا قاتل میں نہیں ہوں۔

حالات اس بات کا ثبوت فراہم کردیتے کہ ایک بار میں نے ڈراما کیا تھا مگر اس کے بعد موقع پاتے ہی میں نے اپنے دونوں دشمنوں کو ٹھکانے لگادیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ مجھے دوبارہ پکڑا گیا تو میں زیادہ واویلا کروں گا کہ یہ سازش ہے۔ میرے دشمن مجھے انہی دو افراد کے قتل میں تختۂ دار تک پہنچانے کا فیصلہ کرچکے تھے اور بالآخر وہ کامیاب ہوگئے۔

میں دھڑکتے دل اور تیز تیز قدموں کے ساتھ پہلے سیدھا گیا پھر میں نے سائڈ کی ایک گلی کا راستہ اختیار کیا۔ میں اس وقت کسی کی نظر میں آنا نہیں چاہتا تھا اس گلی میں تقریباً دو سو گز چل کے میں دوبارہ دائیں طرف ٹرن لیتا تو اسی سڑک پر آجاتا مگر وہاں سے فرید عباسی کا گھر چند قدم کی مسافت تھی۔

میں نے پہلا ٹرن لیا تو ایک دم میرے قدم رک گئے۔ میرے سامنے وہی جیپ موجود تھی اور اس جیپ کے ساتھ فرار ہوجانے والے قاتل سوار بھی۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی نظر آرہے تھے۔

ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے قدرت نے مجھے خوش قسمتی کا جتنا کوٹا دیا تھا وہ ختم ہوچکا ہے۔ میں ناامیدی اور مایوسی کے گرداب میں غوطہ زن تھا پھر میں نے اس منظر کو تفصیل سے دیکھا۔

جیپ موڑ کاٹتے ہوئے بجلی کے ایک کھمبے سے ٹکرائی تھی اور اس ٹکر سے کھمبا ٹیڑھا ہوگیا تھا۔ بجلی کے تار ٹوٹ کے جیپ پر گرے تھے اور وہ دونوں جو اس تصادم میں شاید معمولی زخمی ہوئے بجلی کی کرسی پر بیٹھ کے سزائے موت پانے والوں کی طرح ELECTRICUTE ہوگئے تھے۔ ان کے جسم برقی رو کے مسلسل گزرنے سے جھلس گئے تھے اور وہ ہیبت ناک انداز میں ڈیش بورڈ پر سر رکھے کھلی آنکھوں سے قدرت کے نظامِ انصاف پر غور کررہے تھے۔ اس عدالت میں اتنی جلدی فیصلہ ہوگا' یہ چند لمحے پہلے ان کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا۔

جیپ کی رفتار زیادہ تھی اور وہ قدرتی طور پر کچھ نروس تھے۔ پیشہ ور قاتل بھی ظاہری اطمینان کا جھوٹا مظاہرہ کرنے کے لیے کسی کو قتل کرکے قہقہہ لگائے تو درحقیقت یہ اس کی روح کے عذاب کی چیخ ہوتی ہے۔

وہ موڑ پر گاڑی کو کنٹرول میں نہ رکھ سکے اور اس کے بعد سب آناً فاناً ہوگیا۔ کھمبا جھکا تو ایک طرف سے بجلی کے تار کھنچ گئے اور دوسری طرف سے ڈھیلے پڑگئے۔ کھنچ جانے والے تار نہیں ٹوٹے مگر جو تار ڈھیلے پڑے وہ آپس میں مل گئے۔ دو سو بیس وولٹ کے وہ تار ملے ہوں گے تو چار سو چالیس وولٹ کا شعلہ سا لپکا ہوگا۔ دونوں تار پگھل کے اور ٹوٹ کے نیچے گرے ہوں گے تو جیپ سواروں کے جسم سے دوبارہ چار سو چالیس وولٹ گزرے ہوں گے۔ ایک جھٹکے میں ان کی روح نے آزادی پالی ہوگی۔ شاید انہیں کسی اذیت کا احساس بھی نہیں ہوا ہوگا۔

دھماکے پر گھروں سے نکل آنے والے لوگ جیپ سے دور کھڑے تھے۔ ان میں سے کوئی قریب جانے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ جیپ کی فولادی باڈی میں بھی کرنٹ تھا اور ایک تار سڑک پر یوں گرا تھا کہ راستہ رک گیا تھا۔

ایک شخص نے چلّا کے مجھے خبردار کیا "دیکھ کے میاں۔"

میں نے اپنے قدم روک لیے تھے اور کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ سین کا ہر منظر خود پوری کہانی سنا رہا تھا مگر اوپر کی منزلوں سے جھانکنے والی خواتین میں سے کسی نے نہیں پوچھا "کی ہویا جے۔"

جواب دینے والا ضرور اس کا شوہر تھا "میری ساس کے لڑکا ہوا ہے' نظر نہیں آتا۔"

زوجہ نے سخت سبکی محسوس کی "ایک سیدھا جملہ بول کے بتانا گناہ ہے؟"

پڑوس کی کھڑکی سے باہر گرنے پر آمادہ خاتون نے چیخ ماری "ہائے بڑا ظالم ایس کی ڈنٹ ہوا ہے۔ اوپر سے بجلی گر گئی' توبہ توبہ۔"

میں وہیں سے واپس ہوا۔ میرے جوتوں کے تلوؤں سے انسانی خون کا رنگ تو شاید پیدل چلنے سے اتر گیا ہوگا مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ میرے لباس پر یا جسم کے کسی بھی حصے پر خون کا کوئی چھینٹا نہیں ہے۔ قصور میرے دماغ کا تھا جس میں خون کی بُو ایسے بس گئی تھی کہ مجھے اپنا وجود خون میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

میں نے مرنے والوں کی صورت نہیں پہچانی تھی مگر جیپ کا نمبر نوٹ کرلیا تھا۔ جیپ کے اگلے حصے کی جعلی نمبر پلیٹ ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ نیچے اصل نمبروں والی پلیٹ تھی جو اب سامنے آگئی تھی۔ مجھے اب خیال آرہا تھا کہ اگر میں خادم کے کپڑوں کی جیبوں کی تلاشی لے سکتا تو اچھا ہوتا۔ شاید اس کے پاس سے ملنے والے کاغذات سے کوئی کارآمد بات معلوم ہوجاتی مگر ایسا کرنا اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے والی بات تھی۔ کوئی آجاتا تو مجھ پر صاف بندے کو مار کے لوٹنے کا الزام آتا۔

ہر سمت میں مجھے ایک سوال کی بازگشت سنائی دینے لگی تھی۔ آخر خادم کب سے اور کہاں سے میرا پیچھا کررہا تھا اور کیوں؟ اگر اس کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہوتا تو اسے خاموشی سے میرا تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ پیچھے سے میری کھوپڑی میں ایک سوراخ کرتا اور غائب ہوجاتا۔ اسے وقت بھی ملا تھا اور موقع بھی۔ اس نے مجھ سے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کی تھی مگر موت نے مہلت نہیں دی تھی۔ کیا وہ مجھ سے کوئی بات کہنے کے لیے ہی یہاں تک میرے پیچھے آیا تھا؟

اس سوال سے ایک اور زیادہ پُرتشویش سوال جنم لیتا تھا کہ اس نے رات کے دو بجے مجھے اتفاق سے دیکھ لیا تھا یا وہ اسپتال سے میرے ساتھ تھا اور باہر میرا انتظار کررہا تھا۔ یہ دوسری بات کچھ بعید از امکان لگتی تھی۔ اسے معلوم ہوتا کہ میں اسپتال میں ہوں تو اسے جو کرنا تھا اندر آکے کرسکتا تھا۔ اسے رات دو بجے تک باہر ٹھہرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس نے اچانک مجھے سڑک پر دیکھ لیا۔ اس وقت وہ خود کیوں گھر سے باہر تھا؟ یہ ایک الگ سوال تھا۔ شاید وہ پناہ کی تلاش میں تھا۔ بھاگ رہا تھا' اسے معلوم تھا کہ قاتل اسے تلاش کررہے ہیں اور اس کا تعاقب کررہے ہیں۔ عثمان کے بعد اس کی موت کا بلیک وارنٹ جاری کیا جاچکا ہے۔

بات کچھ بھی ہو۔ مہاتما بدھ کے مجسمے کی مورتی کے شکستہ سر کا خادم کے قتل سے تعلق بہت واضح تھا۔ اسے مارنے والے تو صاف کہہ گئے تھے کہ اس سر کو اپنے ساتھ دوسری دنیا میں لے جاؤ۔ اس سر میں ایسی کیا بات تھی' آخر؟ کیا اس سر سے پوچھا جاسکتا تھا؟

ابھی رات کے کم سے کم تین گھنٹے باقی تھے۔ ابھی وہ سر محفوظ تھا' میں نے اسے بہت جلدی میں چھپایا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ کوئی صبح اسے دریافت کرے پھر کیا مجھے ابھی جاکے اسے اٹھالانا چاہیے؟ میں نے فرید عباسی کے گھر کے دروازے پر رک کے سوچا۔

اس کے لیے مجھے بہرحال ایک گاڑی کی ضرورت تھی۔ میں اتنی دور سے اسے سر پر اٹھا کے نہیں لاسکتا تھا۔ میرے شانوں پر اپنا سر ہی ایک بار تھا۔

کال بیل کی آواز پر فرید باہر آیا اور مجھے دیکھ کے بھونچکا رہ گیا۔ "کیا ہوا ہے تجھے بھائی' بہت لگے ہوئے ہیں تیرے پیچھے۔"

میں سیدھا گزر گیا۔ دروازے میں حیران کھڑی رخشی نے کہا "تم تو خود ایک بھوت لگ رہے ہو۔"

کسی سے بات کیے بغیر میں سیدھا باتھ روم میں گھس گیا۔ وہاں مجھے الٹی آئی اور میں واش بیسن پر جھکا ہانپتا رہا۔ مجھے اپنے پیچھے فرید نظر آیا جس کی نظر باتھ روم کے سفید ٹائلوں پر تھی۔ گیلے ہوجانے والے ٹائلوں پر میرے جوتوں کے خونی نقش بہت نمایاں نظر آرہے تھے۔ رخشی میرے لیے پانی کا ایک گلاس لائی۔ پانی پی کے میں نے اس سے کپڑے مانگے۔

"مجھے فرید کا کوئی جوڑا دے دو۔ جو میں نہا کے بدل لوں۔"

فرید کا ذہن ایک پولیس والے کا ذہن تھا۔ میری حالت نے اس پر بہت کچھ واضح کردیا تھا "ٹھیک ہے۔ تم نہا کے آؤ' میں اتنی دیر میں تمہارے لیے کافی بناتا ہوں۔ اور بالکل ایزی ہوجاؤ۔"

کافی پینے کے بعد میں نے خود کو بہت بہتر محسوس کیا پھر میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بجے تھے۔ میں نے کہا "یار' میرے ساتھ چل ذرا۔"

"پہلے بتا کہاں جانا ہے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "زیادہ دور نہیں جانا۔ ایک کلومیٹر یہاں سے' پہلے ایک چیز اٹھالائیں پھر میں ساری بات بتاؤں گا۔ مجھے امید ہے اب تک لاش تو پولیس لے گئی ہوگی۔"

"لاش۔ کس کی لاش۔" رخشی نے چیخ ماری۔

"آہستہ۔ اماں اٹھ جائیں گی۔ خادم کی لاش۔ اسے قتل کردیا ہے انہوں نے" میں نے کہا "جنہوں نے عثمان کا قتل کیا تھا۔"

"یہ تمہیں کیسے پتا چلا۔ تم جانتے ہو عثمان کے قاتلوں کو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یار فرید۔ واپس آ کے اطمینان سے باتیں کریں گے۔ تو گاڑی نکال۔ دس منٹ میں لوٹ آئیں گے ہم۔ پہلے وہ چیز اٹھالائیں۔"

"ایسے نہیں۔ مجھے بتاؤ کیا لینے جارہے ہو ورنہ میں بھی ساتھ چلوں گی تمہارے۔"

"پاگل مت بنو۔ اگر اماں اٹھ جائیں کسی وجہ سے تو ان سے کہنا کہ ہم کسی کام سے گئے ہیں۔ کسی کو اسپتال لے جانا تھا۔"

"اگر دس منٹ کی بات ہے تو اماں کو پتا نہیں چلے گا۔"

وہ ہم سے پہلے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے بیٹھ گئی۔ مجبوراً فرید نے گاڑی کو دھکیل کر پورچ سے باہر نکالا اور سڑک پر اسٹارٹ کیا۔ پورچ میں انجن غرایا تو فرید کی ماں کی آنکھ شور سے ضرور کھل جاتی۔ ان کی نیند اس عمر میں بہت ہلکی تھی اور ویسے بھی ان کے اٹھنے کا وقت ہو رہا تھا۔ فرید کو ہٹا کے میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس سیدھی سڑک پر وہ راستہ پانچ منٹ کا ہوگا۔ یہ شاید ایک گھنٹے سے پہلے کی بات تھی جب میں نے خادم کا قتل ہوتے دیکھا تھا۔ افسوس اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ ابھی تک پولیس جائے واردات پر نہیں پہنچی تھی۔ وہاں چار پانچ افراد ڈرے سہمے دور کھڑے لاش کو دیکھ رہے تھے جو آس پاس رہنے والے نہیں تھے' راہ گیر قسم کے لوگ تھے۔ ایسے نہ جانے کتنے لوگ اب تک رک کے اور دل ہی دل میں افسوس کرکے جاچکے ہوں گے۔ پولیس کو رپورٹ اور گواہی کے چکر میں تو کوئی بھی پڑنا نہیں چاہتا لیکن سڑک پر ایک لاش دیکھ کے کسی نے اپنے گھر سے فون کال کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

جب میں نے گاڑی روکی تو دو افراد فوراً وہاں سے چل پڑے۔ مجھے معلوم تھا کہ بدھ کی مورتی کا وہ سر کہاں پڑا ہے۔ میں نے فرید سے کہا کہ وہ لوگوں کو باتوں میں لگائے تاکہ ان کی توجہ میری طرف نہ رہے۔

فرید نے انہیں پولیس والوں کی طرح ڈانٹنا شروع کیا "یہ کیا مجمع لگا رکھا ہے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دی؟ کب سے کھڑے ہو تم لوگ یہاں؟"

لوگوں نے اپنی اپنی صفائی میں کچھ کہا۔ میرے لیے چند منٹ کی یہ مہلت کافی تھی۔ گاڑی کی اوٹ میں رہتے ہوئے میں اس جگہ تک گیا جہاں۔ مورتی کا سر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے مٹی ہٹا کے اٹھایا اور گاڑی کی طرف بڑھا۔

اسی وقت گلی کے موڑ سے ایک جیپ تیزی کے ساتھ اندر آئی۔ اس کی تیز روشنی براہِ راست لاش پر' وہاں کھڑے لوگوں پر اور مجھ پر پڑی۔ کسی نے خوف زدہ لہجے میں کہا "پولیس۔۔۔!" پھر وہاں کھڑے ہوئے سب لوگ کھسک گئے۔ لاش کے پاس صرف فرید رہ گیا۔ جلد بازی کے باعث میں نے خود کو ایک مشکل صورتِ حال میں ڈال دیا تھا اور اپنے ساتھ فرید عباسی اور رخشندہ کو بھی لیکن وہ اسی گلی میں رہتے تھے اور یہ کہہ سکتے تھے کہ انہوں نے وہاں سے گزرتے ہوئے لاش دیکھی تو رک گئے تھے۔

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔

○☆○

میرے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ ہر بات مجھے معلوم ہوگئی تھی اور چند الفاظ پر مشتمل ایک سطر نے گویا مجھ پر چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ شادو کو بلڈ کینسر ہے اور یہ بات نیلم جانتی ہے لیکن صاف ظاہر تھا کہ نیلم کے علاوہ بھی کوئی تھا جو اس سفاک حقیقت سے واقف تھا اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس میں جھوٹ یا مذاق کا کوئی پہلو نہیں ہوسکتا' اس نے ایک گواہ کا نام بھی پیش کردیا تھا۔ نیلم واش روم میں تھی' میں فون لیے بیٹھا رہا۔

میرا ذہن شدید شاک کی کیفیت میں بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہوا تھا۔ اگر یہ بات سچ نہ ہوتی تو نیلم کا نام کوئی نہ لیتا۔ بتانے والا اگر صرف مجھے پریشان دیکھنے کا خواہش مند ہوتا تو میرے دل میں شک اور وہم پیدا کرکے تماشا دیکھتا۔ میں صرف متفکر اور پریشان ہوکے بیٹھنے والا آدمی نہیں تھا۔ میں شادو کو چیک اپ کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتا اور خدانخواستہ رپورٹ وہی کہتی جو مجھے کسی دوست یا دشمن نے بتادیا تھا تب بھی میں شادو کو کسی بڑے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا پھر اس سے بڑے ڈاکٹر کے پاس اور جب تک مکمل تصدیق نہ ہوجاتی' میں اس حقیقت کو جھٹلاتا رہتا۔

لیکن میرے اس نادیدہ دوست یا دشمن نے میرے ساتھ بڑا بے رحمانہ مذاق کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا جس کو میری ایک خواب کی تعبیر کا سچ ہونا بھی گوارا نہ ہوا اور اس نے میری زندگی کی سب سے بڑی' بہت دیر سے اور بڑی مشکل سے ملنے والی خوشی کو صرف ایک رات کی حد تک برداشت کیا۔ وہ بھی اس لیے کہ اتنی بڑی اور انمول خوشی کی سرشاری میں میرے لیے اذیت کا صدمہ زیادہ سے زیادہ ہو۔

اگر یہی بات مجھے شادو کے حصول میں کامیابی سے پہلے معلوم ہوجاتی تو شاید میں تذبذب میں مبتلا ہوجاتا۔ شادی کو

ملتوی کردیتا اور تصدیق ہوجانے کے بعد شادی کا خیال ہی دل سے نکال دیتا۔ ایسا ناممکن تھا لیکن جس نے میرے خوابوں کے آئینے کو اتنی بے رحمی سے چکنا چور کیا تھا اس کو ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہوجائے۔

ایسا شخص میرا دشمن ہی ہوسکتا تھا۔ دوست ہوتا تو اس ظالمانہ حقیقت سے باخبر ہونے کے باوجود بے خبر ہونے کے جھوٹ کو ترجیح دیتا۔ انجان بن کے خاموش رہتا کہ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ بالآخر مجھے معلوم ہوجائے گا کہ شادو کے ساتھ میری زندگی کا سفر کتنا محدود اور مختصر ہوگیا ہے پھر وہ میری خوشی کیوں غارت کرے اور وہ بھی شبِ وصل کی صبح ہوتے ہی۔ میرے ذہن میں ایک سوال کی بازگشت سارے خیالوں پر حاوی تھی۔ وہ کون ہے' یہ بات کس کے علم میں تھی جو مجھے معلوم نہ ہوسکی؟ اگر اس سے ایک شخص واقف ہے' نیلم واقف ہے تو پھر اور لوگ بھی یہ بات جانتے ہوں گے۔

صرف ایک میں تھا جو اپنے خوابوں کی دنیا میں جذبات کے پر لگا کے خوشیوں کے آسمان کی آخری حد تک پرواز کرنے میں اتنا مگن تھا کہ کچھ نہیں دیکھ رہا تھا اور کچھ نہیں سن رہا تھا۔

میں انتظار سے تنگ آ کے ریسیور رکھنے ہی والا تھا کہ نیلم کی آواز آئی "ہیلو۔ سوری یار ناصر' تمہیں انتظار کرنا پڑا۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

"خیریت تو ہے نا۔ تمہاری شب عروسی کی صبح اتنی جلدی کیسے ہوگئی۔" وہ ہنسی "بیوی نے اٹھادیا کہ چلو کچن میں' چائے بنا کے لاؤ۔"

میں نے کہا "نیلم۔ کیا شادو کو TERMINAL بلڈ کینسر ہے؟"

اس کی ہنسی ایک دم بند ہوگئی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو' پاگل ہوگئے ہو؟"

میں نے کہا "میں جانتا ہوں کہ تم بہت اچھی ایکٹریس ہو۔ مجھ سے جھوٹ مت بولو کیا تم یہ بات جانتی تھیں؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟"

"نیلم۔ یہ بات رہنے دو کہ کس نے کہا اور کیوں کہا' کیا تمہیں معلوم تھا؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھو۔ تم کہاں سے بات کررہے ہو۔ اپنے گھر سے؟"

"ہاں۔"

"شادو کہاں ہے۔ تم اتنی اونچی آواز میں کیوں بول رہے ہو؟"

میں نے کہا "مجھے صرف ہاں یا نہ میں جواب دو نیلم!"

"نہیں" اس نے کچھ توقف کے بعد کہا "مگر تم آجاؤ یہاں اگر آسکتے ہو۔ پھر میں بتاؤں گی تمہیں پوری بات۔ کیا شادو سو رہی ہے؟"

"ہاں۔ میں ابھی نہیں آسکتا نیلم۔ شادو اٹھے گی تو نہ جانے کیا سمجھے گی" میں نے کہا "میں بہت پریشان ہوں۔"

"اپنی پریشانی کا ڈھول پیٹنے سے کیا ہوگا ناصر۔ پریشانی کا یہ علاج تو نہیں کہ سارے زمانے کو پریشان کرو۔"

"میں پریشان کررہا ہوں تمہیں؟"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں شادو کی پریشانی کی بات کررہی تھی۔ اگر یہ سچ ہو تب بھی کیا یہ تمہارا فرض نہیں بنتا کہ جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کے اٹھاؤ۔"

"یعنی یہ سچ ہوسکتا ہے؟"

"بھئی مجھے کیا معلوم۔ اچھا بعد میں بات کریں گے۔ مجھے جانا ہے۔"

"نیلم۔ شادو نے مجھے پھر دھوکا دیا ہے" میں نے دکھ بھرے شکایتی لہجے میں کہا لیکن دوسری طرف نیلم نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ اس موضوع پر بات کرنے سے گریزاں تھی۔ اس نے جانے کا بہانہ بنالیا اور مجھے ٹال دیا۔

میں ریسیور رکھ کے پلٹا تو اپنے پیچھے شادو کو دیکھ کر چونک پڑا۔ میں نے مسکرانے اور نارمل نظر آنے کی ناکام کوشش کی۔

شادو کی آنکھوں میں ملال نہیں۔۔۔ ایک سوال تھا۔

مجھے شادو کے اپنے پیچھے آکر کھڑے ہونے کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اس نے صرف آخری جملہ سنا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے نیلم سے میری ساری گفتگو سن لی ہو۔

میں نے کہا "مجھے تو عادت ہے جلدی اٹھنے کی۔۔۔ تم کیوں اٹھ گئیں؟"

اس نے آہستہ سے کہا "کس سے فون پر بات کررہے تھے صبح صبح۔؟"

"نیلم تھی' تمہاری طبیعت کا حال پوچھ رہی تھی" میں نے شرارتی لہجہ بنالیا۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟"

"کیا کچھ ہونا ضروری ہے؟ بھئی سب ہی دلہنوں سے ان کے مزاج پوچھے جاتے ہیں صبح۔"

"جھوٹ مت بولو' تم کیا کہہ رہے تھے اس سے۔" اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر میری شوخ بیانی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔ مجھے کوئی معقول عذر تلاش کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت درکار تھی۔ "چلو بتاتا ہوں' یہاں ماسی کے سامنے نہیں کہہ سکتا۔"

سودے کے بعد ماسی نے کچن میں خالص دیسی گھی کی مہک اڑانے والے پراٹھے بنانے شروع کردیے تھے اور ہماری خصوصی صبح کے لیے خاص ناشتے کا انتظام کرتے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی۔

میں نے ایک کان پر ہاتھ رکھ کے غور سے سننے کی اداکاری کی "پڑوس میں کوئی عورت رو رہی ہے بے چاری۔"

وہ ہنسنے لگی "تجھے پتا چلتا ہے رونے گانے کا۔"

میں نے کہا "اچھا۔ تم گا رہی تھیں' کون سا گانا تھا۔۔۔ وہی' میں کیا کروں رام مجھے نکما مل گیا۔۔۔ صبر کرو ماسی۔"

ماسی نے حلوے کی کڑاہی والا کفگیر لہرایا "دولہا میاں' زیادہ مت بول ورنہ یہی ماروں گی۔ لحاظ نہیں کرنا میں نے۔"

"اس کے سر پر ڈال کے دیکھو گرم حلوا' شاید بال گھبرا کے نکل آئیں۔ جیسے چیونٹیاں نکل آتی ہیں بل سے۔"

ماسی نے جوتی کا میزائل چلایا جو مجھے چھوئے بغیر صحن سے گزرا اور منڈیر پر سے گلی میں جا گرا۔ ماسی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ نیچے سے کسی نے چلّا کے کہا "اوئے' اے کی ہو ریا جے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آئی "ماسی اب دوسری جوتی بھی پھینک دو۔ کسی کے تو کام آئے۔ تم کیا ایک پہن کے پھرو گی۔ لگی ہوگی کسی کے تو وہی آجائے گا اوپر۔" اسی وقت کسی نے دروازے پر دستک دی۔

ماسی نے آواز دبا کے کہا "ناصر۔ جا کہہ دے بچے نے پھینک دی تھی۔"

"کس کے بچے نے؟" میں نے معصومیت سے سوال کیا "میرے یا تمہارے؟ خواہ مخواہ جھوٹ بولوں؟" میں نے دروازہ کھولا تو ایک شخص مظلوم صورت بنائے کھڑا تھا۔

"یہ جوتی کس نے ماری ہے صبح صبح مجھے؟"

میں نے جوتی لے لی "صبح شام کی بات نہیں' راستہ دیکھ کے چلا کرو۔"

"کیا؟ اوپر منہ اٹھا کے چلوں؟" وہ چلانے لگا۔

"مجھے کیا۔ سر جھکا کے چلو" میں نے کہا "کل اخبار میں دیکھا نہیں تھا۔ ایک شخص نے اپنی بیوی کو دوسری منزل سے باہر پھینک دیا تھا۔"

مجبوراً ماسی نے میرے پاس آکے بات ختم کی "معاف کرنا بھائی۔ چھوٹا بچہ شیطان ہے۔ یہ تو پاگل ہے" اس نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"تو" میں نے بڑبڑا کے احتجاج کیا "چھوٹا شیطان ہے۔ بڑا پاگل ہے' دو ہی تو ہیں اس گھر میں۔ ایک میں اور دوسرا راجھا۔"

بالکل غیر متوقع انداز میں مجھے سوچنے کی مہلت مل گئی تھی۔ اچانک ہی ایک مزاحیہ صورت حال پیدا ہوگئی تھی مگر شاد اسی طرح گم صم کھڑی تھی۔

ماسی نے دروازہ بند کرکے کہا "چل پتر تو بھی جلدی سے آجا۔ ناشتا تیار ہے۔"

میں نے کہا "اس مُوے کے کان میں بھی تو صور اسرافیل پھونکو جا کے۔ دوپہر ہوگئی ہے۔ پتا نہیں کیسا خواب دیکھ رہا ہے کہ جاگنا نہیں چاہتا۔۔۔ اس عمر میں بھی شرم نہیں آتی اسے۔"

ماسی نے پھر جوتی اٹھائی "تو نے مار ضرور کھانی ہے حرامی نہ ہو تو۔"

میں شاد سمیت کمرے میں بھاگ گیا۔ وہاں میں نے اسے بیڈ پر بٹھادیا اور خود اس کے سامنے فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا "یہ کیا ہے آخر۔ شاد جی؟"

"ناصر۔ میں نے پھر کیا دھوکا دیا ہے تمہیں؟"

"دیکھو۔ اتنی خوب صورت رات کی صبح آنسوؤں سے نہیں ہونی چاہیے۔ کون کہتا ہے ایسی فضول بات" میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"ابھی تم اور کیا کہہ رہے تھے" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میں نے ایک جوا کھیلا "حد کرتی ہو تم بھی۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔ تم نے کیا سنا اور پھر خواہ مخواہ آدھی ادھوری بات کا غلط مطلب نکال کے رونا شروع کردیا۔ پاگل ہو تم بھی۔"

"مجھے۔۔۔ ایسا ہی لگا تھا" وہ بولی۔

میں نے سکون کا سانس لیا کہ شاد نے میری ساری گفتگو نہیں سنی تھی "شاد جی' معلوم نہیں ہمارے کسی بدخواہ الو کے پٹھے نے نیلم کو فون کیا تھا۔ اس نے بس کہا اس کا۔۔۔ کہ۔۔۔ خیر چھوڑو۔"

"نہیں' مجھے بتاؤ۔ تمہیں میری قسم۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس نے نیلم سے کہا کہ دیکھا کیسا دھوکا دیا تمہیں تمہارے یار ناصر نے۔ کتنا بے عزت کیا تمہیں۔ سب دنیا میں بدنام کردیا اور تم پر تھوک کے چلا گیا اسی فقیر زادی کے پاس۔۔۔ دیکھ لینا وہ اسے پھر دھوکا دے گی۔"

شاد کا اڑا ہوا رنگ غصے میں لال ہونے لگا "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "تمہاری قسم کے بعد جھوٹ بول سکتا ہوں میں۔ تم خود پوچھ لو نیلم سے۔ بات کرلو فون پر۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔"

وہ اٹھی اور پھر رک گئی "تم پر تو اعتبار ہے لیکن ایسا کمینہ آدمی کون ہو سکتا ہے ناصر؟"

"ارے اب چھوڑو۔ نہ جانے کتنے میری اور تمہاری شادی پر حسد اور جلن سے کباب ہوئے ہوں گے۔"

"کیوں' اس سے کسی کو کیا تکلیف ہے۔ کسی کا نقصان کیا ہے تم نے۔" وہ خفگی سے بولی۔

"دیکھا جائے تو نہ جانے کتنے ہوں گے ایسے۔ جو سمجھتے ہوں گے کہ بڑا نقصان کردیا میں نے ان کا۔ جو آس لگائے بیٹھے ہوں گے کہ اتنی خوب صورت سنہری چڑیں ہمارے جال میں پھنس جائیں" میں نے کہا۔

وہ اپنے ہونٹ کاٹتی رہی "جسے چاہیے لے جائے میری سب دولت۔"

میں نے کہا "کیا پتا شاد جی' کوئی دل جلا عاشق ہو نیلم کا۔ اسے موقع مل گیا نیلم کو ذلیل کرنے کا۔ قسم خدا کی' میں نے تو نیلم کے بارے میں کبھی ایسا سوچا بھی نہیں مگر وہ ہے اتنی بڑی سپر اسٹار کہ خواہ مخواہ کے اسکینڈل بنا دیے جاتے ہیں۔ اونٹ بھی اس کے ساتھ نظر آئے تو خبر بن جائے گی۔ نیلم سے کوئی بیان منسوب ہوجائے گا کہ پچھلے جنم میں میرا محبوب تھا اور میں بھی اونٹنی تھی۔"

شاد اس مذاق پر بھی نہیں مسکرائی "میں نیلم سے بات کروں گی۔ میری وجہ سے اس کو ایسی گھٹیا بات سننی پڑی۔ اس نے تو خود کہا تھا کہ مجھ سے کہ ناصر کے لیے دنیا میں شاد کے سوا کسی عورت کا وجود ہی نہیں رہا جیسے۔"

"کیا غلط کہا تھا اس نے۔"

باہر سے ماسی نے پھر آواز لگائی "چلو پتر۔ سب ٹھنڈا ہوجائے گا۔"

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول

اندھیر نگری

قیمت فی جلد 150 روپے

چار جلدوں میں مکمل

محی الدین نواب

شاد باہر نکلی اور سیدھی ٹیلی فون والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس خیال سے کہ اتنے بڑے جھوٹ کا پردہ چاک ہوجانے کے بعد میں شاد سے سچ کیسے بولوں گا۔ میں اسے زبردستی فون کرنے سے روکتا ہوں تو اس کا شک قوی سے قوی تر ہوجائے گا اور پھر وہ نیلم کو فون کرکے بنا چین سے نہیں بیٹھے گی۔ میرے خدا' آخر میں کیا کروں؟ مجھے تھوڑی سی مہلت چاہیے۔

مجھے مہلت مل گئی۔ شاد نے نیلم کا نمبر ملایا تو اسے بتایا گیا کہ شوٹنگ کے لیے جا چکی ہیں۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے میری عزت رکھی۔ یہ دعا کے لیے قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں نے سوچا' کتنا اچھا ہوتا اگر میں خدا سے یہ دعا مانگ لیتا کہ۔۔۔ رب کریم' ایک سطر کی وہ تحریر غلط ہو جس نے جنت کے خواب کی ایک رات کو میرے لیے عذاب جہنم کے دن میں بدل دیا ہے۔

لیکن کیا دعا سے حقائق بدلتے ہیں؟ اگر کوئی قبولیت کی ساعت میں دعا مانگ بیٹھے کہ اس شب کی سحر نہ ہو۔ تو کیا ایسا ہوجائے گا؟ زمین کی گردش ٹھہر جائے گی اور سورج طلوع نہیں ہوگا۔ ایچ جی ویلز کی ایک مشہور کہانی میں ایسا ہی ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں قیامت آگئی تھی۔ وہ ایک سائنس فکشن کی بات تھی لیکن زندگی میں بھی جو ناممکن ہے' وہ ناممکن ہے۔ دعاؤں سے نظام قدرت اور کائنات کی کوئی بنیادی سچائی تبدیل نہیں ہو سکتی۔

وقتی طور پر بات ٹل گئی تھی مگر میرے دل کا اطمینان رخصت ہوگیا تھا۔ نیلم نے بھی صاف انکار نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ میں پھر بات کروں گی اور بڑی عجلت میں فون بند کردیا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بات ضرور ہے۔ شاید اسے امید نہیں تھی کہ میری فون کال صبح صبح آجائے گی۔ ابھی اس نے سوچا نہیں تھا کہ مجھ سے کیا کہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اب اسے مہلت مل گئی ہے۔ وہ سوچ کے کوئی جھوٹ بنالے گی جس کی تردید میرے لیے ممکن نہ رہے۔

ماسی ہیر نے مجھے دوبار ٹوکا مگر میرا دھیان کہیں اور تھا۔ میں نے نہ چاہنے کے باوجود شادو کو مطمئن رکھنے کے لیے پورا ناشتا کیا اور اپنے چہرے کے تاثرات سے اپنی دلی کیفیت چھپانے کی پوری کوشش کرتا رہا۔

میرے لیے اس ایک سطر کی تحریر کو جھوٹ یا سنگدلانہ مذاق سمجھ کے بھول جانا عملی طور پر ناممکن تھا۔ اب یہ ضروری ہوگیا تھا کہ میں حقیقت کا پتا چلاؤں لیکن سوال یہ تھا کہ کیسے؟

فی الحال مجھے شادو پر کچھ ظاہر نہیں کرنا تھا۔ میں نے طے کیا کہ سب سے پہلے میں نیلم سے بات کروں۔ وہ بات پوچھوں جو اس نے مجھے فون پر نہیں بتائی تھی۔ شاید اس سے یہ معلوم کرنے میں مدد ملے کہ میری خوشیوں کے امرت میں زہر گھول کے کس نے اپنے انتقامی جذبات کی تسکین کا سامان کیا تھا۔ کون تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میری شبِ وصل کی صبح یوں ہو؟ جو حقیقت تھی وہ چھپی نہیں رہ سکتی تھی مگر میں چند دن یا چند ہفتے تو خوش رہ سکتا تھا۔ کس کو مجھے یہ خبر سنانے کی جلدی تھی کہ میرے نصیب میں شادو سے دائمی جدائی کا آزار لکھ دیا گیا ہے اور میں نے اسے صرف کھونے کے لیے پایا ہے۔

میں نے شادو کو بہت غور سے دیکھا۔ وہ بظاہر بالکل تندرست تھی۔ اس کی صورت سے یا رنگت سے بلڈ کینسر جیسے موذی مرض کی علامات کا بالکل پتا نہیں چلتا تھا۔ نہ وہ سست تھی اور نہ کمزور۔ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ علامات کیا ہوتی ہیں جن سے کوئی ڈاکٹر شک میں پڑ جائے۔ تاہم یہ بات یقینی تھی کہ اس مرض کا پتا صرف ظاہری علامات سے نہیں چلایا جاسکتا۔ حتمی فیصلہ لیبارٹری کے مخصوص ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھے بغیر ناممکن ہے۔

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک پُرعذاب انکشاف کے پتھر سے میرے خوابوں کا شیش محل چکنا چور کرنے والے کو اس بارے میں کوئی شک نہیں تھا۔ کیا اس نے بلڈ کینسر کے ٹیسٹ کی رپورٹیں دیکھی تھیں؟ یہ ٹیسٹ کب ہوئے تھے اور کہاں؟ اور آخر اسے قدرت کے اس اٹل فیصلے کا علم کیسے ہوا؟ کیا یہ اسے کسی ڈاکٹر نے بتایا تھا جو شادو کا معالج رہا تھا؟ کیا وہ خود ڈاکٹر تھا؟

اس آخری سوال نے مجھ پر امکانات کے جنت سے بند دروازے کھول دیے جو ابھی تک میری نظر سے اوجھل تھے۔ شادو کے ساتھ اپنی ازدواجی زندگی کے آغاز کا پہلا دن ڈرانے والے خیالوں، عذاب ناک اندیشوں اور منحوس سوالوں کے حصار میں نہیں گزارا جاسکتا تھا۔ میرے لیے یہ بہت آسان ہوتا کہ میں وہ تحریر شادو کے سامنے رکھ دوں اور اس سے پوچھوں کہ یہ کیا ہے؟ یہ سچ تو خیر نہیں ہوسکتا مگر ایسا جھوٹ کس نے بولا اور کیوں؟

میں ایسا بھی کرسکتا تھا کہ شادو کی کوئی بات نہ مانوں اور اپنے یقین کے لیے اس کو کسی ONCOLOGIST کے پاس لے جاؤں اور اس سے کہوں کہ وہ ہر طرح کے ٹیسٹ لے کر اس جھوٹ کی تصدیق کردے کہ نہ ایسا ہے اور نہ ہوسکتا ہے تاکہ میرے دل سے بے بنیاد شک کے کانٹے کی خلش بھی دور ہوجائے۔

لیکن میرے لیے ایسا کرنا بالکل ناممکن تھا۔

اس سے شادو کی خوشیوں کا وہ اجالا ماند پڑ جاتا جس میں میرے ارمانوں کے سارے رنگ شامل تھے۔ اسے پانے کے لیے میں نے مجنوں کی طرح جس صحرا کی خاک چھانی تھی اور فرہاد کی طرح صبر کے تیشے سے آزمائش کا پہاڑ کاٹا تھا۔ کیا اس کا صلہ وصل کی ایک ہی شب تھی؟ اس کا انعام شادو کے قرب کی ساعتوں سے معمور زندگی نہیں تھی؟ آرزوؤں کا حاصل وہ مستقبل نہیں تھا جس کے خواب میں نے اور شادو نے مل کر سجائے تھے؟

آہستہ آہستہ میرے دل اور دماغ نے ایک سمجھوتا کرلیا۔ میری عقل اور جذبات ہمنوا ہوگئے۔ مجھے یقین آنے لگا کہ یہ جھوٹ کسی نے عمداً مجھے ذہنی اذیت دینے کے لیے بولا ہے۔ قدرت کا کوئی فیصلہ اتنا غیر منصفانہ نہیں ہوسکتا۔ سزا کے بعد جزا کا عمل فطری ہے۔ شادو سے دوری کی سزا میں نے کاٹ لی ہے۔ اب اس کی رفاقت پر میرا حق ہے۔

اب میرے سامنے جواب طلب صرف ایک ہی سوال رہ گیا تھا کہ مجھ سے ایسا ظالمانہ جھوٹ بولنے والا کون ہے؟ اور مایوسی کے اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے بالآخر مجھے وہ روشنی نظر آگئی تھی جس میں مجھے امکانات کا ایک واضح راستہ نظر آنے لگا تھا۔ تاہم یہ ضروری نہیں تھا کہ میں فوراً اس راستے پر چل پڑوں۔ جھوٹ بالآخر جھوٹ بولنے والے کا پتا دے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے لہو خود قاتل کا سراغ دیتا ہے۔

ناشتے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی میری اداکاری ناکام رہی۔ شادو اور ماسی ہیر نے بار بار مجھ سے پوچھا کہ میں کس خیال میں گم ہوں اور میں نے ہر بار انہیں ہنس کے ٹال دیا مگر ناشتے کے بعد شادو نے مجھے اکیلے میں پکڑ لیا۔

"بات کیا ہے ڈھیر۔ صبح سے تم پریشان ہو۔"

میں نے کہا "پریشانی تو لازمی ہے۔ اب میں اکیلا نہیں۔ بال بچوں والا ہوں۔ ساری فکریں لاحق ہوگئی ہیں۔ اولاد کی، ان کے مستقبل کی۔"

"تم نے جھوٹ نہ بولنے کی قسم کھائی تھی۔"

"ہاں۔ بہت بڑی قسم تھی۔ پیٹ تو اسی سے بھر گیا تھا۔ اوپر سے ماسی ہیر صدقہ تھی حلوا پوری کھلانے پر۔"

"ناصر۔ نہیں بتانا چاہتے مجھے تو میں بھی نہیں پوچھتی۔" اس کا چہرہ اُتر گیا۔

میں نے اسے اپنے قریب کرنے کی کوشش کی "جانِ من!"

اس نے خود کو چھڑا لیا "کچھ شرم کرو، ابھی ماسی آجائے گی۔"

"پھر کیا ہوگا؟ میں کون سا گناہ کا کام کر رہا ہوں۔ ویسے یہ وہم کیوں ہوگیا ہے تمہیں کہ میں پریشان ہوں۔"

"اتنی دیر سے خاموش ہو تم۔ بتاتے کچھ نہیں۔ مسلسل مجھے گھورتے رہے ناشتے کے دوران میں۔" وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تمہیں تو میں بے خودی میں دیکھتا رہا۔ دراصل ابھی تک مجھے یقین نہیں آیا کہ تم میری ہوگئی ہو، ہمیشہ کے لیے۔" اس کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی "اور سوچتے کیا رہے؟"

میں نے کہا "سوچنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں۔ حالانکہ آج تو اس زندگی کا پہلا دن ہے۔ ابھی سے کل کی کیا فکر مگر میں ہوں ذرا دور اندیش۔"

"مسٹر دور اندیش۔ ایسی کون سی فکر لاحق ہے کل کی۔ مجھے بھی تو پتا چلے۔ آخر میں تمہاری وہ ہوں، نصف بہتر۔ یا تم نصف بدتر سمجھتے ہو مجھے؟"

"دیکھو شادو۔ جب میں گزرے ہوئے کل کو دیکھتا ہوں تو مجھے آج کے دن کا اعتبار کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بقول فلمی شاعر، یہ کہاں آگئے ہم یونہی ساتھ ساتھ چلتے۔"

"وقت جو گزر گیا سو گزر گیا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مگر آنے والے وقت میں ابھی تک میرا کردار کچھ واضح نہیں۔ میں بڑے تذبذب میں ہوں۔"

"تذبذب کیسا؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ ازدواجی زندگی میں تو ہم واقعی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں مگر اس سے الگ بھی ہماری ایک زندگی ہوگی۔ جس میں ہمارا کردار اور ہماری حیثیت ایک جیسی نہیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔"

میں نے کہا "میں تو وہی ناصر ہوں۔ جس کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ میں ایک میٹرک پاس نوجوان ہوں جس کے سامنے ابھی تک کوئی واضح مستقبل نہیں۔"

وہ ہنسنے لگی "اور تم اس کے لیے فکر مند ہو۔ میں بتاتی ہوں تمہیں کہ تمہارا مستقبل کیا ہے؟"

"کیسے؟ میرا ہاتھ دیکھ کر؟"

"کیوں نہیں۔ ادھر لاؤ ہاتھ۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اپنی نازک سی انگلی میری ہتھیلی پر پھیرنے لگی۔ "دیکھو یہ ہے دماغ کی لکیر۔"

"جو خراب ہوگیا تھا ایک لڑکی کے عشق میں۔ اور ابھی تک خراب ہی ہے" میں نے کہا "اس عشق نے مجھے فقیر کیا۔ پھر مجنوں اور سودائی کیا اور آخر کار ایک شوہر بنا دیا۔ دماغ کی خرابی تو ثابت ہے۔"

"غلط۔ تمہاری دماغی صلاحیتیں قابلِ رشک ہیں" وہ بولی "اپنی ذہانت اور مستقل مزاجی سے تم ایک دن۔۔۔"

"وزیرِ اعظم بن جاؤں گے۔ چل چھوڑ میرا ہاتھ۔۔۔ پاگل" میں نے کہا۔

اس نے میرا ہاتھ زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیا "ہاتھ چھوڑنے کے لیے نہیں پکڑا ہے میں نے ناصر۔ بتا تو دیا تھا کہ اب موت ہی جدا کرے گی ہمیں۔"

"یہ تم موت کا ذکر کیوں کرتی ہو بار بار" میں نے چڑ کے کہا۔

وہ ہنسنے لگی "کیوں ڈرتے ہو موت سے۔ فکر مت کرو، پہلے میں ہی مروں گی۔"

میرے دل کے اندر کانٹے کی خلش ایک ٹیس بن گئی۔ "یہ تم میری قسمت کا حال بتا رہی ہو، اپنا ہاتھ دکھاؤ۔"

اس نے معمولی سی مزاحمت کی مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے ہتھیلی اپنے سامنے کرلی "یہ دیکھو۔ اتنی پامسٹری مجھے بھی آتی ہے۔ یہ زندگی کی لکیر ہے۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "میں تو مذاق کر رہی تھی۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔"

میں نے کہا "تمہاری زندگی کی لکیر تو بہت چھوٹی ہے۔"

"پھر کیا ہوا" اس نے پھیکی بے جان ہنسی کے ساتھ کہا۔

میں نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا دی "تمہارے مقابلے میں اتنی زندگی کیسے ہوسکتی ہے میری؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں نہیں ہو سکتی؟" وہ نروس ہونے لگی۔

"میں جیوں گا ہی نہیں تمہارے بغیر۔ حالانکہ میری زندگی کی لکیر تو پوری ہتھیلی پار کر گئی ہے۔"

"یہ بہت لمبی عمر کی نشانی ہے۔"

میں نے کہا "ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ یہ فضول باتیں ہیں۔ اچھا ٹھہو' میں تمہارے ہاتھ پر زندگی کی لکیر کو یہاں تک لاتا ہوں' انچ برابر۔"

اس کی مسکراہٹ کافور ہو گئی "تم کیسے لاؤ گے؟"

میں نے میز پر رکھی ہوئی پھلوں کی ٹوکری سے چاقو اٹھایا "تم دیکھو۔"

معلوم نہیں اس وقت مجھے کیا ہو گیا تھا۔ وہ کون سا خیال یا جذبہ تھا جس نے مجھے عقل و ہوش سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ میں نے چاقو کی نوک سے شادو کی ہتھیلی پر لکیر کو کھرچ کے آگے تک بڑھانا شروع کیا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری دیوانگی کا یہ مظاہرہ دیکھتی رہی۔

ہتھیلی کی گلابی جلد پر چاقو کی خراش سے ایک خونی لکیر بننے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ کلائی سے پکڑ کے تھامے رکھا۔ یہ یقیناً ایک انتہائی تکلیف دینے والا عمل تھا مگر شادو کے ہاتھ میں لرزش تک نہیں ہوئی۔ اس کے ہونٹوں سے اذیت کی کراہ تک نہیں نکلی۔ کسی ظروف ساز کی طرح جو چاندی یا پیتل کے برتن میں نقش بناتا ہے یا سنگتراش کی طرح جو پتھر کو تراشتا ہے' میں نے شادو کی ہتھیلی پر ایک لکیر کھود ڈالی۔

اس کی ہتھیلی سے ٹپکنے والا قطرہ قطرہ لہو میرے ہاتھ پر پھیل گیا۔ میں نے ہنس کے کہا "لو اب میری اور تمہاری زندگی کی لکیر برابر ہو گئی۔ اب ہم ایک ساتھ مریں گے پھر کبھی مجھ سے پہلے مرنے کی بات مت کرنا۔"

یہ ماسی ہیر کی چیخ تھی جس نے مجھے دیوانگی سے ہوش کی دنیا میں کھینچ لیا "یہ۔۔۔ یہ کیا ہے۔۔۔ خون' کیا ہوا ہے اسے؟"

میں ایک دم چونکا اور میں نے بے یقینی سے اس چاقو کو دیکھا جو ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ لہو اس کی نوک پر بھی تھا۔ میرے اس ہاتھ پر بھی جس نے شادو کی کلائی تھام رکھی تھی اور اس کے چند قطرے فرش پر بھی گرے تھے۔

"ہائے او میرا رہا" ماسی نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا "یہ تو نے کیا ہے نامراد۔ اس کا ہاتھ کاٹ دیا نامراد۔ پاگل ہو گیا ہے تو۔"

چاقو میرے ہاتھ سے گر گیا "کس کا ہاتھ کاٹ دیا ہے میں نے؟"

ماسی نے مجھے دھکا دیا "چل دور دفع ہو۔ الٹا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔۔۔ لڑکی کو لہولہان کر دیا۔ دماغ چل گیا ہے تیرا۔"

میں نے شادو کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے لیکن وہ پتھر کا بت بنی بیٹھی تھی "اسے کچھ مت کہو ماسی۔"

ماسی نے اسے ایک جھٹکے سے اٹھا لیا "اچھا پھر تو بتا' یہ کیا ہو رہا تھا۔ توبہ توبہ کتنا خون نکل رہا ہے۔ ہاتھ چھیل کے رکھ دیا ظالم نے۔۔۔ چل ہاتھ کرپانی کے نیچے۔۔۔ اُف۔۔۔ میں کیا کروں' ڈاکٹر کو بلاؤں گی تو وہ پوچھے گا کہ یہ کیا ہے۔۔۔ رانجھا بھی چلا گیا۔"

شادو نے آہستہ سے کہا "ابھی ٹھیک ہو جائے گا ماسی۔"

"ہائے زخم ہے' ٹھیک کیسے ہو جائے گا۔ میں پٹی باندھتی ہوں" ماسی بہت گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ تھی۔ وہ بار بار میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتی تھی مگر اسے مجھ سے سوال کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔

آج میں اسے پاگل پن کے دورے کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرے ذہن میں پہلے سے یہ خوف کسی عفریت کی طرح اپنے پنجے گاڑے بیٹھا تھا کہ شادو کی زندگی محدود ہو گئی ہے۔ اسے بلڈ کینسر ہے اور وہ میرا ساتھ چھوڑ جائے گی۔ جب شادو نے پہلے مرنے کی بات کی اور میں نے اس کی اور اپنی زندگی کی لکیر کا موازنہ کیا تو غالباً میرے اعصاب کا دباؤ ناقابلِ برداشت ہو گیا اور وقتی طور پر ایک جنونی کیفیت مجھ پر غالب آ گئی۔

اب میں دہشت زدہ اور شرمندہ بیٹھا تھا۔ میرے پاس اپنے دفاع میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ میں کوئی وجہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا اور میرے پاس کسی بھی سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میرے پاس الفاظ نہیں تھے کہ میں شادو سے معافی مانگوں۔

ماسی ہیر نے پٹی باندھی تو خون رک گیا۔ شادو میرے پاس آ کے بیٹھ گئی "اب کیوں فکرمند ہو۔ میری اور تمہاری زندگی برابر ہو گئی۔"

میں اس کے سامنے رو پڑا "میں پاگل ہو گیا تھا شادو۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔"

"مجھے کوئی شکایت تو نہیں ہے تم سے" اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا "تمہارے اس پاگل پن پر ناز ہے مجھے۔ ہمیشہ تھا۔ ایسا ہی ہے تمہارا عشق۔ اس پر شرمندگی کیسی؟"

"نہیں شادو۔۔۔ یہ عشق نہیں دیوانگی ہے۔ پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے۔" میں اس کی بانہوں میں سمٹا ہوا کسی چھوٹے سے بچے کی طرح روتا رہا "معلوم نہیں مجھے ایسا کیوں لگتا ہے

کہ تم مجھ سے بچھڑ جاؤ گی۔"

"میں نے کہا نا۔۔۔ میں خود کبھی تمہیں چھوڑ کے نہیں جاؤں گی۔" اس نے آہستہ آہستہ میرے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی "اپنی مرضی سے میں جیتے جی تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ میں وعدہ کر چکی ہوں تم سے۔"

اس کے وجود کی مہک اور نرم حرارت کی پناہ نے مجھے سکون دیا "مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم پھر مجھے مل گئی ہو۔ میں نے گنوا دیا تھا تمہیں ایک بار۔ اب ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ خواب آرزو نہ ہو۔"

ابھی کچھ دیر پہلے میں نے شادو کے قریب ہونے کی کوشش کی تھی تو اس نے مجھے دور دھکیل دیا تھا کہ ماسی دیکھ لے گی اور اب ماسی دیکھ رہی تھی مگر وہ مجھے اپنی آغوش میں لیے بیٹھی تھی اور میں اس کے سینے سے لگا جذبات کے ایک بلا تمیز ریلے سے نبرد آزما تھا۔ اس منظر میں کوئی قابلِ اعتراض یا شرم کی بات نہیں تھی۔ نہ میرے لیے نہ شادو کے لیے اور نہ ماسی ہیر کے لیے۔ کیونکہ یہ قربت کے احساس اور اپنائیت کے دکھ کا ردِ عمل تھا جن پر میرے سارے رشتے استوار ہیں۔

پھر ماسی بھی میرے پاس بیٹھ گئی "دیکھ پتر تا میرہ۔ ذرا سنبھال اپنے آپ کو۔ بڑا خوشی کا دن ہے آج۔ اس گھر میں سوہنے رب کی مہربانی سے دلہن آئی ہے۔ تیری دوہنی اور میری نونھ' ہزار لاکھ بار شکر کر اس کا جس نے اپنے حبیب کے صدقے سب کی مرادیں پوری کر دیں۔ چل اٹھ' ہم نے ساتھ جانا ہے۔"

احساسِ جرم و ندامت سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ "کہاں لے جانا چاہتی ہو تم اپنے پاگل بیٹے کو۔"

"ہائے" اس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا "اللہ نہ کرے پاگل ہو میرا سوہنا پتر۔ میں نے تیرے اور شادو کے ساتھ حاضری دینی ہے داتا صاحب کے دربار میں۔ شکرانے کے نفل ادا کرنے ہیں اور چادر چڑھانی ہے۔"

شادو بھیگی ہوئی نظروں کے ساتھ مسکرائی "دعا کرنا ماسی کہ خدا اسے عقل دے۔"

"عقل تو پہلے ہی بہت دی ہے خدا نے۔۔۔ میں نے تو اب کچھ اور ہی مانگنا ہے اپنے رب سے۔" وہ مسکرانے لگی۔

"ہمیں نہیں بتاؤ گی" شادو نے کہا۔

"لے۔ ابھی بتا دوں تجھے" ماسی ہنسنے لگی۔

میں نے کہا "چلو یہ بتا دو کہ اپنے لیے مانگو گی یا رانجھے کے لیے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "اب اپنے لیے اور کیا مانگنا۔ مانگی ہیں میں نے اس گھر کے لیے خوشیاں جس نے باگ (باغ) بگیچہ (باغیچہ) دیا ہے۔ وہ پھل پھول بھی دے۔ گڈے گڑیوں سے میرا ویہڑا (آنگن) بھر دے۔"

ماسی کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئی تھیں اور اس کے ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے شادو کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر حیا کی شفق پھیلی اور اس کی مسکراہٹ میں ارمانوں کی سنہری کرنیں اتر آئیں۔ پھر جیسے سورج افق سے نیچے اتر گیا اور اس کی روشنی پر تاریکی غالب آ گئی۔

شادو کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اس کی مسکراہٹ بے جان ہو گئی۔ اس کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں پھر ماسی نے منہ پر ہاتھ پھیر کے کہا "آمین!" اور کھڑی ہو گئی "چل کڑیے۔ تیار ہو جا اور تو بھی اٹھ کے منہ دھو لے۔ بوتھا بنا رکھا ہے نوچار کا۔ ایسی شکل ہوتی ہے کوئی دولھے کی۔ ہائے کیسا سوہنا گبھرو جوان لگ رہا تھا رانجھا۔ جب میں نے اسے صبح دیکھا۔ چوری چوری۔۔۔ ایسا خوشی کا نور تھا اس کی صورت پر کہ میرے دل میں اجالا ہو گیا اور میں نے دل میں کہا کہ رہا' میرے رانجھے کو کسی کی نظر نہ لگے۔"

ماسی کی باتوں پر مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ وہ اپنی شبِ عروسی کی صبح کی یادوں میں کھو گئی تھی۔ "اور تم دلہن بن کے کیسی لگ رہی تھیں؟"

وہ جھینپ کے ہنسی "یہ پوچھنا رانجھے سے۔"

میں نے کہا "ماسی' کیا اس وقت بھی وہ رانجھا ہی تھا۔"

ماسی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اس وقت وہ راجا نذیر تھا۔ سب راجا راجا کہتے تھے۔"

"راجا سے رانجھا کیسے ہو گیا؟"

ماسی کے چہرے پر یادوں کے اُجالے پھیل گئے۔ "بس۔۔۔ شادی کے بعد جھلا خود ہی ہر جگہ کہنے لگا کہ میں راجا نہیں رانجھا ہوں اور وہ ہیر ہے۔ نام تو میرا کچھ اور تھا۔ حور بانو' وہ راجا سے رانجھا ہو گیا' میں حور سے ہیر ہو گئی۔ خود اس نے مشہور کیا' پہلے لوگ ہنستے تھے پھر مذاق میں کہنے لگے۔ آہستہ آہستہ یہی نام ہو گیا۔ وہ تھا بھی پاگل۔ فلمیں دیکھ کے آتا تھا اور میرے سامنے ویسی باتیں کرتا تھا۔ میں کہتی تھی' کچھ شرم و حیا کر لیکن وہ سب کے سامنے۔۔۔ اب میں کیا بتاؤں۔۔۔ تمیں سال ہو گئے۔"

میں اور شادو اسے حیرانی سے دیکھتے رہے۔ آج تمیں سال گزر جانے کے بعد بھی وہ ہیر رانجھا تھے۔ خوش تھے اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سن تھے۔ خدا نے انہیں اولاد نہیں دی تھی اور دیکھا
ئے تو دنیاوی مال و متاع سے حاصل ہونے والی آسائشوں
ے بھی وہ محروم رہے تھے مگر ان کے پاس محبت اور رفاقت
ے خلوص کی دولت تھی اور اطمینانِ قلب تھا اور پُرسکون
عت تھی۔

ہم داتا صاحب کے دربار گئے اور وہاں ہم سب نے اپنی
نی مرادیں پوری ہونے کے لیے خدا سے دعا کی۔ ماسی ہیر
نے ہم سے کچھ چھپایا نہیں تھا۔ وہ سادہ دل عورت کسی سے
ی دل کی بات چھپانا نہیں جانتی تھی۔ اس نے خدا سے وہی
نگا ہوگا جو اس کے دل میں تھا۔ میں نے خدا سے شادو کی
فاقت مانگی۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اس کا ساتھ
نگا۔

کیا یہ منافقت نہیں تھی؟ میں نے بعد میں سوچا۔
واسطہ طور پر میں نے خدا سے کہا کہ اس خبر کو جھوٹا کردے
کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔ جس کی تصدیق کرنے کا حوصلہ مجھ میں
میں ہے۔ دونوں ہاتھ اٹھائے شادو نے کیا دعا مانگی' معلوم
میں کیوں میں اس سے یہ بات پوچھتے ہوئے ڈرتا رہا۔ میں
خوف کے بے بس کردینے والے جال کا اسیر تھا۔ میں سوال
سے ڈرتا تھا اور جواب سے ڈرتا تھا اور اپنی سوچوں سے ڈرتا
تھا اور شترمرغ کی طرح ریت میں سر دھنسائے رہنا چاہتا تھا
تاکہ خطرے کا احساس نہ رہے جبکہ خطرہ اپنا اٹل وجود رکھتا
تھا۔

وہاں میرے جیسے اور بھی بہت ہوں گے جو یہ جانتے اور
سمجھتے ہوئے بھی کہ ایسا ناممکن ہے' خدا سے خواہاں ہوں گے
کہ ایسا ممکن ہوجائے جیسے تختۂ دار پر کھڑا ہوا شخص دعا مانگے
کہ اے خدا' تیری قدرت میں سب کچھ ہے۔ ایسا ہو کہ
میرے گلے میں رسّا ڈالنے کے سر پر سیاہ کٹوپ چڑھانے والا
جلاد اور وہاں موجود ہر شخص جو مجھے مار دینے پر مامور ہے'
اچانک خود مرجائے اور جب میں گلے سے پھندا نکال کے
بھاگ جانا چاہوں تو ربر زنداں تک کسی کو بھی نظر نہ آؤں۔

شادو نے میرے قریب آکے مجھے کہنی ماری "اور کتنی
دعائیں باقی رہ گئی ہیں؟"

میں نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا "میں نے تو بس
ایک ہی دعا مانگی ہے۔"

"میں نے بھی" وہ بولی "چلو آؤ' اب ہم مل کے ایک دعا
کریں۔"

میں نے کہا "مل کے؟"

"ہاں۔ جب ہم ایک ہیں تو کیا ایک دعا نہیں ہوسکتی
ہماری؟"

"اچھا دعا تم مانگو۔ میں تمہارے ساتھ اپنے ہاتھ اٹھاتا
ہوں۔"

"ایسے نہیں" وہ بولی "میں بولتی ہوں' تم میرے ساتھ
بولو۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں سب ذہنی استغراق اور
روحانی یکسوئی کے ساتھ اپنی عقیدت مندی کے اظہار میں
مگن تھے اور کسی کو کسی کی خبر نہ تھی اور کوئی کسی کی طرف
نہیں دیکھ رہا تھا اور کسی کا دھیان اپنی حاجت مندی کے سوا
کہیں نہ تھا۔

شادو نے کہا "بولو۔ اے خدائے رحیم و کریم' زور سے
بولو۔"

میں نے کہا "اے خدائے رحیم و کریم!"

"ہماری نقطۂ یہی التجا اور دعا ہے۔"

"ہماری بس یہی التجا اور دعا ہے" میں نے دہرایا۔

"کہ ہم تیری عطا کی ہوئی عمر کی مہلت کا ہر لمحہ ایک
ساتھ گزاریں۔"

میں نے یہ بھی دُہرادیا۔

"اور ہم میں سے ہر ایک زندگی کی آخری سانس تک
دوسرے کے ساتھ ہو۔"

میں نے اس کے الفاظ اپنی زبان سے ادا کرنے کے بعد
کہا "آمین" کیونکہ میرا خیال تھا کہ دعا تمام ہوئی۔

مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں "اور اگر ہم میں سے
ایک نہ رہے۔"

میرا اندیشہ ایک حقیقت بن کے سامنے آنے لگا۔ اس
نے مجھے کہنی ماری۔ میں نے مجبوراً کہا "اور اگر ہم میں سے
ایک نہ رہے۔"

"تو اپنے انبیا اور اولیا کے صدقے میں۔" وہ بولی۔

میں نے کہا "اپنے انبیا اور اولیا کے صدقے میں۔"

"دوسرے کو ہمت اور توفیق دے۔" اس نے میری
طرف دیکھا۔

"دوسرے کو ہمت اور توفیق عطا کر۔"

اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا "کہ وہ جدائی کے
صدمے کو برداشت کرسکے اور خوش و خرم زندگی کے باقی دن
پورے کرے۔"

میرے لیے ممکن نہ تھا کہ اس کی دعا کے الفاظ سے
مفہوم الگ کروں یا الفاظ کے انتخاب پر اعتراض اور احتجاج
کروں۔ اس میں ایسی کوئی بات بھی نہیں تھی۔

شادو بولتی گئی "اور داتا صاحبؒ کے دربار میں۔ ہم میں
ہر ایک کا یہ عہد ہے۔ کہ ہم صدقِ دل سے کوشش کریں
گے۔"

میں نے کہا "کس چیز کے لیے؟"

اس نے مجھے گھور کے کہا "بھئی ہنسی خوشی جینے کے لیے
اور کس کے لیے۔ چلو بولو!"

میں نے سرہلا کے وہی کہہ دیا جو شادو چاہتی تھی۔

"اب کلمہ پڑھ کے آمین کہو" وہ بولی "میرے ساتھ۔"

میں نے کلمہ پڑھا اور آمین کہہ کے منہ پر ہاتھ پھیرلیا۔
شادو انتہائی سنجیدہ تھی اور اس کی آنکھوں میں یقین اور
اطمینان کی روشنی تھی اور چہرے پر سکون تھا۔

"نئی شادی ہوئی ہے تمہاری؟" میرے پیچھے سے کسی
نے کہا۔

شادو کے ساتھ میں نے بھی چونک کے پیچھے دیکھا۔ وہ
ساٹھ ستر سال کا کوئی بوڑھا آدمی تھا جس کے سر اور داڑھی
کے سارے بال سفید ہوگئے تھے لیکن وہ بالکل سیدھا
نوجوانوں جیسے اعتماد کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ
سفید شلوار قمیص اور سفید چادر میں جو عورت کھڑی تھی' وہ
اس کی بیوی بھی ہوسکتی تھی' اس کی عمر بھی اتنی ہی یا کچھ کم
ہوگی۔ وہ دونوں بھاری بھرکم تھے اور نہ بہت دبلے پتلے۔
انہوں نے نظر کی عینک بھی نہیں لگا رکھی تھی اور ان کی
صورتوں پر سکون اور طمانیتِ قلب کا وہ اجالا تھا جس میں ان
کی گزری ہوئی زندگی کا عکس دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ زندگی جس
نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ ان کی ہر خواہش کو پورا کیا تھا
اور ہر جدوجہد کو کامیاب کیا تھا اور انہوں نے بھی قناعت
پسندی کے ساتھ ان خوشیوں اور کامیابیوں پر خدا کا شکر ادا
کرنا ضروری سمجھا تھا۔ زیادہ بڑی خوشی اور زیادہ بڑی کامیابی
کے لیے دامن پھیلائے رکھتے تو اس عمر میں بھی بے سکونی ان
کا مقدر ہوتی۔

وہ خوش تھے کیونکہ انہیں خوش رہنے کا ہنر اور سلیقہ آتا
تھا۔ وہ اپنے آپ سے ایک دوسرے سے اپنے گھر سے اور
دنیا سے خوش تھے۔

عورت نے کہا "اس میں پوچھنے والی کون سی بات ہے۔
نظر آرہا ہے۔"

میں نے کہا "ٹھیک سمجھا آپ نے۔"

شادو بولی "کل ہوئی ہے ہماری شادی۔"

"اچھا؟" بوڑھا مسکرایا "میں نے تو تمہاری دعا سے
اندازہ کیا۔"

"تم اپنی دعا مانگ رہے تھے یا ان کی دعا سن رہے تھے۔
چھپ چھپ کے دوسروں کی باتیں سنتے ہو؟"

بوڑھا ہنسا "نیک بخت۔ اپنی ساری دعائیں تو رب نے
سن لیں۔ اب مانگنے کو کیا رہ گیا ہے۔ بس ہر بار ایک ہی جملے
میں ساری بات کہہ دیتا ہوں کہ رب جی' ہماری طرح ہمارے
بچوں سے بھی راضی رہنا۔ اور بس۔۔۔ چھپ کے سننے والی
بات ہوتی تو یہ سب کے بیچ میں کھڑے ہوکے اتنی اونچی آواز
میں نہ کہتے۔"

میں نے کہا "کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

بڑے میاں نے اپنی شریکِ حیات کی طرف دیکھا
"بس۔ اتنے کہ صحیح تعداد یاد نہیں رہتی۔"

"چلو ہٹو' خیر سے چودہ ہوئے۔ سات لڑکیاں سات
لڑکے۔" وہ کچھ شرما کے بولی۔

"ماشاء اللہ" میں نے کہا۔ ہم سب دروازے کی طرف
چلنے لگے۔

"شادی کردی سب کی۔ اللہ کی رضا سے سب راضی
خوشی ہیں" بڑے میاں بولے۔

"اب تو ان کے بھی بچے ہوں گے؟" شادو کے لہجے میں
حسرت سی اتر آئی۔

"پوتے اور پوتیاں' نواسے نواسیاں۔ پورا لشکر ہے
اپنے گھر کا۔ ابھی ہم اشارہ کردیں تو کشمیر فتح کرلیں۔"

"سب آپ کے ساتھ رہتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تو شاہی قلعہ بھی کم پڑجاتا۔ خیر سے اپنے
اپنے گھر میں ہیں سب لڑکیاں۔" بڑے میاں نے کہا "بیٹے
اور بہوئیں ساتھ ہیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ پہلے
ساتھ والا ایک گھر مل گیا۔ ہم نے دیوار گرا کے ایک کرلیا پھر
دوسرے پڑوسی نے گلبرگ میں کوٹھی بنالی۔ اس کا گھر بھی
لے لیا ہم نے' بہت جگہ ہوگئی۔"

"ویسے بھی پتر' جگہ ہوتی ہے دل میں۔ ورنہ کوٹھیاں اور
مربعے بھی کم پڑجاتے ہیں" بڑی بی نے کہا۔

"گھر میں تو بڑی رونق رہتی ہوگی" میں نے پیچھے مڑ کے
دیکھا لیکن ماسی ہیر مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

"جس دن سب اکٹھے ہوتے ہیں' جمعے والے دن لڑکیاں
بھی آجاتی ہیں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ' تو لگتا ہے
گھر میں برات اتری ہے" بڑے میاں نے مسرت اور فخر کے
ساتھ کہا "ابھی سب ملا کے ساٹھ ہوتے ہیں' اکسٹھ ہونے
والے ہیں۔"

"بہت خوش قسمت ہیں آپ۔ خدا نے آپ کو اولاد کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشیوں کا اتنا بڑا خزانہ دیا" شادو بولی۔

"سب میرے مولا کا کرم ہے" بڑے میاں نے اوپر انگلی اٹھائی "ورنہ یہ بجلی شروع شروع میں ایسی ہی باتیں کرتی تھی۔"

"کیسی باتیں؟" میں نے کہا۔

"جیسی۔۔۔ ابھی تم کر رہے تھے" انہوں نے جواب دیا "یہ کہتی تھی کہ پہلے میں مرجاؤں اللہ کرے۔ مجھ سے پوچھتی تھی کہ میرے بعد تم کیا کرو گے۔۔۔ دوسری کرلو گے؟ اور میں کہتا تھا قبر کی مٹی خشک ہوتے ہی۔ اور اس کے لیے پنکھا لے کر بیٹھ جاؤں گا قبر پر ہوا کرنے۔"

میں نے ہنس کے کہا "ایسا سوال آپ نے کبھی نہیں کیا ان سے؟"

"کیوں نہیں کیا مگر یہ ہمیشہ جواب میں جھوٹ بولتی تھی۔" وہ ہنسے۔

"کوئی جھوٹ نہیں بولتی تھی میں" بڑی بی نے چمک کے کہا۔

"کہتی تھی کہ تمہارے بغیر میں تو نہیں جیوں گی' میں بھی مرجاؤں گی۔"

"آزما لیتے اگر یقین نہیں تھا" بڑی بی نے مسکرا کے کہا۔

وہ ہنس پڑے "ہے نا پاگل۔ اسے آزمانے کے لیے میں مرجاتا۔ دیکھ لو' آج پورے پچاس سال ہوگئے' آدھی صدی گزر گئی ساتھ نہ اس نے چھوڑا نہ میں نے۔"

"دوسری کی حسرت دل میں ہی رہ گئی" بڑی بی نے کہا۔

بڑے میاں نے ایک آہ بھری "دوسری کیا نیک بختے' تین کی حسرت دل میں آج بھی ہے مگر تیرے جیسی دوسری ملی ہی نہیں کہیں۔ دیکھا تو بہت اِدھر اُدھر لیکن بندے کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی' کیوں بھئی؟"

"کچھ شرم کرو۔ کیا عمر آگئی ہے' ان بچوں کے سامنے ایسی باتیں کرنا اچھا لگتا ہے؟" بڑی بی نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"ارے عمر کیا ہے۔۔۔ دل جوان ہونا چاہیے بندے کا۔ ابھی تو میں جوان ہوں" بڑے میاں بولے "تو خود ہی ہمت ہار گئی تھی ورنہ چودہ اور ہو جاتے۔"

"اب چلو یہاں سے" بڑی بی کا چہرہ لال ہونے لگا۔

"ہاں بھئی چلتے ہیں۔ تم کیوں کھڑے ہو؟" انہوں نے کہا۔

میں نے اندر ہجوم میں ماسی کو تلاش کیا "دراصل۔۔۔ ماسی ہیر بھی ہمارے ساتھ تھی۔"

"ماسی ہیر؟"

"ہاں۔ اس کا شوہر ہے ڈاکٹر رانجھا۔ سچ مچ کے ہیر رانجھا ہیں دونوں حالانکہ عمر آپ سے کچھ ہی کم ہوگی" میں نے کہا۔

"بات وہی ہے' دل جوان رہے تو سب ہیر رانجھے۔"

شادو نے حسرت آمیز دکھ کے ساتھ کہا "کاش ایسا ہی ہمارا نصیب بھی ہوتا۔ آج سے پچاس سال بعد ہم بھی آپ کی طرح نظر آتے یا ہیر رانجھے کی طرح۔ اتنی لمبی زندگی ہم بھی ساتھ گزارتے۔"

بڑے میاں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا "دل سے خوف نکال دے پتر۔ خوف کی جگہ امید رکھ۔ مایوسی گناہ ہے۔"

بڑی بی نے سر ہلایا "اچھا' رب راکھا۔"

میں انہیں سیڑھیاں اتر کے گلی کے ہجوم میں غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ بلاشبہ ان کی خوش قسمتی قابلِ رشک تھی۔ وہ ستر سال کی عمر میں جوان تھے کیونکہ ان کے جذبے جوان تھے' امیدیں اور حوصلے جوان تھے۔

مجھے شادو پر سخت غصہ آیا "یہ کیسی باتیں کرتی ہو تم؟"

وہ ڈر گئی "ایسا کیا کہہ دیا میں نے؟"

"جو دعا مانگی تم نے میرے ساتھ مل کے۔ کیا وہ کافی نہیں تھی۔ تمہیں بھروسا نہیں ہے اپنی دعا پر بھی؟"

"بھروسا کیوں نہیں۔۔۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"پھر کیوں کرتی ہو ہر وقت مرنے کی باتیں۔ تم تو نفسیاتی مریض ہوگئی ہو شادو جی۔ ایک ہاشمی صاحب کیا مرگئے تم سمجھتی ہو میں بھی ایسے ہی مرجاؤں گا؟ وہ تو تھے بوڑھے اور دل کے مریض۔"

"میں نے کبھی تمہارے بارے میں ایسا نہیں سوچا" وہ روہانسی ہوگئی۔

"اپنے بارے میں بھی کیوں سوچتی ہو؟ کیا ہوا ہے تمہیں؟" میں نے کہا۔

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا؟"

میں نے کہا "اگر کچھ ہے تو بتادو۔ کیا تم۔۔۔ خدانخواستہ بیمار ہو' کیا تمہارا چیک اپ کرائوں میں؟"

اس نے بڑی ہوشیاری سے اپنے جذبات کے ردِعمل کو چھپالیا اور ہنسنے لگی "چیک اپ بھی کرالینا وقت آنے پر۔ ابھی تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس اب غصہ تھوک دو۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔"

اس کے رویے اور اس کی باتوں سے آہستہ آہستہ میرا

شک پھر سانپ کی طرح پھن اٹھائے کھڑا ہو رہا تھا اور اپنی پُراجل پھنکار سے مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید خوش فہمی کے حصار میں رہنا خود فریبی ہے اور میں اندر سے ڈرا ہوا ہوں۔ اگر مجھ میں سچ کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہوتی تو اب تک میں ضرور نیلم سے مل کے معلوم کرچکا ہوتا کہ جو بات اس نے مجھے فون پر نہیں بتائی تھی وہ کیا تھی۔

میں نے شادو کا زخمی ہاتھ پکڑ لیا جس پر ماسی ہیر نے اپنا کورا دوپٹہ پھاڑ کے پٹی باندھی تھی۔ اس پر خون کا ایک ننھا سا داغ نمودار ہوگیا تھا "اس ہاتھ سے میرے منہ پر طمانچہ مارو شادو جی۔"

اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا "تمہارے دماغ کا معائنہ پہلے کرانا پڑے گا مجھے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ میرا دماغ واقعی خراب ہے۔"

"شروع سے خراب ہے۔"

میں نے کہا "تم کہہ سکتی ہو کہ بہت ناقص معیار کا اور حد سے زیادہ ناقابلِ اعتبار دماغ ہے۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے پیچ ڈھیلے ہیں۔ کبھی ایک وجہ ہوتی ہے خرابی کی دوسری۔۔۔"

وہ بولی "میں درست کردوں گی تمہارا دماغ۔ سارے پیچ ٹائٹ کردوں گی۔"

"ایک پاگل دوسرے پاگل کا کیا علاج کرسکتا ہے۔ مزید خرابی ہی ہوگی مگر تم کوشش کرکے دیکھ لو۔ بقول قلمی شاعر۔ تمہی نے درد دیا ہے تمہی دوا دینا۔"

"یہ ماسی ہیر کہاں رہ گئی آخر۔۔۔؟"

میں نے کہا "اسے چادر چڑھانے کے بعد شکرانے کے نفل ادا کرنے تھے اور کیا پتا اب تک وہ سجدے میں ہو۔"

"اسے دیگ بھی تقسیم کرنی ہے ابھی" شادو نے کہا۔

ماسی چند منٹ کے بعد نمودار ہوئی تو ہم پر خفا ہونے لگی "تو تم یہاں کھڑے ہو' میں اندر بھلی ہو رہی تھی کہ دونوں کہاں غائب ہوگئے۔"

"ہم نے بھی بہت تلاش کیا تمہیں پھر یہاں آگئے' آتا تمہیں بھی ادھر ہی تھا" میں نے وضاحت کی۔

ماسی نے ایک اور دیگ وہاں رکھوا دی جہاں پہلے ہی پلاؤ زردے کی دیگیں لیے لوگ منتظر تھے کہ کوئی کھانے والا آئے۔ لوگ ہر طرف اور ہر جگہ اپنا پیٹ بھر رہے تھے مگر کوئی بھی دیگ خالی نہیں تھی۔ ایک دیگ خالی ہونے سے پہلے دوسری پہنچ جاتی تھی۔ یہ داتا کی دین تھی۔ ان کے نام کا بابرکت صدقہ تھا۔ دن رات کے چوبیس گھنٹے لنگر جاری تھا۔ داتا کی نگری میں کوئی بھوکا سونے والا نہیں تھا۔

واپس گھر پہنچنے تک شادو کی حالت ٹھیک تھی مگر وہ زینہ چڑھ کے اوپر گئی تو اچانک اس کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے سہارے کے لیے اپنے ہاتھ پھیلائے اور پھر اس سے پہلے کہ میں اسے سنبھالتا' وہ سہارے سے محروم ہوجانے والی بیل کی طرح فرش پر گر کے ڈھیر ہوگئی۔

میں نے چلا کے کہا "شادو جی!" اور اسے فرش سے پھولوں کی ٹوکری کی طرح اٹھا کے بیڈ پر ڈال دیا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے بہت ہلکی لگی۔

"ناصر۔۔۔ کیا ہوگیا ہے اسے؟" حواس باختہ ماسی نے میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھمادیا۔

اسی وقت شادو نے آنکھیں کھول دیں اور چند سیکنڈ مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو پھر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "مجھے۔۔۔ چکر آگیا تھا" وہ اٹھ بیٹھی۔

"چل پتر پانی پی" ماسی نے کہا اور گلاس اس کے ہونٹوں سے لگادیا۔

"میں ڈاکٹر کو لاتا ہوں" میں نے کہا۔

شادو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "کوئی ضرورت نہیں۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ آنے جانے میں کچھ تھکن ہوگئی تھی۔"

"چل اچھا۔ میں گرم دودھ لاتی ہوں۔ پی کے سوجا" ماسی نے حکم دیا۔

ماسی نے اسے زبردستی ایک ایسا ٹانک پلایا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ تھا کہ مردہ پی لے تو ڈکار لے کر کھڑا ہوجائے۔ اس نے ابلتے دودھ میں ملائی کے ساتھ بادام گھوٹ کے ڈالے تھے۔ پھر ایک انڈا پھینٹ کے ملایا تھا اور اوپر سے دیسی گھی کا تڑکا لگادیا تھا۔ شادو کی ایک نہیں چلی اور ماسی نے وہ کٹورا اس کے حلق سے اُتار کے دم لیا۔

"انکار اور ضد کا علاج بھی ہے کاکا میرے پاس" اس نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

"کیا علاج ہے۔ میں تو ہرگز نہ پیوں یہ جان لیوا مکسچر۔ مجھے اپنی جان پیاری ہے" میں نے کہا۔

ماسی نے چولہے میں پھونک مارنے والا آلہ لہرایا "یہ دیکھی ہے نا۔ ایسی ہی چیز ہوتی ہے جس سے گائے بھینس کو تیل پلاتے ہیں۔"

میں نے کہا "رانجھا تمہیں کون سا تیل پلاتا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے پھونکنی میرے رسید کی "مجھے بھینس کہہ رہا ہے کھوتے۔"

میں نے بلبلا کے کہا "ہائے ہائے۔ اپنے بیٹے کو مار رہی ہو بہو کے سامنے۔"

"چل اٹھ۔ شور مت کر یہاں۔ اسے سونے دے" ماسی نے کہا۔

"ایک اچھی ساس کی طرح تم پر لازم ہے کہ بہو کو ہاتھ پکڑ کے اٹھاؤ کہ چل جنت مکر ہوگیا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

شاذو نے میرا ہاتھ پکڑلیا "نہیں۔ تم میرے پاس بیٹھو۔ ابھی مجھے نیند نہیں آرہی ہے" شاذو نے کہا۔

"اچھا پھر میں کھانے کا کہتی ہوں۔ تم باتیں کرو' رانجھا بھی آج جلدی آنے کا کہہ گیا ہے لیکن وہ تیرا جوڑی دار کہاں غائب ہے؟ رئیس خبیث!" ماسی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"وہ تو فوت ہوگیا کل رات کو سالا" رئیس نے اچانک نمودار ہو کے پیچھے سے ماسی کے کان میں کہا۔

ماسی نے ایک چیخ ماری اور پھر پلٹ کے رئیس کو کوسنے لگی "حرامی نہ ہو تو۔ میرا دل کیسے دھک دھک کر رہا ہے۔"

"ماسی دل دھک دھک نہیں کرے گا تو کیا بک بک کرے گا؟" رئیس کی بغل میں ایک لفافہ تھا "اور تمہارا دل ہے کہاں۔۔۔ وہ تو تم نے جوانی میں ہی دے دیا تھا اس بے دال کے بودم کو۔"

ماسی جاتے جاتے رک گئی "کیا۔ کیا کہا تو نے؟"

"بے دال کا بودم۔ تمہارا ڈاکٹر رانجھا" رئیس پھسکڑا مار کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"بھرا اس کا مطلب کیا ہوا؟"

میں نے کہا "بے دال کا بودم۔ یعنی بوم۔"

ماسی نے جھلا کے کہا "بوم کیا ہوتا ہے؟ تو بتا شاذو؟"

شاذو ہنسنے لگی "بوم تو فارسی میں کہتے ہیں۔۔۔ الو کو۔"

رئیس اٹھ کے ماسی سے دور جا کھڑا ہوا "دیکھو ماسی۔ قسم اللہ کی' مجھے کیا پتا فارسی کا۔ مجھے ناصر نے بتایا تھا۔ کوئی جگہ ہے ٹانگانیکا۔۔۔ وہاں مرد عورت سب ٹانگوں پر پھرتے ہیں۔"

"اور یہاں کیا پیٹے لگے ہوتے ہیں ٹانگوں کی جگہ" میں نے کہا "خواہ مخواہ میرا نام مت لے۔"

"بے حیا۔ تیرے باپ کی جگہ ہے وہ۔" ماسی نے کونے میں رکھی ہوئی پرانی چھڑی اٹھالی۔

رئیس نے فوراً لفافہ اس کے سامنے کردیا۔ "بالکل ہے۔ اسی لیے تو آج میں ایک تحفہ لایا ہوں اس کے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔"

ماسی نے خوش ہو کے چھڑی پھر کونے میں رکھ دی۔ "رانجھے کے لیے کیا لایا ہے؟"

"دیکھ لو خود ہی نکال کے۔ تم بھی کیا یاد کروگی کہ کس کیس سے پالا پڑا تھا۔"

ماسی نے بڑے اشتیاق کے ساتھ لفافہ کھولا۔ اس میں سے دو پرانے پھٹے ہوئے جوتے برآمد ہوئے۔ ایک مردانہ اور ایک زنانہ۔ دونوں اس نے کہیں کوڑے میں پڑے دیکھے ہوں گے۔ انہیں وہ بڑے اہتمام سے پیک کرکے لایا تھا۔ رئیس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ماسی اسے چھڑی سے مارنے دوڑی۔

رئیس فوراً بیڈ کے نیچے گھس کے قہقہے لگانے لگا۔ ماسی نے پہلے اسے چھڑی کی نوک سے مارنے کی کوشش کی مگر اس نے چھڑی پکڑلی تو ماسی نے باری باری دونوں جوتے اسے کھینچ مارے۔ وہ چادر کا کونا اٹھا کے نیچے دیکھ رہی تھی اور رئیس کو گالیاں دے رہی تھی۔ رئیس آخری کنارے پر دیوار کے ساتھ لگا ہوا بالکل محفوظ تھا لیکن وہ بلبلاتا رہا "اوہ۔ ہائے۔۔۔ کیا نشانہ ہے قسم اللہ کی۔ ناک ٹوٹ کے نیچے گر گئی۔ آہ' ماسی یہ دل پر چوٹ لگی ہے۔ دل تو ڑدیا ظالم" پھر وہ نیچے لیٹا گانے لگا۔ ہم جی کے کیا کریں گے' جب دل ہی ٹوٹ گیا۔"

ماسی نے تھک ہار کے کہا "باہر آئے گا نا' پھر بتاؤں گی۔ دل نہیں سر بھی توڑوں گی تیرا۔"

شاذو بہت ہنسی۔ اسے ہنستا دیکھ کے مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ پہلے ہنستی تھی تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے تھے مگر اب اس کے رخساروں پر گوشت ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے اچانک اندازہ ہوا کہ اس کا چہرہ کتنا کمزور ہوگیا ہے۔ خوف کا اژدھا پھر پھنکارنے لگا۔ شاذو کو بلڈ کینسر ہے۔ یہ جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی اتنا بڑا جھوٹ کیسے لکھ سکتا ہے۔ یہ مذاق بھی نہیں ہوسکتا۔

شاذو نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں چونکا۔ میرے خیالات کی رو کے ساتھ وقت بھی آگے نکل گیا تھا۔ ماسی ہیرا اب کچن میں تھی اور رئیس بیڈ کے نیچے سے نکل آیا تھا۔

"تم بہت کمزور ہوگئی ہو شاذو جی" میں نے کہا۔

"ابے ہاں یار۔ اپن کو ایسا ہی لگا تھا لیکن اب ٹھیک ہوجائے گی" رئیس بولا۔

"نہیں۔ میں اسے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں گا" میں نے کہا۔

"ڈاکٹر تو سب ہی اچھے ہیں" رئیس بولا "اور ڈاکٹر یاد آیا کہ وہ جو تیرے ڈاکٹر مشہود صاحب تھے نا؟"

"تجھے کا کیا مطلب؟"

"ابے وہ کل نظر آئے تھے مجھے' بیگم صاحبہ کے ساتھ۔"

میں نے کہا "پھر میں کیا کروں؟"

"یار' تجھ سے جھوٹ بولا تھا انہوں نے' وہ کہیں بھی نہیں گئے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ بس وہ شادی میں آنا نہیں چاہتے تھے' بہانہ کردیا۔"

"وہ بہت ناپسند کرتے ہیں مجھے" شاذو نے کہا "اس شادی سے بہت ناخوش ہیں وہ۔"

"ان سے زیادہ دکھ تو بیگم صاحبہ کو ہے۔" رئیس بولتا گیا "مجھے دیکھ کے گاڑی روک لی۔ ڈاکٹر صاحب نے تو اتنا ہی کہا کہ بے وقوف ہے تمہارا دوست۔ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے اس نے۔"

میرا چہرہ گرم ہونے لگا "تو سنتا رہا ان کی بکواس؟"

"نہیں۔ میں نے کہا کہ آپ فکر مت کریں جی۔ وہ بہت خوش ہے۔ اس پر بیگم صاحبہ نے کہا کہ چند دن کی ہے یہ خوشی۔ دیکھ لینا کچھ دن بعد روتا نظر آئے گا اور ڈاکٹر صاحب اوپر نیچے سر ہلاتے رہے۔ میں نے کہا کہ جناب آپ کیوں کرتی ہیں ایسی بات۔ کیوں اس کا برا چاہتی ہیں۔ آپ کی اتنی عزت کرتا ہے وہ۔ آپ کو اپنا محسن سمجھتا ہے وہ۔ آپ ہیں کہ اسے بددعائیں دے رہی ہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بگڑ گئے کہ بھاڑ میں گئے محسن۔ ہم اس کے کچھ بھی نہیں ہیں اور یہ بددعا نہیں ہے' حقیقت ہے۔ کبھی آنا میرے پاس کلینک میں تو میں بتاؤں گا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "یار' کبھی کیا' ہم ابھی جا کے پوچھ لیتے ہیں۔"

شاذو کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ "بیٹھ جاؤ۔ کہیں نہیں جانا تمہیں۔ اب کیا ایسی فضول باتوں پر لڑتے پھروگے لوگوں سے۔ باتیں کرنے والے تو باتیں کرتے ہی رہیں گے۔"

لیکن میرے نزدیک یہ بات اتنی فضول نہیں تھی۔ اس نے مجھ پر حقیقت کے وہ دریچے وا کردیے تھے جو ابھی تک میری نگاہ سے اوجھل تھے۔ اچانک مجھ پر بہت سے بھید کھل گئے تھے اور انکشاف کی اس روشنی میں مجھے وہ چہرہ صاف نظر آنے لگا تھا جو ایک حاسد اور بدخواہ کا چہرہ تھا۔ جسے میری خوشی نے اذیت دی تھی اور میری پسند نے احساس کمتری کی ذلت میں مبتلا کردیا تھا۔

جو مسئلہ میرے ذہن میں تھا' وہ لاشعور میں پہنچ گیا تھا جہاں قدرت کا نصب کردہ خودکار کمپیوٹر اس کو حل کرنے میں ہمہ وقت مصروف تھا۔ ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ روز مرہ مشاہدے کی بات ہے۔ اس وقت جب آپ کسی کا نام' کوئی شعر' کسی لفظ کے معانی یا اس کا انگریزی متبادل' کی بھولی بسری بات یاد کرتے ہیں تو بہت سوچنے پر بھی ذہن میں کچھ نہیں آتا مگر بعد میں جب آپ کچھ اور کر رہے ہوتے ہیں اور آپ کا دماغ کسی اور کام میں مصروف ہوتا ہے تو لاشعور کسی وجہ کے بغیر اچانک وہ بات یاد دلا دیتا ہے۔

کسی شک وشبے کے بغیر میں نے سمجھ لیا کہ ایک سطر کی وہ تحریر بیگم صاحبہ کے سوا کوئی اور مجھ تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ کسی اور کے پاس ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس رات جب شاذو سوگئی تو میں سوچتا رہا اور جاگتا رہا۔

ڈاکٹر نوید یا ڈاکٹر مشہود کو مجھے یہ بات بتانا مقصود ہوتی تو اس کے لیے وہ اتنا پُراسرار' سفاک اور مجرمانہ طریقہ اختیار نہ کرتے۔ وہ ایک سطر کا پیغام ٹائپ کرکے خاموشی سے میری جیب میں نہ ڈالتے۔ اگر وہ اس فیصلے پر پہنچ جاتے کہ مجھے حقیقت سے آگاہ کرنا بالکل ناگزیر ہوچکا ہے تو وہ کسی بھی وقت کہیں بھی مجھے بٹھا کے اعتماد اور ہمدردانہ رازداری سے یہ بات خود کہتے۔

جیسے حساب کے کسی مشکل سوال کا جواب پوری تفصیل کے ساتھ پرنٹ ہو کے سامنے آجائے۔ ایسے ہی میں اپنی الجھن کا حل واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔ یہ بالکل دو جمع دو چار منفی چار مساوی ہے صفر والی بات تھی۔ اس کے لیے مجھے کسی سے تصدیق کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرے مفروضات نے ثبوت تلاش کرلیے تھے اور میں نے انہیں تسلیم کرلیا تھا۔

طے شدہ طور پر شاذو کی اس جان لیوا بیماری کا علم سب سے پہلے ڈاکٹر نوید یا ان کی بیوی انجم کو اس وقت ہوا جب شاذو علاج کے لیے ان کے پاس پہنچی۔ اس کے اسقاط کے اصل اسباب بہت واضح تھے اور شاذو جس روحانی وجسمانی عذاب سے دوچار ہو کے وہاں لائی گئی تھی وہ خود نعیم کی زبانی ڈاکٹر انجم تک پہنچ گئے تھے۔ لیکن علاج کے دوران میں ہی علامات سے' جن کو صرف کوئی ڈاکٹر سمجھ سکتا تھا یا بلڈ رپورٹ اور دوسرے ٹیسٹ کے نتائج سے ان پر شاذو کی اس مہلک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیماری کا انکشاف بھی ہوا جس سے شاید خود شادو بے خبر تھی یا شاید وہ جانتی تھی۔ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا فی الحال مشکل تھا۔

تاہم یہ بات یقینی تھی کہ ڈاکٹر انجم اور اس کے شوہر ڈاکٹر نوید نے بلڈ کینسر کے سارے ٹیسٹ خاموشی سے اور رازداری سے مکمل کیے اور نتیجے کو اپنی ذات تک محدود رکھا مگر ان دونوں کے کلاس فیلو اور دوست ڈاکٹر مشہود اچانک کلینک پہنچ گئے تو ایک ڈاکٹر نے دوسرے ڈاکٹر سے ایک ناگزیر حقیقت کو چھپانا ضروری نہیں سمجھا۔

اس وقت تک ہم شادی کے فیصلے کا اعلان کر چکے تھے۔ ظاہر ہے اس فیصلے نے اور پھر شادو کی بیماری کی خبر نے ذہنی طور پر ڈاکٹر مشہود کو شدید ذہنی صدمے سے دوچار کیا۔ وہ مجھ سے ایک جذباتی وابستگی رکھتے تھے اور ہمیشہ میری خیر خواہی کو پیشِ نظر رکھتے تھے مگر اس کے ساتھ ہی وہ میرے شادو کے ساتھ دیوانگی والے عشق کا سارا حال بھی جانتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے لیے مجھے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنا کتنا ناممکن ہے۔ یہ بات کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے مجھے شادی کا فیصلہ کرنے سے پہلے معلوم ہو جاتی تب بھی مجھے فرق نہ پڑتا اور اس فیصلے کے بعد تو جو ناممکن تھا وہ مزید ناممکن ہو گیا تھا۔

شدید ذہنی انتشار میں ڈاکٹر مشہود نے اپنی الجھن کا ذکر بیگم صاحبہ سے کر دیا کہ بتاؤ اب کیا کروں میں۔ وہ لڑکا تو پاگل ہے ویسے بھی اس لڑکی کے پیچھے۔ اسے کچھ بتایا تو فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ الٹا نقصان ہو سکتا ہے۔ صدمے سے اس کا دماغ بالکل ہی الٹ جائے تو وہ اس لڑکی شادو سے کہے کہ چلو ہم یہ دنیا ایک ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ تمہارے بغیر اس دنیا میں کیسے رہ سکتا ہوں میں۔ اگر تمہیں جانا ہے تو میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ پتا نہیں وہ لڑکی کس حد تک جانتی ہے اپنی بیماری کے بارے میں۔ اسے کچھ پتا نہیں تو ناصر سے پتا چل جائے گا اور پھر وہ بھی کہے گی کہ ہاں یہی ٹھیک ہے۔ ایسا ہی عشق ہے ان کا۔ دونوں کا دماغ خراب ہے۔ شب مرگ کی صبح ہو تو دونوں مرے پڑے ہوں۔ خواب آور گولیاں اور زہر سب مل جاتا ہے آسانی سے۔ بس ہمت چاہیے تو پاگل پن میں آدمی کے لیے آگ میں کودنا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ اگر اس لڑکی کو پتا ہے اور پھر بھی وہ شادی کر رہی ہے ناصر سے تو صاف ظاہر ہے کہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے۔ زندگی کے جو تھوڑے سے دن باقی ہیں وہ اس کی جھولی میں ڈال کے اس پر احسان کر رہی ہے۔ محبت ہوتی تو اسے چھوڑ کے ایک بڈھے وکیل سے کیوں شادی رچاتی۔ ایک عذاب بن کے چمٹ گئی ہے وہ تو ناصر کو۔ میں تو سمجھا تھا کہ ناصر کی جان چھوٹ گئی مگر وہ تو بی کی طرح پھر نمودار ہو گئی اور ڈاکٹر مشہود نے کیا کہا ہوگا کہ اس کی نہیں' مجھے فکر ہے ناصر کی۔ اسے بھی کیسے سمجھاؤں' کیسے روکوں اس شادی سے۔ بے شک یہ مرض متعدی نہیں ہے۔ ناصر کو کچھ نہیں ہو سکتا مگر وہ برداشت کیسے کرے گا یہ صدمہ اور ڈاکٹر نوید اور ڈاکٹر انجم کی طرح ڈاکٹر مشہود نے بھی یہی طے کیا ہوگا کہ حالات کے دھارے کا رخ نہیں موڑا جا سکتا تو فی الوقت کچھ بھی نہ کیا جائے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑنے کے لیے خاموشی اور لاعلمی کا اظہار ہی سب سے بہتر ہوگا۔ انہوں کو ہونی اور ہونی کو ان ہونی کون کر سکتا ہے۔ بالآخر حقیقت خود آشکار ہوگی اور خود اپنا وجود تسلیم کرا لے گی۔

یہ دکھ' صدمے اور غصے کے جذبات کی شدت تھی جس نے ڈاکٹر مشہود کو مجبور کر دیا کہ وہ میری شادی کی تقریب میں ہی شریک نہ ہوں۔ وہ اس خاموش احتجاج کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔

لیکن بیگم صاحبہ کا ردِ عمل بالکل مختلف رہا۔ میری شادو کے ساتھ شادی کی خبر نے انہیں شدید صدمہ پہنچایا۔ یہ ایک عورت کی حیثیت سے ان کے پندار کی شکست تھی۔ ان کے نزدیک میں وہ مملکت تھا جس کو سب سے پہلے تسخیر کرنے کا احساسِ تفاخر انہیں حاصل تھا مگر اب اس مملکت پر کسی اور کی حکومت قائم ہو رہی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ ایک دن ایسا ہوگا۔ ان کی قوتِ تسخیر کی ایک حد تھی۔ جیسے زمین کی کشش کی ایک حد ہے۔ جب تک کوئی جسم اس حد کے دائرے میں رہے گا کسی سیارے کی طرح اس دائرے میں حرکت کرے گا مگر راکٹ پچیس ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار حاصل کر لے تو کشش ثقل بھی اسے نہیں روک سکتی۔ وہ خلا میں چاند تک یا مریخ تک کہیں بھی جا سکتا ہے۔

میں بیگم صاحبہ کی کشش کے دائرے سے نکل گیا تھا لیکن وہ سمجھتی تھیں کہ میں ابھی تک اسی مدار میں ہوں۔ وہ جب چاہیں گی' مجھے پھر کھینچ لیں گی اور اس کے لیے وہ کوشش بھی کرتی رہی تھیں۔ اس تعلق کو استوار رکھنے کے لیے انہوں نے اپنی عنایات کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہونے دیا تھا لیکن شادو نے مجھے ان سے چھین لیا تھا۔ وہ شادو جسے وہ بڑی نفرت اور حقارت سے ایک فقیرزادی کہتی تھیں۔ جو ان کے خیال میں بہت معمولی شکل و صورت کی ایک بہت نچلے طبقے کی ذہنی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی اور ہرگز میرے لائق نہ تھی' اچانک وہ طاقتور اور دولت مند ہو گئی تھی اور اس نے

اپنے عشق سے بیگم صاحبہ کی ہوس کو ایک ذلت آمیز شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ اگر میں کسی انتہائی حسین' اونچے خاندان کی اور عالی مقام لڑکی سے شادی کر لیتا تو انہیں صرف صدمہ ہوتا' احساسِ ذلت نہ ہوتا۔ میں نیلم سے شادی کر لیتا تب بھی وہ اسے ایک فطری تعلق کا نتیجہ سمجھ کے برداشت کر لیتیں مگر شادو کی جیت ان سے برداشت نہ ہوئی۔

اس کے ساتھ ہی بیگم صاحبہ کو معلوم ہوا کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے تو انہوں نے اپنی شکست کی ذلت کا بدلہ مجھ سے یوں لیا کہ شادی کو میرے لیے خانہ بربادی کی خبر بنا دیا اور یہ خبر مجھے اس رات پہنچانے کا انتظام کیا جب شادی کے بعد میرے جذبات کی دنیا میں خوشیوں کا بھرپور چراغاں ہو اور شبِ وصل میں مسرتوں کے خیرہ کن اجالے ہوں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ میری زندگی میں دکھ' مایوسی اور عذاب کا اندھیرا اتارنے کے لیے وہی رات سب سے مناسب ہوگی اور بڑی خود غرضانہ کمینگی اور سفاکی کے ساتھ انہوں نے میری زندگی کی سب سے حسین رات کی پشت میں خنجر گھونپ دیا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ جب وہ خود شریکِ محفل نہیں تھیں تو ان کی طرف سے کسی نے میری جیب میں وہ ٹائپ کی ہوئی سطر والا پرزہ ڈالا مگر اس میں شک کی کوئی بات نہیں تھی کہ خنجر انہی کا تھا۔ دستِ قاتل میں خنجر تھمانے والی خود بیگم صاحبہ تھیں۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ قاتل کی صورت میں کون تھا۔ وہ جو بھی ہوگا بیگم صاحبہ کی دولت حسن و شباب کا زر خرید کوئی ہوس کا غلام ہی ہوگا جسے کوئی شکایت نہ ہوگی کہ معاوضے کی ادائیگی میں بیگم صاحبہ نے فیاضی سے کام نہیں لیا۔

بظاہر شادو بھی رات بھر سکون سے سوتی رہی۔ ایسا ہی اس نے میرے بارے میں سمجھا ہو تو غلط نہیں۔ میں اندھیرے میں دم سادھے پڑا تھا لیکن میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور میرا دماغ پوری طرح مستعد تھا۔ میرے پاس ایک مفروضے کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کے لیے بہت سے عوامل تھے۔

انگریزی کے ایک محاورے کے مطابق دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو اور دھواں نظر بھی آتا ہے۔ اگر کسی نے اور میرے یقین کے مطابق بیگم ڈاکٹر مشہود نے۔ مجھے ایک ٹائپ شدہ سطر میں یہ "خوش خبری" سنائی تھی کہ شادو بلڈ کینسر میں مبتلا ہے اور تھوڑے دن کی مہمان ہے تو یہ ناممکن تھا کہ اس میں صداقت بالکل ہی نہ ہو۔ وہ بہرحال ایک ڈاکٹر کی بیوی تھیں اور پریکٹس نہیں کرتی تھیں مگر خود بھی ڈاکٹر تھیں۔ ان کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایسی گمنام اطلاع سے ہارٹ فیل نہیں ہوگا۔ میں تصدیق کروں گا اور جب جھوٹ سامنے آجائے گا تو اس احمقانہ مذاق کا نتیجہ خود بخود صفر ہو جائے گا۔

اس کے بعد شادو کا پُراسرار رویہ تھا جس کا شروع سے جائزہ لینے کے بعد شبہے کی بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی۔ اس نے اچانک ہی مجھ سے شادی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلے کی خوب تشہیر کی تھی اور مجھے بار بار یقین دلایا تھا کہ اب ہمیں موت ہی جدا کرے گی۔ موت کا ذکر اتنا ناگزیر بھی نہیں تھا مگر میں ویسے ہی اعتبار کر سکتا تھا کہ میرے اور شادو کے درمیان ازدواجی تعلقات کا رشتہ برقرار رہے گا۔ یہ کہنا شاعرانہ مبالغے کی بات ہوتی کہ تا ابد قائم رہے گا۔ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ خدا نے کسے کتنی زندگی کی مہلت دی ہے مگر یہ کوئی کہنے کی بات ہی نہیں تھی کہ بالآخر ہمیں موت جدا کرے گی۔ موت برحق ہے اور میاں بیوی کا رشتہ سو سال کی عمر کو پہنچنے تک ستر اسی سال رہے پھر بھی ایک دن ختم ضرور ہوتا ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ اتنی طویل رفاقت کے بعد پہلے ساتھ چھوڑنے والا شوہر ہوگا یا بیوی ہوگی۔ یہ شادو کے لاشعور اور شعور کو مغلوب اور مفلوج کر دینے والا قریب آتی موت کا احساس تھا جو اسے بار بار اپنی وفاداری اور محبت کا یقین دلانے پر مجبور کرتا تھا۔ اسی خوف کے تحت اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں داتا صاحب کے مزار پر مانگی جانے والی دعا میں اس کا ساتھ دوں۔ وہ میری زبان سے اقرار اور تصدیق چاہتی تھی کہ جب وہ نہیں ہوگی تو میں اس کے بغیر بھی ہنسی خوشی زندگی گزاروں گا۔

شادی سے پہلے بھی مجھ سے اپنی قسم پر یہ وعدے لے چکی تھی کہ میں اس کی ہر بات مانوں گا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے دل پر رکھ کے کہا تھا کہ قسم کھاؤ میری ایک بات مانو گے اور میں نے کہا تھا کہ ایک بات کے سوا ہر بات مانوں گا۔ ایک بات یہ کہ تمہیں نہیں چھوڑوں گا اور اس نے کہا تھا کہ اچھا' دیکھوں گی کہ تم کتنے سچے ہو۔ کتنا مان رکھتے ہو اپنی قسم کا۔

پھر مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ اس نے نیلم کی بہت تعریف کی تھی کہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ ایکٹریس ہونے کے باوجود اس قابل ہے کہ میں اس سے شادی کر لوں اور میرے خفا ہونے پر اس نے کہا تھا کہ اگر میں نہ رہوں تو۔

اب میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کیا چاہے گی۔ جب اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی بیماری کا راز عیاں ہوجائے گا اور ڈاکٹر اس کی زندگی کے بارے میں حتمی فیصلہ صادر کردیں گے کہ اب وہ زیادہ سے زیادہ کتنا عرصہ گزار سکتی ہے' تو شاید مجھے میرے وعدے یاد دلائے گی اور میری دعا کے الفاظ دہرائے گی۔ وہ کہے گی کہ میرے بعد خوش رہنا اور نیلم سے شادی کرلینا۔ تم انکار نہیں کرسکتے کیونکہ تم نے میری قسم کھائی ہے اور داتا صاحب کے مزار پر وعدہ کیا ہے۔

یہ اتنا وحشت انگیز خیال تھا کہ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی پر پڑے پردوں کے پیچھے رات کا اندھیرا ابھی قائم تھا لیکن میں جانتا تھا کہ صبح ہونے والی ہے۔

شاذو کسمسائی اور اس نے آنکھیں تھوڑی سی کھول کے خواب آور لہجے میں کہا "کیوں اٹھ گئے اتنی جلدی۔۔۔ رات ہے ابھی تو۔"

پھر اس نے کروٹ لی اور مجھے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹ کر اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر میں نے نرمی سے خود کو چھڑالیا "میں ذرا نماز پڑھ لوں۔"

اس نے سرہلایا اور پھر سوگئی۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ آج تمہیں خدا کیوں یاد آگیا۔ شاید اسے شک نہیں ہوا کہ میں کتنا پریشان ہوں اور میری رات کیسے ذہنی عذاب اور انتشار میں گزری ہے۔ ہر خود غرض بندے کی طرح جسے خدا صرف مصیبت میں یاد آتا ہے' اچانک مجھے نماز کا خیال آیا تھا۔

میں کبھی راسخ العقیدہ راست باز اور دیندار مسلمان ہونے کا دعوے دار نہ تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنے نام کے مسلمان ہونے پر کبھی شرم تک نہیں آتی تھی حالانکہ میری پرورش ایک یتیم خانے اور دینی مدرسے میں ہوئی تھی جہاں ہر صبح ہمیں ٹھوکریں اور بید کی چھڑیاں مار مار کے بیدار کیا جاتا تھا۔ ہمیں نماز پڑھوانے والے ہماری صبح کا آغاز حمد تسبیح و تمجید سے نہیں غلیظ گالیوں سے کرتے تھے۔ ہمیں ساری انسانیت کے لیے نوربدایت قرآن کی تعلیم ایسے ملتی تھی کہ کبھی مولا بخش تو کبھی اس کی گھر والی یعنی بید سے ہماری نازک کھال ادھیڑ دی جاتی تھی۔ ہمارے استاد اپنی فطرت میں جلاد تھے۔ میں اس ماحول سے متنفر ہو کے بھاگا تو ایک باغیانہ سرکشی میرے مزاج کا حصہ بن چکی تھی۔ قصوروار مذہب نہیں تھا مگر مذہب کے ٹھیکے داروں کے چہرے اتنے کریہہ اور کردار ایسے دوغلے تھے کہ میں مذہب سے بھی دور ہوگیا اور اس ماحول سے نکل کے میں نے ماضی کی تلخ یادوں کے ساتھ روزہ نماز کو بھی بھلادیا۔

برسوں بعد آج میں جائے نماز پر کھڑا ہوا تو میری جذباتی کیفیت اس لڑکے جیسی تھی جو گھر سے بھاگ جائے اور پھر دربدر ہو کے ذلت وخواری اٹھا کے اور سختی حالات سے گھبرا کے واپس آنے پر مجبور ہو۔

تاہم میری اور اس لڑکے کی صورت حال ایک لحاظ سے بالکل مختلف تھی۔ گھر سے بھاگ جانے والا اپنے باپ کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہوا تھا۔ میں جتنا شرمسار و خجل تھا اس سے زیادہ پُرامید تھا بقول شاعر

رحمت پہ تیری میرے گناہوں کو ناز ہے
بندہ ہوں جانتا ہوں تو بندہ نواز ہے

میں نے حضوری اور آداب بندگی کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے خدا کو سجدے کیے اور اس سے صرف صبر اور حوصلہ مانگا کہ اے قادر مطلق' اگر شاذو کے بارے میں وہ سب سچ ہے جو میں جان سکا ہوں تو اس میں تیری رضا سمجھ کے قبول کرتا ہوں۔ بس مجھے آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے صبر اور استقامت کی ضرورت ہے۔

نماز کے بعد دعا نے مجھے بڑا سکون دیا اور میرے ذہنی انتشار کی وہ کیفیت بھی نہ رہی جس نے مجھے تمام رات بیدار و بے قرار رکھا تھا۔ میں اس قابل ہوگیا کہ اپنے خیالات کو کنٹرول کرسکوں اور اپنی قوت ارادی و قوت عمل کو مجتمع کرکے ایک ڈسپلن کے ساتھ تابع اختیار رکھ سکوں۔

میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو شاذو پر کچھ ظاہر کیے بغیر مجھے حقائق معلوم کرنے چاہئیں۔ میرے پاس ابھی صرف وہ یقین ہے جو میری سوچ کا حاصل ہے۔ میں نے واقعاتی شہادتوں کی مدد سے ایک نتیجہ اخذ کیا ہے مگر میری سوچ کے درست ہونے کا ثبوت دیگر ذرائع سے بھی حاصل ہونا چاہیے۔ حساب کے سوال کا جواب ایک ہی آئے گا خواہ کوئی اسے بلیک بورڈ پر حل کرے' امتحانی کاپی میں یا کیلکولیٹر پر۔

میں نماز پڑھ کے فارغ ہوا تو باہر سے نور سحر نے خواب گاہ کے دریچوں پر ایک نئی صبح کے آغاز کا اعلان کردیا تھا۔ شاذو ہنوز لذت خواب سحر میں مدہوش تھی۔ اس کے سیاہ چمکیلے ریشمی بالوں کا ایک ڈھیر تکیے پر پھیلا ہوا تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا' مجھے وہ پہلے سے کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ اس کا رنگ جو پہلے ہلکی سی ملاحت رکھتا تھا نکھر کے اجلا گلابی ہوگیا تھا۔ اس کی صورت کے تیکھے نقوش میں ایک انوکھی جاذبیت پیدا ہوگئی تھی جو شاید تکمیل کے فطری عمل کا نتیجہ تھی۔ یہی گداز اور لوچ اس کے جسم کی ساری رعنائیوں میں اتر آیا تھا۔

میں نے چادر سے اس کا بدن ڈھانپا تو میرے دل میں ایک دکھ بھرے سوال کا درد کسی انگارے کی طرح جلنے لگا۔ کیا یہ قوس وقزح اور خشیب وفراز کی ساری دلکشی فریب نظر ہے یا یہ خواب ہے جو آنکھ کھلتے ہی بے وجود ہوجائے گا۔ فقط اس کا تصور رہ جائے گا۔ یہ کسا ہوا ریشمی لمس کی حرارت سے معمور جسم ہڈیوں کا ڈھانچا بن جائے گا اور پھر خاک میں مل جائے گا۔

میں نے ذہن سے خوف کو جھٹکا اور باہر آتے ہوئے دروازہ بند کردیا۔ ماسی ہیرا بھی ابھی نماز سے فارغ ہوئی تھی اور کچن میں روز مرہ کی مصروفیات کا آغاز کرچکی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کے حیران ہوئی "ہائے' تجھے کیا ہوا ہے؟"

"کیا ہوا ہے مجھے؟" میں نے اپنے سر کو چھوا "سینگ نکل آئے ہیں میرے؟"

وہ مسکرائی "آج صبح صبح چن کیسے چڑھ گیا؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "میں نماز پڑھنے کے لیے اٹھا تھا۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا "بکواس' صبح اٹھتے ہی جھوٹ۔"

میں نے کہا "تمہاری قسم ماسی۔ اب میں روز نماز پڑھوں گا۔"

اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کے اوپر سر اٹھایا "شکر ہے میرے مولا کوئی تو نیک کام کیا اس حرامی نے۔"

میں نے ہنس کے کہا "شادی کرنا کیا نیکی نہیں ہے؟"

ماسی نے کہا "بالکل ہے۔ رسول کی سنت ہے۔"

"تو پھر کیا خیال ہے' نیکی زیادہ سے زیادہ کرنی چاہیے مجھے بھی اور راجے کو بھی۔ تین اس کے لیے دیکھو' تین میرے لیے۔ ثواب تمہیں بھی ملے گا اگر نیکی کے کام میں مدد کروگی۔"

اس نے چمٹا اٹھالیا "شروع ہوگئی تیری بکواس۔۔۔"

میں تھوڑا سا دور ہوگیا "لو' ابھی خود تم نے کہا ہے کہ شادی کرنا نیکی ہے۔ رنگ' روپ عمر اور سب باتیں چھوڑو۔ بس یہ دیکھ لو کہ نبض چل رہی ہے یا نہیں اور کچھ تلاش کرلو۔ میں اور رانجھا قرعہ اندازی کرلیں گے۔"

"مرن جوگے" اس نے چمٹا میرے شانے پر رسید کیا "ابھی اٹھ جائے شاذو تو اس سے کہنا۔ چل دفع ہو۔"

میں ہائے ہائے کرتا اٹھا "اچھا جاتا ہوں۔ تمہارے پاس آیا تھا کہ ایک کپ چائے ملے گی' اب جارہا ہوں کہیں باہر۔"

ماسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی "ناصر' کہاں جارہا ہے۔"

میں نے دروازے سے پلٹ کے کہا "شاذو اٹھے تو بتادینا۔ میں نیلم کے گھر جارہا ہوں' چائے پینے۔"

نیلم ابھی سو کے بھی نہیں اٹھی تھی۔ رات کو دیر تک اور بعض اوقات پوری رات اپنے شوٹنگ کے شیڈول میں مصروف رہنے کے بعد اس کا صبح یا دوپہر تک سوتے رہنا ایک ناگزیر ضرورت تھا۔

میں لاؤنج میں بیٹھ گیا "نیلم کب اٹھے گی' رات کب آئی تھی۔"

بابا جی نے گھڑی دیکھی "کل رات اس کی کوئی شوٹنگ نہیں تھی مگر اس کا جی خراب ہے۔"

"آپ مہربانی کرکے اسے جگادیں اور بتادیں کہ ہم تشریف لائے ہیں۔"

میں نے کہا "اور دس منٹ بعد ہم بقلم خود اس کی خواب گاہ میں بیل کی طرح گھس جائیں گے۔"

بابا جی نے مجبوری کی ایک آہ بھری اور نیلم کو جگانے چلے گئے۔ میں نے براہ راست کچن میں جاکے چائے طلب کی جو مجھے فوراً مل گئی۔ تاہم بنگالی خانساماں کو میرا محکمانہ انداز پسند نہیں آیا۔ اس کا اظہار اس کی صورت کے تاثرات سے ہوگیا تھا مگر پھر اس نے بنگالی میں کچھ کہا جس کا جواب کچن میں ساتھ کام کرنے والی عورت نے دیا۔ وہ غالباً اس کی بیوی تھی پھر ان دونوں کا جھگڑا شروع ہوگیا۔

دس منٹ بعد نیلم نے آکے انہیں چپ کرایا۔ وہ ہاتھ منہ دھوکے اور کپڑے بدل کے آئی تھی مگر نیند کا خمار اس کی آنکھوں میں باقی تھا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے" وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "ایسی رونی شکل بنائے کیوں بیٹھے ہو؟ خیریت تو ہے نا؟"

میں نے خالی کپ میز پر رکھ دیا "ہاں ابھی تک تو ہے۔"

"دلمن نے صبح صبح کیوں نکال باہر کیا دولھا میاں کو؟"

میں نے کہا "نیلم۔ میں وہ بات کرنے آیا ہوں جو کل ٹیلی فون پر نہیں ہوسکی تھی۔"

وہ ایک دم سیریس ہوگئی "مجھے جو معلوم تھا' وہ میں نے تمہیں بتادیا تھا۔"

میں نے جیب میں سے وہ کاغذ کا پرزہ نکالا جو مجھے شب عروسی کی صبح اپنے لباس کی ایک جیب میں ملا تھا۔ "یہ دیکھو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نیلم نے مڑے تڑے کاغذ کو پھیلا کے دیکھا۔ میں غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور یہ بات وہ جانتی تھی۔ وہ ایک بہت اچھی اداکارہ تھی۔ اسے سچویشن کے مطابق اپنے چہرے کے تاثرات کو کنٹرول کرنے کی بہت پریکٹس تھی۔ اس وقت بھی نیلم نے اپنی پیشہ ورانہ مہارت اور تجربے سے کام لیتے ہوئے جذبات کے اصل ردِعمل کو چھپالیا۔ اس نے بے نیازانہ حیرت سے وہ تحریر پڑھی اور پھر میری طرف دیکھا "یہ کیا ہے ناصر!"

میں نے کہا "کل میں نے تم سے یہی سوال کیا تھا۔ تم اس سطر کے سامنے سوالیہ نشان لگا کے جواب دو۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی "میں کیا جواب دوں؟"

"کیا یہ بات تمہیں معلوم تھی" میں نے کہا۔

"معلوم تھی کا کیا مطلب؟" وہ بولی "یہ پوچھو کہ کب معلوم ہوئی تھی؟"

"میری اور شادو کی شادی سے پہلے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی "نہیں۔ شادی کی رات جب میں واپس آئی تو کسی نے مجھے فون کیا۔"

"کسی عورت نے؟"

وہ چونکی "تمہیں کس نے بتایا؟"

میں نے مسکرا کے کہا "یہ میرا اندازہ تھا۔ خیر، تم بتاؤ کہ اس نے کیا کہا تھا۔"

"وہی جو اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے" نیلم دوسری طرف دیکھنے لگی۔

میں نے کہا "نہیں۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔"

نیلم کی نظریں خلا میں دیکھتی رہیں۔ "میں سونے کے لیے لیٹی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ کال میں خود ریسیو نہیں کرتی۔ بابا جی نے آ کے مجھے بتایا کہ کوئی عورت ہے جو مجھ سے ناصر صاحب کے بارے میں کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے بیڈ روم میں ریسیور اٹھالیا تو اس عورت نے کہا کہ تم نیلم ہی ہو نا؟ میں نے کہا کہ ہاں تو وہ بولی "تم ابھی اپنے محبوب کو کسی اور کے ساتھ جلتے حویلی میں چھوڑ کے آئی ہو، میں جانتی ہوں تمہارے دل پر کیا بیت رہی ہوگی۔ ناصر نے ایک دو ٹکے کی فقیرزادی کے لیے تمہیں بھی ٹھکرا دیا۔"

"تمہیں بھی..... یہی کہا تھا اس نے؟"

"ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔ پہلے مجھے غصہ آیا مگر پھر مجھے کچھ دلچسپی پیدا ہوگئی اس عورت سے۔" میں نے کہا "میرے جذبات کو چھوڑو۔ کیا اس نے مجھ سے پہلے تمہیں ٹھکرا دیا تھا؟ محبت تم سے کی تھی اور شادی کرلی اس لڑکی سے جو تمہارے خیال میں دو ٹکے کی فقیرزادی ہے؟" وہ کہنے لگی کہ "اور کیا ہے وہ آخر۔ ایک بڈھے وکیل کو پھانس کے اس سے شادی کی اور پھر اسے قتل کرکے اس کی دولت پر قبضہ جمالیا۔" میں نے کہا "کیا تم نشے میں ہو؟ تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو۔ وہ بولی "میں وہی کہہ رہی ہوں جو زمانہ کہہ رہا ہے۔ شادو ہنی مون پر اس بڈھے کو لندن لے گئی اور وہاں اس کو مار دیا۔ لندن میں اس پر دل کا دورہ پڑا۔ شادو اگر چاہتی تو فوراً ایمبولینس طلب کرسکتی۔ وہ پاکستان نہیں ہے۔ ایمرجنسی میں پولیس بھی چند منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔ شادو خود اسے اسپتال لے جاسکتی تھی مگر اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے دیکھتی رہی" میں نے کہا "یہ بات تم کیسے جانتی ہو؟ تم وہاں موجود تھیں یا شادو نے اعتراف کیا ہے تمہارے سامنے کہ جانتے بوجھتے اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔"

میں نے سرہلایا "بہت صحیح سوال کیا تھا تم نے۔"

"میرے سوال پر وہ تھوڑا سا گڑبڑا گئی۔ کہنے لگی کہ "ظاہر ہے ایسا ہی ہوا ہوگا کیونکہ جب بالآخر وہ اسے لے کر اسپتال پہنچی تو ہاشمی صاحب کے انتقال کو آدھا گھنٹا ہوچکا تھا۔ یہ بات اسپتال کے ریکارڈ پر ہے۔ ڈاکٹروں نے دل کی دھڑکن مصنوعی اور مشینی طریقے سے بحال کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ اٹ از ٹوٹلی ٹائم۔ اس پر میں نے پوچھا کہ کیا ڈاکٹروں نے اس تاخیر کا سبب نہیں پوچھا تھا؟" وہ کہنے لگی "پوچھا ہوگا ضرور لیکن اس چالاک عورت کے لیے جواب دینا کیا مشکل تھا۔ اس نے کہہ دیا ہوگا کہ راستے میں دیر ہوئی۔ گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ ٹریفک جام تھا۔ اسے بہانے بہت۔" میں نے پھر پوچھا کہ "تم یہ سب کیسے جانتی ہو آخر؟ وہ ہاشمی صاحب کو اپنی گاڑی میں لے گئی تھی یا ایمبولینس میں اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ کس اسپتال میں گئی تھی اور وہاں کے ریکارڈ پر کیا ہے؟"

"کیا جواب میں اس نے کہا کہ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ میرے شوہر ایک مشہور ڈاکٹر ہیں۔"

نیلم نے مجھے حیرانی سے دیکھا "تم جانتے ہو اس عورت کو۔"

"شاید۔ پہلے مجھے بتاؤ اس نے کیا کہا تھا؟"

نیلم نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک خانساماں میز پر ناشتا لگا کے فارغ نہیں ہوگیا "ناشتا کرو" وہ بولی "چلو شروع ہوجاؤ۔"

میں نے کہا "ابھی بھوک نہیں ہے مجھے۔"

"بھوک نہیں ہے یا کرکے آئے ہو؟"

میں نے کہا "شادو سو رہی تھی کہ میں اٹھ کے ادھر آگیا۔"

"اچھا تو واپس جا کے اسی کے ساتھ ہوگا ناشتا۔ ابھی سے اتنا ڈرتے ہو، چلو میں بتادوں گی اسے کہ میں نے ایک ضروری کام سے بلالیا تھا۔ ناشتا نہیں کرو گے تو میں بھی کچھ نہیں بتاؤں گی۔"

"اچھا بابا بلیک میل مت کرو مجھے۔"

نیلم نے ایک سلائس اٹھالیا "میری جرح نے اسے کچھ پریشان کیا۔ اس نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے بتایا کہ وہ خود ایک ڈاکٹر ہے اور اس کے تعلقات ہیں لندن میں۔ میں نے کہا کہ "چھوڑو یہ فضول بات۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم نے کہا تھا کہ تم ناصر کے بارے میں کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہو اس لیے میں نے کال وصول کرلی" وہ بولی "بات ناصر کے بارے میں ہی ہے مگر اس کا تعلق شادو سے ہے" اس نے مجھے بلڈ کینسر کے بارے میں بتایا اور پھر آگئی اپنی باتوں پر کہ یہ تو قدرت کا انصاف ہے۔ شادو نے اپنے شوہر کو قتل کیا اور اب خدا نے اس کو سزائے موت سنادی ہے۔ بس کچھ دن بعد اس پر عمل درآمد بھی ہوجائے گا۔ ناصر نے تمہارا دل دکھایا۔ وہ خود بھی خوش نہیں رہے گا۔"

"تم نے پوچھا نہیں کہ....."

"میں نے پوچھا تھا" نیلم بولی "اس نے جواب میں کہا کہ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم شادو سے پوچھ لو۔"

میں نے چائے کا کپ رکھ لیا "شادو..... یہ جانتی ہے۔"

"اس عورت کا خیال تھا کہ جانتی ہوگی" نیلم نے کہا "تم ناشتا مت چھوڑو۔"

میں نے کہا "نیلم۔ میری نیند بھوک سب اڑ گئی ہے۔ میں بہت کوشش کررہا ہوں کہ اس بات کو جھوٹ سمجھوں مگر سچ خود اپنے وجود کو ثابت کرتا جارہا ہے۔"

نیلم نے کہا "دیکھو۔ جانے سے پہلے بھی سمجھایا تھا تمہیں کہ جھوٹ ہو یا سچ۔ ہر صورت میں تمہیں خود کو حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رکھنا چاہیے کیونکہ ذمے داری صرف تمہاری ہے۔"

"ذمے داری؟" میں نے تلخی سے کہا "شاید ایسا ہی شادو بھی سمجھتی ہوگی۔ یہ وہی فلمی کہانی شروع ہوگئی ہے نیلم، میرا نام ہے محبت والی۔ ہم لوا سٹوری کے کردار بن گئے ہیں شاید۔ ایک دوسرے کے جھوٹ کو ماننے اور نباہنے کی اداکاری کو اپنی ذمے داری سمجھنا شروع کردیا ہے ہم نے۔ ایسے کب تک چل سکتا ہے؟"

"اس فلم کے اختتام تک۔" نیلم نے کہا "ناچ گانے اور مار دھاڑ کو نکال دو تو فلم میں بھی وہی ہوتا ہے جو زندگی ہے۔ لوگ اسی طرح محبت کرتے ہیں اور نفرت کرتے ہیں۔ ملتے اور بچھڑتے ہیں۔ زندگی کے سارے رشتے فلموں میں بھی وہی ہوتے ہیں، ماں باپ، بھائی بہن..... میاں بیوی۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں بنگالی نے ناشتے کے برتن اٹھائے۔ نیلم نے شادو سے فون پر بات کی اور اسے بتایا کہ ناصر کو میں نے صبح صبح ایک کام سے بلالیا تھا۔ وہ یہاں ہے۔ اس کی فکر مت کرنا، وہ ناشتا کرچکا ہے۔

پھر وہ مجھے اپنے ساتھ اوپر والے حصے کے ٹیرس گارڈن میں لے گئی جہاں سے نیچے کے باغ کا نظارہ بہت دلفریب لگتا تھا۔ سبزے پر اور پھولوں پر دھوپ اتر آئی تھی اور کہیں کہیں گلوں کے رنگ میں شبنم کے موتی چمک رہے تھے۔

نیلم نے خود ہی بات شروع کی "اس عورت نے مجھے بتایا کہ ہاشمی صاحب کے ساتھ شادو لندن گئی تو اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ ہاشمی صاحب نے اس کا مطلب کچھ اور لیا۔"

"وہ سمجھے کہ شادو ماں بننے والی ہے۔"

"ہاں۔ ان کا ایسا سمجھنا جائز تھا" نیلم نے کہا "اگر یہاں کے ڈاکٹر دیکھتے تو وہ بھی تصدیق کردیتے۔ ابتدائی علامات سے پتا چل جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تم بے وقوف ہو یا بے خبر ہو نیلم۔"

"کیوں؟"

میں نے کہا "دیکھو۔ جب شادو لندن گئی تھی تو اس کی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اور PREGNANCY کی جن ظاہری علامات کا تم حوالہ دے رہی ہو، وہ اتنی جلدی ظاہر نہیں ہوتیں۔ ہاں ٹیسٹ سے فوراً پتا چل جاتا ہے اور وہ بہت سادہ سے ٹیسٹ ہوتے ہیں۔"

نیلم ہنسنے لگی "بڑے تجربہ کار لگتے ہو باتوں سے تو۔ میں واقعی بے وقوف بھی ہوں اور بے خبر بھی۔ تمہارے مقابلے میں۔"

میں نے کہا "میں نے کچھ عرصہ ایک ڈاکٹر کی فیملی کے ساتھ گزارا ہے۔"

نیلم چونکی "وہ۔ ڈاکٹر مشہود..... کیا ان کی بیوی بھی ڈاکٹر ہے؟"

میں نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ہاں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"تو کیا۔۔۔؟"

میں نے ایک گہری سرد آہ بھری "ہاں۔ مجھے شک نہیں یقین ہے کہ تمہیں فون کرنے والی بیگم صاحبہ تھیں اور مجھے یہ خوش خبری بھی کسی اور نے نہیں دی۔"

نیلم مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی "لیکن۔۔۔ وہ تو بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں تمہارا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے مگر ڈاکٹر مشہود کے خیال رکھنے اور ان کی بیگم صاحبہ کے خیال رکھنے میں بڑا فرق ہے" میں نے کہا۔

"ناصر۔ مجھے یقین نہیں آتا۔"

"آجائے گا جب تمہیں پس پردہ حقائق کا علم ہوگا۔ میں نے بھی بہت سوچا' بہت غور کیا۔ میں رات بھر جاگتا رہا اور بالآخر اتنے بہت سے لوگوں میں جن سے میری شناسائی یا دوستی ہے' صرف ایک عورت کی ذات پر میرے سارے شکوک مرکوز ہوگئے۔ میرے اندازے بے بنیاد نہیں تھے۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا فون کرنے والی کوئی عورت تھی اور کیا اس نے کہا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے؟"

نیلم نے آہستہ سے سر ہلایا "مجھے دکھ ہوا یہ جان کے۔ میں اسے ایک خیر خواہ سمجھتی تھی تمہارا۔"

"کیا خیر خواہی کے پردے میں کسی کی کوئی غرض وابستہ نہیں ہو سکتی؟ مقصد الگ الگ ہو سکتا ہے۔ نیکی اور ہمدردی جتانے والے کا' تم آگے بتاؤ۔"

نیلم نے کہا "ہاشمی صاحب اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ لندن گئے تو انہوں نے سوچا کہ وہ سیر و تفریح اور آرام کریں گے۔ ہنی مون ویسے تو نوجوان جوڑوں کا ہوتا ہے مگر ہاشمی صاحب نہ سہی' شادو تو نوجوان تھی۔ لندن میں ہی انہوں نے شادو کے ٹیسٹ کرائے۔ جو ابتدائی طور پر PREGNANCY کے تھے مگر ڈاکٹروں نے دوسری علامات کو غیر معمولی قرار دیتے ہوئے زیادہ تفصیل کے ساتھ چیک اپ کیا تو دوسری ہی بات معلوم ہوئی۔ اس وقت بیماری کی بالکل ابتدائی اسٹیج تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ ایک سال۔"

میں نے کہا "چھ مہینے تو گزر چکے ہیں۔"

"ہاں۔ عدت کا زمانہ چار مہینے دس دن۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد سب ملا کے۔ آدھی سلمت تو ختم ہو چکی ہے۔"

"یہ سب اس عورت نے بتایا تھا تمہیں؟"

"ہاں۔ ورنہ مجھے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ ایک سوال اور کیا تھا میں نے اس عورت سے۔ میں نے کہا کہ بی بی' مجھے نہیں معلوم تم کون ہو۔ یہ سب مجھے بتانے کا مقصد کیا ہے یہ کس حد تک سچ ہے لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی' تم نے شادو کے بارے میں اتنی تفصیل سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ تم سائے کی طرح اس کے پیچھے لگی رہیں یا کسی کو لگائے رکھا۔ تم نے یہاں سے لندن کے اسپتال تک۔ ہاشمی صاحب کی موت کے اسباب سے شادو کی بیماری کے ٹیسٹ اور ان کے نتائج تک ہر بات تمہیں معلوم ہے۔ جو کسی اور کو معلوم نہیں۔ تم یہاں رہتی ہو۔ مانا کہ تمہارے جاننے والے لندن میں ہیں مگر کیا تم نے انہیں شادو کی نگرانی اور اس کے معمولات کی رپورٹ پر مامور کر دیا تھا اور وہ ایسے جاننے والے ہیں جنہوں نے اسپتال کا پتا چلا کے وہاں کے ریکارڈ تک رسائی حاصل کر لی اور ساری انفارمیشن تمہیں بھیج دی۔ آخر کیوں؟ تم نے یہ سب کس مقصد کے تحت کیا تھا؟"

"یہ تو کمال کر دیا تم نے۔ INTELLIGENT سوال ہے یہ۔"

نیلم مسکرائی "اسی لیے جواب دیے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔"

"وہ کیا جواب دے سکتی تھی اس سوال کا۔"

نیلم نے کہا "سوچنے کی بات تو ہے ناصر!"

"وہ عورت شادو سے حسد کرتی ہے۔ اس سے نفرت کرتی ہے شروع سے" میں نے کہا "اس کا بس چلتا تو وہ شادو کو قتل کر دیتی یا کروا دیتی۔"

"مگر شادو کا معاملہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ تمہاری زندگی سے نکل گئی تھی اور کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایسے لوٹ آئے گی۔"

"غالب کا ایک شعر سناؤں تمہیں۔"

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے۔ پر نہ خدا کرے کہ یوں

"مطلب کیا ہوا اس کا؟" وہ بولی۔

میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا "اگر شادو آئی لوٹ کے میرے پاس۔ تو اسے میں اپنی خوش قسمتی کا سب سے بڑا انعام سمجھتا لیکن جیسے وہ آئی ہے' ایسے نہ آئی تو اچھا تھا۔ وہ آئی ہے مل کے پھر بچھڑنے کے لیے۔ زیادہ دکھ دے کر۔"

"ایسے دکھی ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ناصر۔ اب آگے جو بھی ہو' تمہیں اس کا مقابلہ تو کرنا ہی ہے۔ اپنے آپ کو اکیلا مت سمجھنا کبھی۔ تمہارے ساتھ میں ہوں۔ رئیس ہے' ہاسی ہیر اور ڈاکٹر رانجھا ہیں۔"

"اگر یہ سچ ہے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

نیلم میرے ساتھ آبیٹھی "دیکھو ناصر۔ میں تم کو اتنا کم ہمت نہیں سمجھتی۔ میں تمہیں خوش فہمی کے آسرے پر ٹالنا نہیں چاہتی۔ یہ نہیں کہہ سکتی کہ ہاں یہ جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تم مطمئن ہو کے نہیں بیٹھو گے۔ تم تصدیق کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ میں تمہیں ابھی بتا دیتی ہوں کہ یہ سچ ہے۔ اس عورت نے جھوٹ ضرور بولا تھا مجھ سے مگر صرف اس حد تک کہ اسے تمام معلومات لندن سے حاصل ہوئی ہیں۔ اسے یہ سب کچھ اپنے شوہر ڈاکٹر مشہود سے معلوم ہوا تھا اور ڈاکٹر مشہود کو بتانے والے تھے میرے دوست اور معالج۔ ڈاکٹر نوید اور ان کی بیوی ڈاکٹر انجم۔"

میں نے اپنے آنسو صاف کیے "تم ملی تھیں ان سے؟"

"ہاں۔ اس عورت کے فون نے مجھ سے میرا ذہنی سکون چھین لیا تھا۔ میں بھی اس رات سو نہیں سکی۔ میں نے بہت سوچا کہ آخر اس عورت کو مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ سب بتانے کے لیے اس نے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ میں اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ کوئی دل جلی اور زخم خوردہ عورت ہے جس نے میرا جذباتی استحصال کرنے کی کوشش کی۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں اور وہ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نے اسے بھی دھوکا دیا اور مجھے بھی۔ غلط فہمی ہے اسے۔"

"حالانکہ تم جانتی ہو نیلم کہ میں نے کبھی تمہاری ہمدردی اور خلوص آمیز عنایت کا غلط مطلب نہیں لیا۔ تم سے کبھی ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے تمہارا اور میرا اعتماد کا رشتہ مجروح ہو۔"

"اگر ایسا نہ ہوتا تو تم کو ہر وقت بلا ضرورت بھی اس گھر میں آنے کی اجازت کہاں ملتی۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ میری ایک جھلک دیکھنے اور مجھ سے ایک بار ملنے کے تمنائی کیسے دروازے سے دھتکارے جاتے ہیں۔ ڈنڈے مار مار کے گیٹ سے بھگانا پڑتا ہے انہیں لیکن تم مختلف ہو' تمہارے کردار نے متاثر کیا ہے مجھے۔ میں اکیلی تھی' ایک دوست کی ضرورت تھی مجھے جو بے غرض ہو۔"

میں نے کہا "ایک بار میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہاسی ہیر کیا چاہتی ہے۔ وہ تمہارے لیے میرا پیغام دینا چاہتی تھی۔"

"ہاں' اور ہم بہت ہنسے تھے اس پر کیونکہ میرے یا تمہارے دل میں ایسی کوئی بات کبھی نہیں آئی تھی۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ کہ ڈاکٹر نوید کی کیا رائے ہے؟"

"رائے کیسی' ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے جو انہیں معلوم تھا وہ انہوں نے مجھے بتا دیا۔ میرے سوال پر وہ حیران ضرور ہوئے تھے۔ انجم نے کہا کہ پہلے تم بتاؤ نیلم تم کیا جانتی ہو؟ میں نے بتا دیا کہ ویسے تو مجھے کچھ پتا نہیں تھا مگر ایک عورت نے گمنام ٹیلی فون کال کر کے مجھے یہ بتایا ہے کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ ڈاکٹر نوید نے افسوس کے ساتھ اعتراف کیا کہ اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔"

میں نے کہا "تمہاری کب بات ہوئی تھی ان سے؟"

"کل۔ تم ہاسی ہیر کے ساتھ داتا صاحب کے دربار گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر انجم نے کہا کہ ہم نے کچھ واقعات تو تم سے سنے تھے اور شادو کی جو حالت تھی' اس سے بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا کہ ABORTION کیوں ہوا۔ اس کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تو ہم نے شادو سے پچھلی ہسٹری پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہاشمی صاحب کے ساتھ لندن میں تھی تو ایک دو بار اس کی طبیعت بگڑی تھی۔ اس کے فلاں اسپتال میں ٹیسٹ ہوئے تھے اور فلاں ڈاکٹر نے اس کو دیکھا تھا۔ شک ہمیں بھی تھا مگر ہوا یوں کہ لندن سے میرے سالے نے فون کیا۔ اس کی کال آتی رہتی ہے۔ میں نے اس سے ذکر کیا اور کہا کہ ذرا مجھے اس کیس کی رپورٹیں دیکھ کے بتائیں۔ دوسرے دن اس کا فون پھر آیا اور اس نے تکذم کیا کہ شادو کے بلڈ کینسر کی یہاں تشخیص ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے رپورٹیں بعد میں فیکس کر دیں۔"

میں نے کہا "یعنی شادو کے یہاں ٹیسٹ نہیں ہوئے؟"

"ان کی ضرورت نہیں تھی۔ لندن کا کراموِیل اسپتال کوئی عام اسپتال نہیں ہے۔ اس کی بڑی گڈوِل ہے۔ ان کے ٹیسٹ فائنل تھے اور وہاں کے ڈاکٹرز کی رپورٹ حتمی تھی۔ اس کے بعد شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ رپورٹیں ڈاکٹر مشہود نے بھی دیکھیں اور غالباً اس کیس کو اپنی ڈاکٹر بیوی سے بھی ڈسکس کیا۔ شادو کا معاملہ نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ گھر میں بات نہ کرتے۔ بعد میں ان کی بیگم صاحبہ نے اپنی معلومات کی بنیاد پر مجھے فون کر کے یہ جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہ سمجھا کہ انہیں اپنے جاننے والوں نے یہ بات لندن سے بتائی ہے۔ ڈاکٹر تو وہ ہے۔ اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔"

میں نے کہا "کیا شادو کو اپنی بیماری کا علم ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں ناصر۔ میرا اندازہ وہی ہوگا جو تمہارا کہ ہاشمی صاحب نے یہ بات شادو سے چھپائی ہوگی۔ ہر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سمجھ دار آدمی ایسا ہی کرے گا۔"

"مگر خود انہیں سب پتا چل گیا تھا۔ کیا اسی صدمے سے ان کا ہارٹ فیل ہوا؟"

"یہ ناممکن نہیں ہے۔ وہ دل کے مریض تھے۔"

"یقیناً وہ کہانی جھوٹی ہے کہ شادو نے انہیں مارا؟"

"ظاہر ہے" نیلم نے کہا "مگر ناصر۔ ایسی باتوں سے اب کیا فائدہ۔ کون جھوٹا ہے کون سچا؟ اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا مگر شادو کے بارے میں میری ذاتی رائے ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔"

"تمہیں معلوم ہے' شادو نے میرے ساتھ کیا کیا؟"

وہ چونکی "نہیں۔ کیا کیا ہے اس نے؟"

"اس نے مجھے وعدوں اور قسموں کی زنجیر سے باندھ کے بے بس اور مجبور کر دیا ہے اور اسی سے مجھے شک ہوتا ہے کہ وہ اپنے انجام کے بارے میں جانتی ہے۔ اسے سب معلوم ہے" میں نے کہا۔

نیلم میرے اخذ کردہ نتائج حیرانی اور دکھ کے ساتھ سنتی رہی۔ میں نے اسے شادو کی کہی ہوئی ہر بات بتادی اور اس دعا کا بھی ذکر کر دیا جو اس نے داتا صاحبؒ کے مزار پر مانگی تھی۔

نیلم نے ایک ٹھنڈی سانس لی "شاید تمہارا اندازہ ٹھیک ہے۔ شادو کو اپنی بیماری کا علم ہے مگر وہ تم سے چھپا رہی ہے۔"

"میں کیا کروں؟"

"تم وہی کرو جو شادو چاہتی ہے۔ جس کا تم اس سے وعدہ کر چکے ہو۔" نیلم نے کہا "اس کے سوا تم کر بھی کیا سکتے ہو؟"

"اس ذلیل عورت کو نہیں چھوڑوں گا میں۔ میں معلوم کروں گا کہ اس کے کس یار نے یہ پیغام مجھ تک پہنچایا تھا؟" میں غصے میں اٹھا۔

نیلم نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے پھر بٹھالیا "نہیں ناصر۔ تم یہ سب بھول جاؤ۔ تم اب کچھ بھی نہیں کرو گے۔ اگر تم نے کوئی بے وقوفی کی تو اس کی خبر شادو کو مل جائے گی۔ کیا تم ایسا چاہو گے؟"

میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

"دیکھو۔ جو بات کل تمہیں معلوم ہوئی تھی۔ وہ کسی نے تمہیں قبل از وقت بتادی۔ بے شک اس نے یہ بُری نیت سے کیا مگر اس سے کیا نقصان ہوا تمہارا؟ اچھا ہوا کہ تم نے مجھ سے پوچھا اور ہم نے آپس میں بات کر لی۔ حقائق سامنے آ گئے۔ اب ہم مل کے سوچیں گے اور کچھ کریں گے۔"

"کیا میں ماسی ہیر کو بھی بتادوں؟" میں کسی بچے کی طرح سہما ہوا تھا "ڈاکٹر رانجھا شاید کچھ کرے۔"

"ناصر' عقل سے کام لو۔ رانجھا کیا ڈاکٹر ہے۔ جس مرض کا علاج لندن کے کراموِل اسپتال کے ڈاکٹروں کے پاس نہیں تھا' اسے ڈاکٹر رانجھا ٹھیک کر سکتا ہے۔ کل کو تم نام نہاد حکیموں' ویدوں' یا پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تو خوار کرو گے شادو کو۔"

"پھر کیا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اسے مرتا دیکھتا رہوں؟" میرے ضبط کا حوصلہ ایک دم جواب دے گیا اور میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔

نیلم مجھے روتا دیکھتی رہی "رو لو یہاں میرے سامنے جتنا رونا ہے مگر شادو کے سامنے یہ سب نہیں ہونا چاہیے ناصر۔ ابھی وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اگر اس کی طبیعت خراب ہونے لگے تو اسے شہر کے سب سے اچھے اسپتال میں داخل کرا دو۔ خرچے کی فکر مت کرو۔ شہر کا ہر ڈاکٹر بلا سکتی ہوں میں۔ شادو کا ہر ممکن علاج کرائیں گے ہم مگر یہ علاج صرف اس کی تکلیف کم کرنے کے لیے ہوگا۔ دوا کوئی نہیں مگر ہم دعا کر سکتے ہیں۔ دعا کے قبول ہونے کی امید رکھ سکتے ہیں اور یہ کر سکتے ہیں کہ وہ خوش اور پُرسکون رہے۔ آخری وقت تک۔"

"مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہوگا نیلم' میں مر جاؤں گا۔"

"نہیں۔ تم زندہ رہو گے۔ تم نے وعدہ کیا ہے شادو سے اس کی قسم کھا کے۔ مرنے کی باتیں بزدل کرتے ہیں۔" اس نے میرا سر اپنے سینے سے لگالیا اور پیار سے میرا سر تھپکنے لگی۔ میرے آنسو اس کے گریبان کو بھگوتے رہے۔ اس وقت وہ نیلم نہیں تھی جو ایک سپر اسٹار تھی اور نامور فلمی ہیروئن تھی بلکہ وہ صرف ایک عورت تھی جس کے ہر روپ میں غمگساری کا اور پرائے درد کو سمیٹ لینے کا اور دوسروں کے دکھ اپنا لینے کا وہی ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جو دل کی جلن کو پیار کی ٹھنڈک اور احساس کے زخموں کو محبت کا مرہم اور روح کے ناسوروں کو اپنائیت کا سکون دیتا ہے خواہ وہ عورت ماں اور بہن ہو یا بیوی اور بیٹی ہو یا کوئی اجنبی ہو جو نرس کی یونیفارم پہنے کسی اسپتال کے وارڈ میں گھوم رہی ہو یا کہیں کسی محاذ پر قائم کیے جانے والے فیلڈ اسپتال کے خیمے میں دشمن قیدی کے زخم کی ڈریسنگ کر رہی ہو۔

آہستہ آہستہ میں پُرسکون ہوتا گیا اور میرے دل پر رکھی ہوئی غم کی چٹان کا بوجھ بھی پہلے جیسا جان لیوا نہیں رہا۔ میری

مایوسی اور بے بسی کے اندھیرے میں حوصلے کی تھوڑی سی روشنی اتر آئی جس میں اپنے مستقبل کے لائحہ عمل کا راستہ تلاش کرنا میرے لیے ناممکن نہ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں واقعی اکیلا نہیں ہوں۔ مجھ میں حوصلہ ہے اور طاقت ہے کہ میں شادو کو خوش رکھ سکوں اور اس سے کیے گئے سارے وعدوں کو استقامت کے ساتھ پورا کر سکوں۔

میں نے اپنے آنسو پونچھ کے نیلم کو دیکھا "نیلم۔ تم مجھے چپ کرا رہی تھیں اور خود رو رہی ہو۔"

اس نے خفت سے کہا "میرا دل اتنا پتھر نہیں ہے ناصر۔ کہ تم کو روتا دیکھتی رہتی' آئندہ ایسا مت کرنا۔"

میں نے کہا "رونے کے لیے میں اور کہاں جاؤں گا نیلم؟"

وہ آنسوؤں میں مسکرائی "اچھا۔۔۔ یہ بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ ہم ایسے ہی چھپ کے روئیں گے ایک ساتھ۔"

"میں نے اچھا کیا کہ یہاں آ گیا لیکن اب میں جاتا ہوں۔ بے شک وہ شک کرنے والی عورت نہیں ہے لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ میں دو دن کی دلہن کو سوتا چھوڑ کے نکل جاؤں اور اسے معلوم ہو کہ میں کہاں ہوں' وہ محسوس تو کرے گی۔"

"اس کی جگہ میں ہوتی تو تم مشکل میں پڑ جاتے۔ میں تمہاری صفائی میں کسی ضروری کام کا عذر کبھی قبول نہ کرتی" نیلم نے کہا۔

"شادو بہت مختلف ہے۔"

"شادو بہت مجبور بھی ہے" نیلم نے کہا "اسے یہ احساس نہ ہو کہ تم اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔ میں تو مالک ہوں اپنی مرضی کی۔"

دو گھنٹے بعد میں واپس پہنچا تو شادو فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ریسیور رکھ دیا "بہت دیر کی تم نے۔ ایسا کیا ضروری کام پڑ گیا تھا نیلم کو" شادو کے لہجے سے صاف ناگواری عیاں تھی۔

"جان۔ تم خفا ہو مجھ سے یہ بتاؤ ناشتا کیا؟" میں نے اسے چومنے کی کوشش کی۔

"کر لیا۔ خفا میں اس لیے ہوں کہ نیلم نے مجھے کچھ بتایا نہیں اور تم بھی باتوں میں ٹالنا چاہتے ہو؟" اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

میں نے ہنس کے کہا "یہ شادی کے بعد پہلی لڑائی ہے ہماری۔ کیا خیال ہے یہ سین کچھ لمبا ہونا چاہیے۔ میں ایک مثالی شوہر کی طرح دہاڑتا ہوں کہ خبردار جو پھر کبھی زبان چلائی۔ میں مجازی خدا ہوں تمہارا۔ جہاں جی چاہے گا جاؤں گا' اور تم رونا دھونا شروع کرو اور دو مکی دو میکے جانے کی۔"

وہ ہنسنے لگی "میرا میکا ہے کہاں۔ ہاں لڑائی ضرور ہوگی اگر تم نے مجھ سے کچھ چھپایا۔"

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا "کمال ہے۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔"

شادو کے چہرے پر ایک سایہ سا آ کے گزر گیا "کیا مطلب؟ میں نے کیا چھپایا ہے تم سے؟"

"ابھی تک مجھے تم نے یہ نہیں بتایا کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"کیسے ارادے؟" وہ کچھ نروس ہونے لگی۔

میں نے ہنس کے کہا "یہی۔۔۔ کہ آج ہم کیا کریں گے۔ ایسے دن رات گھر میں بیٹھ کے تو گزارے نہیں جا سکتے۔"

اس کا چہرہ پُراطمینان ہو گیا۔ "میں بھی یہی بات کرنا چاہتی تھی۔ جناب منہ اندھیرے نکل کھڑے ہوئے اور اب تشریف لائے ہیں دو گھنٹے بعد۔"

میں نے کہا "یار' نیلم کچھ پریشان تھی۔ بڑے ملک اور چھوٹے ملک کی وجہ سے۔۔۔ کہ ان کے خلاف قانونی کارروائی کرے یا نہ کرے۔ وہ خطرناک لوگ ہیں۔ صلح پسندی کو کمزوری سمجھ کے شیر نہ ہو جائیں اور قانونی کارروائی کے جواب میں اپنی عادت اور روایت کے مطابق بدمعاشی پر نہ اتر آئیں۔"

"یہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو" شادو نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "ابھی تم کو میرے ساتھ جانا ہے۔"

"کہاں جانا ہے۔ تم ان سے لڑنے جا رہی ہو؟" میں نے کہا "ایسے خالی ہاتھ تو نہیں جانا چاہیے ہمیں۔ ایسا کرو تم انھالو کلاشنکوف' میں راستے میں سے لے لوں گا بھٹکیوں کی توپ اور ماسی کے ہاتھ میں ہو اس کا چمٹا۔"

وہ ہنسنے لگی "آج ہم اپنے گھر چلیں گے۔"

میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ تمہارا مطلب ہے ہاشمی صاحب کے گھر "یہ اپنا گھر نہیں ہے کیا؟"

"بالکل ہے مگر اپنا ایک دوسرا گھر بھی ہے۔ جو پہلے میرا گھر تھا۔ اسے چھوڑا تو نہیں جا سکتا۔ اس کی ذمے داری اب تمہاری ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔"

"اگر مگر کچھ نہیں۔ ایک بات طے ہو گئی تھی ہمارے درمیان کہ جو تمہارا ہے وہ میرا ہے اور جو میرا ہے وہ تمہارا ہے۔ میاں بیوی ہیں ہم تو پھر میرا تیرا کا کیا سوال۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک ہے لیکن شادو جی' میں وہاں نہیں رہوں گا۔"

"تم وہاں رہو گے جہاں میں رہوں گی۔ یہاں یا وہاں کی بات نہیں۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

میں نے کہا "اچھا چلتے ہیں۔ یہ ماسی ہیرا اور اپنے ڈاکٹر رانجھا کہاں چلے گئے؟"

"وہ گئے ہیں وہیں' جہاں سے آئے تھے۔"

"کیا۔۔۔" میں نے چونک کے کہا "تم نے نکال دیا انہیں؟ اچھی مالکن بنی ہو تم اس گھر کی۔"

شادو کا رنگ فق ہو گیا "ناصر۔ کیا ایسا سمجھتے ہو تم مجھے؟ میں اتنی گھٹیا اور تنگ دل ہوں۔۔۔ میں نے انہیں بھیجا ہے اپنا سامان لانے کے لیے۔ وہ لوٹ کے یہاں آنے پر راضی نہیں تھے۔ میں نے انہیں قسمیں دے کے اور ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کے انہیں راضی کیا اور تم الٹا مجھے الزام دے رہے ہو۔"

میں شرم سے پانی پانی ہو گیا "آئی ایم سوری شادو۔"

"کیا سوری۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "بڑا مان تھا مجھے تم پر کہ تم مجھے سمجھتے ہو۔ میرا مان توڑ دیا تم نے ایسی چھوٹی بات کہہ کے۔ رانجھا بالکل تیار نہیں تھا یہاں اپنا کلینک دوبارہ کھولنے پر۔ میں نے اسے بھی منا لیا۔"

"دیکھو شادو! میں اپنا قصور مانتا ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کے اس کی آنکھوں کو چوما۔

"تم نے تو۔۔۔ وعدہ کیا تھا۔ میری ہر بات مانو گے" وہ سسکیاں لیتی رہی۔

"بالکل مانوں گا۔۔۔ ایک بار نہیں ہزار بار مانوں گا" میں نے کہا۔

وہ بولی "تم نے میری قسم کھائی تھی۔ داتا صاحبؒ کے دربار میں عہد کیا تھا۔"

"بالکل کیا تھا۔ اب بتاؤ کیا حکم ہے میرے لیے۔"

وہ مسکرانے لگی "تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ یہ وعدہ کیا تھا تم نے۔"

"ارے بابا کیا میں انکار کر رہا ہوں۔ کتنی بار کہنا پڑے گا یہ مجھے آخر۔ کیا میں لکھ کے دے دوں۔ دستخط بھی کر دوں اور انگوٹھا بھی لگا دوں۔" میں نے اس کے گالوں اور ہونٹوں پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا اور اسے منانے میں کامیاب ہو گیا۔

ہاشمی صاحب کی کوٹھی کے در و بام ایک سوگوار ویرانی میں ڈوبے نظر آئے تھے۔ یہ صرف میرے احساس کی بات تھی۔ وہاں سے گزرنے والے کو صرف اس کوٹھی کی شان و شوکت اور خوب صورتی متاثر کرتی ہو گی۔

جب میں نے اپنی سوزوکی کار سے اتر کے کال بیل کا بٹن دبایا تو مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایک وقت تھا کہ میں یہاں سائل بن کے آیا تھا۔ میں ایک لاوارث اور بے گھر شخص تھا جس کو شاہ جی سے جان کا خطرہ لاحق تھا اور تحفظ کے لیے مجھے ہاشمی صاحب کی قانونی امداد کی ضرورت تھی۔ ان کی خدمات حاصل کرنے یا انہیں اپنا قانونی مشیر سمجھنے کا میرے جیسا بے سہارا اور غریب آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت بڑے وکیل تھے اور یہ ان کی غریب پروری یا خدا ترسی تھی کہ انہوں نے میرے جیسے بے مایہ شخص کو سہارا فراہم کیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ ہاشمی صاحب کی نیت بدل گئی اور اس کے ساتھ ہی میرے جذبات بدل گئے۔ مجھے اس گھر میں بن بلائے مہمان کے مرتبے سے ہٹا کر ناپسندیدہ شخصیت قرار دے دیا گیا اور بالآخر مجھ پر اس گھر کے دروازے بند کر دیے گئے۔ ہاشمی صاحب جو پہلے میرے محسن تھے' اب میری نظر میں ایک ہوس پرست غاصب اور شیطان ہو گئے جنہوں نے زور اور زر سے شادو کو ورغلا لیا تھا اور میری محبت کتے کے اس پلے کی طرح کوٹھی کی دیواروں کے باہر چاؤں چاؤں کرتی رہ گئی تھی جسے فٹ بال کی کک مار کے باہر پھینک دیا گیا ہو۔

آج میں اس گھر میں مالک کی حیثیت سے داخل ہونے آیا تھا۔ بدلتا ہے وقت آسماں کیسے کیسے اور وقت کے ساتھ آدمی کے جذبات بھی کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ میں نے ممنونیت کے جذبات کو یاد کیا جب میں ڈرا سہا پہلی بار ہاشمی صاحب کی عالی شان کار میں بیٹھ کے یہاں آیا تھا پھر وہ وقت آیا جب میں نے چشمِ تصور سے ہاشمی صاحب کے ساتھ مجلۂ عروسی میں شادو کو دیکھا اور میرے جذبات میں نفرت کا زہر اور جلا کے خاک کر دینے والی آتش انتقام کا دھواں بھر گیا تھا اور آج جب ہاشمی صاحب اپنی دولت مندی کی طاقت اور غرور کے ساتھ خاک میں مل چکے تھے اور میں جو شادو پر ملکیت اور محبت کا حق پا چکا تھا اور اس کوٹھی کا مالک ہو گیا تھا تو میرے جذبات بالکل مختلف تھے۔

اندر سے آنے والے عمر رسیدہ چوکیدار نے دوسری کال بیل پر بیزار لہجے میں کہا "او کون ہے بھئی۔ آ رہا ہوں یار!" پھر اس نے بڑے آہنی گیٹ میں بنا ہوا چھوٹا دروازہ کھولا اور مجھے شادو کے ساتھ کھڑا دیکھ کے جیسے اس پر بجلی گری۔

اس نے بڑی مشکل سے ہاتھ کو سلام کے لیے اٹھایا

"آپ۔۔۔ آپ جی۔"

شادو نے کہا "اب راستہ چھوڑو اور بند کرو ہنگلانا۔"

وہ گھبرا کے ایک طرف ہو گیا "جی۔۔۔ جی بیگم صاحبہ۔ میں اندر سے دروازہ کھولتا ہوں۔ چابیاں لے آؤں۔"

وہ پچھلے حصے میں اپنے سرونٹ کوارٹر کی طرف بھاگا۔ اس کی بدحواسی پر مجھے ہنسی آئی۔ اس نے ایک بار بڑی حقارت آمیز بیزاری سے مجھے یہ رسوا کن اطلاع دی تھی کہ بیگم صاحبہ اور صاحب تو ہنی مون پر لندن چلے گئے ہیں۔ اس کا انداز بالکل فقیر کو دھتکارنے والا تھا۔

شادو نے کہا "بہت پرانا ملازم ہے اور بہت بھروسے کا۔ چوکیداری بھی کرتا ہے اور مالی کا کام بھی۔"

شادو کے ساتھ میں گیلری سے گزر کے پہلے حصے تک گیا۔ وہاں سرونٹ کوارٹر کے سامنے چوکیدار کی بیوی اور بیٹی یا بہو کے ساتھ تین بچے ہکا بکا کھڑے مجھے اور شادو کو ایسے دیکھ رہے تھے جیسے ہم کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں۔

چوکیدار نے بڑی مستعدی سے دروازوں کے قفل کھولے پھر اندر جا کے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے۔ اندر کے بند کمروں میں محبوس ہوا کی مخصوص بُو تھی۔ چوکیدار نے لائٹس جلائیں اور ہوا باہر نکالنے والے پنکھے آن کیے۔ اس وقت تک چوکیدار کی بیوی کچن میں پہنچ گئی تھی۔ شادو نے اپنا پرس بیڈ پر پھینک کے چوکیدار کو حکم دیا "اے سی چلاؤ اور دیکھو' میرے لیے چائے لاؤ' صاحب کے لیے کافی۔ دوپہر کا کھانا ہم ذرا دیر سے کھائیں گے۔ بس اب جاؤ۔"

چوکیدار نے اپنے حواس پر قابو پا لیا تھا اور اب وہ میری طرف بھی مشکوک سوالیہ نظروں سے نہیں دیکھ رہا تھا "جی بیگم صاحبہ!" وہ الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔

میں شادو کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ یہ ہاشمی صاحب کا بیڈ روم تھا۔ وہی بیڈ روم جس میں انہوں نے شادو کے ساتھ شبِ عروسی گزاری تھی۔ میرے سامنے وہ بیڈ تھا جس پر وہ شادو کو اپنے ساتھ لپٹا کے سوتے ہوں گے۔ آج وہ مٹی کے بستر پر ڈھانچا بنے لیٹے تھے۔ ان کو مٹی کھا گئی تھی اور زمین کے کیڑے چاٹ گئے تھے۔ اس خیال نے مجھے ایک احساسِ فتح مندی سے دوچار کیا جس میں انتقامی جذبات کی غرور آمیز طمانیت تھی۔

میں نے بیڈ سائڈ پر رکھی ہوئی ہاشمی صاحب کی تصویر کو دیکھا۔ ایک ڈبل سنہرے فریم میں ان کی تصویر کے ساتھ شادو دلہن بنی مسکرا رہی تھی۔ بیڈ سے میری نظر وارڈ روب پر گئی۔ اس کے اندر بھی ہاشمی صاحب کے بیش قیمت سوٹ ہوں گے اور وہ کالے کوٹ جو وکیل پہنتے ہیں۔ ان کے نائٹ سوٹ اور عام استعمال کے کپڑے جس میں شاید ابھی تک ہاشمی صاحب کی بُو بسی ہوئی تھی۔

شادو کی نظر میری نگاہ کے تعاقب میں تھی۔ "میں۔۔۔ یہ سب ہٹاؤں گی یہاں سے۔"

"کیا اس کوٹھی میں یہ ایک ہی بیڈ روم ہے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ دو بیڈ روم اور بھی ہیں" شادو نے کہا "یہ ماسٹر بیڈ ہے۔"

"اسے ہم بعد میں استعمال کریں گے" اچانک مجھے اپنے لہجے میں بے پناہ اعتماد محسوس ہوا "میں چاہتا ہوں کہ اس بیڈ روم کی ہر چیز بدل دی جائے۔ دیواروں کا رنگ' فرنیچر' پردے' قالین۔"

شادو کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی "میں یہ سب آج ہی نکلواؤں گی پھر جو تمہیں پسند ہو' ہم سودے آئیں گے یا آرڈر دے کر بنوالیں گے۔ تب تک گیسٹ بیڈ بھی برا نہیں' آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔"

باہر آ کے میں نے قدرے بہتر محسوس کیا۔ نہ جانے کیوں ماسٹر بیڈ روم میں میرے اعصاب پر دباؤ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہاں ابھی تک ہاشمی صاحب کی روح نظر نہ آنے کے باوجود ہر گوشے میں موجود ہے۔ پردوں کے پیچھے اور وارڈ روب کے بند پٹوں کے پیچھے اور بے شکن خالی بستر پر اور نائٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں اور ائرکنڈیشنر سے نکلتی ٹھنڈک کی سرسراہٹ میں۔

میں نے اپنے سر کو جھٹکا اور خود کو یقین دلایا کہ میں اس احساس سے خائف نہیں ہوں۔ ہاشمی صاحب نہیں اب میں اس جگہ کا اور یہاں کی چیزوں کا مالک ہوں اور میں نے ایک قانونی اخلاقی اور شرعی جواز کے ساتھ یہ حق ملکیت حاصل کیا ہے۔

میرے خیالات میں یہ تبدیلی بھی اچانک آئی تھی۔ کوٹھی کے اندر قدم رکھنے سے پہلے میں نے یہاں رہنے کی مجبوری کو شادو کی خواہش سمجھ کے قبول کیا تھا مگر اب مجھے سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ جو شادو کا ہے وہ میرا ہے۔ میں نے سوچا اور جب شادو کی یہ کوٹھی اتنی پُر آسائش ہے تو مجھے اپنے اس پانچ مرلے کے فضول سے پرانے مکان میں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی زندگی میں کامیابی کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اس کا مقصد انہی چیزوں کا حصول ہوتا ہے جو یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پہلے سے موجود ہیں۔ اگر میں یہاں نہیں رہتا اور ان سب چیزوں کو استعمال نہیں کرتا تو یہ خودداری کا نہیں جھوٹی انا کا اور احساسِ کمتری کے کمپلیکس کا مسئلہ ہوگا۔

شادو اب بہت مطمئن اور پُرسکون تھی۔ اس کے دل میں کہیں اس اندیشے کی خلش نہیں تھی کہ شاید میں اپنی انانیت پسندی اور مجروح جذبات کے باعث یہاں رہنے سے انکار کردوں گا۔

گیسٹ ہاؤس بھی کسی طرح کم پُرتکلف نہ تھا۔ یہ سائز میں ماسٹر ہاؤس سے کچھ کم تھا لیکن یہاں ہاشمی صاحب کی زندگی کا کوئی عکس براہِ راست کسی چیز کی یاد سے نہیں جھلکتا تھا۔ ویسے تو یہ سب کچھ انہی کا تھا۔ ان کی ساری زندگی کی محنت کا حاصل تھا جو شادو کے ذریعے مجھ تک پہنچا تھا مگر ان کے ذاتی استعمال کی اشیا کا یہاں وجود نہیں تھا۔ یہاں میں نے زیادہ ایزی محسوس کیا۔

چائے اور کافی لانے والی تیس سال کی یا کچھ کم عمر کی ایک عورت تھی جس کے بارے میں شادو نے بتایا کہ یہ ڈرائیور کی بیوی ہے اور چوکیدار کی بہو ہے۔ یہ کچن سنبھالتی ہے اپنی ساس کے ساتھ اور صفائی وغیرہ کرتی ہے۔

میں نے کہا "یعنی ایک پورا خاندان تمہاری خدمت کررہا ہے۔"

"ہاں۔ ہاشمی صاحب نے چالیس سال پہلے چوکیدار کو ملازم رکھا تھا۔ یہاں نہیں' اس وقت اتنی بڑی کوٹھی کہاں تھی ان کے پاس۔ وہ خود بھی اکیلے تھے اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ چوکیدار ان کا ڈرائیور بھی تھا اور گھر کے دوسرے کام بھی کرتا تھا۔ بعد میں ہاشمی صاحب کی شادی ہوگئی۔ چوکیدار کا بھی گھر بس گیا۔ ہاشمی صاحب اکیلے رہ گئے۔ بیوی مرگئی اور بچے اِدھر اُدھر ہوگئے۔ بیٹیاں رخصت ہوکے اپنے گھر کی ہوگئیں۔ ایک کراچی میں ہے اور دوسری دبئی میں۔ دو بیٹے تھے' ایک امریکا پہنچا اور اس نے دوسرے کو بھی بلالیا۔"

"ہاشمی صاحب کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔"

"تھا۔ واجبی سا۔ کبھی کبھی فون آجاتا تھا۔ جب انہوں نے دوسری شادی کی تو سب نے قطع تعلق کرلیا۔ اس سے فرق کچھ بھی نہیں پڑا۔ سالوں میں کبھی کبھار کا آنا جانا ہی رہا اور بس۔ چوکیدار کے بچوں میں سے ایک بڑا ہوا تو ہاشمی صاحب کا ڈرائیور بن گیا اور ڈرائیور نے چوکیداری سنبھال لی۔ بیٹے کی شادی ہوئی تو اس کی بیوی کو بھی اوپر کا کام سونپ دیا گیا۔ کھانا پکانا اسے نہیں آتا۔ اس کے بھی تین بچے ہیں۔ یہ نذیراں ہے۔ اس کی ساس کا نام نوراں۔"

اور یہ سب ایک ہی کوارٹر میں رہتے ہیں؟"

"دو کوارٹر تھے جن کو دروازہ نکال کے ایک بنالیا ہے۔ بہت خوش اور مطمئن ہیں سب کہ عزت آرام سے بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "کیسی عجیب بات ہے۔ ان کا یہ اطمینان اور یہ قناعت پسندی۔ کیا ان کا دل ایسی کوٹھی میں ٹھاٹ باٹ سے رہنے کے لیے نہیں مچلتا۔"

"میرا خیال ہے آدمی کبھی ناممکن کی تمنا نہیں کرتا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ جیسے تم جانتے ہو کہ آدمی چاند پر جاسکتا ہے مگر تم نے کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ مجھے چاند پر جانا ہے۔ ناصر' اب ہم یہیں رہیں گے نا؟"

اس نے اچانک سوال کردیا تھا۔ میں نے کہا "ہاں۔ تم چاہتی تھیں نا؟"

"ہم ماسی ہیر کو اور ڈاکٹر رانجھے کو بھی یہاں بلالیں گے۔"

میں نے بے خیالی میں کہا "ہاں۔"

"کیا خیال ہے تمہارا؟ وہ آجائیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "نہیں۔ انہیں کیا مجبوری ہے۔"

"کیا تم مجبور ہو؟" وہ کچھ افسردہ ہوگئی۔

"ہاں۔ میں تم سے کیے ہوئے وعدوں کا پابند ہوں۔ جہاں تم کہو گی اور رہو گی' میں وہاں رہوں گا۔"

"لیکن مجبوراً۔ اپنی خوشی سے نہیں؟"

میں نے ہنس کے کہا "شادو جی۔ تمہارے ساتھ جنم میں بھی رہنا پڑے تو میں خوش' میری خوشی تم سے ہے۔ کسی جگہ سے نہیں۔"

اس نے اٹھ کے مجھے چوما تو میں نے اسے اپنی بانہوں میں جکڑلیا "مجھ سے اتنے وعدے لیے۔ اتنی قسمیں کھانے پر مجبور کیا مجھے۔ اب ایک وعدہ تم بھی کرو مجھ سے۔"

وہ شرما کے کسمسائی "ارے کیا کرتے ہو۔ دروازہ تو بند کردو۔ نوکر ہیں گھر میں' وہ کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ میاں بیوی پیار کررہے ہیں۔ یہ کون سی انوکھی بات ہے' وہ نہیں کرتے کیا" میں نے کہا۔

اس نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور میرے سینے پر سر رکھ دیا "اب اور کیا چاہتے ہو تم مجھ سے؟"

میں نے کہا "بس ایک وعدہ کہ پھر چھوڑ کے نہیں جاؤ گی۔"

وہ اُداسی سے مسکرائی "اس زندگی کی آخری سانس بھی تمہاری ہے ناصر!"

اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کا جسم کچھ گرم ہورہا ہے "شادو' کیا بخار ہے تمہیں؟"

"پتا نہیں' بس ایسے ہی طبیعت کچھ گری گری لگتی ہے۔"

میں نے اسے گود میں اٹھایا اور بیڈ پر لٹادیا "میں ڈاکٹر کو بُلاتا ہوں۔"

شادو نے میرا ہاتھ پکڑلیا "نہیں۔ معمولی حرارت ہے۔ شاید تھکن کا نتیجہ ہے۔"

"تھکن کیسی' صبح سے تم نے کون سے پہاڑ کھودے ہیں؟"

"تو پھر رات کی تھکن ہوگی" وہ ہنسی اور پھر شرمائی۔

"ایسے نہیں جان۔ بتاؤ کسے فون کروں۔ ڈاکٹر نوید کو بلاؤں یا کوئی فیملی ڈاکٹر ہے۔"

وہ اٹھ بیٹھی "خدا کے لیے ناصر۔ میں اسپرین کھالیتی ہوں۔ ایسے بات بات پر تم پریشان ہوکے ڈاکٹر کو بلاؤ گے؟"

میں نے کہا "یعنی جب بخار تیز ہوجائے اور حالت بگڑ جائے تمہاری تب بلاؤں۔ اس وقت تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہوں؟"

چوکیدار کی بیوی دروازے پر دستک دے کر اندر آگئی۔ "بیگم صاحب جی' دوپہر کے کھانے میں۔"

"نوراں صاحب سے پوچھو؟" شادو نے کہا "اور یہ بات سب کو بتادو کہ آج سے اس گھر میں صاحب کا حکم چلے گا۔ یہ ہیں تمہارے مالک۔"

نوراں نے سر جھکا کے کہا "جی بیگم صاحبہ!"

میں نے کہا "یہ کھانے پکانے اور امورِ خانہ داری کے معاملات اپنے پاس رکھو بیگم صاحبہ۔ مجھے نہیں آتا یہ سب۔ میں ایک مثالی شوہر ہوں۔ ٹینڈے بینگن کدو کرلے سب کھاسکتا ہوں اور دل پر پتھر رکھ کے جھوٹ موٹ مسکرا بھی سکتا ہوں۔ تعریف بھی کرسکتا ہوں۔"

دوپہر کے کھانے تک شادو کا بخار تیز ہوگیا۔ اسپرین کھانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے میرے مجبور کرنے پر تھوڑا سا کھانا کھایا مگر دس منٹ کے بعد وہ سردرد سے کراہنے لگی۔ میں نے پھر ڈاکٹر کو بُلانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑلیا "بس تم بیٹھ جاؤ میرے پاس۔ میرا سر دباؤ۔"

میں نے کہا "میں کہیں نہیں جارہا ہوں۔ تمہارا سر بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دبادوں گا مگر ڈاکٹر کو ضرور بلاؤں گا۔"

ڈاکٹر نوید کے آنے تک وہ بے ہوش ہو چکی تھی اور میری تشویش میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔

یہ گویا BEGINNING OF THE END ہے۔ میں نے شادو کا بے جان ہاتھ تھام کے سوچا۔ آنے والے وقت میں END کیسے ظاہر ہو گا۔ شادو کی اذیت اور میرے عذاب کی صورت کیا ہو گی' اپنی اپنی آزمائش سے ہم کیسے گزریں گے' یہ سب سوال لاحاصل اور لاجواب تھے مگر آگے نامعلوم مستقبل میں میری آنکھیں بہت سے ہولناک مناظر دیکھ سکتی تھیں اور اس دن کو بھی جب شادو ایک نام' ایک خیال اور ایک یاد کے سوا کچھ نہ ہو گی۔ ایک تصور یا کوئی مجسد تصویر رہ جائے گی۔

ڈاکٹر نوید نے ایک پیشہ ورانہ انداز بے نیازی سے شادو کا معائنہ کیا اور اپنے اطمینان سے مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ معمولی بخار ہے اور بے ہوشی محض اعصابی کمزوری ہے۔ اس نے ایک انجکشن لگایا اور مجھے دوائیں لکھ دیں۔ یہ کہا کہ انجکشن روز لگے گا۔ دوا کی گولیاں کب اور کیسے کھائی جائیں گی' یہ بتا کے اس نے میرے شانے پر تھپکی دی "شام تک سونے دو اسے۔ اٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہو گی۔ تم نے اچھا کیا کہ یہاں آ گئے۔ بہت شاندار جگہ ہے۔"

میں نے کہا "آپ ذرا تشریف رکھئے ڈرائنگ روم اُدھر ہے۔"

"میں چائے نہیں پیوں گا' مجھے جلدی ہے۔"

"میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے کچھ پوچھنا تھا آپ سے۔"

وہ میرے ساتھ آ گیا "یس۔"

"TELL ME EVERYTHING" میں نے اس سے کہا۔

وہ چونکا "کیا؟"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے کہ شادو کو بلڈ کینسر ہے۔ اس کو لندن کے ڈاکٹرز نے چھ مہینے دیے تھے۔ تین گزر چکے ہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "ویل۔"

میں نے کہا "بلڈ کینسر کا علاج ہے۔ بچوں کو ہوتی ہے یہ بیماری اور ان کا خون بدلا جاتا ہے۔ وہ زندہ رہتے ہیں۔"

"یہ تھیلی سیمیا نہیں ہے" ڈاکٹر نے کہا "بلڈ کینسر کی ایک سو ایک اقسام ہیں۔ کچھ انتہائی مہلک اور ناقابل علاج۔ انہی میں سے ایک ہے۔"

"BONE MARROW TRANSPLANT بھی ہوتا ہے باہر ایک طریقۂ علاج۔"

"ہاں۔ اس میں سو فیصد کامیابی کا تناسب نہیں ہے اور پیچیدگیاں بہت پیدا ہو جاتی ہیں۔ کچھ لوگ کافی عرصہ گزار دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "جہاں بالکل امید نہ ہو وہاں یہ رسک لینے میں کیا ہوتا ہے؟"

ڈاکٹر نوید نے سر ہلایا "میں نے لندن سے آنے والی رپورٹیں دیکھی تھیں۔ اس بیماری کا پتا دیر سے چلا اور جب پتا چلا تو شادو PREGNANT تھی۔ کچھ بھی کرنا ممکن نہیں تھا اس وقت۔"

"کیوں ممکن نہیں تھا؟ بچہ مر جاتا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"صرف بچے کی بات نہیں۔ شادو کا SURVIVE کرنا بھی مشکل تھا بلکہ ناممکن۔ اب وقت گزر چکا ہے۔ آئی ایم سوری۔"

"کہیں بھی کوئی چانس نہیں؟" میں نے مایوسی کے اندھیرے میں امید کی ایک کرن تلاش کی۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا "ہوتا تو میں تمہیں ضرور مشورہ دیتا کہ چانس لو۔ زندگی اور موت بہرحال خدا کے ہاتھ میں ہے اور طبی دنیا میں بھی معجزے ہوتے ہیں۔ میری نالج میں تو ایسے کیس ہیں جو میڈیکل ریسرچ کے سارے مستند نظریات کی واضح نفی کرتے ہیں۔ میں نے سنا ہی نہیں' خود دیکھا ہے ایسے مریضوں کو جو لاعلاج قرار دیے جا چکے تھے اور پتا نہیں کیسے وہ بچ گئے۔ عجیب و غریب واقعات ہیں۔ کسی کو شفا مل گئی ایک ایسے شخص کی دوا سے جو نہ ڈاکٹر ہے نہ حکیم۔ کوئی پڑیا دیتا ہے تو کوئی اپنی گولی جس کے بارے میں کچھ پتا نہیں کہ وہ کیا ہے۔ روحانی طریقۂ علاج اپنی جگہ ہے۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے صرف دوا پر اور مسلمان کی حیثیت سے دعا پر یقین رکھتا ہوں۔ تمہیں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ تم شادو کو جعلی ڈاکٹروں' حکیموں اور نیا سی باوا کہلانے والوں کے پاس لے جاؤ یا دھوکے باز پیروں فقیروں کے چکر میں پڑو' تم خود بھی سمجھ دار اور تعلیم یافتہ ہو۔"

"پھر میں کیا کروں' صرف اس کی موت کا انتظار؟"

"تم اسے خوش رکھو' مطمئن رکھو' دوا کے ساتھ دعا کرو۔"

میں نے کہا "جب دوا کا فائدہ ہی نہیں۔"

"دوا صرف اس کی تکلیف کم کرے گی۔ یہ ایک بھیانک حد تک تلخ حقیقت ہے جس پر ڈاکٹر یقین کرتے ہیں کہ ہر شخص کو ایک پُرسکون اور کم سے کم تکلیف والی موت مرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ سزائے موت پانے والوں پر بھی لاگو ہونے والا اصول ہے" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک آخری بات..... آپ کا تجربہ اور اندازہ کیا کہتا ہے؟"

میرے نامکمل سوال کو ڈاکٹر نے سمجھ لیا اور نفی میں سر ہلایا "کوئی بھی قطعی طور پر یہ نہیں بتا سکتا۔ یہ ناممکن ہے' ہر مریض کی قوتِ ارادی پر بہت کچھ منحصر ہے۔ تم سمجھ لو ..... چار سے چھ ہفتے۔"

مجھے ایک چکر سا آیا۔ میری آنکھوں کے سامنے دن کا اجالا تاریکی بن گیا اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں کسی گہرے کنوئیں میں اترتا جا رہا ہوں۔ ڈاکٹر کے "خدا حافظ" کہنے کی آواز میرے کانوں میں بازگشت کی طرح آئی۔ جیسے اندھے کنوئیں کے اوپر سے کسی نے بہت گہرائی میں مجھ سے کچھ کہا ہو۔

میں صوفے پر گر گیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کمرے کی دیواریں مجھ پر جھک آئی ہیں اور سمٹتی جا رہی ہیں۔ دیواروں کے چہرے سپاٹ تھے۔ دروازوں اور دریچوں کے بغیر۔ ہوا کے لیے کوئی روزن بھی نہ تھا۔ اندھیرے میں موت کی سرسراہٹ تھی اور ہڈیوں تک اتر جانے والی خنکی تھی پھر باہر نہ جانے کہاں سے کسی کے بین کرنے کی آواز آنے لگی۔ چار سے چھ ہفتے' چار ہفتے کیا ہوتے ہیں۔ ایک مہینے کے تیس دن۔ آج کیا تاریخ ہے' کون سا مہینہ ہے۔ میرے تصور میں ایک قبر کے کتبے کی تحریر اُبھر آئی۔ اس پر لکھی ہوئی تاریخ صاف پڑھی جاتی تھی۔ دن مہینہ سال۔ سب واضح تھا۔ صرف نام نہیں تھا' نام کی جگہ خالی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے ہوش آیا تو میں سر سے پاؤں تک ٹھنڈے پسینے میں ڈوبا ہوا تھا اور میرے بدن پر کپکپی طاری تھی۔ میری نظریں بے اختیار اپنے سامنے دیوار پر آویزاں کلاک پر گئیں جس کی سیکنڈ کی سوئی مسلسل حرکت کر رہی تھی۔ اس میں تاریخ کے خانے میں سات کا عدد نظر آ رہا تھا۔ آج منگل کا دن تھا۔ وقت آگے کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ سات ستمبر سے سات اکتوبر کے درمیان پھیلے ہوئے وقت کی مسافت میرے سامنے تھی اور یہ اتنا تھی اس رفاقت کے سفر کی جو ابھی میں نے شادو کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اس سے آگے خلا تھا اور تاریکی تھی جس میں شادو کو غائب ہو جانا تھا اور مجھے اس کو چھوڑ کے اپنا راستہ بدل کے زندگی کی طرف اور روشنی کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔

نوراں کی آواز پر میں چونکا "کیا بات ہے؟"

"صاحب جی۔ بیگم صاحبہ سو رہی ہیں۔ آپ کے لیے کھانا لگا دوں؟"

میں نے کہا "نہیں' تمہارا بیٹا کہاں ہے' اسے بھیجو میرے پاس۔"

چند منٹ بعد ڈرائیور حاضر ہو گیا۔ یہ وہی ڈرائیور تھا۔ وہ پہلے مجھے اور شادو کو ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کے لیے کورٹ لے کر گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میرا اور شادو کا تعلق فقیروں کے ایک ڈیرے سے تھا اور اس کے ساتھ گاڑی میں شادو کے ساتھ گھومتے ہوئے میری ملاقات شاہ جی سے بھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سابق مالک ہاشمی صاحب کا بدلا ہوا رویہ بھی دیکھا تھا پھر ایک فقیر زادی اچانک اس کی بیگم صاحبہ بن گئی تھی اور اس کا چاہنے والا' اس کا پرستار' عاشق صادق اور مجنوں۔ اس در پر بھونکنے والے پاگل کتے کی طرح ذلت کے ساتھ دھتکارا گیا تھا۔

میں نے کہا "کیا نام ہے تمہارا؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "علی نواز۔ ولد رب نواز۔"

میں نے کہا "مجھے پہچانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح۔" اس نے نظریں اٹھا کے کہا "ابھی بتایا ہے بیگم صاحب نے میرے ابا کو۔"

"کیا بتایا ہے؟" میں نے محسوس کیا کہ علی نواز کے رویے میں نئے مالک کے لیے احترام کے بجائے ناپسندیدگی آمیز سرکشی ہے۔

"یہی۔ کہ اب آپ ہمارے نئے مالک ہو" وہ بولا تو اس کے لہجے میں دکھ تھا اور مایوسی تھی "آپ ناراض مت ہونا' مالک بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تو بس دانے پانی کی بات تھی کہ ہم چالیس سال تک ایک ہی گھر کا نمک کھاتے رہے ورنہ نوکری کا کیا ہے' سو دو سو کے لالچ میں بھی لوگ گھر چھوڑ دیتے ہیں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "آرام سے بیٹھ جاؤ علی نواز۔"

"نہیں جی۔ کوئی بھی بات نہیں کرنی ہے مجھے۔" وہ بولا "میرا ابا جب اللہ بخشے ہاشمی صاحب کے پاس نوکری کے لیے آیا تھا تو اس کی عمر بیس سال تھی۔ یہ اس نے بتایا ہے مجھے' اس نے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔ ہاشمی صاحب نے اسے رکھ لیا۔ جب اس کے جھوٹ کا پتا چلا تو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انہوں نے ابا کو بے عزت کر کے نکالا نہیں۔ انہوں نے کہا اچھا' سیکھ لو گاڑی چلانا پھر خود انہوں نے گاڑی چلانا سکھایا اسے۔ انہوں نے اس کی شادی کرائی۔ رہنے کو جگہ دی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عزت دی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اچھے نوکر نہیں ملتے' سچی بات یہ ہے جی کہ اچھے مالک نہیں ملتے۔"

میرے دل میں ہاشمی صاحب کی تعریف سے حاسدانہ جذبات بیدار ہونے لگے "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو۔ تم نے پہلے سے کیوں فرض کر لیا ہے کہ میں ہاشمی صاحب کے مقابلے میں اچھا مالک ثابت نہیں ہو سکتا۔"

"ایسی تو میں نے کوئی بات نہیں کی" وہ بولا "بس آپ اجازت دو ہمیں۔ اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔"

اس کی بات نے مجھے حیران بھی کیا اور میں نے ایک نوکر کی طرف سے دیے جانے والے نوٹس پر ٹیکی بھی محسوس کی۔ "آخر کیا پریشانی لاحق ہو گئی ہے تمہیں؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ابا کی یہی مرضی ہے۔"

میں نے کہا "کہاں ہے تمہارا ابا۔ وہ خود بات کرنے کیوں نہیں آیا؟ تمہیں اپنا ترجمان بنا کے بھیج دیا۔"

"وہ رو رہا ہے جی۔ ادھر لیٹا ہوا ہے" اس نے ہاتھ سے کوارٹر کی سمت میں اشارہ کیا۔

میں نے کہا "اسے کہو کہ میں نے بلایا ہے۔ اچھا ٹھہرو' میں خود چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

سرونٹ کوارٹر کے سارے مکین' رب نواز اور اس کی بیوی نوراں۔ اس کی بہو نذیراں' ان کے تینوں بچے سب میری اچانک آمد پر سہم کر اور سٹ کر ایک کمرے میں چلے گئے۔ شاید وہ سب جانتے تھے کہ علی نواز کے ساتھ میرا آنا کیا معنی رکھتا ہے۔

دس فٹ چوڑے اور بارہ چودہ فٹ لمبے نیم تاریک کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ جھلنگا چارپائی پر رب نواز ایک ہاتھ ماتھے پر رکھے لیٹا تھا اور چھت کو گھور رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

"آپ مالک۔۔۔ علی نواز' پُتر ادھر رکھ وہ مونڈھا۔"

میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا "رب نواز چاچا۔ بیٹھنے کے لیے پھر کبھی آؤں گا۔ ابھی میں اپنے ایک کام سے آیا تھا۔"

"حکم کریں مالک!"

"دیکھو۔ نہ میں مالک ہوں تمہارا اور نہ مجھے مالک کہلوانا پسند ہے۔ ہم سب کا مالک ایک خدا ہے۔" میں نے کہا "کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

رب نواز کچھ حیران ہوا "یہ تو ایمان ہے جناب ہمارا۔"

"چاہے وسیلہ وہ کسی کو بنائے' مگر مجھے تمہیں' سمندر کی تہ میں پڑے گھونگے کو اور پتھر کے کیڑے کو رزق بھی وہی دیتا ہے" میں نے کہا۔

اس نے جھکا ہوا سر اقرار میں ہلایا "وہ سارے جہاں کا مالک ہے جناب!"

میں نے کہا "علی نواز نے مجھے بتایا کہ تم سب جانا چاہتے ہو۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم کہاں جاؤ گے؟"

"ہاشمی صاحب کے پاس آنے سے پہلے تھوڑی سی زمین تھی ہماری۔ میرا باپ زندہ تھا اس وقت اور اس پر ہل چلاتا تھا۔ تقسیم سے پہلے۔ فصل کی آمدنی سے ہمارا گزارا ہو جاتا تھا۔ پینسٹھ کی جنگ ہوئی تو میں شہر آ گیا۔ گاؤں میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ بعد میں باپ بھی مر گیا اور ماں بھی مر گئی۔ وہ جگہ کارپوریشن کی حد میں آ گئی۔ آس پاس مکان بننے لگے۔ میں نے زمین کے گرد دیوار کھینچ دی تھی تاکہ اس پر کوئی قبضہ نہ کر لے۔ ہاشمی صاحب نے کہا تھا مجھ سے۔ دیوار اٹھانے کا خرچا بھی انہوں نے دیا تھا۔ بڑی بیگم صاحبہ نے' ان کی پہلی بیوی نے۔ وہاں ہاشمی ایڈووکیٹ کا بورڈ بھی لگا دیا تھا میں نے۔ چوروں کا کیا ہے' دیوار پھاند کے اندر کود جائے..... ایک وکیل کا نام دیکھ کے کسی کی ہمت نہیں پڑی۔"

میں نے کہا "تو اب وہاں جا کے رہو گے تم؟"

"نہیں جناب۔ لاکھوں کی ہو گئی تھی وہ جگہ۔ اللہ جنت نصیب کرے ہاشمی صاحب کو۔ انہوں نے بیچنے نہیں دی۔ ہمیشہ یہی کہا کہ ابھی ٹھہرو۔ قیمت بڑھ رہی ہے تو جلدی کیسی۔ ہاشمی صاحب کے انتقال کے بعد ہم نے آدھی زمین بیچ دی۔ تیرہ لاکھ میں۔"

میں بھونچکا رہ گیا "آدھی زمین کتنی تھی؟"

"دس مرلے جناب۔ باقی دس مرلے میں اپنا مکان بنا لیا اور ایک دکان نکالی" وہ بولا "اب علی نواز دکان پر بیٹھے گا۔"

"اور تم ریٹائر ہو کے آرام کرو گے۔ ویری گڈ۔ میں تم کو روکنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا مگر تم نے اتنا عرصہ انتظار کیا۔"

"بس جناب۔ ہاشمی صاحب نے جانے نہیں دیا۔ ہمیں کوئی تکلیف ہی نہیں تھی یہاں اور نہ کوئی تنگی تھی روپے پیسے کی طرف سے۔ رہنے کو جگہ تھی پانچ چھ ہزار مل جاتے تھے ہمیں۔ دکان داری میں مشکل ہو گی۔ اتنی کمائی ایک دم تو نہیں ہو سکتی۔"

"یہ تو ہے پھر تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ علی نواز کو دکان پر بٹھا دو۔ اگر چاہے تو یہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ وہاں رہے۔"

"نہیں جی۔ پوتے پوتیوں کے بغیر نہیں رہ سکتے ہم۔"

میں نے کہا "پھر یہ ہو سکتا ہے کہ تم اس مکان کو کرائے پر اٹھاؤ فی الحال۔ اس سے کچھ آمدنی ہو گی۔ دکان بھی چل جائے گی رفتہ رفتہ۔ باقی سب پہلے کی طرح یہاں رہو۔ علی نواز کو جتنے ملتے تھے اتنے کرائے سے آ جائیں گے۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کی جگہ علی نواز نے کہا "کہہ دے نا ابا کہ بس اب ہم نہیں رہ سکتے یہاں۔" وہ اپنے باپ کے مقابلے میں بدلحاظ تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے مالک نہیں کہا تھا۔ جناب کہہ کے بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس کا لہجہ بھی جارحانہ تھا۔

میں نے کہا "میں تم سب کے ملا کے دو ہزار بڑھا دوں گا۔"

بوڑھے نے ممنونیت سے سر اٹھایا "مہربانی ہے آپ کی جناب' لیکن بات پیسے کی نہیں ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "دیکھو۔ میں جو تم سے بات کرنے یہاں آیا ہوں' اس کی وجہ بھی کچھ اور ہے۔۔۔ نوکر بہت ملتے ہیں۔"

"تو رکھ لو جی!" علی نواز نے بدتمیزی سے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں "رب نواز۔ میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے جو میں یہاں سب کے سامنے نہیں کہہ سکتا۔"

وہ میرے پیچھے پیچھے چلتا ہوا آ گیا حالانکہ اس کے بیٹے علی نواز نے اپنے باپ کی اس تابعداری کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ پینتیس سال کا جوان آدمی تھا اور ایک آدمی کی ذاتی ملازمت کا خاندانی طوق گلے سے اتار کے آزادانہ طور پر ذاتی کاروبار کا مالک بننا اس کی عین خواہش ہو گی مگر باپ وضع داری میں وفاداری کی رسم نبھا رہا تھا۔ اب حالات بدل گئے تھے۔ پرانی روایات کے مطابق حق نمک ادا کرتے رہنے کی پابندی بھی ہاشمی صاحب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔

میں نے رب نواز کو اپنے ساتھ بٹھا لیا "دیکھو چاچا رب نواز۔ میری عمر تمہارے بیٹے کی عمر سے بھی کم ہے۔ ہاشمی صاحب کا جو رشتہ تم سے رہا' وہ میرا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے تمہیں خاندان کے ایک فرد کی طرح سمجھا۔"

"اس لیے کہ وہ ایک خاندانی آدمی تھے" رب نواز بولا۔

میں نے پھر اپنے آپ کو بے عزت محسوس کیا۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ہاشمی صاحب کے مقابلے میں اپنے آپ کو دیکھو۔ تم کیا ہو؟ تمہارے تو خاندان اور نام نسب کا بھی پتا نہیں۔ ایک یتیم خانے سے نکل کے آج تم اس کوٹھی اور ہاشمی صاحب کی دولت جائداد کے مالک کیسے بنے ہو۔ یہ کون نہیں جانتا' حادثات اور اتفاقات کے نتیجے میں تمہارے نام دولت مندی کی لاٹری نکل آئی ہے اور ہاشمی صاحب کی بیوہ کو پھانس کے تم ہمارے مالک بن بیٹھے ہو۔ اس بیوہ سے بھی خدا سمجھے جس کو تم نے چارے کے طور پر استعمال کیا اور ہاشمی صاحب تمہارے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گئے۔ چند دن میں اس نے بوڑھے بیمار شوہر کو ٹھکانے لگایا اور پھر تم سے آ ملی۔ اس فاحشہ کو شریف خاندانی عورت کہہ سکتا ہے کوئی جس نے اپنا حسن اور جوانی داؤ پر لگا کے ایک اکیلے آدمی کو محبت کا جھانسا دیا' ایسی عورت سے کیا بعید کہ وہ ہاشمی صاحب کو لندن بھی اسی لیے لے گئی ہو کہ وہاں ان کا کام تمام کر دے اور ڈھونگ رچائے ہارٹ فیل ہونے کا۔ کتنی ڈھٹائی اور بے شرمی سے اس نے عدت کا زمانہ پورا ہوتے ہی اپنے آشنا سے بیاہ رچا لیا اور اسے لے کر آج یہاں آ گئی۔ اس بے غیرت کو آج ہم مالک کہیں جس نے اپنی ہونے والی بیوی کے جسم کی مدد سے یہ دولت و جائداد حاصل کی؟ ورنہ وہ کیا تھی' ایک فقیر کی بیٹی تھی اور اس کا عاشق خود فقیر تھا۔

ان تلخ حقائق کو میں اور شادو اپنی کتاب زندگی سے خارج نہیں کر سکتے تھے۔ ہمارا وقت ہمارے خلاف ایک شہادت کی حیثیت رکھتا تھا مگر میرے نزدیک یہ حق کسی کو نہیں دیا جا سکتا تھا کہ وہ میرے یا شادو کے ماضی کو ہمیں ذہنی احساسِ ذلت و ندامت میں مبتلا کرنے کے لیے استعمال کرے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں موروثی رئیس زادوں اور شجرۂ نسب کی رو سے خاندانی ثابت ہونے والوں کی عزت افزائی کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں سلام کرنے کا پابند نہیں تھا۔

مجھے یقین تھا کہ آج سے بیس تیس سال بعد اگر خوش قسمتی نے ساتھ نہ چھوڑا تو اپنی محنت سے اور ذہانت سے میں بھی وہ مقام حاصل کر لوں جو ہاشمی صاحب نے کیا تھا۔ شاید میں ان سے زیادہ عزت دار کہلاؤں لیکن آج پیدائشی طور پر مجھے ورثے میں ملنے والی بدقسمتی کے باعث ان سے میرا موازنہ بھی غلط تھا۔ ناانصافی پر مبنی تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ابھی یہ گھر کے اندر کی بات تھی۔ اس سے بدتر صورتِ حال کا سامنا مجھے باہر کی دنیا میں ہوگا جہاں میرے مقابل گھریلو ملازم نہیں ہاشمی صاحب کے ہم رتبہ' ہم پیشہ لوگ۔ احباب و اقارب اور شاید ان کے وارث ہوں گے جو ہرگز مجھے اپنے جیسا عزت دار سمجھنے پر راضی نہ ہوں گے اور مجھے میری اوقات یاد دلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔ ان کے رویے سے یقیناً شادو کو ذہنی اذیت ہوگی۔ جب بیگم ڈاکٹر مشہود کی طرح اور بہت سے حاسد اور بدخواہ اسے بار بار احساس دلائیں گے کہ وہ دو ٹکے کی عورت ہے' فقیرزادی ہے' فاحشہ ہے' اس نے اپنا جسم بیچ کے ہاشمی صاحب کی دولت حاصل کی۔ وہ ہاشمی صاحب کی قاتل ہے۔ تو میں کس کس کی زبان پکڑوں گا اور کیسے شادو کی زندگی کے باقی دنوں میں اسے وہ خوشی' سکون اور اطمینان فراہم کرپاؤں گا جس کی اسے ضرورت ہے۔

اس کا سب سے آسان طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ میں ایسے سب آزار دینے والوں سے مکمل لاتعلقی اختیار کرتے ہوئے شادو کو کہیں اتنی دور لے جاؤں جہاں ان کی نظروں اور ان کی زبانوں کی پہنچ نہ ہو۔

رب نواز میرے سامنے بیٹھا میری صورت دیکھ رہا تھا "میں جاؤں جی!"

"ہاں۔ تمہارا جانا ہی بہتر ہے" میں نے کہا "حالانکہ میں جانتا ہوں کہ بیگم صاحب کو دکھ ہوگا اور مجھے ان کی بیماری میں تمہارے جیسے مددگاروں کی ضرورت تھی لیکن ان کے اور میرے لیے تمہارے وہ جذبات نہیں ہیں جو ہاشمی صاحب کی فیملی کے لیے تھے۔"

اس نے اعتراف میں سر جھکا لیا "بیگم صاحبہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

میں نے کہا "رب نواز۔ جیسے میں تمہارا مالک نہیں ہوں' ہاشمی صاحب تھے۔ ویسے ہی شادو تمہاری بیگم صاحبہ نہیں ہے۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے "سب ختم ہو گیا جی' دیکھتے دیکھتے۔ بیگم صاحبہ کی شادی میرے سامنے ہوئی۔ بچے ہوئے۔ میں انہیں اسکول لے جاتا تھا پھر وہ بڑے ہو گئے اور باہر چلے گئے۔ اب کچھ بھی نہیں' بیگم صاحبہ پہلے گئیں پھر صاحب بھی نہیں رہے۔ چالیس سال گزرنے کے بعد اب اس گھر میں میرے لیے کچھ نہیں ہے جناب!"

مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔ وہ اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ ساری بات جذباتی وابستگی کی ہے ورنہ معاشی مجبوری آدمی کو باندھے رکھتی ہے۔ "تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ" اس نے مجھے سلام کیا "بڑی مہربانی آپ کی۔ بس اجازت دے دیں اپنی خوشی سے۔"

میں نے کہا "شادو کو یقیناً دکھ ہوگا لیکن اسے میں سمجھاؤں گا تم کو اس سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں' خاموشی سے چلے جاؤ۔"

وہ بولا "ہم چلے جاتے لیکن گھر کسی کے حوالے کرنا ضروری تھا۔"

میں نے کہا "ہم آج جائیں گے تو کل آئیں گے۔ دوپہر تک۔ سارے تالے لگا کے چابیاں کہیں بھی رکھ جانا' جہاں آسانی سے مل جائیں۔ ویسے تو ڈپلی کیٹ ہوں گی شادو کے پاس۔"

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

یہ کہانی وطن کے پُرآشوب حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔

آ ساتھ مرے اور دیکھ ذرا جس دنیا میں تُو رہتا ہے
یہ دنیا اک تماشا ہے اور سب انسان مداری ہیں

کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیا کیا کھیل دکھاتے ہیں
یہ لیڈر، ووٹر، پیر مرید، شاگرد اُستاد مداری ہیں

آ دیکھ نہ آنکھوں سے انہیں ان سب کے ہاتھ میں جھنڈا ہے
یہ قوم کے خادم، دانشور، فن کار، وزیر مداری ہیں

ان چہرہ بدلنے والوں کو ایمان اصول وفا سے کیا
یہ ڈاکو تاجر، چور افسر، عاشق معشوق مداری ہیں

آ کمیشن، الیکشن، یو این او، انصاف حقوق انسانی
لے پنچ جمہورا یہ باتیں جو کرتے ہیں وہ مداری ہیں

احمد اقبال

PDFBOOKSFREE.PK

Rs.60/-

ISBN 969-517-084-6